سلسلۂ اشاعت پنجم اکیڈمی

میری زندگی کا ہر لمحہ تیری زندگی ہو جاتی — آہ! یہ تمنا ہے کہ اب عمر تیری زندگی کو سنواروں!

تاجور نمبر



شمس اسلام علامہ احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی مرحوم کی منظوم و منثور نگارشات کا بہترین انتخاب جو ان کی زندگی اور ادب کے بارے میں پاک و ہند کے مشاہیر، ادبا و شعراء کے خیالات کا مہکتا ہوا گلدستہ، ایک ایسی ادبی پیش کش جو دنیائے ادب میں زندہ رہے گی ۔

قیمت فی کاپی
تین روپے


پاکستان کی پہلی رنگین فلم "سنگم"
جو ایسٹمین کلر فلم پر فلمائی گئی
رنگین
فلمبندی کے لئے
ایسٹمین کلر نگیٹو فلم ہی بہترین ہے
بہترین نتائج کے لئے ان کو استعمال کیجئے۔
ایسٹمین کلر نگیٹو فلم
ایسٹمین انٹرمیڈیٹ فلم
ایسٹمین کلر پرنٹ فلم
کوڈک
رنگین فوٹوگرافی کے لئے
حسین و دلآویز رنگین فوٹوگرافی صرف ایسٹمین کلر نگیٹو فلم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔
اس مخصوص کلر نگیٹو فلم پر خودکار نظام کے ذریعہ فلمی چہروں کی بہترین تصویر کشی کی جا سکتی ہے۔
اس کی قوت کار (ٹنگسٹن ۵۰ اے ایس اے) آرٹسٹوں پر روشنی کے صحیح تناسب اور پس منظر
کی بھرپور عکاسی کی ضامن ہے۔ علاوہ ازیں اس نگیٹو فلم کا ہر رول فلمبندی کے دوران رنگوں کا صحیح
توازن اور فوٹوگرافی کا اعلیٰ معیار برقرار رکھتا ہے دنیا بھر میں سب سے زیادہ فلمیں ایسٹمین کلر نگیٹو
فلم پر ہی فلمائی جاتی ہیں اور سچ پوچھئے تو یہی وہ فلم ہے جس پر دنیا کی مشہور رنگین داستانیں منتقل کی گئی
ہیں جب بھی آپ رنگین فلم بنانے کا ارادہ کریں۔ ہمیشہ ایسٹمین کلر نگیٹو فلم کا ہی انتخاب فرمائیں۔
کوڈک لمیٹڈ (محدود ذمہ داری کے ساتھ انگلستان میں تشکیل شدہ) لاہور - کراچی - چٹاگانگ

ماہنامہ
پکچر لاہور

تاجور نمبر

مرتبہ: نظر زیدی

منیجنگ ایڈیٹر: مظفر شباب

طابع: شباب کیرانوی
مطبوعہ: پاکستان ٹائمز پریس لاہور
مقام اشاعت: ۲/۳۲-۲ سمن آباد لاہور
کتابت: ایم خالد صدیقی

★ جلد نمبر ۹
★ شمارہ نمبر ۵

★ قیمت فی کاپی
تین روپے

★ زر سالانہ بذریعہ رجسٹری ۱۶ روپے
★ عام ڈاک سے ۱۲ روپے

فہرست

(گلہائے عقیدت)

نگارشاتِ تاجور

تاجور نمبر

الحمد للہ! کہ آج آپ کے سامنے پنچ تاجور نمبر کی صورت میں حاضر ہے۔ علامہ تاجور مرحوم کی وفات کے بعد کتنے ہی جرائد نے تاجور نمبر نکالنے کا اعلان کیا۔ لیکن مقام افسوس ہے کہ اعلان کرنے والا کوئی جریدہ بھی اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا۔

علامہ تاجور مرحوم میرے استاد تھے۔ میرے شفیق تھے۔ میرے بزرگ تھے۔ اُن کی وفات کا صدمہ جتنا اُن کی اولاد کو ہوا اتنا ہی مجھے بھی ہوا۔ میں اگر فلم سازی میں مصروف نہ ہوتا تو اب تک نہ جانے کتنے تاجور نمبر پیش کر چکا ہوتا۔ ایک امنگ تھی۔ ایک ارمان تھا کہ استادِ محترم کی یاد میں پنچ کا ایک ایسا نمبر نکالا جائے جو نہ صرف اُن کے مداحوں کی نگارشات پر مشتمل ہو بلکہ علامہ تاجور مرحوم کے نادر و نایاب نظم و نثر کا ذخیرہ بھی اس نمبر میں موجود ہو تاکہ نظم و نثر میں اُن کی نکتہ آفرینی محفوظ ہو جائے۔

جب بھی اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کرتا مصروفیت آڑے آ جاتی۔ یوں بھی ایک مدت سے عملی طور پر صحافت سے دور جا چکا ہوں۔ اب تو کیفیت یہ ہے کہ پنچ کو چھپنے کے بعد بھی پوری طرح دیکھ نہیں پاتا۔ ان حالات میں یہ کام قریب قریب ناممکن تھا۔ اتفاق سے ایک روز برادرم سید نظر زیدی تشریف لائے۔ باتوں باتوں میں استادِ محترم علامہ تاجور مرحوم کا ذکر چل نکلا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ نظر زیدی صاحب میری اس آرزو کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں جو ایک مدت سے میں اپنے دل میں لیے ہوئے ہوں چنانچہ میں نے زیدی صاحب سے ذکر کیا تو اُن کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دوڑ گئی اور انہوں نے فوراً ہی ہاں کہہ دی۔ چنانچہ اُسی وقت پروگرام مرتب کیا گیا اور تاجور نمبر نکالنے کا اعلان کر دیا گیا۔

مجھے نہیں معلوم زیدی صاحب کو یہ نمبر مرتب کرنے میں کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے اور وہ کتنی دشواریوں سے دوچار ہوتے ہیں لیکن اتنا اندازہ ضرور ہے کہ مضامین اور مواد کی فراہمی میں انہیں خاصی تگ و دو کرنا پڑی ہے اور توقع کے مطابق وقت پر مضامین نہ ملنے کے باعث ہی تاجور نمبر مقررہ تاریخ پر شائع نہیں ہو سکا تاہم زیدی صاحب نے کسی مرحلے پر ہمت نہیں ہاری اور وہ مسلسل اس کام میں مصروف رہے۔

میرے نزدیک زیدی صاحب کی محنت اور ہمت کی داد نہ دینا بے انصافی ہے اگر وہ پوری توجہ سے یہ نمبر مرتب نہ کرتے تو شاید میری آرزو تشنۂ تکمیل رہ جاتی۔ میں زیدی صاحب کے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں کہ انہوں نے تاجور نمبر مرتب کر کے حقِ شاگردی ادا کیا ہے۔

میں استاد محترم علامہ تاجور کے متعلق لکھنا تو بہت کچھ چاہتا ہوں لیکن افسوس کہ مصروفیت آڑے آتی ہے۔ علامہ تاجور مرحوم ایک شاعر انشاپرداز اور نقاد ہی نہیں تھے۔ اُن کی ذات اُردو کا ایک ادارہ تھی۔ انہوں نے کتنے ادیب کتنے شاعر اور کتنے نقاد پیدا کیے ہیں اس کا صحیح اندازہ تو وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو انصاف کی نظروں سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ یہ ٹریجیڈی علامہ مرحوم کی زندگی میں بھی تھی کہ اُن کی ذات سے استفادہ حاصل کرنے والے اعتراف کرنے میں بخل سے کام لیتے تھے اور اُن کی وفات کے بعد تو اکثر لوگوں نے کھلم کھلا یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہم علامہ تاجور کے شاگرد نہیں تھے۔ حالانکہ یہ کہنے والوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو علامہ تاجور کی زندگی میں اُن کی ذات سے ہمیشہ فائدہ اُٹھاتے رہے ہیں۔ بہرحال ان باتوں سے علامہ تاجور کی عظیم شخصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا اُن کی علمیت اور قابلیت کسی نہ کسی رنگ میں آج بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔ علامہ مرحوم نے ان لوگوں کی بے رُخی کو اپنی زندگی میں محسوس تو ضرور کیا ہے لیکن مرنے کے بعد انہیں اس سے کیا واسطہ ؟ افسوسناک بات صرف یہ ہے کہ وہ عظیم انسان جو نظم و نثر کا بادشاہ تھا۔ اُس قدر افزائی سے محروم رہا جس کا وہ مستحق تھا۔ کتنے لوگ ہیں جنہیں یہ خیال آیا کہ علامہ تاجور کی شاعری یا انشاپردازی کو محفوظ رکھا جاتے ۔ ؟

کاش ! علامہ تاجور نے اپنی زندگی میں یہ سوچا ہوتا کہ اُن کا کلام یا اُن کی نثر کتابی صورت میں شایع ہو۔ انہوں نے بہت لکھا۔ بہت شعر کہے لیکن یہ سرمایہ محفوظ نہ رہ سکا۔ زیدی صاحب نے ہمت کر کے پچھلے صفحات میں جو ذخیرہ جمع کر دیا ہے اگر اس کی بھی حفاظت کر لی جائے تو بڑی بات ہے ؟

۳۰ / اپریل ۱۹۶۷ء

گزارشِ احوال

"یہ کسی ٹوٹے ہوئے تارے کا ماتم نہیں بلکہ
آفتابِ علم و ادب کی عظمت کا اعتراف ہے"

استاد محترم شمس العلماء احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی کی وفات کے تقریباً چھ سال بعد اس حقیری ادبی پیشکش کی صورت میں اُن کی یاد تازہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا ایمان یہ ہے کہ دنیاوی شہرت یا گمنامی دونوں ہی اپنے اثر و اعتبار کے لحاظ سے ایک ہیں۔ جو لوگ بزمِ دنیا سے اُٹھ کر اپنے خالقِ حقیقی کے دربار میں پہنچ گئے انہیں اس بات سے غرض نہیں رہتی کہ اُن کے متعلقین نے انہیں فراموش کر دیا یا اُن کی یاد تازہ رکھنے کے لیے دھوم دھام سے یوم منائے جا رہے ہیں۔ آخرت کی زندگی اس مادی زندگی سے سراسر مختلف ہے، وہاں اگر کوئی چیز کام آتی ہے تو وہ انسان کے اعمالِ حسنہ ہیں۔ نظیر اکبر آبادی نے اس نکتے کو کس خوبصورتی سے بیان کیا ہے ؎

نظیر ہم کو پہنے ہوس تھی کفن کی
جو دیکھا تو ناحق کا دیوانہ پن تھا

پھر بھی مرحومین کی یاد تازہ رکھنا اور اُن کے اچھے کاموں کا چرچا کرتے رہنا فائدے سے خالی نہیں۔ اس کا ایک بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ اچھے کاموں کے ذکر اور اُن کی قدردانی سے دوسرے لوگوں کے دلوں میں بہتر زندگی گذارنے اور مفیدِ خلائق بننے کی اُمنگ پیدا ہوتی ہے، دوسرے وہ لوگ اپنے فرض سے کسی حد تک سبکدوش ہو جاتے ہیں جن پر ان مرحومین کے احسانات تھے۔

علامہ تاجور مرحوم و مغفور کی یاد تازہ رکھنا ان دونوں وجوہ سے ضروری ہے۔ اگرچہ اُن کا تعلق علمی، ادبی اور تعلیمی حلقوں سے رہا، ایک عالمِ دین کی حیثیت سے وہ عموماً پس منظر ہی میں رہے لیکن شعر و نغمہ کی گونج اور ادبی معرکہ آرائیوں کے دوران بھی انہوں نے اعلیٰ انسانی قدروں کے تحفظ اور شرافت کو فروغ دینے میں قابلِ ذکر حصہ لیا۔ برصغیر پاک و ہند میں ایسے ہزارہا افراد موجود ہیں جنہوں نے علامہ مرحوم کی صحبت میں انسانیت کا حقیقی مفہوم سمجھا اور پھر انسانیت کے تحفظ کو اپنے ایمان کا جزو بنا لیا۔ پھر اس سلسلے میں ایک حیرتناک بات یہ ہے کہ ان حضرات میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل ہیں۔ مسلمان بھی ہیں، ہندو بھی ہیں، سکھ بھی ہیں اور عیسائی بھی ہیں۔

اس خاص وصف کے علاوہ علامہ مرحوم کی ادبی و علمی حیثیت بھی آفتاب کی طرح درخشاں ہے۔ اس سرزمین میں جسے ہم ماضی قریب میں پنجاب کے نام سے پکارتے تھے انہوں نے ایسے موسم اور ایسے حالات میں علم و ادب کی محفل آراستہ کی جب عام لوگ شعر و ادب کے نام سے بھی تقریباً ناآشنا تھے۔ اردو اُن کے لیے ایک اجنبی اور نامانوس زبان تھی اور شعر و ادب ایک ایسا نادر اور عجوبۂ روزگار رشتہ جسے چھونے کی بھی وہ خود میں ہمت نہ پاتے تھے۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ مولوی محمد حسین آزاد اور مولانا حالی وغیرہ بزرگ سرزمینِ پنجاب میں بزمِ ادب کی داغ بیل ڈال گئے تھے اور سر عبدالقادر، علامہ اقبال اور اُن کے رفقاء ادب کو فروغ دینے میں خلوصِ دل سے کوشاں تھے لیکن اس زمانے تک یہ مساعی خواص تک محدود رہیں۔ انہیں حقیقی معنوں میں عوامی رنگ علامہ تاجور کی کوششوں سے ملا۔ بالخصوص پنجاب کے ہندو اور سکھ نوجوانوں کے بارے میں تو یہ بات پورے دعوے کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ ان کی

غالب اکثریت تاجور ہی کی تربیت یافتہ تھی۔ علامہ مرحوم نے اس زمانے میں ان اقوام میں اردو ادب کا ذوق پیدا کیا، جب ہندوؤں کے بڑے لیڈر ہندی زبان کے فروغ و استحکام کی تحریک شروع کر چکے تھے اور سکھ حلقوں میں اُردو کو قرآنی زبان قرار دے رہے تھے۔

اس اہم خدمت کے علاوہ ایک شاعر، ادیب اور ایک صحافی کی حیثیت سے علامہ تاجور کا مقام بیحد بلند ہے۔ نثر اور نظم دونوں میں انہیں صاحب طرز ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اُن کی نظم میں جذبات کی فراوانی کے ساتھ زبان کی ایسی پاکیزگی اور تخیل کی ایسی رفعت ہے کہ اس کے معیار پر پہنچنا تو کجا اس کی نقل بھی کسی کے بس کی بات نہیں۔ یہ حقیقتاً زمانے کی ستم ظریفی ہے کہ اُن کی زندگی میں اُن کا کلام شائع نہ ہو سکا اور اپنی بے نیازی کی خو کے باعث وہ ان جواہر پاروں کو محفوظ رکھنے کا اہتمام بھی نہ کر سکے اور یوں اُن کی کاوشوں کا بہت بڑا حصہ تلف ہو گیا یا بعض لوگوں کے کشکول کی زینت بن گیا۔ اگر یہ سارا کلام جمع ہوتا تو اردو شاعری کا قیمتی سرمایہ تسلیم کیا جاتا۔

یہی عظمت اُن کی نثر کو حاصل ہے۔ تاریخی، تنقیدی اور تحقیقی مقالات کے علاوہ علامہ مرحوم نے علامہ ظریف کے نام سے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا ایک طویل سلسلہ تحریر کیا اور اپنی ان دونوں حیثیتوں میں وہ اس قدر کامیاب ہیں۔ کہ موجودہ دور تک اُن کا کوئی حریف نظر نہیں آتا۔

اسی طرح علامہ مرحوم نے ایک صحافی کی حیثیت سے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔ انہوں نے اردو صحافت کے ابتدائی دور میں شاہکار اور ادبی دنیا جیسے پرچے نکالے اور ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے انہیں اس بلندی پر لے گئے، کہ اُن کی طرف دیکھتے ہوئے ہمیں آج بھی اپنی پگڑیاں اور ٹوپیاں سنبھالنی پڑتی ہیں۔

اس نمبر میں مرحوم کے شاگردوں اور دوستوں نے اُن ادب پاروں کے علاوہ جو انہوں نے اپنے ممدوح کی مختلف حیثیتوں پر لکھے ہیں خود علامہ کے مضامین نظم و نثر کا کافی حصہ شامل کیا گیا ہے۔ ان مضامین کی حیثیت صرف آفتاب آمد دلیل آفتاب کی نہیں بلکہ اردو ادب کے گمشدہ خزانے کی بازیافت کی ہے۔ یہ وہ ادب پارے ہیں جو ہماری نااہلی اور زمانے کی احسان فراموشی کے باعث آہستہ آہستہ نگاہوں سے اوجھل ہوتے جا رہے تھے اور یوں ادبِ عالیہ کا ایک بہت بڑا حصہ تاریکی میں ڈوب رہا تھا۔ ہمیں یقین ہے قارئینِ کرام ان مضامین کے مطالعہ سے نہ صرف محظوظ ہوں گے بلکہ یہ محسوس فرمائیں گے حقیقی ادب کی حلاوت انہیں آج میسر آئی ہے۔ ہماری تمنا تو یہ تھی۔ کہ علامہ مرحوم کے تمام مضامین محفوظ کر لیے جاتے لیکن ع

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

کا معاملہ تھا۔ اس ضخامت کے باوجود اس مقصد کے لیے یہ نمبر تنگ داماں نظر آیا۔ خدا کرے بہت جلد کوئی ایسا وسیلہ پیدا ہو جائے، کہ علامہ مرحوم کی تمام نگارشات کو کتابوں کی صورت میں پیش کیا جا سکے۔

اس نمبر کے سلسلے میں ایک بات اور بطور خاص قابلِ ذکر ہے اور وہ ہے پیکچر کے مالک و مدیر برادرم شباب کیرانوی صاحب کی اپنے استاد مرحوم کی ذات سے عقیدت۔ یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ شباب صاحب کو علامہ مرحوم کی ذات سے فیضیاب ہونے کا بہت کم وقت ملا، کیونکہ وہ اس وقت اُن کے دامن سے وابستہ ہوئے جب علامہ مرحوم اپنا ادبی اور علمی سفر ختم کر کے تقریباً گوشہ نشینی کی زندگی گذار رہے تھے اور اپنے بعض نامور شاگردوں کی "احسان شناسیوں" کے باعث کسی کو اپنا عقیدت مند دیکھ کر خوشی محسوس نہ کرتے تھے لیکن انہوں نے اس تعلق کو بھی زندگی کی سب سے بڑی برکت خیال کیا اور اس احساس کا ثبوت یہ نمبر ہے۔ اللہ پاک اُن کی اس کوشش کو کامیاب کرے۔

نظر زیدی

اپریل ۱۹۶۵ء

تاجور کی کہانی تاجور کی زبانی

میں نسباً درانی افغان ہوں، اپنے وطن نجیب آباد میں فارسی عربی کی ابتدائی تعلیم میں نے اپنے برادر معظم سے حاصل کی۔ ماہ صفر ۱۳۲۶ھ میں دس سال کی عمر میں دارالعلوم دیوبند کا طالب علم بنا۔ دس سال وہاں رہ کر درس نظامیہ کی تکمیل کر کے اکتوبر ۱۹۱۵ء میں لاہور آیا۔ اور حسب ایما حضرت شمس العلماء مفتی عبداللہ ٹونکی، اورینٹل کالج میں داخل ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۱۷ء میں مولوی فاضل اور ۱۹۱۸ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۱۶ء ہی میں رسالہ مخزن کا ایڈیٹر بنا ۱۹۲۲ء میں دیال سنگھ کالج لاہور میں فارسی اور اردو کے استاد کی حیثیت میں میرا تقرر ہوا۔ اسی سال رسالہ ہمایوں لاہور میں مدیر معاون بنایا گیا۔ ۱۹۲۹ء میں رسالہ ادبی دنیا اور ۱۹۳۴ء میں رسالہ شاہکار جاری کیا۔ ادبی دنیا میری انتظامی ناقابلیت اور زود اعتمادی کے سبب میرے ہاتھ سے منتقل ہو کر دوسرے ہاتھوں میں پہنچ گیا اور شاہکار اب تک میری نگرانی میں جاری ہے۔ میں نے سارا عہد طالب علمی امتیازی شہرت میں بسر کیا تھا۔ مگر غالباً کسی گناہِ کبیرہ کی پاداش کے طور پر قدرت نے مجھے اردو کے جنونِ خدمت میں مبتلا کر دیا۔ اردو زبان و ادب کی راہ میں اپنا ذاتی سرمایہ تیس ہزار روپیہ کاروباری آمدنی کا، اپنی جوانی صحت و طاقت اور متعلقین کا حال و مستقبل سب کچھ نثار کر دیا۔

اردو مرکز کے نام سے ۱۹۲۶ء میں ایک ادارہ تصنیف و تالیف قائم کیا تھا۔ جو اب تک قائم ہے۔ میرے ہندوستان گیر شہرت رکھنے والے شاگردوں کی ایک جماعت اردو اصنافِ ادب کے ہر شعبے میں رہنمایانہ خدمت انجام دے رہی ہے، یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ جدید دور ادب کی تعمیر کرنے والوں میں ۸۰ فی صدی میرے شاگرد ہیں۔ اردو میری تفریح تھی لیکن شامتِ اعمال سے یہ تفریح عذابِ زندگی بن گئی۔ چونکہ میرا مجموعۂ کلام ابھی تک شایع نہ ہو سکا۔ اس لئے جدید دور کے نام نہاد نقادوں کے دائرۂ تعارف سے آج تک خارج ہوں۔ متعدد اصنافِ ادب میں بیسیوں شاگردوں کو آسمان شہرت پر پہنچا دیا۔ لیکن ماہناموں کے صفحات سے اردو نثر کی تاریخ مرتب کرنے والے اُن تابناک ستاروں کے مبداء نور سے بیخبر بن رہے ہیں۔ اِدھر جس ادبی فضا میں زندگی کے ۲۵ سال بسر کر چکا ہوں، وہ میرے لئے اس وجہ سے ناساز گار چلی آئی ہے کہ میں دریائے ستلج کے اُس پار کیوں پیدا ہوا!

اوائل مشق کا کلام تو اگر گم نہ ہوتا تو میں اُسے خود گم کر دیتا۔ البتہ وسط مشق کے ایک مجموعے کے گم ہونے کا افسوس ہے غالباً کسی شاگرد کی سعادت مندی اس سرقے کی مرتکب ہوئی۔ اس مجموعے کے گم ہو جانے سے میری ہمت شکست ہو گئی اور پھر کبھی میں نے اپنے کلام کی فراہمی کی جانب توجہ نہیں کی۔

میرا کلام وقتاً فوقتاً پنجاب کے اخبارات اور ماہناموں میں شایع ہوتا رہا ہے۔ میرے پاس اس کی کوئی نقل بھی نہیں نہ یہ یاد کہ کس پرچے میں کب شایع ہوا، حافظہ بھی اب کمزور ہو چکا ہے :

تاجور

ماہنامہ نگار لکھنؤ جنوری ۱۹۴۱ء

علامہ تاجور کے استاد

(خط بنام مولوی محمد اظہار الحسن وکیل غازی آباد)

ادبی دنیا - پوسٹ بکس ۱۹۷ - لاہور

۱۱ رجون ۱۹۳۱ء

مکرمی ! سلام مسنون

والا نامہ صادر ہوا - شکریہ - حضرت رسا مرحوم میرے استاد تھے اور مجھ سے بہت التفات سے پیش آتے تھے - ان کے کلام کو میں مدوّن کرنا چاہتا تھا مگر ان کے بھانجے نشتر سکندر آبادی نے ان کا کلام دبا رکھا ہے - ۱۹۰۸ء میں مرحوم میرٹھ تشریف لے گئے تھے وہاں انہوں نے مجھے بھی طلب فرمایا تھا - اس وقت ان کے پاس اپنے کلام کے دو مسودے دو مجلّات میں موجود تھے - اس کے بعد میں ان سے رام پور میں ملا اور پھر میری ملاقات نہ ہو سکی - ان کا بہت سا کلام قاضی علی الدین صاحب مقیم ریاست رام پور (یو-پی) کے پاس ہے ان سے حاصل کیجیے - مرحوم کی بیوی جنہوں نے نکاح ثانی کر لیا ہے ان کا پتہ لے کر ان سے مرحوم کے کلام کا حال معلوم کیجیے ممکن ہے ان کے پاس کچھ خطوط، کچھ کلام اور تصویر ہو -

مولوی عبد اللہ صاحب کامل شاہ آبادی ایم - اے پروفیسر گورنمنٹ کالج لائل پور نے مرحوم کے حالات اور خطوط ان کے شاگردوں سے جمع کر کے مرتب کیے تھے - ان سے بھی امداد لیجیے - "جلوۂ یار" میرٹھ میں ان کا کلام اکثر شائع ہوا کرتا تھا - منشی محمد شریف خاں آزاد میرٹھی مالک رسالہ جلوۂ اندرکوٹ میرٹھ سے بھی فائل حاصل کیجیے - حضرت رسا کی تصویر، حالات اور منتخب کلام اگر مجھے عنایت کریں تو رسالہ ادبی دنیا میں شائع کر کے حق شاگردی پورا کر سکوں - جگر مراد آبادی ان کے شاگرد ہیں مگر اب اپنے آپ کو داغ کا شاگرد بتاتے ہیں - منشی عبد المجید خاں سالک بی - اے ایڈیٹر انقلاب بھی انہی کے شاگرد ہیں - حضور نعیمی مراد آبادی مرحوم، طالب مرحوم، حامد اللہ افسر میرٹھی بی - اے پروفیسر انٹرمیڈیٹ جوبلی گورنمنٹ کالج لکھنؤ بھی انہی کے شاگرد ہیں - بہت سے شاگردانِ داغ مرحوم بھی ان سے درپردہ اصلاح لیتے تھے - رام پور کے سرکاری و غیر سرکاری عظیم الشان مشاعروں میں مرحوم کی موجودگی نے شوق قدوائی، اکبر قدوائی اور رام پور کے سرکاری شعراء کا کبھی رنگ نہیں جمنے دیا - یوں بھی ان کا کلام اور اس پر ان کا اثر آفرین پڑھنے کا انداز بزمِ سخن کو درہم برہم کر دیا کرتا تھا - مجھ سے مرحوم میر نثار علی شہرت دہلوی سابق ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم کشمیر نے ایک بار (وہ اس سے بے خبر تھے کہ میں اُن کا شاگرد ہوں) رامپور کے سرکاری مشاعرے کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ: "ریاست کی جانب سے ہندوستان کے تین سو مشہور شعراء کو دعوت دی گئی تھی - بڑا اہتمام کیا گیا تھا - اس مشاعرے میں میں بھی مدعو تھا، داغ کے ایک شاگرد رسا نے جو غزل پڑھنی شروع کی ہے تو ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے ڈائنامیٹ چھوڑ دیا ہے ہر شخص بے اختیارانہ طور پر داد دے رہا تھا - ساری مجلس زیر و زبر ہو گئی - حتی کہ رسا سے بعض معاصر جو ان سے کدر رکھتے تھے وہ بھی اچھل رہے تھے۔"

(تاجور)



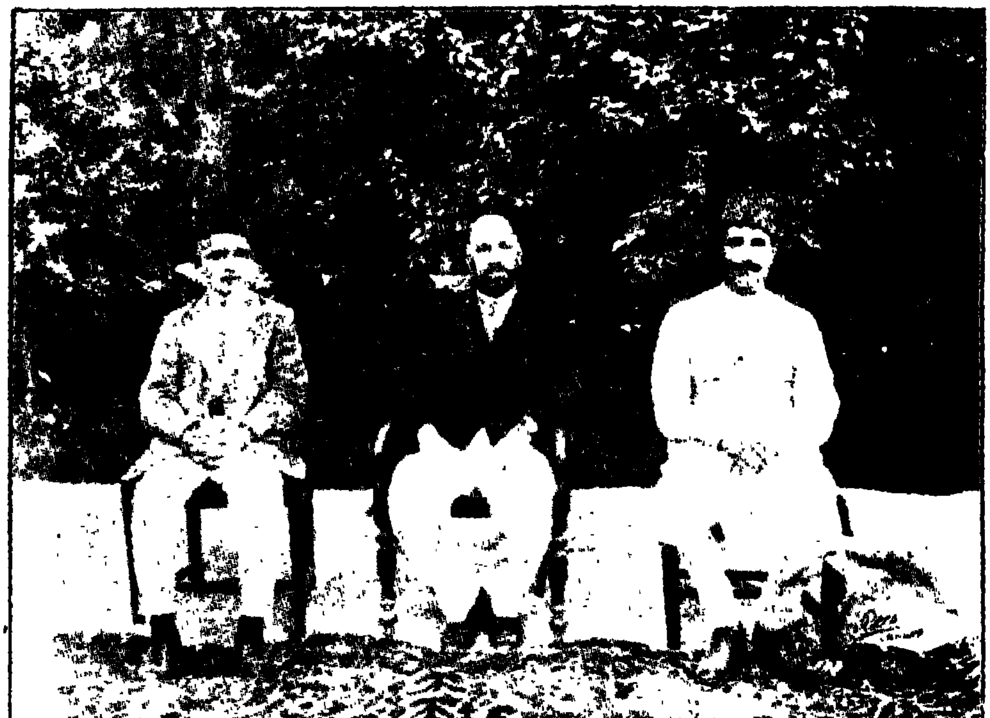
علّامہ تاجورؔ کا قلمی چہرہ

از خوشتر گرامی (ایڈیٹر بیسویں صدی)

پروفیسر، شاعر، ادیب اور نقاد۔

شکل و صورت کے محاسن داڑھی اور مونچھوں نے چھپا رکھے ہیں۔ جسامت کے اعتبار سے رستمِ ہند، علم و فضل میں شمس العلماء۔ دل حد سے زیادہ زندہ مگر جیب اسی قدر مُردہ۔ اگر اس میں کسی وقت زندگی کے آثار پیدا ہونے لگیں۔ تو کسی نہ کسی بہانے فوراً گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ دوستی اور دشمنی میں انتہا پسند دشمنی کے معرکے میں آزمودہ کار جرنیل مگر دوستی کے معاملے میں انتہا کے سادہ لوح اور سآفت طلب۔ دوست چکمے دیتے ہار گئے مگر اس اللہ کے بندے

[illegible]



مجلس مشاورت اردو مرکز کے اراکین ۔ داہنی طرف سے (۱) خان بہادر شیخ نور الٰہی (۲) سر شیخ عبدالقادر (۳) پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی



اردو مرکز کے م



علامہ تاجور، ڈاکٹر محمد عمر داؤد پوتہ۔ ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم سندھ کے ساتھ



علامہ تاجور پنڈت سبھو رام جوش ملیانی

اور

دوسرے رفیقوں کے ہمراہ



عرفان اللہ خاں اور رضوان اللہ خاں اپنے والد محترم کے ساتھ

اس تصویر میں علامہ تاجور مرحوم اپنے اُن دو صاحبزادوں کے ہمراہ تشریف فرما ہیں جن کی بے وقت موت نے انہیں جوانی میں بوڑھا کر دیا تھا۔ ان بچوں کا انتقال ۷؍اکتوبر اور ۲۷؍اکتوبر ۱۹۲۶ء کو ہوا تھا۔

اس نمبر میں ان بچوں کی وفات حسرت آیات پر دو بلند پایہ نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ ایک نظم حضرت احسان دانش کی ہے اور دوسری خود علامہ مرحوم کی۔ یہ دونوں نظمیں اگرچہ ایک خاص سانحے سے متعلق ہیں لیکن اپنے تاثر اور فنی خوبیوں کے اعتبار سے ادب عالیہ میں شامل کی جانے کی مستحق ہیں ⁂



شباب کیرانوی

شبابؔ کیرانوی غالباً علامہ تاجورؔ کے سب سے آخری شاگرد ہیں۔ لیکن استادِ محترم سے عقیدت اور خلوص میں انہوں نے اوّلیت کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ علامہ اپنے شاگردوں سے نالاں رہے، اُن کی تحریروں میں یہ شکایت زیادتی کی حد تک ہے۔ کیونکہ ان حضرات میں اکثر نے انہیں شدید صدمے پہنچائے لیکن اگر وہ آج زندہ ہوتے تو دیکھتے نسلِ انسانی سعید روحوں سے محروم نہیں ہو گئی۔ جہاں انہیں ایسے بدباطن لوگوں سے واسطہ پڑا جنہوں نے اُن کی مہربانیوں کا بدلا بے وفائیوں سے دیا وہیں ایسے شریف طبع شاگرد بھی اُن کے دامن سے وابستہ ہوئے جو اُن کی وفات کے بعد بھی اُن کی ذات سے اظہارِ عقیدت کو اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ جانتے ہیں۔



چودھری محمد اکبر خاں اکبرؔ لاہور

چودھری محمد اکبر خاں اکبرؔ لاہوری بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی اردو زبان کے قادر الکلام شاعر ہیں۔ طنز و مزاح میں انہیں خاص دسترس حاصل ہے۔ آنکھوں کی تکلیف نے انہیں کچھ عرصہ سے گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا ہے۔ اللہ پاک انہیں صحت عطا کرے۔ چودھری صاحب کے دل میں اپنے استادِ محترم کے لئے بے پناہ خلوص اور محبت ہے۔



ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہؔ نسلاً اس قوم سے ایک فرد ہیں جس نے ۱۹۴۷ء کے فسادات میں مشرقی پنجاب کے بے بس اور نہتے مسلمانوں پر ستم ڈھانے میں ماضی کی تمام سفاک قوموں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا لیکن اصلاً وہ ایک اونچے درجے کے انسان اور صحیح معنوں میں عالم فاضل ہیں۔ اُن کی ذات اس بات کی زندہ شہادت ہے۔ کہ کسی بھی قوم کے تمام افراد بُرے نہیں بن سکتے۔



اصغر حسین خاں نظیرؔ لدھیانوی



پیامؔ شاہجہاں پوری



سیّد نظر زیدی



مولانا عبدالصمد صارم

محمد سبطین شاہجہانی



پروفیسر خالد بزمی



چودھری محمد اکبر خان اکبر لاہوتی
(بی اے آنرز ایم اے ایل ایل بی)

شمس العلماء علامہ تاجور نجیب آبادی

(چند تاثرات)

لاہور کی تاریخ میں اردو کے حق میں دو واقعات ایسے ہوئے ہیں جو بھلایا نہیں جا سکتا۔۔۔ ایک شمس العلماء حضرت مولوی محمد حسین آزاد دہلوی کی آمد اور دوسرے شمس العلماء حضرت تاجور نجیب آبادی کی تشریف آوری۔ اردو کے حق میں ان ہر دو حضرات کا وجود مسعود خشک کھیتی پر ابر بہاری کے مثل کر برس جانے کا مصداق ہوا۔ مولانا تاجور نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ اردو زبان کے لئے ہم لوگوں نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کا کچھ اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ ہم نے پہلے ان لوگوں کو اردو پڑھائی جن کی مادری زبان اردو نہ تھی اس کے بعد ان میں شعر و ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی پھر ان کی ادبی کاوشوں کو زیورِ اصلاح سے آراستہ کر کے مقبول و معروف رسالوں میں شائع کرایا اور پھر مسلسل کر فرمایا۔ ہاں کبھی کبھی ان سے اپنے سخن کی داد بھی پائی۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ مولانا تاجور شاگردوں کے دل میں اردو کا صحیح ذوق و شوق پیدا کرنے کے لئے بے پناہ اور مسلسل جد و جہد فرماتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ہم لوگ دس سال تک اسکولوں میں اردو کی تعلیم پانے کے بعد دیال سنگھ کالج کی فرسٹ ائیر کلاس میں بیٹھے تو مولانا نے فرمایا۔ سو تک گن کے دکھاؤ۔ چھٹے تو پہنچے سترہ کو ستارا۔ بادن کو بونجا۔ ترپن کو تروبجا پچپن کو پچونجا، اڑسٹھ کو اٹھاٹھ، نواسی کو انانوے اور نوے کہتے کہتے والوں کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گیا اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب مکروہاتِ زمانہ اور دوسرے اور جھنجھٹوں نے ہمارے اور استاد کے درمیان بے توجہی کی ایک دیوار نہ کھڑی کر دی کیونکہ ایک فارغ التحصیل شاگرد نے عشرۂ محرم کو عشرۂ محرم کہا تھا تو مولانا نے حسبِ عادت ٹوکا اور فرمایا عشرہ ع بالفتح ہے بھائی یہ اور بات ہے کہ فارغ التحصیل کی اصلاح اس وقت فرماتے تھے جب کوئی اور سننے والا قریب نہ ہو۔ اس کے علاوہ زبان کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے لئے ہمیشہ اچھے نمونے شاگردوں کے سامنے رکھتے رہتے تھے۔ ہمارے چاروں طرف زبان کے متعلق نئے نئے تجربات ہو رہے تھے۔ مولانا نے اپنی اس زندگی میں اس حقیقت کی طرف بار بار متوجہ کیا کرتے تھے کہ نئے تجربات کرتے وقت محاورہ اہلِ زبان، لغوی معانی اور مسلمہ اصطلاحات سے روگردانی جائز نہیں۔ زبان کو یوں بولو جیسے مستند لوگ بولتے آئے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ جسے لوگ جوتا کہتے ہیں تم اسے ٹوپی لکھنے لگو۔ اس سلسلے میں انگریزی لکھنے والے ہندوستانی ادیبوں، مولانا محمد علی، پنڈت جواہر لال اور مہاتما گاندھی کی مثال دیا کرتے تھے کہ یہ لوگ انگریزی لکھتے ہیں لیکن کوئی لفظ یا کوئی محاورہ اس طرح نہیں لکھتے جیسے پڑھ کر اہلِ زبان بوکھلا جائیں بلکہ انگریزی کے الفاظ ان ہی معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور اسی اسلوب سے تحریر میں لاتے ہیں جس کی سند پڑھنے والوں کو انگریزی کی معیاری ڈکشنریوں میں مل جاتی ہے۔ اس لئے وہ ہدایت فرماتے تھے کہ نئے نئے خیالات اور نئے نئے اسالیبِ فکر اختیار کرنے کے باوجود زبان کا ڈھانچہ وہی رہنا چاہیئے جسے حضرت داغ دہلوی نے کمال توجہ اور کاوش سے تیار کیا ہے۔ نظم ہو یا نثر مولانا خود اپنی تحریروں میں زبان کی سادگی اور بے تکلفی کو پوری طرح ملحوظ رکھتے تھے مثلاً:

نہ کیجئے گا نہ کیجئے گا، نہ کیجئے گا　　بہت ہی مہنگا پڑے گا آخر بتوں کا سودا نہ کیجئے گا
یہ تاجور خوب پالیسی ہے کراؤ اور دل سے ترکِ دنیا　　مگر رہے یاد آپ کو آپ ترکِ دنیا کا نہ کیجئے گا

اسی طرح۔۔۔ ع

وفا کے گائے ہوئے گیت گا رہا ہوں میں　　کسی ستائی کہانی سنا رہا ہوں میں

محبت آہ، محبت کی زندگی مت پوچھ — بڑی مصیبتوں میں مبتلا رہا ہوں میں
ہے میری خاک کے ذروں میں پھر نمودِ حیات — کہیں انہیں تو نہیں یاد آ رہا ہوں میں

چند شعر اور ملاحظہ فرمائیے:

یہ کیا ہوئی کہ بہار کیوں ہے کہاں وہ جانِ بہار ہے
یہ چمن سے کون چلا گیا کہ کلی کلی تو نثار ہے
نہیں اس میں شک کوئی تاجور کہ تڑپ ہے تیرے کلام میں
مگر اس میں تیرا کمال کیا غمِ دوست دردِ نگار ہے

استاد داغ کے بعد نثر سے قریب ترین جس قدر کلام تاجور کو پایا ہے کسی اور شاعر کے کلام کو نہیں پایا اور لطف یہ ہے نہ جذبات کا علو اور خیالات کا عمق، زبان کی سلاست اور بیان کی روانی میں کسی طرح حائل نہیں ہوا۔

اس سلسلے میں البتہ ایک بات قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ کہ مولانا زبان کی صفائی اور صحتِ لفظی کے شوق میں اس چیز کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتے تھے کہ غلطیاں کرنے کے خوف سے نئے لکھنے والے کہیں اردو سے بددل ہی نہ ہو جائیں۔ یہ خیال ہمیشہ ان کا دامن گیر رہتا تھا کہ وہ اُن لوگوں میں رہتے ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے اور انہیں ان لوگوں میں اردو کا صحیح ذوق پیدا کرتے ہوئے اُن کی مشکلات کو بھی سامنے رکھنا چاہیئے چنانچہ جس طرح عہدِ انگریزی میں بعض فاضل مصنفین نے انگریزی زبان دانی کے کورس اس برصغیر کے پڑھنے والوں کی مشکلات کو سامنے رکھتے ہوئے لکھے تھے، مولانا بھی اس حصۂ ملک کے رہنے والوں کی مشکلات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اصلاح اس خوب صورتی سے اور اس [illegible] سے کرتے تھے کہ ان کی بات [illegible] لوگوں کے احساس پر گراں نہ گزرتی تھی۔ مثلاً مولانا کے ممتاز معاصرین حضرت مولانا ظفر علی خاں اور مولانا عبدالمجید سالک اس طرف [illegible] بالکل کورے ثابت ہوئے، مولانا ظفر علی خاں نے اپنے اخبار "زمیندار" اور مولانا سالک نے اپنے اخبار "انقلاب" میں اردو لکھنے والے پنجابیوں کی غلطیوں پر اپنی اصلاح و تنقید کی ایسی جدائیاں کرائیں کہ لوگوں کے جی چھوٹ چھوٹ گئے۔ اور اکثر لوگ اردو سے بددل ہو گئے۔ ان دو حضرات کے طنزیہ مضامین کی تان بار بار اس پر ٹوٹتی تھی کہ ہندوؤں اور سکھوں کو اردو آ ہی نہیں سکتی، وہ جب لکھیں گے اردو میں بے شمار غلطیاں کریں گے دوسری طرف مولانا تاجور نے یہ موقف اختیار کیا کہ اردو ہندوؤں اور سکھوں کی اپنی زبان ہے وہ اس میں غلطی کر ہی نہیں سکتے وہ ہندو اور سکھ شاگردوں کی بے انتہا حوصلہ افزائی فرماتے تھے جب کوئی شاگرد اپنا مضمون یا نظم اصلاح کے لئے لاتا، ماہرانہ چابک دستی سے اس میں ہلکا ہلکا تغیر و تبدل کر کے اس کی تحریر کو محاورے اور لغت کے مطابق کر دیتے اور اسے کبھی محسوس نہ ہونے دیتے کہ اس نے لکھنے میں شدید ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اصل میں قصور مولانا ظفر علی خاں اور سالک صاحب کا بھی نہ تھا وہ سیاست کی کشتی میں سوار تھے جس میں بیٹھ کر ہر ڈوبنے والے کو بچایا نہیں جاتا بلکہ کئی تیرنے والوں کو بھی چپو مار کر ڈبو دیا جاتا ہے، مولانا کالج میں اردو اور فارسی کے استاد تھے وہ دیکھتے تھے کہ ان بزرگوں کی اصلاح پسندیوں نے ہندوؤں اور سکھوں کو بالعموم اور بعض پنجابیوں کو بالخصوص اردو سے منحرف اور بدظن کر رہا ہے، وہ دیکھتے تھے کہ ہندو اور سکھ نوجوان طالب علم اردو کو چھوڑ چھوڑ کر ہندی کو بطور اختیاری مضمون لے رہے ہیں۔ اس لئے جب مولانا ظفر علی خاں اور سالک صاحب ہندوؤں اور سکھوں کو اردو سے دور دھکیلتے تھے۔ مولانا تاجور انہیں نہایت پیار اور دلار سے اردو کی طرف بلاتے تھے۔ اور اپنی اس کوشش میں اتنے کامیاب تھے کہ لوگ دیکھ دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ یونیورسٹی ہال میں سر عبدالقادر کی زیرِ صدارت منعقد ہونے والے ایک مشاعرے میں شیخوپورہ کے ایک کیش دھاری سکھ نوجوان کرپال سنگھ بیدار نے غزل پڑھی تھی۔ ہندوستان کے نامور شعراء اور اساتذہ اس مشاعرے میں موجود تھے:

حائل نہ ہو زبونیٔ تقدیر دیکھنا — اب منزلِ اخیر ہے تدبیر دیکھنا

کیا ڈال دی ہے پاؤں میں زنجیر دیکھنا   دیکھا تھا زلف کو میری تقصیر دیکھنا
اس دل لگی سے دل کی لگی کیا بجھاؤ گے   لازم ہے حالتِ دلِ دلگیر دیکھنا
بے سود تیری کوششِ پیہم ہے برہمن   ممکن نہیں نوشتۂ تقدیر دیکھنا
اُس شوخ بے وفا کی ادائیں تو سیکھ لیں   پچھتاؤ گے کہ کھا کے نشانہ پھر دیکھنا
بیدار ہوں مگر ابھی مسحورِ خواب ہوں   جادو تھا خواب میں تری تصویر دیکھنا

جب یہ نوجوان نکھر نہایت سلجھے ہوئے رنگین انداز میں غزل پڑھ کر سٹیج سے اترا تو سٹیج سیکرٹری نے اگلے شاعر کا نام پکارنا یاد نہ رہا۔ اسی طرح ایک اور مشاعرے میں کپور تھلہ کے نوجوان ہندو شاعر گردیال بسمل نے جو دیال سنگھ کالج کے طالب علم تھے اپنے یہ شعر پڑھے:-

رنگِ محفل دیکھنے کو ہوش میں آیا تھا میں
ہوش پھر اڑنے لگے ہیں رنگِ محفل دیکھ کر
منزلِ الفت میں اے دل راہزنوں کا خوف ہے
دیکھ کر چل ہر طرف کم ہمت غافل دیکھ کر!

تو اہلِ زبان بھی مسحور ہو گئے تھے۔

دوسری طرف حضرت مولانا ظفر علی خاں کے جوشِ اصلاح کی کیفیت سنیئے اور دیکھئے کہ اس جوشِ اصلاح نے کیا کیا گل کھلائے۔ مولانا ظفر علی خاں اپنے مخصوص انداز میں کہہ گئے:-

ہیں وہ ہندو شعراء دشمنِ جانِ اُردو   مٹنا چاہتے ہیں نام و نشانِ اُردو
فارسی سے انہیں بغض ہے جو کہ ہے شیخِ ادب   عربی سے انہیں کد ہے جو ہے جانِ اردو
ماتِ ہندی کا بنارس میں اثر کر جائے گی   آریا ورت کی بندی میں ... کانِ اردو
گرچہ گن ہندی کا گاتے ہیں ملاپ اور پرتاپ   جس سے چاندی ہوئی ان کی وہ ہے کانِ اردو

اس پر مولانا ظفر علی خاں کے استاد بھائی پنڈت راج نرائن دہلوی تلمیذِ داغ کو تاؤ آ گیا۔ انہوں نے جواب آں غزل کے طور پر ارشاد کیا:-

ہیں وہ مسلم شعراء دشمنِ جانِ اردو   جو مٹانے کو ہیں تیار نشانِ اردو
جو سنانے کی جگہ مٹنا کہہ جاتے ہیں   ... زبانِ اردو
دورِ اردو نے معلا کرم آباد سے ہے   ہم نے ... کی زبانِ اردو

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جس زمانے میں حضرت مولانا ظفر علی خاں جیسے بزرگوں کی اردو دوستی اور اردو نوازی بعض لکھنے والوں کو ہندو شعراء کو بھی بددل کر رہی تھی اس وقت مولانا تاجور اردو زبان کو مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں میں یکساں مقبول بنانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے اور آج بھی جب ہندوستان میں اس مظلوم و مغضوب زبان پر دشمنی اور بے رخی کے وار ہوتے ہیں تو اس کی حمایت میں سینہ سپر ہونے والوں میں مولانا تاجور کے دوستوں اور شاگردوں کی تعداد قابلِ فخر ہے۔ اس ضمن میں ایک چیز یاد آ گئی جس کا اظہار اس موقع پر کر دینا مولانا تاجور کی یاد سے پورا پورا انصاف کرنے کے برابر ہوگا۔ اگلے دن پنجاب یونیورسٹی کے امتحانِ فاضل اردو کا نتیجہ سامنے آیا۔ یہ نتیجہ زیادہ نہ کم پورے آٹھ فیصدی تھا۔ مولانا تاجور کی روح اس نتیجے پر کانپ اٹھی ہوگی۔ یونیورسٹی کے اربابِ بست و کشاد و دیگر متعلقین امتحان ہذا کو کبھی اس امر پر غور کر دینا چاہئے کہ کیا وجہ ہے کہ عربی اور فارسی کے نتائج تو اچھے خاصے ہوتے ہیں مگر اردو پڑھنے اور امتحان دینے والوں کی استعداد کیوں صرف آٹھ فیصدی رہ جاتی ہے اگر وہ غور کریں تو لازماً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ فاضل اردو کے امیدواروں سے یہی سلوک

روا رکھا جا رہا ہے جو اپنے زمانے میں مولانا ظفر علی خاں اور سالک صاحب اردو نویسوں سے بالعموم اور ہندو اور سکھ اردو دانوں سے بالخصوص روا رکھتے تھے آج نہ ہی مولانا ظفر علی خاں بقید حیات ہیں نہ مولانا سالک اور نہ ہی تاجور زندہ ہیں مگر ان حضرات کے کردار آج بھی ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہم ماضی سے سبق سیکھنے کو تیار ہوں۔

مولانا تاجور نے اپنی زندگی میں خدمت اردو کی وہ آبیاری کی کہ ہر طرف گلزار کھلا دیئے۔ بچوں کا ہفتہ وار اخبار "پریم" ہفتہ وار اخبار "اتحاد" ماہانہ ادبی دنیا اور ماہنامہ شاہکار آپ کی توجہات خصوصی سے اردو کے دریا بہاتے رہے۔ اردو مرکز قائم کر کے آپ نے تنقید و تلخیص کے ذریعے بے شمار مصنفین کے رشحات فکر سے اردو دان طبقہ کو روشناس کرایا۔ لیکن آپ کی ان سرگرمیوں کے کماحقہ ذکر کے لئے ایک علیحدہ مضمون درکار ہے مولانا تاجور ایک شفیق، مربی اور پختہ کار استاد تھے انہوں نے جس شاگرد کا ہاتھ پکڑا اسے منزل مقصود تک پہنچایا۔

مشورۂ سخن کرنے والوں کی امداد اس حد تک فرماتے تھے کہ تخلص کے انتخاب میں بھی بغیر مشورہ دیتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک صاحب تشریف لائے نام پوچھا، کہنے لگے "خاضعت ملانوی" فرمایا "ملانوی" کیا ہوا؟ کہنے لگے ملانہ میرے گاؤں کا نام ہے۔ فرمایا اس گاؤں کے قریب کوئی شہر ہے، کہنے لگے کیوں نہیں۔ انبالہ ہے فرمایا تو پھر اپنے نام کے ساتھ انبالوی لکھو۔ پھر فرمایا یہ خاضعت کیا نام ہوا اس کے معنی تو اکثر لوگ نہیں جانتے نہایت غیر مانوس لفظ ہے اور غیر مانوس ہی رہے گا ٹھہرو! میں تمہارا تخلص تجویز کرتا ہوں کچھ سوچ کر فرمایا "وقار" تخلص نہایت موزوں ہے خدا مبارک کرے۔ چنانچہ وقار انبالوی کو آج سارا زمانہ جانتا ہے اور بیچارے خاضعت ملانوی کو وقار انبالوی بھی نہیں پہچانتا۔ اسی طرح اپنے دو ماہناموں کے نام "ادبی دنیا" اور "شاہکار" ایسے تجویز کئے کہ رسائل کی پوری دنیا میں ان کا جواب نہیں خود اردو کے جس شعبے میں قدم رکھا اس میں اپنی فضیلت کے جھنڈے گاڑ دیئے، جوانی میں پہلا مجموعۂ غزلیات شائع کیا جس کا نام تھا ہل من مبارز (کوئی ہے جو مقابلہ پر آئے) تھا اسکے بعد آپ کی غزل نے ایک مخصوص جامعیت اختیار کر لی۔ نثر میں تنقیدی مضامین کے علاوہ ظریفانہ مضامین علامہ ظریف کے قلمی نام سے لکھے جو ان کی باغ و بہار طبیعت کا آئینہ ہے۔ میں نے لکھا تھا :-

جنابِ تاجور جن کے قلم سے پھول جھڑتے ہیں
ہزاروں طالبانِ علم کی جھولی میں پڑتے ہیں

جب سرکار نے ان کی علمی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے شمس العلماء کا خطاب دیا تو میں نے اسے تحصیل حاصل سمجھا اور عرض کیا :-

مدت سے جو ہے تاجورِ مملکتِ فضل
سرکار نے لکھا اسے شمس العلماء آج

فرمایا میں تو سرکار کا ممنون ہوں تم شرارت سے باز کیوں نہیں آتے۔ آج وہ مقناطیسی شخصیت ہم میں نہیں ہے مگر ان کی یاد شاگردوں کے دلوں میں اس طرح باقی ہے کہ ہم کہیں بھی ہوں ہمارے رونگٹے رونگٹے سے ان کی محبت پھوٹ پھوٹ کر نکلتی ہے اور جو ہم تھوڑی بہت اردو لکھ پڑھ لیتے ہیں۔ انہی کے فیض توجہ کا کرشمہ ہے۔

علامہ تاجور اور اصلاحِ سخن

حضرتِ استاذی علامہ تاجور نجیب آبادی کے مختلف النوع ادبی کارناموں میں اصلاح سخن کو ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ مشہور انگریزی شاعرہ مسز براؤننگ کی ایک دلآویز سانٹ پر یہ الفاظ ملتے ہیں :

"میرے چاند کے دو رخ ہیں۔ ایک وہ جو ساری دنیا کے سامنے ہے اور دوسرا وہ جسے دیکھنا صرف میرے حصے میں آیا ہے"

مولانا تاجور کی شخصیت کا یہ پہلو صرف اُن کے خوش قسمت شاگردوں کے حصے میں آیا ہے اور صرف وہی اس کی خوبیوں سے واقف ہیں۔ اس مختصر مضمون سے علامہ مرحوم کی اصلاحِ سخن کے چند پہلو اجاگر کرنا مقصود ہے۔

جب کوئی شاگرد اصلاح کی غرض سے حاضرِ خدمت ہوتا۔ اگر اس وقت وظائفِ منصبی میں کوئی کام سر پر نہ ہوتا تو فوراً ہمہ تن متوجہ ہو جاتے اور فرماتے بیٹھیے "اگر اپنی ساری نظم یا غزل پڑھ دیجیے میں شکریہ۔ پھر دوبارہ پڑھنے کو کہتے جس شعر کی اصلاح مقصود نہ ہو اس پر کہہ دیتے "ہاں ٹھیک ہے آگے چلو" کبھی کبھی "اچھا شعر ہے" "خوب ہے" بھی فرماتے اور شاگردوں کا دل بڑھانے میں کبھی بخل نہ کرتے جس شعر میں اصلاح ضروری معلوم ہوتی اس کا ایک آدھ لفظ ہی بدلتے۔ زیادہ رد و بدل نہ کرتے تعقیدِ لفظی کا عیب ہوتا تو پورے مصرع کو بدل ڈالتے۔ مگر اس طرح کہ مضمون سانچے میں ڈھل جاتا۔ سب چولیں ٹھیک بیٹھ جاتیں اور مضمون کا چہرہ نکھر اٹھتا۔ اسی طرح ساری نظم یا غزل کو پڑھ ڈالتے۔ اور اصلاح کے بعد دوبارہ پڑھنے کی فرمائش کرتے۔ اس وقت بھی اگر کوئی تبدیلی کرنی منظور ہوتی تو کہہ دیتے۔ نظم کا عنوان اکثر بدل دیا کرتے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے بدلے ہوئے نئے عنوان سے نظم میں ایک نیا نکھار پیدا ہو جاتا شاعر کے مضمون کو حتی الوسع کبھی نہ بدلتے۔ اس لیے ان کی اصلاح شدہ نظموں پر استاد کی نہیں بلکہ شاگردوں ہی کی چھاپ باقی رہتی۔

ان کے بعض کرم فرما (جن لوگوں کو انہی الفاظ سے یاد کرتے تھے) ان کے متعلق افواہیں مشہور کرتے تھے کہ وہ غزلیں اور نظمیں کہہ کر شاگردوں کے حوالے کرتے ہیں۔ ان بے چاروں کو کیا خبر کہ جو شخص پچھلے ایک ہفتہ وار اخبار "پریم" کا ایڈیٹر رہا ہو، ہفتہ وار اخبار "اتحاد" کا ایک جلیل القدر ماہنامہ ادبی رسالہ "ادبی دنیا" کا ایڈیٹر ہو۔ اس کے علاوہ کالج میں دو گھنٹے کلاس تک روز مضمون پڑھاتا ہو۔ کالج کے اوقات سے اور یونیورسٹی کے امتحانوں سے پیچھے دیکھتا ہو۔ اس کے علاوہ ایک بہت سی ادبی تصنیفات اور مرکز کا بھی مہتمم ہو اور ساتھ ہی ادبی مجالس اور مشاعروں کی رونق رواں ہو، اس کے پاس اتنی فرصت کہاں سے آئے گی کہ دوسروں کو نظمیں اور غزلیں کہہ کر دے سکتے۔

اصلاحِ فن کے سلسلے میں ایک پابندی البتہ تھی اور وہ یہ کہ جو شاگرد لاہور میں موجود ہوتے وہ اپنا کلام اصلاح کے لیے ڈاک میں نہ ڈال سکتے تھے خواہ کتنی ہی اجازت ہو۔ اجازت صرف لاہور سے باہر رہائش رکھنے والے شاگردوں کو تھی۔ ان کی غزل بننے کے بعد غزل کے اختتام پر بالعموم اکثر دفعہ محاسن کے متعلق مختصر نوٹ بھی فرماتے تھے اور یہ سارا کام وہ اس طرح کرتے تھے جیسے کوئی مذہبی فریضہ انجام دے رہا ہو۔ نہ کسی پر احسان تھا اور نہ کسی سے صلے کی توقع۔ فرماتے تھے "اردو کی خدمت اللہ میاں نے میرے سپرد کی ہے اور یہی کام تندہی سے کیے جا رہا ہوں۔ اگر مجھے کسی سے کچھ توقع ہے تو بس یہ کہ اس فن میں وہ بھی مہارت حاصل کرنے کے بعد اسے قوم میں پھیلائے تاکہ ہمارے استادوں کا نام اور کام زندہ رہے۔ سند کے لیے تاکید فرماتے تھے کہ سند استاد داغ سے لو۔ مرزا غالب اور ڈاکٹر اقبال جیسے اہلِ نظر کے افکار سے فیض حاصل کرو مگر انھیں بوتے اور دقیق مضامین کو استاد داغ کی آسان اور فصیح زبان کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرو۔ اب میں استادِ مرحوم کی اصلاحوں کے چند نمونے پیش کرتا ہوں۔ میں نے بغرضِ اصلاح غزل کا یہ شعر پڑھا ؎

کوئی دیکھے تو یہ دشواریاں اہلِ محبت کی　　　پریشاں ہو کے ہر دل رقیبوں کو سنایا ہے

فرمانے لگے "اہلِ محبت" کی بجائے "راہِ محبت" کر لو۔ راہِ محبت کی دشواریوں کے لحاظ سے ملاحظہ فرمائیے کہ شعر کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اسی طرح میں نے غزل کا شعر پڑھا ؎

اب اٹھ کے تیر کھانے کی ہمت نہیں رہی　　　وہ کہہ رہے ہیں تجھ میں محبت نہیں رہی

فرمایا "اب اٹھ کے" کی بجائے "اٹھ اٹھ کے" پڑھو تو شعر یوں ہو گیا۔

اٹھ اٹھ کے تیر کھانے کی ہمت نہیں رہی　　　وہ کہہ رہے ہیں تجھ میں محبت نہیں رہی

اہلِ ذوق خود دیکھ سکتے ہیں کہ "اب اٹھ کے" کی بجائے "اٹھ اٹھ کے" پڑھنے سے کتنا بڑا فرق نمایاں ہو گیا۔

اسی غزل کا دوسرا شعر تھا ؎

آیا زمانہ ایسا کہ الفت تو درکنار — پہلی سی دشمنوں میں عداوت نہیں رہی

فرمایا "آیا زمانہ" کی بجائے "بدلا زمانہ" کہو۔ میں نے ایسے ہی بدل دیا اور جب مشاعرے میں شعر پڑھا تو خاصا مقبول ہوا۔

میری ایک نظم کا بند تھا :-

یہ ملّا جی کا کام نہیں یہ واعظ کا اسلام نہیں
یہ اک کھلی ہے آم نہیں یہ بدنامی ہے نام نہیں
یہ درویشی ہے درویشی۔

متبسم ہو کر فرمایا، میں تمہاری طرح بریلوی نہیں، دیوبندی ہوں مگر درویشوں کے حق میں بدنامی کا لفظ برداشت نہیں کر سکتا۔ اس مصرع کو یوں پڑھا کرو۔ یہ گمنامی ہے نام نہیں

میں نے ایک قطعہ کہہ کر پیش کیا اور مجھے اس قطعے کے مطالب پر فخر بھی تھا :-

جس میں اکبر گھر بنایا واحد القہار نے
خوف اس دل کو ہو کیا پھر مختلف ارباب کا
عالم اسباب بھی مجبور ہے معذور ہے
بندۂ خالق ہوں میں تابع نہیں اسباب کا

ایک لمحے کے توقف کے بغیر فرمایا ؏

عالم اسباب بھی مجبور ہے میری طرح

دیکھو مجبور اور معذور ایک طرح سے ہم معنی الفاظ ہیں۔ مگر "میری طرح" کے ٹکڑے نے اصل مضمون میں اضافہ کر دیا ہے اور عالم اسباب سے تشبیہہ پیدا ہو گئی۔ میرا دل غنچہ سا کھل گیا۔ میں نے فرطِ محبت سے استاد کے پاؤں پکڑ لیے۔

پڑھنے والے اس میں مبالغہ نہ سمجھیں۔ جو چیزیں استاد کو دکھا چکا ہوں آج تک ادبی مجالس میں انہیں دھڑلے سے پڑھتا ہوں، کیونکہ نواب محمد خاں رند کے اس شعر پر ایمان لا چکا ہوں :-

عیب سے پاک و مبرّا ہے کلام اُن کا رند
جو غزل حضرت آتش کو دکھا لیتے ہیں

اور جو غزلیں اور نظمیں ان کی شفقتِ اصلاح سے محروم رہ گئی ہیں ان کے متعلق میری روش یہ ہے کہ جو کوئی اہلِ زبان یا اہلِ فن ان میں تغیّر و تبدل کرنا چاہے اُسے بخوشی قبول کر لیتا ہوں اور اب جب کہ استاد مرحوم اس دنیا میں نہیں ہیں یہ شعر اکثر وردِ زبان اور حسبِ حال رہتا ہے :-

شعر میں ناتمام ہے حالی
غزل اس کی بنائے گا اب کون

شمس العلماء

تاجور

نجیب آبادی

★ عبدالصمد صارم

ادیبِ شہیر، مولانا تاجور مرحوم سے ان کے آخری حصۂ زندگی یعنی ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۱ء میں راقم سطور کے تعلقات قائم رہے۔ یہ تعلقات اس قدر خصوصی تھے کہ شاید کسی دوسرے شخص کو نصیب نہ ہوئے ہوں گے۔ اس لیے مولانا کے صحیح حالات زندگی سے مجھے پوری واقفیت ہے جو دوسروں کو نہیں ہو سکتی۔

مولانا کے حالات مختلف اہل قلم حضرات نے لکھے ہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ ان کے خصوصی دوست بھی اغلاط کر گئے ہیں۔ ایسا ہونا ہی چاہیے تھا۔ کیونکہ مولانا کسی شخص کو اپنی صحیح عمر نہ بتاتے تھے، ان کے دوست، احباب اس چیز سے واقف ہوں گے کہ ان سے جب کبھی ان کی عمر دریافت کی جاتی تھی تو وہ ہمیشہ ایک معمہ سا ہوتا۔ دیکھتے رہتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ میں نے ان کی وفات سے کوئی تین سال پیشتر ان کی دعوت کی، چند ایک احباب بھی شریک دعوت تھے، ایک صاحب نے دریافت کیا، مولانا آپ کی عمر کیا ہوگی؟ فرمانے لگے کس عمر کے بارے میں دریافت کرتے ہو؟ بھائی! میری تین عمریں ہیں، ایک تو وہ جو کالج میں اور دوسری اسناد پر لکھی ہوئی ہے اس حساب سے تو اسے بچپن کے لگ بھگ ہے اور ایک عمر وہ ہے جس سے میرے بچپن کے ساتھی اور بڑے بوڑھے واقف ہیں اور تیسری میری اصل عمر ہے وہ صاحب کہنے لگے میں تو اصلی عمر معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ کہنے لگے وہ میں کسی کو نہیں بتاتا، نظر انداز کر گئے اور ایک چوتھی عمر میری اور ہے، سائل نے تعجب سے پوچھا وہ کون سی؟ فرمانے لگے وہ جو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔

ان کی وفات سے دو تین ماہ پہلے کی بات ہے کہ میرے والد صاحب نے دریافت کیا مولانا آپ کی عمر کیا ہوئی ہوگی؟ لیکن مولانا نے حسب عادت جواب کو معمہ بنا دیا۔ جب ہم دونوں گھر چلے آئے تو میں نے والد صاحب سے کہا کیا آپ کو مولانا کی عمر کے بارے میں کچھ اندازہ ہے؟ فرمانے لگے میں ان کے تمام خاندان سے واقف ہوں، یہ مجھ سے چند سال ہی چھوٹے ہوں گے میرے والد صاحب اس وقت ستر سے تجاوز کر چکے تھے۔

وفات سے ایک دو ماہ پہلے کی بات ہے میں نے مولانا سے ان کی عمر کے بارے میں سوال کیا تو مولانا نے کچھ جواب نہ دیا، میں نے پھر سوال کیا، مولانا نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور جواب دینے کی بجائے مجھے ٹالنا چاہا۔ میں نے عرض کیا مولانا آپ ساٹھ سے تو تجاوز کر چکے ہوں گے کہنے لگے تم تو پیچھے پڑ گئے ہو کیا حماقت کا اعتراف کر لوں؟

میرے والد صاحب فرمایا کرتے تھے یہ نہ سوچنا کہ تقدیر کا لکھا انسان بانیر کر رہا ہے۔

مولانا کی وفات کے بعد ان کی یادداشت حالات مرتب کرنے کے لیے کاغذات تلاش کئے تو دو کاغذات مجھے مل گئے، مولانا لکھتے ہیں:

"نام احسان اللہ، ابو العزان کنیت، تاجور تخلص، جائے ولادت نینی تال، تاریخ پیدائش غالباً ۱۸۹۰ء، وطن نجیب آباد ضلع بجنور، تعلیم قرآن، فارسی، عربی، فاضل دارالعلوم دیوبند، ذریعہ معاش دیال سنگھ کی پروفیسری ہے، وطن اقامت لاہور ہے۔ گورنمنٹ نے علمی و ادبی خدمات کے صلے میں [illegible] شمس العلماء کا خطاب عطا کیا۔ انجمن ارباب علم نے ۱۹۲۱ء میں بلیغ الملک کا خطاب دیا تھا۔ میں نے مختلف رسالوں کی ادارت کی ہے:

نالۂ بلبل ۱۹۱۱ء، آفتاب اردو لدھیانہ ۱۹۱۲ء، مخزن لاہور ۱۹۲۱ء، ہمایوں لاہور ۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۷ء، ادبی دنیا لاہور ۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۹ء،

شاہکار ۱۹۳۰ء تا حال میں صحیح پنجابی سمجھ لیتا ہوں اور غلط بول سکتا ہوں۔"

رسالہ ساربان کے غزل نمبر میں ایک غزل اور کچھ حالاتِ زندگی شائع کرائے ہیں، اس میں لکھتے ہیں:

"غالباً ۱۹۰۱ء میرا سن پیدائش ہے نجیب آباد یو۔پی میرا وطنِ ولادت ہے اور لاہور میرا وطنِ اقامت ہے لاہور ہی غالباً میرا مدفن بنے گا۔ یہاں میں ۱۹۱۶ء سے زندگی بسر کر رہا ہوں، آخری منزل نظر کے سامنے ہے اور خود اپنی نگاہوں سے اوجھل ہوں۔"

تاجور ۱۴ اپریل ۱۹۴۹ء

اس حساب سے مولانا کی عمر ۵۰ سال ہوتی ہے لیکن میرے خیال میں ان کی اصلی عمر جس کے متعلق وہ فرمایا کرتے تھے کہ کسی کو نہیں بتاؤں گا ۵۵ سال سے زیادہ ہوگی۔

ایک غزل کے چند شعر یہ ہیں:-

دریا کی کہانی ساحل پہ موجوں کی زبانی سنتا ہوں　　　ہر قطرے کے دل میں ہے دریا جس کی طغیانی سنتا ہوں

تھا خلوتِ دل میں پردہ بہ پردہ پنہاں رازِ عشق کبھی　　　اب ہر ہر ساز کے نغمے سے یہ سوز نہانی سنتا ہوں

انوارِ خرام جلی آتی ہے صبحِ صادق پیری کی　　　گل ہونے کو ہے آہ چراغِ شامِ جوانی سنتا ہوں

کچھ خوف نہ کر گر راہِ منزل دوست ہے مشکل در مشکل　　　ہر ہر مشکل میں پنہاں ہے اک سوزِ نہانی سنتا ہوں

دنیا کی طلب بیکار ہے تو دنیا کی طلب میں خوار نہ ہو　　　اے طالبِ دنیا یہ دنیا ہے آنی جانی سنتا ہوں

مولانا کے شاگردوں کی صحیح تعداد تو بتانی مشکل ہے، ہزاروں ہوں گے لیکن ان کے مشہور شاگردوں میں احسان دانش اور اختر شیرانی کو لوگوں نے بالکل قلم انداز کر دیا ہے۔ تلوک چند محروم اور پروفیسر موہن سنگھ دیوانہ بھی مولانا سے مشورہ سخن کیا کرتے تھے۔

مولانا کے اہل و عیال کے بارے میں بھی اہلِ قلم حضرات نے سخت غلطیاں کی ہیں مولانا کی دو بیویاں تھیں، پہلی بیوی سے ناراض ہو کر نکاح ثانی کر لیا تھا، وہ نجیب آباد میں رہتی تھیں، مولانا ان کی امداد کیا کرتے تھے، وفات سے دو ماہ پیشتر وہ عرصہ دراز کے بعد لاہور تشریف لائیں، انہوں نے مولانا کو معاف کر دیا تھا اور بہت خوش رہتی تھیں، ان سے ایک صاحبزادی ہیں، یہ مولانا کی اولاد میں سب سے بڑی ہیں اور مرحوم کے خواہر زادہ مولوی ضیاء اللہ خان صاحب سابق عربی ٹیچر شیخوپورہ ہائی اسکول کی زوجہ ہیں، دوسری بیوی سے تین صاحبزادے اور ایک صاحبزادی ہیں، صاحبزادی نسیم تاجور نے ایم۔اے عربی پاس کیا بعد ازاں شاہجہاں پور کے پٹھانوں میں لائل پور میں ان کی شادی ہو گئی۔ ان کے کئی بچے ہیں۔ تینوں صاحبزادے تعلیم پا کر بڑے بڑے عہدوں پہ پہنچ چکے ہیں۔

افسوس ہے کہ مولانا کی خطوط نویسی کے بارے میں اب تک کسی صاحب نے کچھ بھی نہیں لکھا، حالانکہ میرے خیال میں مولانا کے خطوط ان کے شاہکار ہیں، مولانا کے خطوط نہایت دلچسپ، شگفتہ اور سلیس ہیں، پریم اور شاہکار میں مولانا اپنے بہت سے خطوط شائع کرا چکے ہیں علامہ طریب کے نام سے بھی خطوط کا ایک طویل سلسلہ پریم میں طبع ہوتا رہا ہے، یہ خطوط دراصل مولانا ہی کے رشحاتِ قلم سے ہیں۔ ذیل میں ان کا ایک خط پیش کرتا ہوں:

عزیز گرامی قدر کاوش!

ہزاروں دعائیں، لاکھوں سلام، تمہارا خط ایسے وقت ملا کہ میں تم سے مایوس ہو چکا تھا، تمہارے لئے میرے دل میں طوفانِ محبت، دماغ میں متعصبانہ خیالات اور پھر زبان پر بے تحاشا گالیاں جاری تھیں۔ کاوش! تمہارے مستقل طور پر گم ہو جانے سے دل میں ایک خلا سا محسوس کرتا ہوں پندرہ لاکھ کی آبادی کا یہ لاہور میرے لئے تو اجاڑ ہو رہا ہے اگر تم یاد آتے ہو، تمہاری والدہ یاد آتی ہیں، تمہاری دلہن اور تمہارے حسین بچے یاد آتے ہیں۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:-

لیکن اب اب تو جی چاہتا ہے کہ چاہے لاہور ہی کو مدفن بنانا پڑے گا، آہ نجیب آباد! میری جنت دنیا! کیا اس زندگی میں جو اب بہت تھوڑی سی رہ گئی ہے، تجھے ایک بار پھر دیکھ سکوں گا؟

ایک خط کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:

مکرمی جناب شیخ صاحب!

سلام مسنون۔ مجھے ذاتی طور پر آپ سے شرف نیاز حاصل نہیں مگر غیر شعوری انداز میں ہم دونوں ایک دوسرے سے متعارف ہیں اور اسی بنا پر میں آپ کی خدمت میں یہ عریضہ بھیج رہا ہوں آپ کو یاد ہوگا ------ کہ آج سے چند ماہ بیشتر آپ کے ایما پر راولپنڈی میں ایک مشاعرہ غالباً قائد اعظم فنڈ کے نام پر ہوا تھا جس میں مجھے بھی دعوت دی گئی تھی آپ کی جانب سے دو نمبر تھا ... مجھے حاجی لق لق اور ساحر لدھیانوی کو آپ کی کار میں سب بیان کرتا ... نسیم لاہور سے راولپنڈی لے گئے تھے؟

ایک اور خط ملاحظہ ہو:

دیال سنگھ پبلک لائبریری

۵ نسبت روڈ لاہور

۱۱ اکتوبر سنہ ۵۱ء

عزیز مکرم بعد تسلیم و دعا

تمہاری اس کی ضرورت نہیں تھی تمہاری ... کے اصرار پر لکھنا ہوا ... ان لوگوں کو آگاہ کرنا ... جہاں تک میں تو تکالیف برداشت کیں ہم سب نے ... تمہاری ... مضمون میں حقیقت یہ ہے کہ تم نے اس سلسلے میں وہ سب کچھ کیا جو ایک غیر معمولی سعادت مند اور رشید ... لائق نوجوان سے توقع رکھی جاتی ہے، تمہاری والدہ، بہن اور بھائی (برادر نسبتی) کے تفصیلی بیانات کم و بیش ... اور ... تکلیفات کے احساس سے دل میں نادم بھی ہوں اور شکر گزار بھی۔ خدا تمہیں ... کم ہے ... میری دعاؤں میں ... تم نے مکان رامپور والے مکان کے متعلق پوچھا ہے۔ میاں رامپور جاؤ مکان کو اپنی طرح دیکھو، ہندوؤں کے محلے میں ہے۔ ایک تہائی زائد ... مکان کے سامنے ... لگا ہے، بازار، ڈاکخانہ، غلہ منڈی، تحفظ ... منڈی۔ پلیس ... یہ تمام ضروری مقامات اس مکان سے ایک فرلانگ کے رقبہ میں ہیں۔ جب تک جی چاہے رہو۔ ... برادر نسبتی منشی ... خان صاحب اس مکان میں ہیں ان سے ملو وہ بہت اچھے انسان ہیں تمہیں ... دیں گے۔ ان کا پتہ یہ ہے۔

رامپور ... چاہ شور، مکان بالمقابل چاہ شور۔

رامپور ایک نہایت خوبصورت اور پر رونق شہر ہے، پرانی تہذیب اور نئی روشنی کا مرکب ہے

دعاگو

تاجور

مولانا فرمایا کرتے تھے کہ میں چھ سال کا بچہ تھا، میرا ایک بھائی کانٹوں میں گر گیا تو میں نے یہ شعر کہا، یہ میرا سب سے پہلا شعر ہے ؎

یا الٰہی فضل یہ کرم کر ۔۔۔ اپنے بچے کو سر کانٹوں میں دھر

مسز ہجویری صاحبہ کہنے لگیں کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر شاعر ہوگا، اپنی صحافتی زندگی کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

۱۹۱۵ء میری صحافتی زندگی کا اصل آغاز تو یوں کواس سے بیشتر بھی یعنی ۱۹۱۱ء میں ------ رسالہ نالۂ بلبل لدھیانہ اور اس کے بعد آفتاب اُردو اور اس کے بعد غالباً ۱۹۱۴ء میں رسالہ تاج الکلام نجیب آباد کی ایڈیٹری کی

لیکن مولانا کی صحافتی زندگی دارالعلوم دیوبند ہی سے شروع ہو گئی تھی وہ القاسم کے مدیر یا نائب مدیر کی حیثیت سے عرصہ تک کام کرتے رہے، القاسم

میں اُن کے مقالات اکثر شائع ہوتے تھے۔ وہ پسند کئے جاتے تھے۔ مولانا کے مضامین ہندوستان و پاکستان کے رسائل میں بکھرے ہوئے ہیں جن کا احاطہ مشکل ہے۔ مولانا علمی و ادبی مضامین کے علاوہ مزاحیہ مضامین بھی لکھتے تھے یہ مضامین علامہ ظرافت کے نام سے شائع ہوتے تھے۔ بچوں کے لئے بھی خوب خوب لکھتے تھے مگر انہوں نے کوئی ادبی ذخیرہ تصنیف نہیں چھوڑی۔ ان کی آخری تصنیف پاکستان اردو ریڈر ہے جس کو انہوں نے جو سلیبس کے مطابق ترتیب دیا تھا ادیا کرتے تھے بجائی۔ مجھے اس کتاب نے مار ڈالا، اچھا ہوا جو تونے عربی ریڈر کا کام اپنے ذمہ نہ لیا۔

ایک دو سال سے نازک کچھ پابند ہوگئے تھے کہ یہ طبعی کسل غالب آ کر ہی رہا کہا کرتے تھے میرے سامنے موت کا ذکر زیادہ کرنا ترک کر دیا ہے، بالکل تنہائی بولا۔

مولانا نے تقریباً تمام اصناف سخن میں زور طبع صرف کیا ہے لیکن دراصل وہ غزل کے مرد میدان تھے ۱۹۳۶ء میں دو جوان صاحبزادوں کی پے درپے وفات سے ان کی طبیعت بجھ سی گئی تھی اور وہ ان ہنگاموں سے عزلت گزیں ہوگئے تھے۔ میانی صاحب میں اُن کا مزار صاحبزادوں کے مزار کے برابر ہے۔ ۲ رجب، ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۹۸۰ء میں وفات پائی۔

ذیل میں چند اشعار درج کرتا ہوں:

سنگ دل تجھ پر محبت کا اثر ہو بھی تو کیوں
دل میں احساس ہوا کرتا ہے پتھر میں نہیں
محفل حشر بھی سونی نظر آتی ہے مجھے
ڈھونڈتی ہیں جسے نظریں وہی محشر میں نہیں

وفا کے گاتے ہوئے گیت گا رہا ہوں میں
سنی سنائی کہانی سنا رہا ہوں میں
اب آ رہی ہے مجھے دل فریب یاد ان کی
اب آپ اپنے کو دل سے بھلا رہا ہوں میں

○

پیام شاہجہانپوری

شمس العلماء مولانا تاجور نجیب آبادی

غالباً ۱۹۱۵ء یا ۱۹۱۶ء کے موسم سرما کا ذکر ہے۔ میں دیال سنگھ کالج لائبریری کے گیٹ پر پہنچا۔ ان دنوں یا اپنی زندگی کے آخر دم تک علامہ تاجور اسی عمارت کے بالائی حصے میں مقیم تھے۔ میں نے دروازے پر کھڑے ہوئے چوکیدار سے کہا: "میں تاجور صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔" بوڑھے چوکیدار نے سڑک کی طرف اشارہ کیا: "وہ آرہے ہیں۔" اور میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک گول مٹول جسم بھورے رنگ کی شیروانی اور ڈھیلے ڈھالے پائنچوں کے پاجامے میں ملبوس سر پر ترکی ٹوپی، ہاتھ میں چھڑی، چہرے پر سیاہ رنگ کا چشمہ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، گول ٹھوڑی اور سیاہ داڑھی، نیچے کا ہونٹ موٹا، چہرے پر دبدبہ، ہر دو قدم کے بعد ٹھہر جاتے اور پھر چھڑی کے سہارے چلنے لگتے تھے۔ اپنے چہرے مہرے سے شاعر کم اور عالم زیادہ معلوم ہوتے تھے۔ میں کھڑا بہت غور سے ان کو دیکھ رہا تھا۔ جب "مولانا" میرے قریب آئے تو میں ایک طرف کو ہٹ گیا۔ مجھے دیکھ کر ٹھہر گئے۔ میں نے سلام کیا۔ اور بہت عقیدت سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کا دل ہنسنے کے لیے بالکل تیار نہ ہو اور وہ زبردستی ہنسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے اپنا نام بتایا۔ کہنے لگے کہاں سے آئے ہو میاں؟ میں نے عرض کیا دو سال ہوئے شاہجہاں پور سے آیا ہوں۔ اور وومنٹ ہوسٹل میکلوڈ روڈ لاہور سے۔

پھر ہنستے ہنستے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور لائبریری میں داخل ہو گئے اور صحن میں پڑی ہوئی ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ اور پھر گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ اس مختصر سی صحبت میں میں نے اندازہ کیا کہ مولانا بہت خوش اخلاق بہت منکسر المزاج بہت صاف گو اور بہت شفیق بزرگ ہیں۔ باتوں باتوں میں میں نے پوچھا کہ آپ پنجاب کب اور کس سلسلے میں تشریف لائے تھے؟

فرمانے لگے۔ "بڑا پن جوانی سے مات کھا چکا تھا۔ میں دیوبند سے فارغ التحصیل ہو چکا تھا اور اسی جامع میں پڑھا رہا تھا کہ میرے دماغ میں ایک سودا سمایا اور وہ یہ کہ مولوی فاضل کی سند لینی چاہیے۔ یہ سوچ کر میں نے دیوبند کو خیرباد کہا اور نکل کھڑا ہوا۔ لاہور پہنچا۔ امتحان کی معمولی سی تیاری کی۔ دیوبند کی تعلیم کام آئی۔ اور میں یونیورسٹی میں اول نمبر پر کامیاب ہو گیا۔ اور پھر اورینٹل کالج سے منشی فاضل کی سند حاصل کر لی۔"

"آپ کی شاعری کا آغاز بھی لاہور ہی سے ہوا؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔ فرمانے لگے "نہیں۔ شاعری کا آغاز تو یہاں آنے سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ مگر ہاں شہرت کا آغاز یہیں سے ہوا۔ وہ بھی سن لیجئے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے۔ ۱۹۱۴ء یا ۱۹۱۵ء کا زمانہ تھا۔ پنجاب یونیورسٹی میں ایک مشاعرہ ہونے والا تھا۔ اس مشاعرے کے بڑے چرچے تھے اور بڑے زور شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میری شاعری کا شوق بھی جوان تھا۔ جب مجھے مشاعرے کی اطلاع ہوئی۔ تو میں نے بھی اس میں شامل ہونے کا ارادہ کیا۔ اور مشاعرے والے دن ہال میں پہنچ گیا۔

حکومت پنجاب کے چیف سیکرٹری مسٹر ٹامسن مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے۔ ڈاکٹر اقبال، ڈاکٹر عظیم الدین اور شمس العلماء مولوی محمد عبداللہ ٹونکی جج کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مشاعرے کا رنگ بہت خراب تھا۔ ہر ایک بار تو میں نے ارادہ کیا کہ اس طوفان بے تمیزی سے نکل بھاگوں حالت یہ تھی کہ جہاں شاعر صاحب اسٹیج پر تشریف لائے اور سامعین کرام نے آؤ بھگت شروع کی جو غریب شاعر سامعین کے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے وہ طوفان ہاؤ ہو میں اپنی جبینوں سے پسینہ پونچھتے ہوئے واپس آجاتے تھے خدا معلوم کتنے شاعر اس ادبی مقتل میں کشتۂ ناز ہو چکے تھے۔ کہ اتنے میں اسٹیج سکرٹری صاحب نے میرے قلب و جگر کو نشانہ بنایا "اور اب تاجور صاحب نجیب آبادی تشریف لائیں" اور جیسے مجھ پر بجلی گر پڑی۔ میں ہانپتا کانپتا اسٹیج پر پہنچا ابھی

میں نے پہلا ہی شعر پڑھا تھا کہ ہر طرف سے "ونس مور" کی آوازیں آنے لگیں۔ میں مولوی آدمی انگریزی سے نابلد لیکن یہ بھی نہیں پڑھی تھی اس ونس مور سے سمجھا کہ شاید میرا بھی وہی انجام ہوگا جو میرے پیش رو شعرائے کرام کا ہوا ہے اور میں بھی اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھنے لگا کہ اتنے میں میرے ایک دوست نے عربی زبان میں آواز بلند بتایا کہ آپ کی نظم بہت پسند کی جا رہی ہے آپ پڑھیے۔ تب میری ہمت بندھی اور میں نے تقریباً تیس شعر کی یہ نظم تالیوں کی گونج اور تحسین و آفرین کے نعروں میں ختم کی۔ دراصل یہ نظم اور یہ مشاعرہ میری شہرت کا سنگ بنیاد ثابت ہوا اس کے بعد لاہور کی علمی و ادبی محفلیں مجھے بہت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں اور مجھے بہت جلد یہاں کی ادبی دنیا میں ایک بلند مقام حاصل ہو گیا۔"

"آپ نے کسی سے مشورۂ سخن بھی لیا؟" میں نے تیسرا سوال کیا۔ "ہاں بھائی مشورہ کیا معنی۔ میں نے باقاعدہ اصلاح لی حضرت رسا رامپوری سے" مولانا نے جواب دیا۔

"اگر ۱۹۱۱ء کو آپ کی شاعری کا ابتدائی سال تسلیم کر لیا جائے تو آپ کو شعر کہتے ہوئے پینتیس سال ہو گئے۔ اس دوران میں آپ نے سینکڑوں [illegible] اور خود آپ کو شاعر پیدا کیے۔ خود بھی سینکڑوں غزلیں کہی ہوں گی مگر اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ کا مجموعۂ کلام ابھی منظر عام پر نہیں آیا؟" میں نے مولانا سے ایک اور سوال کر دیا۔ مولانا [illegible] اپنی چھڑی [illegible] ٹھنڈی سانس لے کر کہا "بھائی یہ داستان بہت طویل ہے اور دردناک بھی اسے نہ چھیڑو تو اچھا ہے [illegible] مجھے دو تین چیزوں نے بہت [illegible] کیا۔ ایک تو صحافت میری زندگی کا بڑا حصہ اخبارات اور رسائل کی ادارت کرتے ہوئے گزرا [illegible] صحافتی [illegible] فرصت [illegible] طرح توجہ دیتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ [illegible] کی تعداد ابھی [illegible] اور میری [illegible] بہت سی غزلیں [illegible] میں نے مشاہیر [illegible] "ادبی دنیا" [illegible] "ہمایوں" وغیرہ میں [illegible] شائع کر دیں۔ تیسری وجہ [illegible] میری شاعری [illegible] کس قدر [illegible] کے لفظ [illegible] انہیں مجموعے میں شامل نہیں کیا جا سکتا [illegible] غلط استعمال [illegible]

[illegible] میں نے محسوس کیا کہ [illegible] کچھ تھکن کے آثار [illegible] ہیں اور [illegible] پر خود [illegible] شاعری کی حیثیت [illegible] مولانا سے اجازت لینا مناسب سمجھا اس کے بعد [illegible] ان سے [illegible] موضوعات پر گفتگو [illegible] کے بعد [illegible] آخر [illegible] مولانا کے انتقال کی خبر [illegible] اس کے بعد مجھے ان کے حالات زندگی اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کی جستجو کا شوق پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا [illegible]

آج ۱؎ کے دن جب پنجاب یونیورسٹی کے [illegible] "یوم تاجور" منایا گیا تو مجھے بھی اس [illegible] کی دعوت دی گئی اس تقریب کے سلسلے میں [illegible] مولانا کی شاعری ان کی [illegible] اور ان کے صحافتی کارناموں کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مولانا [illegible] کے علاوہ چوٹی کے صحافی عالم، قادر الکلام استاد اور شیوا بیان شاعر تھے۔ ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں جو ایک سے زیادہ فنون سے واقفیت رکھتے ہوں اور پھر ان پر کمال حاصل ہو۔ مولانا انہی چند لوگوں میں سے تھے۔ ان کے ادبی کارناموں میں نظم و نثر کے اس انتخاب کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو انہوں نے شاہ اردو مرکز کی طرف سے [illegible] جلدوں میں شائع کیا اور اردو ادب کے قابل قدر اور جاندار حصے کو تباہ ہونے سے بچا لیا اور اسے شائقین علم و ادب کے سامنے پیش کر کے ان سے یہ اعتراف کروا لیا کہ اردو زبان کا دامن صرف گل و بلبل کی شاعری اور فرضی قصے کہانیوں ہی سے بھرا ہوا نہیں ہے بلکہ اس [illegible] بلکہ ایسی چیزیں بھی ہیں جنہیں زندگی کے حقائق سے بہت قریبی تعلق ہے اور جو انسان کے بہت نازک احساسات کو بیدار کرنے والی ہیں۔ اس انتخاب میں انہوں نے بڑی محنت اور توجہ سے ہندوستان کے تمام مشاہیر شعراء و ادبا اور اپنے عہد کے لوگوں کا بھی بڑا پاکیزہ حصہ شامل کیا ہے۔ مولانا کی صحافت کے [illegible] میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس دور میں جب پنجاب میں انگلیوں پر گنے ہوئے چند رسالے اور اخبارات کے علاوہ باقی میدان صاف تھا۔ انہوں نے "ہمایوں" [illegible]

۱؎ یہ جلسہ ۱۹۵۲ء میں منعقد ہوا تھا

"ادبی دنیا"، "شاہکار"، "انتقاد" اور "پریم" کے ذریعے سے یہاں کی علمی اور ادبی دنیا میں بڑی ہما ہمی اور گہما گہمی پیدا کردی۔ ان اخبارات اور رسائل میں "مخزن" اور "ہمایوں" کے سوا باقی سارے اخبارات و رسائل مولانا ہی نے جاری کیے اور ایک رسالے کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا رسالہ نکالنا جہاں ان کے [illegible] ادیب ہونے پر دلالت کرتا ہے، وہاں ان کی بلند ہمتی کی بھی غمازی کرتا ہے۔ ان اخبارات و رسائل کی گٹ اپ، مضامین کی ترتیب، کتابت و طباعت میں نفاست، یہ ساری چیزیں اس وقت جب صحافت اپنی ابتدائی منزلوں میں تھی، مولانا کی توجہ و جدت کا پتہ دیتی ہیں اور اردو صحافت میں سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔ آج کے مشہور و معروف شعرا میں بیشتر ایسے ہیں جو انہی رسائل کے ذریعے سے منظرِ عام پر آئے اور انہیں بنانے میں مولانا تاجور صاحب کا بڑا ہاتھ ہے۔ مولانا کی نثر نگاری بھی ایک مستقل موضوع ہے اور اپنے اندر بہت پہلو رکھتی ہے۔ ان کے نثری کارنامے افسانوں، ڈراموں، مقالات اور خطوط پر مشتمل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ افسانوں کی دنیا میں انہوں نے کوئی خاص کارنامہ نہیں کیا اور افسانوں کے نقاد ان کی خدمات کو بہت بڑا درجہ نہیں دیں گے۔ یہ بھی درست ہے کہ افسانہ نگاری ان کا فن اور افسانہ ان کا میدان نہ تھا۔ تجرباتی نقطۂ نظر سے بھی ان کے افسانے خالی ہیں مگر اتنا ضرور ہے کہ مولانا نے سیدھے سادے انداز سے زندگی کے حقائق اور اس دور کے [illegible] افسانوں میں پیش کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس اعتبار سے کہ ان کی تخلیقات میں خلوص ہے اور انہوں نے معاشرے کی اصلاح کرنے کی کوشش کی، ان کی کوششیں قابلِ قدر ہیں۔ ان کے مضامین بہت پائے کے اور معلومات سے پُر ہیں۔ ادبی اور تنقیدی مضامین میں ان کی علمی صلاحیتیں پوری دکھائی دیتی ہیں۔ "ادبی دنیا" اور "شاہکار" کے وہ مضامین جو میر و سودا کے موازنے اور شاعری، زبان اور فنِ عروض کی باریکیوں پر مشتمل ہیں، علم و ادب کے طالب علموں کے لیے ایک مستند اور مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں مولانا نے اپنی معلومات کے دریا بہا دیے ہیں۔ [illegible] اجتہادی رنگ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی اپنی بھی ایک اپنی خاص رائے تھی اور نہایت بے باکی سے اس کا اظہار کر دیتے تھے۔ مولانا نے مزاحیہ مضامین کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس سلسلے کی چیزیں اخبارات و رسائل کے صفحات کے علاوہ ریڈیو اسٹیشن سے بھی وقتاً فوقتاً نشر ہوتی رہی ہیں۔ یہ مضامین صرف ہنسنے ہنسانے کے لیے نہیں تھے بلکہ ان میں انہوں نے اپنے دور کے معاشرے پر بھرپور طنز کی تھی۔ بحیثیت مزاح نگار وہ حیرت انگیز طور پر کامیاب ہوئے، ان مضامین کی افادیت خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے۔

مولانا نے اسکولوں کے نصاب کے لیے بہت سی کتابیں لکھی تھیں جن میں سے بعض الہ آباد اور مدراس یونیورسٹیوں کی ایف اے اور بی اے کے درجوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ ان کی مرتب کی ہوئی کتاب "روحِ نظم" لندن یونیورسٹی کے آنرز ان اردو کلاس کے کورس میں بہت عرصے تک شامل رہی۔ اس سے بھی ان کی علمی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے اور ان کا مرتبہ متعین کرنے میں مدد مل سکتی ہے مگر افسوس ہے کہ ان کی آنکھ بند ہوتے ہی ان کی چیزیں نصابِ تعلیم سے منسوخ کردی گئیں۔

مولانا کی شاعری کے متعلق اردو ادب کے نقادوں نے مختلف آرا کا اظہار کیا اور ہر نقاد نے انہیں اپنے معیار پر پرکھنے کی کوشش کی ہے مگر شاید ہی کوئی نقاد ایسا ہو جس نے مولانا کو ان کے معیار پر بھی پرکھ کر دیکھا ہو۔ مولانا کی رگوں میں پٹھان کا خون گردش کرتا تھا، ان کے مزاج میں محبت اور نرمی کے ساتھ ساتھ سختی اور کسی قدر رانا کا بھی عنصر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی گفتگو، نثر اور نظم میں بھی گرمی اور کسی قدر تعلّی بھی پائی جاتی ہے۔ "ادبی دنیا"[1] کی وہ طویل نظم جس میں انہوں نے اپنے ایک دوست سے مخاطب کیا ہے ان کے مزاج کی پوری غمازی کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں ضرورت سے زیادہ گرمی پیدا ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ نظمیں جن میں قومی مسائل اور مناظرِ قدرت سے تعلق رکھنے والے جذبات ظاہر کیے گئے ہیں، دل میں گرمی اور گدگدی پیدا کرنے والی چیزیں ہیں۔ ان نظموں میں "کمال آتا ترک"، "کہسارِ شملہ" اور "برسات" قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا کی غزل گوئی کے متعلق پروفیسر آل احمد سرور نے یہ رائے ظاہر کی ہے: "ان کے کلام میں جادو کم اور گرمی زیادہ ہے۔" اس میں شک نہیں کہ ان کی نظموں کی طرح ان کی غزلوں میں بھی گرمیٔ جذبات پائی جاتی ہے۔ زبان اور بیان کا زور اور بعض جگہ الفاظ کی تکرار نے ان کی غزلوں میں عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔ مگر ان کی غزلوں میں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں ہے جو دردمند اور پُرخلوص دل کی پکار معلوم ہوتے ہیں۔ زبان کی صحت اور خیالات کی بلندی کے اعتبار سے بھی ان کا کلام بہت پاکیزہ ہے۔ سفلہ جذبات اور بازاری خیالات سے ان کی شاعری یکسر پاک ہے۔

۱: اس نظم کے بارے میں عجیب غلط فہمی پیدا ہوئی یا دانستہ پیدا کی گئی۔ دراصل یہ کسی مجازی معشوق کا قصیدہ نہیں بلکہ محبوبِ خدا حضرت رسول اکرم ﷺ کی نعت ہے

تاجور نجیب آبادی

محمد سبطین شاہجہانی

قصرِ ادب کو ناز تھا جس کے کمال پر
وہ افتخارِ علم دبستاں تھا تاجور

وہ سرزمینِ علم و ادب کا تھا شاہکار
اُس سے ہر ایک مزرعِ ویراں تھی لالہ زار

وہ جلوۂ خیال طلسمِ غزل ہوا
گلزارِ شعر و فن کا مہکتا کنول ہوا

اُس سے بہارِ معنی و دانش ہے نورگر
اُس سے فروغ بار ہے الفاظ کا نگر

کامل تھی دسترس اُسے طرزِ بیان پر
حاصل تھا وہ عبور اُسے اردو زبان پر

تاجِ سخن میں اس کے ہیں موتی جڑے ہوئے
اُس کے فرازِ فن پہ ہیں پرچم گڑے ہوئے

وہ بے مثال اپنے تدبر میں باکمال
وہ شہرِ نظم و نثر میں تھا مرکزِ خیال

اُس نے ادب کا روپ نکھارا تمام عمر
زلفِ نگارِ فن کو سنوارا تمام عمر

دانشوروں میں محترم و نامور ہے وہ
ملکِ سخن کا آج بھی اک تاجور ہے وہ

میرا محسن ○ میرا اصلاح کار

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ
چنڈی گڑھ

دیوانہ تھا اب تو بھی تھا مرا جانا رہا — خوش ہو بوڑھا شہر میں نہ جانا آ رہا
لاکھوں بیٹوں میں تیرے ایسی تو پاتی — کہہ دیا یہ میں نے کیا جاتا رہا

آج سے قریباً پچاس سال پہلے کی بات ہے۔ میں چنگڑ محلہ لاہور میں منشی گوری شنکر لال اختر مدیر رسالہ شیو شمبھو کے پاس اُن کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ ایک خوبصورت نوجوان سر لمبا، داخل ہوا متانت اور بشاش کے ساتھ۔ اختر صاحب سے نہایت دھیمی گفتگو ہوئی۔ میں نے توجہ پھیر لی کہ ان کی بات چیت نہ سن سکوں۔ پھر کان میں پڑ ہی گئے چند الفاظ:

اختر: اس کی اشاعت کتنی ہے؟

تاجور: پچاس

بے اختیار داد دی۔ شاعر، مدیر، غرض مند ناشر اور حق گوئی واقعی یہ کوئی راست باز راسخ سوری قسم کا نوجوان ہے جو آگرہ اودھ کے مجاہدوں کا خون رگوں میں لیے پھرتا ہے۔ تاجور صاحب رسالہ تاج الکلام ماہانہ شروع کر چکے تھے اور نجیب آباد سے لاہور پہنچے تھے کہ رسالہ کے لیے خریدار اور لکھنے والے ڈھونڈ ڈھونڈ نکالوں۔ اختر صاحب اپنے رسالہ کی اشاعت کی ٹھیک گنتی کبھی نہ بتاتے۔

تاجور صاحب پڑھاتے وڑھاتے ہوں گے، شاید کچھ طلبا کو چند باتیں سکھانے میں کامیاب بھی ہوئے ہوں، بندہ خاکی تو اُن کی استاذہ گری (پدرزن بادشاہ گری) کا قائل ہے۔ اساتذہ کے کامل اور ادق، پرشاکارانہ اصلاح کار تھے۔ لاہور کا ہر ادیب، شاعر، پروفیسر جسے تاجور رما ... سے گراں قدر نہایت مفید مشورے نہیں تفویض دعا کیے گئے۔ صلاح کار بھی تھے اور تاجر بھی۔

اُردو ہندی، پنجابی کی لکچراری کی آسامیاں یاروں نے خطرے میں ڈال دیں۔ آج اُستادی جاتی ہے کل تنزل کر دی جائیں گی۔ نہ شیرانی کو اتنی فرصت ملتی، نہ بناری داس میں اتنی طاقت۔ بندۂ ضعیف دوڑا بھاگا تاجور صاحب اور رانا جنگ بہادر تک پہنچا۔ للہ مدد کرو، امداد کا وقت ہے۔ تاجور نے خم ٹھونکا۔ ہاں ابھی ان کو ٹھیک کرتا ہوں۔ قلم میرے پاس، زبان میرے پاس۔ اُردو پریس میرا۔ انگریزی جنگ بہادر کا۔ ذرا ہم پٹھانوں اور راناؤں کے دو ہاتھ تو دیکھو۔ ایس پی ایس کے ہال میں جلسہ ہوا۔ دھواں دھار تقریریں چل اٹھ گئیں۔ دوسرے تیسرے روز معزولی آسامیات کے بادل چھٹ گئے جب بھی کسی نے للکارا یہ شیر مرد آمدم کہہ کر پہنچا۔

میرے گھریلو معاملات کچھ سے کچھ ہو رہے تھے۔ گڑھی باغ (کپورتھلہ ہاؤس) میں میرے غریب خانہ پر پہنچے، دو باتیں یاد ہیں "دیکھو سردار جی یہ اچھا نہیں لگتا بالکل۔ تم اپنے دونوں بچوں کو معشوق سمجھ کر پال رہے ہو؛ نہیں بچے ہی سمجھو۔ اس قدر اسراف اس قدر دل داری جو کہا دی مانا، یہ کیا بات ہوئی۔

رہا پریشانیوں کا سوال۔ تو کیا ہیں کم ہیں۔ مگر میری طرف دیکھو (صاف انا نہ بیا) جب کبھی افکار کی زجر و بیخ کی یورش ہوتی ہے سر پہ ہاتھ

مولانا محمود شیرانی

پھیرتا ہوں داڑھی پر ہاتھ پھیرتا ہوں اور کہتا ہوں ہر بلا دور، ہر مصیبت ختم۔ قسم خدا کی سب کچھ بھول جاتا ہوں اور نئے سرے سے تازہ دم وارد میدان ہوتا ہوں ؛

مگر بھئی تاجور صاحب اگر مربی گری اور مصلح گری اور شاعر گری ہی کرتے رہتے تو نسلی اور خاندانی خوبیوں کے زیادہ دیر تک حامل نہ رہ سکتے۔

چلو مانا کہ بے ڈری، تاب مقاومت، تاب بورش یہ سب ورثے میں ملی چیزیں ہیں۔ یہ کہئے کہ اُن کی Sense of Humour طنز و مزاح کی بے پناہ قوت کہاں سے آئی۔ اور اُن کی بے پناہ ہنسی جسے دیکھ اور سن کر روٹھا محبوب بھی من جاتے، اُس کا مولانا پن سے کیا علاقہ ہے! تاجور بیٹھنے تھے تو سارے کمرے میں ساری محفل میں شگفتگی اور جلادت کی خوشبوئیں بکھیر دیتے تھے۔ اور طنز و مزاح کی بات۔ ارے تو یہ اُس کے آگے سرشار، پطرس، کرشن چندر وغیرہ کی پھبتیاں پھیکی اور بے رس محسوس ہوتی ہیں۔ اِس کا پتہ ہم لوگوں کو اُس وقت چلا جب غالباً ادبی دنیا میں "دو بیویوں" یا ایسے ہی کچھ عنوان کے تحت تاجور صاحب نے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا۔

دراصل: تو یوں ہی، ایک روز صاحب موصوف کے دولت کدہ میں جا گھسا۔ دیکھوں واقعی دو بیویوں کے خاوند ہیں؟ ان کی کامیاب خانہ داری کا کون سا پوشیدہ دھیان گر ہے

ابھی بیویوں تک ہی یہ طنز پروری اور مزاح ورزی موقوف نہ تھی۔ شعر و سخن میں مجلس و محفل میں تو اس نے لطیف ترین نسخے مہیا کیے جاتے تھے۔ کسی مشاعرہ میں آپ صدر تھے۔ وفا جو آج کل سیاست کی نوازشوں کا شکار ہیں غزل پڑھنے آئے۔ مقطع پڑھا ؎

تمہیں دل سی شے دے کے دادِ وفا دوں
بڑے آئے دادِ وفا دینے والے

شعر اپنی جگہ خوب ہے مگر دادِ وفا کی تکرار نے ایک طنز پرور اور مزاح خیز پہلو تاجور کے سامنے رکھ دیا۔ کب چوکنے والے تھے۔ ایسے انداز میں شعر کو خود دہرایا کہ تمام حاضرین دادِ وفا دادِ وفا کہہ کہہ کر قہقہے لگانے لگے۔

کہتے ہیں کہ بڑے لوگوں کی اپنے وطن میں قدر و منزلت بہت کم ہوتی ہے۔ مگر فقیر نے منصوری میں مولانا احسان اللہ خان تاجور نجیب آبادی کی پوجا ہوتی دیکھی ہے۔ گرما کی تعطیل میں یہ گدائے درگاہ پہاڑ کی سیر کرنے کا عادی ہے۔ مولانا بھی بیویوں کو لے کر آ ڈٹے۔ اسلامیہ ہائی سکول نے تاجور کے ایما و پر مجھے نوازا۔ اُس جلسہ میں تاجور صاحب کو جو داد صوبجات متحدہ کے خواص نے نذر گذرانی اُس سے ثابت ہو گیا کہ وطن والے بھی دادرسی کر سکتے ہیں، اور کرتے ہیں گاہے گاہے ہی سہی۔

مولانا حسرت موہانی کے بعد درویش نے تاجور صاحب کو اپنی کورنشوں کے قابل پہچانا۔ وہی خلوص، وہی بے نیازی، وہی دین پرستی، وہی عالم دوستی۔ "کیفیات" کاتب سے آگئی۔ میں نے اول کے صفحات تاجور صاحب کے پاس نظرثانی کے لیے بھیجے۔ مغفور کو ایک شعر بہت پسند آیا ؎

دل کو اب تک نہیں معلوم کہ دلداروں نے
اسے آباد کیا یا اسے برباد کیا

تاجور صاحب آئے ادبی دنیا کو آباد کیا، جاتے رہے اور ادبی دنیا برباد ہو گئی۔

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ
چنڈی گڑھ ۳۱ دسمبر ۱۹۶۴ء

ثاقب زیروی مدیر "لاہور"

آہ! علامہ تاجور

علامہ تاجور مرحوم شعر و ادب کا چلتا پھرتا ادارہ تھے۔ انہوں نے خاص طور پر اردو کی سرپرستی کے لا تعداد مستحکم ادارے قائم کیے۔ غیر مسلموں کے قلب میں اردو کا درد سمویا، ان میں اردو کے شعراء پیدا کیے، لیکن واے وہ بہت سے مقتدر روح — کہ جسے اٹھایا وہی ذرا آگے بڑھ کر ان کی سربلندی کے درپے ہوا۔ جیسے بیٹا نہ کرا جارا اسی لئے اپنے عہدِ اقتدار میں ان کے بیٹوں کے منہ سے روٹی کے لقمے چھیننے سے گریز کیا۔

مرحوم اپنے سے چھوٹوں کے ساتھ کس نظر سے ملتے تھے، اپنے نیاز مندوں کو کیسے کیسے التفات سے نوازتے تھے اور ان کی نجی زندگی کس درجہ بے تکلف، محبت نواز اور بے ساختہ تھی۔ اس کا کچھ کچھ اندازہ ذیل کے دلچسپ واقعہ سے ہو سکتا ہے، جو میرے ساتھ پیش آیا:

مجھے سب سے پہلی دفعہ حضرت مولانا تاجور سے ۱۹۳۵ء میں ملنے کا اتفاق ہوا اور یہ ایسا دلچسپ اتفاق تھا کہ وہ اس کے بعد مجھے جب بھی ملتے بلکہ ہر ملاقات پر اس دلچسپ اتفاق کی یاد اس حسن و خوبی سے تازہ ہوتی رہی کہ ہر دفعہ نیاز و ناز کے سلسلے کی تجدید سی ہو جاتی۔

۱۹۳۵ء میں شہنشاہِ برطانیہ کی سلور جوبلی ہوئی تھی۔ شاید اسی تقریب پر فیروز پور شہر میں اچھا خاصا مشاعرہ منعقد کرنے کا پروگرام مرتب ہوا تھا۔ ان دنوں وہاں مسٹر انتر حسین ڈپٹی کمشنر تھے اور مسٹر جی معین الدین ضلع کے دوسرے بڑے اعلیٰ حاکم۔ قرار پایا کہ اس مشاعرہ میں امرتسر، جالندھر، کپورتھلہ، دہلی اور لاہور سے بھی شعراء کو دعوت دی جائے۔

لاہور سے اساتذۂ دانش کے علاوہ (جنہوں نے پہلے ہی خط پر "ہاں" کر دی تھی) مولانا تاجور اور ڈاکٹر تاثیر مرحوم مدعو تھے اور بقول سردار اودھے سنگھ شائق جو مولانا تاجور کے شاگرد بھی تھے، سب سے ٹیڑھی کھیر انہی کو لانا یا لے کر جانا تھا۔ چنانچہ مجھے ارشاد ہوا کہ میں خود لاہور جا کر ان دونوں صاحبوں کو لاؤں۔

میں نے راستے میں سوچا جس قسم کا غائبانہ تعارف مولانا کا کرایا گیا ہے، اگر میں نے بھی وہاں کوئی تکلف برتا تو شاید مزید تاخیر ہو جائے۔ بہتر ہو کہ میں انہیں بالکل ہی خادموں کی طرح ملوں اور اپنا اصل عہدہ ایسا — کہ میں سیشن کورٹ کا ملازم ہوں، میں خود بھی شاعر ہوں یا بزمِ فردوسِ ادب کا سیکرٹری ہوں وغیرہ — کچھ نہ بتاؤں۔ لہٰذا اسی تدبیر پر عمل کیا گیا۔ میں مولانا کے حضور پہنچا اور آنے کا مقصد بیان کیا۔ ایک دفعہ تو انہوں نے مجھے اوپر سے نیچے تک بڑے ہی بے تکلف انداز میں دیکھا اور پھر ایک لمبی سی "ہونہہ" کے بعد کہا:

"اچھا تو آپ ہیں جو ہمیں فیروز پور سے لینے آئے ہیں مگر آپ کا نام کیا ہے بھئی؟"

"جی — میرا نام؟ میرا نام امام دین ہے!"

"امام الدین — سبحان اللہ! کیا نام پایا ہے، مگر امام دین! آپ کام کیا کرتے ہیں؟"

"جی — میں — میں سردار اودھے سنگھ شائق صاحب وکیل کا منشی ہوں!"

"اچھا —" مولانا کی نگاہیں ایکا ایکی چمک اٹھیں، کیونکہ شائق کے منشی پر تو ان کا "حق شفع" بھی چلتا تھا، فرمانے لگے:

"دیکھو امام الدین! تاثیر کھانے پر آئیں گے، تم اس عرصے میں مجھے تیار کرا دو — پاجامے میں ازاربند ڈالو، ٹوپی کو برش کرو — اور کیا پالش کرنا جانتے ہو؟"

"جی، کرسکتا ہوں"

"کیسا کرسکتے ہو؟ دو آنے والا یا ایک آنے والا؟"

"جیسا حکم ہو!"

(مزے دار بات یہ ہے کہ میں صرف کرتہ، پاجامہ اور انگوٹھے والی چپل پہنے ہوئے تھا۔ گویا میری ہیئت کذائی وکیلوں کے فالتو منشیوں کی سی ہی تھی) چنانچہ مولانا کی تیاری میں ہر ممکن حصہ لینے کے بعد میں نے نوکر کے ساتھ مل کر کھانے وغیرہ کے برتن بھی کھلوائے، کھانے کے بعد تانگہ لایا گیا، اس پہ ان کا سامان لادا، اسٹیشن پر پہنچ کر ٹکٹ خریدے اور قلی کے بجائے خود ہی سامان اٹھا کر انٹر کے ڈبے میں رکھا۔

گاڑی چلی تو شاید راستے میں مولانا نے تاثیر صاحب سے میری پالش کرنے میں مہارت کی بات کی۔ لہٰذا رائے ونڈ کے اسٹیشن پر جہاں گاڑی کافی دیر ٹھہرتی تھی، ان کے بوٹ بھی چمکائے۔ انہیں سگریٹ سے کھلائے، مولانا کے لیے پان لایا۔ وغیرہ وغیرہ —— یہاں تک کہ آدھر شام اتری ادھر ہماری گاڑی فیروزپور شہر کے لیے پلیٹ فارم میں جا گھسی۔

گاڑی رکتے ہی میں نے بڑھ کر عرض کی "مولانا گیٹ پر اغلباً اراکین بزم آپ کے لیے آئے ہوئے ہیں، آپ تشریف لے چلیں، میں سامان لے کر پہنچتا ہوں" —— اور ان کے تینوں بیگ میں نے خود ہی اٹھا لیے۔

مولانا اور تاثیر مرحوم تو چونکہ خالی ہاتھ تھے، اس لیے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گیٹ پر جلد جا پہنچے، مگر میرے پاس تو تین چھوٹے بڑے بیگ بھی تھے، اس لیے میں قدرے دیر سے پہنچا۔ اتنے میں گیٹ پر عجیب و غریب مکالمے ہوئے (جو مجھ تک اراکین بزم کے واسطے سے پہنچے) مثلاً شائق صاحب نے بڑھ کر پوچھا

"مولانا! ثاقب صاحب کہاں ہیں؟"

"کون ثاقب صاحب؟"

"مولانا! وہی نوجوان جو آپ کو بزم کی طرف سے لینے گئے تھے۔ وہ ہماری بزم کے سفیر ہیں نا ثاقب زیروی صاحب!"

"نہیں بھائی۔ ہمارے پاس تو تمہارا منشی گیا تھا امام الدین"!

اس پر ڈپٹی کمشنر صاحب نے ایک قہقہہ لگایا اور فرمایا:

"اودھے سنگھ کا منشی اور امام الدین؟ مولانا! آپ کے پاس کوئی اور تو نہیں پہنچ گیا؟"

اتنے میں میں کافی قریب آ چکا تھا، مجھے دیکھتے ہی سب نے ایک اور قہقہہ بلند کیا اور تاثیر مرحوم پوچھنے لگے —— میں نے پاس سے طرح دے کر معاروں میں گذر جانا چاہا، مگر مولانا تو پھر کر میری طرف کو بڑھے اور چہرے پر ندامت اور جعلی خفگی آمیز مسکراہٹ لاتے ہوئے میرے ہاتھ سے اپنا بیگ چھین کر بولے:

"ادھر لاؤ جی میرا بیگ۔ میں امام الدین ہوں، سالا منشی ہوں اور سالا اندر سے ثاقب زیروی نکلے۔ گویا امام دین بننا اتنا آسان ہے"!

اور میں نے جو اس پہ قدرے گھبراہٹ کا اظہار کیا، تو بیگ کو پرے پھینک کر مجھے اس وارفتگی سے لپٹے کہ آنکھیں محبت کے آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ پھر بڑے ہی پیار سے بولے:

"بیٹا! مجھے معاف کرنا۔ میں نے تم سے بڑی زیادتی کی ہے —— اور چونکہ تاثیر کو بھی میں نے ہی اکسایا تھا، اس لیے اس کی طرف سے بھی میں ہی معافی مانگتا ہوں"!

اور میں —— گویا اسی ثانیے آسمان پر پہنچ گیا —— اور پھر ان کی وفات حسرت آیات تک مولانا سے جب بھی ملاقات ہوئی انہوں نے انتہائی معذرت کے ساتھ اس واقعے کے کچھ حصے دہرائے، مولانا نے جو بھی مشاعرہ اپنے اہتمام میں کرایا، اس میں مجھے فیروزپور سے بلوایا اور ہر دفعہ تمہید میں

اس تعارفی ملاقات کے کچھ نکتے ضرور بیان کیے۔

اور میں —— ان کے حضور میں جس وقت بھی کوئی بات، مسئلہ، انجمن یا عرض لے کر پہنچ گیا، انہوں نے اسی محبت، اسی وضعداری اور خندہ پیشانی سے مجھے وصول و قبول کیا، مگر آج اخلاقی اقدار کے وہ سرپرست کہاں!

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

موجودہ نظام تعلیمات تمام درجے ناقص اور ضرر رساں ہے۔ کسانوں اور پیشہ وروں کی اولاد موجودہ تعلیم حاصل کر کے اپنے آبائی پیشوں سے متنفر اور اپنے آبائی پیشوں کو ترک کرنے کی بجائے دفتری بابو بننے کی سعی ناکام میں سرگرداں رہتی ہے۔ موجودہ تعلیم انہیں گھر اور گھاٹ کہیں کا بھی نہیں چھوڑتی۔ اسی تعلیم نے کسانوں اور دستکاروں کی اولاد کو دفتری کلرک بنا کر دروازوں پر قفل لگا دیا ہے اور لاکھوں تعلیم یافتہ نوجوان آبائی پیشوں سے بیگانہ ہو کر نوکری کے عنقائے بلند آشیاں کی تلاش میں دربدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اگر یہ تعلیم نہ پاتے تو والدین کا روپیہ، اپنا وقت اور دماغ بچا کر اپنے گھریلو پیشوں پر لگ جاتے اور اس طرح ملک کی صنعت و حرفت اور زراعت تباہی سے بچ جاتی۔ نوجوانوں کے لیے کام اور رزق مہیا ہوتا۔ ملک کے یہ وبال دوش نہ بنتے۔

** تاجور ۱۹۳۶ء

ڈاکٹر اے وحید
چیئرمین فیروز سنز لاہور

مولانا تاجور نجیب آبادی

مولانا تاجور نجیب آبادی مرحوم ایک ہمہ صفت موصوف شخصیت تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ لاہور میں اردو کی ترویج و ترقی میں آپ کی مساعی کو بہت دخل ہے۔ تو مبالغہ نہ ہوگا۔ نوجوان شاعروں کی ایک کھیپ ان کی تربیت میں پروان چڑھی بلاتمیز مذہب و ملت شاگردوں سے مولانا کا سلوک بڑا مشفقانہ اور مربیانہ ہوتا تھا۔

مولانا تاجور جس دور میں لاہور میں وارد ہوئے اس زمانے میں کسی اچھے ہندوستانی شاعر کا لاہور میں قدم جمانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ کئی لوگ آتے۔ مگر "نیاز مندان لاہور" نے اُن کے قدم نہ جمنے دیے۔ لیکن مولانا تاجور نے بڑی ہمت اور پامردی سے ان مخالفتوں کا مقابلہ کیا۔ اور پھر لاہور کی مٹی ایسی دامن گیر ہوئی کہ مر کر بھی یہیں دفن ہوئے۔

مولانا کا سب سے اہم علمی اور ادبی کارنامہ ماہنامہ "ادبی دنیا" کا اجراء ہے۔ اس وقت نیرنگ خیال اور عالمگیر پورے شباب پر تھے۔ مگر مولانا نے "ادبی دنیا" کو ہر اعتبار سے حسن صورت و معنویت سے مزین کیا۔

"ادبی دنیا" کو ایک بہترین اور بلند پایہ مجلّہ بنانے میں مولانا نے نہ صرف اپنی علمی و ادبی صلاحیتوں سے کام لیا بلکہ اپنی زندگی کا تمام اثاثہ اس کی نذر کر دیا۔ اگرچہ علمی و ادبی حلقوں میں اس نے خوب خوب خراج تحسین حاصل کیا۔ مگر دفتری بدانتظامیوں کے باعث مولانا کے لیے یہ مشکل ہو گیا کہ اس کو کچھ اور دیر تک چلا سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا نے "ادبی دنیا" مولانا صلاح الدین مرحوم کے حوالے کر دیا اور خود اس سے کنارہ کش ہو گئے۔

"ادبی دنیا" کا پہلا سالنامہ جو مولانا مرحوم کی نگرانی میں شایع ہوا تھا ادبی دنیا میں ایک گراں قدر اضافہ تھا۔ اس میں مولانا کی ایک طویل نظم جو کئی صفحات پر محیط تھی شایع ہوئی۔ اس نظم کا عنوان تھا "دوست سے خطاب" اس میں مولانا نے اپنی محرومیوں کی داستان نہایت خوبصورت انداز میں پیش کی تھی۔

لاہور میں آکر مولانا نے اس وقت کے مشہور ناشرین کی فرم میسرز عطر چند کپور سے رابطہ قایم کر کے اردو مرکز کی بنیاد رکھی جس کے زیر اہتمام مولانا نے اردو ادب کی بیش بہا خدمت انجام دی۔ جس کو مستقبل فراموش نہ کر سکے گا۔

اللہ کریم مولانا کی روح کو اطمینان و سکون نصیب کرے۔ آمین ثم آمین　　ڈ

مولانا محمد وارث کامل

شمس العلماء تاجورؒ

علی ساہیں کی مسجد کے عقب میں جہاں اپنے آخری موڑ پر ملیننگ روڈ دم توڑتی ہوئی نظر آتی ہے کچھ نئی وضع کے مکانات بنے ہوئے ہیں۔ انہی مکانات میں ایک وہ مکان بھی ہے جو ایک مدت تک شمس العلماء علامہ تاجور نجیب آبادی کی قیام گاہ بنا رہا ہے۔ علامہ سے میری پہلی ملاقات اسی مکان کے ایک کمرے برآمدے میں ہوئی تھی ۱۹۴۴ء کے موسم گرما کا شباب ڈھل چکا تھا۔ لیکن پھر بھی اس ایک منزلہ مکان میں دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا گمان ہوتا تھا۔ اس بلا کی گرمی اور اس قیامت کا حبس تھا کہ دم گھٹا جاتا تھا۔ علامہ نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے اپنے بھاری بھرکم جسم کی ایک ارتعاشی حرکت سے میرا خیر مقدم کیا اور کسی تمہید کے بغیر مجھ پر طنز و ظرافت سے ملے جلے الفاظ کے تیروں کی بوچھاڑ کردی:

"اچھا تو آپ ہیں میرے ہم وطن مولانا محمد وارث کامل بی۔اے۔ خوب! ماشاءاللہ آپ تو بڑے نستعلیق دکھائی دیتے ہیں۔ مولانا آپ کافی عرصہ سے لاہور رہ رہے ہیں۔ کبھی بھولے سے بھی آپ نے ادھر کا رخ نہیں کیا۔ میرے ڈیل ڈول کا آدمی جو دوشِ کائنات پر گراں بنا ہوا ہو۔ کہاں کہاں جائے اور کس کس سے ملے۔ پھر کچھ عمر کے تقاضے بھی تو ہوتے ہیں۔ آپ مجھ سے عمر میں کہیں چھوٹے تھے۔ آپ کا یہ اخلاقی فرض تھا کہ مجھ سے اوّلین فرصت میں ملتے۔ تاجور بُرا ہی سہی لیکن اتنا بُرا تو نہیں کہ اچھے اس کے پاس بھی نہ پھٹکیں مولانا! میں تو آپ کی برادری کا ہی آدمی ہوں۔ سالہاسال پہلے میں نے دارالعلوم دیوبند سے فضیلت کی سند لی ہے۔ میں نے خود ہی بلایا تو آپ تشریف لائے۔ مولانا! ہے تو یہ ہمارے بندے کی ملاقات پھر بھی آپ شکریہ کے مستحق ضرور ہیں"

میں نے علامہ کی یہ گفتگو خاموشی کے ساتھ سنی اور آخر میں اپنے غلط رویے پر معذرت طلب کی۔ علامہ سے میری ملاقات شاہکار کی ادارت کے سلسلے میں تھی۔ اگر یہ ماہنامہ پہلے کی طرح علامہ کی ادارت ہوتا اور کسی شیخ الیہودہ کے ہاتھوں میں اس کی باگ ڈور نہ ہوتی تو میں اس ادارت کو اپنے حق میں ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھتا۔ میں نے علامہ کی پیشکش تو قبول نہیں کی۔ البتہ ان کی یہ متبادل تجویز مان لی کہ مولانا! مکتبہ دانش سے وابستہ ہو جائیے۔ غرض علامہ کی ناگواری خاطر کا خطرہ جاتا رہا اور تعلقات کی خوشگواری میں مطلق کوئی فرق نہیں آیا۔ حادثہ تقسیم تک علامہ سے راہ و رسم کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب عظیم نے میرے اور ان کے درمیان کچھ ایسا خط فصل کھینچا کہ مزید ملاقاتیں جن کے امکانات کچھ کم قوی نہ تھے قیامت تک کے لئے معرض التوا میں جا پڑیں۔ پاکستان کی آزادی یا بالفاظ دیگر نوزائیدہ مملکت پاکستان نے ابھی اپنی زندگی کی تین بہاریں دیکھی تھیں کہ علامہ نے آخرت کی راہ لی۔ میں نے بجنور میں جہاں میں سات سال (سہ روزہ) مدینہ کی ادارت کے فرائض سرانجام دیتا رہا ہوں۔ یہ خبرِ وحشت اثر سنی تو ایک تعزیتی جلسہ کا فوری اہتمام کیا۔ اور اس میں علامہ کے حالاتِ زندگی، ان کی علمی، ادبی خدمات اور ان کی شاعری پر روشنی ڈالی۔ اس موقع پر میں نے ارتجالاً یہ دو شعر بھی کہے تھے ؎

غضب کی بات ہے تاروں کی چھٹ گئیں نبضیں + جو کچھ دیئے ہیں وہ بس ٹمٹماتے جاتے ہیں

نظر سے دل کی بناہیں جو کھینچ لیتے ہیں
کہیں جہاں میں وہ انسان بھی پائے جاتے ہیں

علامہ تاجور نجیب آبادی کے ساتھ جو علمی و ادبی صحبتیں گرم رہی ہیں میں ان کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا البتہ ایک صحبت جس سے علامہ کی : بانداقی اور وسیع النظری پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ تقاضا کر رہی ہے کہ میں اس کے نقوش مزید اجاگر کروں، اس صحبت کا شرف مجھے حضرت دانش کی پہلی قیام گاہ دکوٹ عبداللہ شاہ مزنگ، پر حاصل ہوا۔ علامہ دعوت چائے پر مدعو تھے جس کمرے میں چائے کا اہتمام کیا گیا۔ اس میں علامہ کے خیر مقدم کے لئے ایک تو میری خدمات وقف تھیں اور دوسرے ایک مولانا محمد علی سہارنپوری تھے۔ جو ان خدمات کے سلسلے میں میرے دستِ راست بنے ہوئے تھے۔ علامہ تشریف فرما ہوئے تو ہم دونوں نے بصد ادب و احترام ان کا استقبال کیا اور اس مسند پر نشست کی درخواست کی جو خاص ان کے لئے آراستہ کی گئی تھی چند لمحات نہیں گزرے تھے کہ موقر مہمان کے میزبان حضرت احسان درآمد ہوئے اور رسمی علیک سلیک کے بعد اپنے بڑے صاحبزادے کو حکم دیا کہ چائے کی چینک اور پرچیں پیالیاں لے آئے۔ ہر چیز تیار تھی۔ اس لئے آن واحد میں حکم کی تعمیل ہوئی۔ علامہ نے چینک پرچوں اور پیالیوں پر ایک تجسس آمیز نظر ڈالی اور پھر برق سرعت کے ساتھ اس کارگہ شیشہ گری کا طلسم پاش پاش کر ڈالا۔ احسان صاحب ٹھہرے خانہ بدوش قلندر۔ ان کی طبیعت پر شکست وریخت کا یہ جارحانہ عمل گراں نہیں گزرا بلکہ میں نے دیکھا کہ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ احسان صاحب کے اس حسی جمود نے علامہ کے مزاج کا پارہ کچھ اور تیز کر دیا اور بولے:

"تو اب بھی اپنے آپ کو شاعر مزدور ہی سمجھتا ہے۔ تجھے اس بات کا مطلق احساس نہیں کہ دنیائے ادب میں تیرا کیا مقام ہے۔ ایسی بھی کیا کوتاہی کہ روزمرہ کے استعمال کی چیزیں بھی تیرے گھر میں نہیں۔ یہ پرچیں پیالیاں کیا اس قابل تھیں کہ ان میں کسی مہمان کو چائے پلائی جائے۔ بھونڈی اور بھدی پیالیاں، ٹیڑھی، ترچھی پرچیں، بے ڈول چینک۔ یہ ہے تیرے ذوق کی کائنات۔ شرم کر میں تجھے اجلے کپڑوں میں دیکھنا چاہتا ہوں اور اس ٹھاٹھ کے ساتھ کہ تیرے گھر میں ہر چیز سلیقے کی اور ہر شے قرینے کی ہو۔ جا ابھی۔ نیا سیٹ لا!"

چائے کے سیٹ کا مسئلہ حل ہو گیا اور ہم سب نے چائے پی بھی لی لیکن دوران میں جو لطف "حدیث مائدہ" نے دیا۔ بیان سے باہر ہے۔ علامہ کی زبان سے جو فقرہ بھی نکلتا تھا۔ کبھی طنز و ظرافت کی چاشنی لئے ہوتا اور کبھی قند و نبات کا مزہ دیتا۔ علامہ نے اس دعوتی تقریب میں معاشرتی زندگی کے نشیب و فراز پر اس بالغ نظری کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا کہ ہم عش عش کر اٹھے۔ ہم میں سے جب کوئی لب کشائی کی جسارت کرتا تو علامہ لفظ لفظ پر ٹوکتے۔ کبھی الفاظ کے در و بست پر اور کبھی تراکیب کی تراش خراش پر بڑی بے رحمی کے ساتھ تنقید کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ علامہ نے مولانا محمد علی سہارنپوری کے ایک جملے میں تین غلطیاں نکالیں۔ مولانا کا جملہ یہ تھا۔

"علامہ! یہ ہماری ناعاقبت اندیشی ہے کہ ہم غریبی کے دن کاٹ رہے ہیں۔"

علامہ نے ارشاد فرمایا کہ مولانا "ناعاقبت اندیشی" غلط ترکیب ہے۔ نفی عاقبت کی نہیں بلکہ اندیشہ کی ہے۔ اس لئے "نا" کا استعمال "اندیشی" کے ماقبل ہونا چاہئے۔ "ہم غریبی کے دن کاٹ رہے ہیں۔" دوسری حیثیت سے یہ جملہ بھی غلط ہے۔ رات کٹتی ہے۔ دن نہیں کٹتا۔ دن بسر ہوتا ہے۔ گذرتا ہے اور تیر ہوتا ہے۔ "غریبی کے دن" میں یہ سقم ہے کہ مضاف الیہ غریبی بن گیا ہے حالانکہ نفس عبارت سے کچھ اور ظاہر ہوتا ہے۔ جملہ یوں ہونا چاہئے تھا کہ "ہم غریبی کے دن تیر کر رہے ہیں۔"

احسان صاحب تو کاندھلہ کی مخصوص بولی بولتے ہیں۔ لہٰذا علامہ کے تنقیدی نشتر ان پر نہیں چل سکے۔ رہا میں، میرا شغل ایک ...

مطابقت ہے۔ زبان کھلتی ہے تو پھر میرے سامنے وسعتیں ہوتی ہیں جن میں فکر و ادارہ کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ تلفظ، الفاظ کی نشست و برخاست اور محاورہ بندی پر میری نظر صرف تحریر ہی میں نہیں بلکہ تقریر میں بھی رہتی ہے۔ علامہ سے میری گفتگو بڑی دیر تک ہوتی رہی۔ اس میں جی ہی جی میں مگن ہو رہا تھا کہ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ علامہ ایسا نقاد بھی میرے کسی لفظ، و کسی جملہ پر گرفت نہیں کر سکا۔ نہایت اطمینان کہ باتوں باتوں میں، میری زبان سے یہ جملہ نکل گیا "علامہ! سنگیاں بہت لذیذ ہوتی ہیں" علامہ برس پڑے اور ایسے برسے کہ مدتوں نالے بہہ نکلے۔ فرمایا:

"سنگیاں یہ کیا کہا آپ نے یہ کس زبان کا لفظ ہے۔ ہماری نظر سے تو آج تک نہیں گذرا"

میں نے علامہ! یا بہر، بلفرضیہ پر تو آپ نے بھی سنگیاں کھائی ہوں گی"

"علامہ صاحب! آپ نے تلفظ غلط کیا ہے۔ یہ لفظ "سنگیاں" نہیں بلکہ "میٹریاں" ہے۔ کچھ سمجھے آپ اہل زبان ہوتے ہوئے ایسی فاش غلطی۔ آپ کو تو پنجاب آئے ابھی چند جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ نہیں دیکھئے کہ ہم نے اپنی زبان کو ہر قسم کی دستبرد سے محفوظ رکھا ہے۔ دوسروں پر اپنی زبان کے نقش بٹھائے ہیں۔ کسی کی زبان ہم پر اثر انداز نہیں ہو سکی۔ اردو میر و سودا، مصحفی و انشاء، آتش و ناسخ، غالب و ذوق، انیس و دبیر، داغ و میر، جوش و جگر، سیماب، احسان، اصغر و تاجور کی زبان ہے۔ اور پنجابی وارث شاہ اور بلھے شاہ کی زبان ہے۔ زبان کے استعمال الگ الگ ہیں"

اس صحبت کے جو نقوش میں نے اپنے حافظے کی مدد سے زیب قرطاس کئے ہیں۔ ان سے علامہ کی معاشرتی اخلاقی اور ادبی زندگی کے بہت سے پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں۔ تاریخ ادب میں ان کا جو مقام ہے اسے سمجھنے کے لئے ہمیں علامہ کی چند خصوصیات پر نظر ڈالنی ہوگی۔ اور وہ بھی ذیلی سرخیوں کے ساتھ تاکہ بعد میں کسی تذکرہ نویس کو زیادہ کاوش نہ کرنی پڑے۔

علامہ فارسی اور عربی علوم میں اتنی کامل دستگاہ رکھتے تھے کہ ان کے اساتذہ کو بھی ان کے تبحر علمی پر ناز تھا بحیثیت دیوبند، القاسم میں اس بالغ نظر فاضل دیوبند کے جو مضامین کسی دور میں اشاعت پذیر ہوئے۔ ان سے کہیں اگر وقت نظر کا ترشح ہوتا ہے۔ تو کہیں ہوتِ فکر تراوش کرتی ہے۔ علامہ کو ذرا سے ذہنی سکون میسر آتا تو نہ معلوم وہ اپنے علمی ذوق کی تسکین کا سامان کس بلند پیمانے پر بہم پہنچا سکتے۔ "میری نجی اور ادبی زندگی" کے عنوان سے علامہ نے ۱۹۴۰ء میں جو سلسلۂ مضامین سپرد قلم فرمایا تھا۔ اس میں ایک جگہ یہ الفاظ بھی نظر آتے ہیں:

"مدت مدید سے اس فکر میں ہوں کہ قسمت موجودہ افکار کا حاصل سے رہائی بخشے تو "ادب العرب" کے نام سے چند مجلدات میں اُدب عربی (نظم و نثر) پر ایک ضخیم تصنیف سرانجام دے کر اسے زندگی کی راہ بے منزل کے لئے منزل راہ زندگی بنا لوں ..... دیوبند میں میرے دل پسند مضامین شروع ہی سے عربی ادب اور فلسفہ بنے رہے۔ لاہور آیا تو شمس العلماء مفتی عبداللہ ٹونکی جیسے عربی کے بے مثل ادیب اور بین الاقوامی شہرت کے فلسفی کا فیض مجھے نصیب رہا۔ اردو ادب میں میری دلچسپی تفریح کی حد تک رہتی تھی مگر حالات ناسازگار نے اس تفریح کو میری زندگی بنا دیا"

علامہ کے اندر نثر نگاری کی بے پناہ صلاحیتیں تھیں طنز و ظرافت، بذلہ سنجی، نغز گفتاری، سحر نگاری، شعلہ بیانی ان کی دلآویز تحریر کی وہ ادائیں ہیں، جن پر ان کے معاصرین رشک کرتے تھے۔ ان کی نثر کے دو تین فقرے پیش کرتا ہوں۔ آپ ان سے علامہ کی قلمی بوقلمونیوں کا اندازہ کر سکتے ہیں:

"میں زمانے سے دولت و حشمت کا طلبگار نہ تھا کہ میرے آباؤ اجداد اپنی نا شدہ نسلوں کے حصے کی بھی دولت و حشمت صرف

ترس گئے۔ عیش و راحت کا خوگر بھی نہیں کہ گردش تیمی نے اس حسرت نادیدہ سے روشناس ہی نہیں ہونے دیا اور شہرت ؟ اس کا آغاز جس قدر مسرور کن نظر آتا ہے۔ اگر اس کے اندوہگین انجام سے باخبر ہوتا تو شہرت کو اپنے لئے شجر ممنوعہ بنا لیتا۔ اردو زبان سے متعلق میرا جنونِ خدمت، ادب نواز و ادب پرست طبقات کی نگاہ و ستحسان کا مستحق ہو یا نہ ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ رسوائی میرے لئے سوہانِ روح بن گئی ہے۔ اس شخص کی بدنصیبی سے کون انکار کرے گا جس نے زندگی کے پندرہ سال علوم عربیہ کی تحصیل و تکمیل میں اس طرح گذارے ہوں کہ عید بقر عید کے سوا شکم سیر کھانا اور سالم لباس بھی میسّر نہیں ہوا جس کی جوانی کے حسین خواب گرسنگی و برہنہ پائی کے تصورات تک محدود رہے اور جس نے اپنا عہد طالب علمی اردو سے نفرت اور فارسی سے بیزاری میں اس لئے بسر کیا کہ عربی اور علوم عربیہ کے مقابلے میں اردو و فارسی ادب بے حقیقت چیز ہے۔ . . . . . . ——اپنے شاگرد و ہونہار کاوش کو ایک خط لکھتے ہیں:۔

"عزیز گرامی قدر کاوش!

ہزاروں دعائیں۔ لاکھوں سلام! تمہارا خط ایسے وقت ملا کہ میں تم سے مایوس ہو چکا تھا۔ تمہارے لئے میرے دل میں طوفانِ محبت و دماغ میں متعصّبانہ خیالات اور زبان پر بے تحاشا گالیاں جاری تھیں۔ کاوش تمہارے مستقل طور پر گم ہو جانے سے دل میں ایک خلا سا محسوس کرتا ہوں۔ ۱۵ لاکھ کی آبادی کا یہ لاہور میرے لئے تو اجاڑ ہو رہا ہے۔ تم یاد آتے ہو۔ تمہاری والدہ یاد آتی ہے۔ تمہاری دلہن اور تمہارے حسین بچّے یاد آتے ہیں"

اپنے بعض معاصرین کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

"علم و ادب کا صحافتی طوفان پانچ سال کے مُلک بھر کے علم و ادب کی بے کراں وسعتوں میں برپا رہا۔ اکثر معاصرین نے اپنے اپنے ظرف و حوصلے کے مطابق اس سیلاب کو روکنا چاہا۔ مگر ان کی زمین گیری کہئے یا سخت جانی انہیں اس طوفان سے بچا لے گی۔ ورنہ پانی تو ان کے سر سے گذر چکا تھا۔ اس دور میں پست فطرت معاصرین کی حاسدانہ بدحواسی کے ایسے ایسے انوکھے تماشے دیکھنے میں آئے کہ اکثر نگاہ تماشا حیرت میں ڈوب ڈوب گئی۔ ہماری ادبی و صحافتی لائنوں میں بدنسلی و بے نسلی وبائے عام کی صورت اختیار کئے ہوئے ہے۔ "ادبی دنیا" کے عہدِ عروج میں مجھے اس وبائے عام کو عریاں صورت میں دیکھنے کا موقع ملا"

علامہ نے پنجاب میں اردو شاعری اور انشاء پردازی کا کچھ اس شان سے صور پھونکا کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خوابیدہ جذبات بیدار ہو گئے۔ لکھنؤ اور دہلی میں ادبا کی تحریر کا جو رنگ تھا۔ اس کے سانچے میں پنجاب کے ادیبوں کی تحریریں بھی ڈھلنے لگیں۔ رسائل و اخبارات کی زبان میں پہلے جو روکھا پن تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی جگہ بانکپن نے لے لی بیگمات اودھ کی ٹکسالی زبان کی چھاپ جب پنجاب کی اردو زبان پر پڑی تو زبان کا لطف دوبالا ہو گیا۔ ۱۹۱۵ء میں جب مخزن کی ادارتی باگ ڈور علامہ تاجور نجیب آبادی نے سنبھالی تو پانچ سال تک آپ نے اس کے ادارتی فرائض اس خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دیئے کہ ادبی حلقوں میں اس کی مانگ بڑھ گئی علامہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دنیا پیدا کر لی تھی۔ مخزن بھی میرے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہا۔ اس کے بڑھاپے کو جوانی میں تبدیل کر سکا لیکن ع "جو آ کے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا" کے مقولے کو مخزن کے حق میں، میں نے غلط ثابت کر دیا۔ مخزن کے بعد علامہ تاجور نے ہمایوں کی ادارت سنبھالی۔ پانچ سال اس سے وابستہ رہے۔ اس مختصر سی مدت میں ان کی ادبی شہرت کے آفتاب کی شعاعیں ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ چکی تھیں۔ علامہ نے اپنی صحافتی زندگی کے تیسرے دور میں خود اپنے رسالے کا اجرا کیا یہ رسالہ "ادبی دنیا" ۱۹۳۴ء تک شعر و ادب کا علمبردار رہا۔ ۱۹۳۵ء میں علامہ نے "شاہکار" کے نام سے ایک اور رسالہ نکالا۔ علامہ نے ہفتہ وار اخبار "پریم" بھی جاری کیا تھا جس کے ذریعے آپ ملک کے بچوں بچیوں کے دل میں خدا، مذہب، وطن اور بنی نوع انسان کی محبت اور بالخصوص ہر مذہب

کے پیشواؤں کی نسبت پیدا کرنی چاہتے تھے۔ لاہور میں آمد سے قبل علامہ رسالہ "نالۂ بلبل" "آفتاب اردو" (لدھیانہ) اور رسالہ "تاج الکلام" (نجیب آباد) کے مدیر رہ چکے تھے)۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ آج پاکستان کے طول و عرض میں جو اردو روزنامے، ہفت روزہ اخبارات اور ماہنامے جاری ہیں ان کے ادبی دامن کا سہرا علامہ تاجور نجیب آبادی کے سر ہے جنہوں نے شرکے بارے میں اسلاف نے جو نظریہ پیش کیا ہے کہ جو شخص بھی خیر یا شر کی رسم ایجاد کرتا ہے اس کے اعمال پر اس کے منفی یا مثبت اثرات کی پرچھائیاں ضرور پڑتی ہیں۔ اس کی رو سے بلا شائبہ و مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جذبات و مسائل میں جرأت و اپنی بندشیں، لطائف، ظرافت، پرشوکت الفاظ زبان کے محاورے اور ادب و تنقید کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اشعار جہاں کہیں بھی دیکھنے میں آتے ہیں، زبانِ حال سے علامہ کی عظمت کی گواہی دیتے ہیں اور علامہ کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں ؎

تیرے نازک ہونٹوں سے سیکھا ہے
ہم نے انداز مسکرانے کا

علامہ کی شاعرانہ خصوصیت کو میں نے اس لیے آخر میں جگہ دی ہے تاکہ ان حضرات سے جو میرے مخاطب ہیں یہ حقیقت مخفی نہ رہے کہ علامہ اپنی اس خصوصیت کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ مدت العمر میں اپنے کلام کا ایک مختصر سا مجموعہ بھی شائع نہ کر سکے۔ علامہ کا بیشتر غیر مطبوعہ کلام ایسے شعراء کی تخلیل میں ہے جو علامہ کے شاگرد نہ عقیدت کیش ہیں خدا کرے کہ ان بد باطن شعراء کی پردہ دری ہو اور علامہ کا یہ غیر مطبوعہ کلام پوری دیانت و امانت کے ساتھ منظرِ عام پر آ جائے۔ علامہ اتنے خوش اعتقاد اور اتنے خوش فہم نہ ہوتے تو کسی کو بھی دستبرد کی جرأت نہ ہوتی۔ علامہ کا مزاج کچھ اس شاعر کا ہمنوا جن کی آئینہ داری اسی شعر سے ہوتی ہے ؎

سلطنت بیچتے ہیں وہ دل کشاں خاک کے مول
ہے یہاں سایۂ ہما کا خس و خاشاک کے مول

علامہ تاجور نجیب آبادی کے نام و نسب کے بارے میں اس دور کے ادبا کو بہت کم معلومات ہیں، اس لئے میں انہی کی زبان میں چند سطور لکھے دیتا ہوں :-

" میرا نام احسان اللہ خان، ابو الاثر خان کنیت تاجور تخلص جائے ولادت مینی تال تاریخ پیدائش غالباً ۱۸۹۰ء وطن نجیب آباد ضلع بجنور قومیت افغانی پٹھان، تربیت گاہ دارالعلوم دیوبند، ذریعۂ معاش دیال سنگھ کالج کی پروفیسری۔ وطن اقامت لاہور ہے۔ گورنمنٹ نے علمی ادبی خدمات کے صلے میں ۱۹۴۰ء میں شمس العلماء کا خطاب عطا کیا۔ انجمن اربابِ علم نے ۱۹۲۱ء میں بلیغ الملک کا خطاب دیا تھا۔"

علامہ تاجور چند در چند فضائل کے باوصف طبعاً منتقم واقع ہوئے تھے اگر کسی کی طرف سے دل میں گرہ بیٹھ جاتی تو پھر مشکل سے نکلتی تھی، کانوں کے کچے بھی تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ کسی کے خلاف کسی نے علامہ کے کان بھر دیئے اور پھر اس بیچارے کی وہ شامت آئی کہ علامہ اس سے برسوں نہیں بولے۔ مزاج ناآشنا ہونے کے باعث علامہ کے اکثر شاگرد ان کی زندگی ہی میں ان سے کٹ گئے۔ علامہ کی اس کمزوری کا اثر ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر پڑا ہے۔ شروع شروع میں اس اثر نے خاندانی کشیدگی کی شکل بھی اختیار کی ہے۔ پہلی بیوی سے علامہ کی ناراضگی اور پھر نکاحِ ثانی ...... یہ بھی علامہ کی اسی کمزوری کا نتیجہ تھا۔ علامہ مستقل مزاج بھی نہیں تھے۔ عمر بھر انہوں نے کوئی کام پامردی اور مستعدی کے ساتھ نہیں کیا۔ ذہنی انتشار کا ناسور اس بری طرح ان کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں بس رہا تھا کہ دلجمعی کے ساتھ وہ کسی موضوع پر ایک مختصر سی تصنیف بھی نہیں پیش کر سکے۔ اپنی طالب علمی کے ابتدائی دور میں علامہ نے جو کچھ پڑھا تھا۔ بعد کے مطالعے سے اس میں اضافہ تو کیا ہوتا بلکہ بہت کچھ سہو و نسیان کی نذر ہو گیا تھا۔ صحافتی زندگی کے اس دور میں جب "شاہکار" کی ادارت ان کے سپرد تھی۔ انہوں نے ایک دفعہ نہایت صفائی کے

ساتھ مجھ سے کہا کہ "مولانا اب تو درسِ نظامی کی ایک بھولی بسری یاد باقی رہ گئی ہے۔ وہ مبلغ علم جس پر مجھے ناز تھا حوادثِ روزگار کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔ اب تو عالم یہ ہے کہ "المسیح" کے عربی مضمون کا اردو ترجمہ بھی میرے بس کی بات نہیں ہے۔"

علامہ صرف گفتار کے غازی تھے۔ کردار کا گوہر ان کی زندگی میں نظر نہیں آتا۔ مجھے نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ علامہ نے نہ دین کمایا نہ دنیا۔ ایک فاضل دیوبند کی حیثیت سے مذہب کو ان کا اوڑھنا بچھونا ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری طرح جن لوگوں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ علامہ اکثر و بیشتر نماز تک بھی نہیں پڑھتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ انہیں دین سے اتنا بعد ہو گیا تھا کہ وہ علماء کو بھی قدر و منزلت کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے۔ ایک دفعہ رئیس المفسرین مولانا شبیر احمد عثمانی اور سید العلماء علامہ سید انور شاہ کاشمیری نے علامہ تاجور کی بے عملی پر انہیں سرزنش بھی کی تھی۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے۔ علامہ کی بے عمل زندگی میں زیادہ دخل ان کی اس وابستگی کو تھا جو انہیں اپنے ہندو اور سکھ شاگردوں سے تھی۔ دیال سنگھ کالج کی پروفیسری ان کے حق میں رحمت نہیں بلکہ زحمت ثابت ہوئی۔ ایک تو اس لئے کہ انہوں نے ماحول کا غلط اثر قبول کر لیا۔ دوسرے اس لئے کہ ان کے تعلقات مسلمان شاگردوں سے کشیدہ ہوتے چلے گئے جو اگر چاہتے تو علامہ کو ادب کے اس اعلیٰ ترین مقام تک پہنچا سکتے تھے جس کی بلندیوں تک رسائی ان کے سان گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔

اگر جمالیاتی ذوق کوئی عیب ہے تو پھر مجھے یہ بات لکھنے میں بھی مطلق کوئی تامل نہیں کہ اس عیب کا داغ بھی علامہ کے دامن پر تھا۔ علامہ کا یہ ذوق اتنا بالغ نظر تھا کہ بھونڈے خد و خال انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ان کے ایک ہم وطن مولوی صاحب کسی ضرورت سے ان کے پاس آئے تھے۔ بیچارے کریہہ المنظر۔ میں نے دیکھا کہ جب تک وہ علامہ کے پاس بیٹھے رہے۔ علامہ کی تیوری چڑھی رہی۔ ماتھے کے بل کچھ ویسے رہے تھے کہ یہاں تو کہاں آ مرا۔ نزول بلا کے لئے تو خانۂ انوری مخصوص تھا۔ تاجور کا گھر اس قابل کہاں کہ اس پر بلائیں ٹوٹیں۔ بیچارے مولوی صاحب پر علامہ کی بے رخی کا نفسیاتی اثر پڑا۔ اور انہوں نے بددل ہو کر رخصت چاہی۔ علامہ نے سر کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ انہیں الوداع کہا۔ وہ مشکل ہی سے گھر سے نکلے ہوں گے کہ علامہ کہنے لگے "مولانا دیکھا آپ نے کتنا بد ہیئت تھا یہ مولوی قسم اس کی جس نے مجھے نیست سے ہست کیا ہے بد صورتی میرے ذوقِ نظر پر سخت گراں گزرتی ہے۔" میں نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا البتہ جی ہی جی میں یہ ضرور سوچا کہ اگر دوسروں کا ذوقِ جمال بھی اتنا ہی وسیع ہو جائے جتنا علامہ کا ہے تو علامہ کے پاس بھی کوئی نہ پھٹکے۔ علامہ خود اتنے بدشکل واقع ہوئے تھے کہ مجھے تو کبھی کبھی ان پر علامہ جاحظ کا گمان ہوتا تھا۔ علامہ جاحظ کا ذکر آ گیا تو لگے ہاتھوں انکا لطیفہ بھی سن لیجئے۔

ایک دفعہ علامہ جاحظ بغداد کی کسی گلی سے گذر رہے تھے کہ پیچھے سے انہیں کسی خاتون نے آواز دی۔ علامہ جاحظ نے مڑ کر دیکھا تو اس خاتون نے جو قریب ہی آ گئی تھی۔ بڑی لجاجت سے یہ درخواست کی کہ آپ کو زحمت تو ہو گی ذرا سامنے والی دکان تک میرے ہمراہ چلیں۔ علامہ جاحظ اپنے دور کے بڑے فلسفی تھے اور آج تک انہوں نے کبھی کسی کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ لیکن اس خاتون کی لجاجت نے ان پر ایسا جادو کر دیا کہ بغیر سوچے سمجھے اس کے ساتھ ہو لئے۔ دکان کے پاس پہنچے تو اس خاتون نے کہا کہ یہ صاحب جو میرے ہمراہ ہیں انہیں دیکھ لیجئے۔ پھر یہ جاحظ سے مخاطب ہوئی۔ علامہ! آپ نے میری خاطر بڑی زحمت گوارا کی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ علامہ جاحظ کھسیل گئے اور انہیں اپنی حماقت پر اتنا غصہ آیا کہ دانت پیسنے لگے۔ خاتون جا چکی تھی۔ وہ دکاندار جو دراصل پیشہ ور سنار تھا۔ بولا کیوں صاحب! آپ کو کیا فکر دامن گیر ہے؟ علامہ جاحظ نے کہا فکر کیا دامن گیر ہوتی۔ اس سوچ میں ہوں کہ یہ خاتون مجھے یہاں کیوں لائی تھی؟ کیوں اس نے آپ سے کہا کہ انہیں دیکھ لیجئے۔ پھر کیوں میرا شکریہ ادا کیا؟ ان سوالات کا جواب چاہتا ہوں۔ سنار علامہ سے واقف تھا اس نے ادب و احترام کے ساتھ علامہ

ے معنف نے یہاں سخت مبالغے سے کام لیا ہے۔ مولانا گورے چٹے خوبصورت آدمی تھے۔ اگر فربہی کو عیب یا بدصورتی کہا جائے تو یہ ان میں ضرور تھا۔

کی خدمت میں یہ گذارش کی کہ حضرت! یہ خاتون اپنی انگوٹھی کے نگینے پر ابلیس کی تصویر کندہ کرانا چاہتی ہے۔ میں نے اسے مذاق سمجھا اور مزاحاً اس سے یہ کہہ دیا کہ اگر ابلیس کی شکل کندہ کرانی ہے تو اسے میرے پاس لے آنا۔ میں اسے ایک نظر دیکھ لوں۔ آج کئی دن کے بعد یہ خاتون آپ کو ہمراہ لائی اور مجھ سے کہا انہیں دیکھ لیجئے۔ مجھے تو بہرحال حکم کی تعمیل کرنی ہے۔"

علامہ حافظ یہ سن کر چپ رہ گئے اور زندگی میں پہلی بار انہیں شکست خوردگی کا احساس ہوا۔ علامہ حافظ نے یہ پورا واقعہ خود قلمبند کیا ہے۔ اس سے جہاں یہ علم ہوتا ہے کہ علامہ حافظ کتنے کریہہ المنظر تھے۔ وہاں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اپنی بدصورتی سے مطلق عار نہ تھی۔ وہ اسے بھی اپنے خالق کی شانِ خلاقی کا مظہر سمجھتے تھے۔ بہت ممکن ہے علامہ تاجور کا بھی یہی عقیدہ ہو۔ بہرحال یہ ضرور ہے کہ علامہ تاجور کو اپنے بارے میں یہ غلط فہمی ضرور تھی کہ وہ اپنے چہرہ کی تراش خراش کے لحاظ سے ایک مردِ معقول ہیں۔ ان کی چلتی ہوئی آنکھیں ہر شخص سے یہ مطالبہ کرتی تھیں کہ وہ ان کے حسنِ ذوق کی داد دے۔

میں نے اپنے ممدوح کی شخصیت کے یہ نازیبا پہلو اس لئے اجاگر کئے ہیں تاکہ لوگوں پر یہ حقیقت واضح ہو کہ کسی صاحبِ کمال کی زندگی نقائص سے مبرا نہیں ہوتی۔ البتہ بعض ثنا پسند اور غرض مند تذکرہ نویس یہ پہلو تشنہ چھوڑ دیتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ بہت بڑی زیادتی ہے نقائص سے علامہ کے محاسن پر حرف نہیں آتا۔ یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ بہت کچھ تھے۔ لیکن بتقاضائے بشریت اُن سے کچھ غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں۔ علامہ تاجور آج ہمارے درمیان نہیں لیکن پھر بھی زبانِ حال سے ہمیں یہ پیغام دے رہے ہیں ؎

بُرے ہیں ہم مگر ایسے بُرے بھی کم ہونگے
کسی زمانے کے اچھے نہیں کریں گے یاد!

"بچوں کے پرچوں میں دیو، پری، جن، بھوت، شہزادہ، شہزادی کے معاشقہ اور اسی قسم کے دور از کار، وہم آفریں، مخربِ اخلاق کہانیوں کی اشاعت حد درجہ ناروا ہے، مگر ان پرچوں کے بے دماغ ایڈیٹروں کے برابر ہی وہ محروم نظر حضرات بھی اس جرم ناروا کی نشوونما کے ذمہ دار ہیں جو اچھے بُرے اور کھرے کھوٹے میں امتیاز نہیں رکھتے اور اپنے معصوم بچوں کے لئے کوئی پرچہ منگواتے وقت ذوقِ انتخاب سے کام نہیں لیتے، یا صحیح لفظوں میں لے ہی نہیں سکتے۔ اس سے قطع نظر محکمہ تعلیم کی منظور کردہ فہرست رسائل و اخبار دیکھنے کے بعد شاید یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اس خرافات کو زندہ رکھنے میں محکمے کی مسیحائی بھی بہت حد تک شریک گناہ ہے۔"

(علامہ تاجور)

اقتباس

حشر اور تاجور

میرے مکرم حضرت آغا حشر کاشمیری انڈین شیکسپیئر ایک روز میرے مکان پر تشریف رکھتے تھے، اثنائے گفتگو میں میں نے مولانا حسرت موہانی کا یہ مصرع پڑھ کر آغا صاحب سے داد طلب کی ؎

قیام بلبل مجبور رحم باغباں تک ہے

انہوں نے فرمایا، اس پر غزل کہنی چاہیئے۔ قافیے بتاتے جاؤ۔ میں نے کہا کہ کہاں تک ہے باندھیے۔ آغا صاحب نے فرمایا کہ تم بھی فکر کرو۔ دو منٹ نہیں گزرے تھے کہ میں نے ایک شعر گھڑ لیا ؎

بتائیں کیا تجھے خود رفتگان بیخودی ہمدم　　خیال یار کا دامن کہاں سے ہے کہاں تک ہے

آغا صاحب نے طبیعت پر زور دیا تو دس بارہ منٹ میں اسی زمین میں وہ وہ رنگین شعر نکالے کہ دوسرے لوگ ہفتوں بھی اس زمین کو رنگین نہ کر سکے لیکن "کہاں تک ہے" کا قرعہ فال میرے ہی نام رہا۔

ذیل کے چھ شعر جن پر پورے بارہ منٹ بھی صرف نہیں ہوئے بغرض ملاحظہ شائع کیے جاتے ہیں۔ اس زمین میں ملک کے مقتدر شعراء کے ہفتوں کی جگر کاوی کے جوہر ناظرین ملاحظہ فرما چکے ہوں گے لیکن حشر کی منٹوں کی پرواز فکر نے آسمان خیال سے جو تارے توڑ کر پیش کیے ہیں، ان کی تابانی کے آگے شب تاب جگنوؤں کی چمک دمک ماند پڑ جاتی ہے۔ (تاجور)

کشاکش زندگی کی ارتباط جسم و جاں تک ہے
یہ سب ہنگامۂ عقل ہماری داستاں تک ہے
خبر ہے خشک ہو جائیں نہ آنسو سوزش دل سے
ترا غم گل بداماں دیدہ ہائے خونچکاں تک ہے
مٹا دے دل کو دل کی لذت ایذا نہ مٹنے دے
ہجوم کاروان شوق اس جنس گراں تک ہے
لہو ہو جائے دل گھٹ گھٹ کے پر آنسو نہ ٹپکیں گے
کریں گے ضبط مجبور ستم طاقت جہاں تک ہے
نہ میٹ اس کو یہی ہے درس آموز وفاداری
تپش آمادہ دنیا اس دل آتش بجاں تک ہے
یہی آ کر لب شاعر پہ شعر گرم بنتا ہے
وہ سوز زندگی جو شعلہ زن دل سے زباں تک ہے

(مخزن جولائی ۱۹۱۷ء)

(تنقید و تجزیہ)

علامہ تاجور بچوں کے ادیب اور شاعر کی حیثیت سے

[illegible] بچوں کے ادب کی حیثیت کئی پہلوؤں سے [illegible] ہے۔ صرف اتنی ہی بات نہیں کہ کسی مضمون کو آسان الفاظ میں بیان [illegible] جاسکتا ہے [illegible] ادب میں کام کرنے والے شاعر اور ادیب کو [illegible] بہت سی باتیں نگاہ میں رکھنی پڑتی ہیں۔ مثلاً بچوں کی نفسیات [illegible] ماہر کی حیثیت [illegible] معلوم ہونی چاہیے کہ [illegible] ان موضوعات اور کیسے عنوانات کو خاص دلچسپی سے پڑھیں گے [illegible] اس بات سے بھی آگاہ ہونا چاہیے کہ [illegible] معاشرے کے مفید رکن اور قوم و وطن کے سعادت مند فرزند بناتے [illegible] اسے اس بات سے بھی آگاہ ہونے کی ضرورت ہے [illegible] علم اخلاق اور مصنف ماہر نفسیات، ماہر تعلیم، علم اخلاق اور [illegible] ضرورتوں سے پوری طرح آگاہ نہیں ہے تو وہ اپنی قوم کے بچوں کے لیے فائدہ مند ادب تخلیق نہیں کر سکے گا۔

بچوں کے ادب کی اس تعریف کو درست مان کر جب ہم اس ادب کے موجودہ ذخیرے پر نظر ڈالتے ہیں تو گنتی کے چند ایک مصنف ہی [illegible] بچوں کے ادیب اور شاعر [illegible] نظر آتے ہیں اور اس قلیل تعداد میں علامہ تاجور کا نام درخشاں ہے۔

[illegible] کی مصلحتوں یا اقتصادی حالات کی بنا پر مولانا مرحوم کو کسی ایک ادبی موضوع پر جم کر کام کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ انہیں اپنی پوری ادبی زندگی میں عموماً چومکھی لڑائی لڑنی پڑی۔

پنجاب یونیورسٹی سنڈیکیٹ کے ممبر اور دیال سنگھ کالج کے پروفیسر کی حیثیت سے وہ ملک کے تعلیمی مسائل سے وابستہ رہے۔

مخزن، ہمایوں، ادبی دنیا اور شاہکار جیسے مؤثر ادبی رسائل کے ایڈیٹر کی حیثیت سے انہیں تنقیدی، تاریخی، اصلاحی اور سیاسی مقالات لکھنے پڑے۔

ایک شاعر اور شاعر گر ہونے کی حیثیت سے انہوں نے لاہور کی ادبی لڑائیوں میں بھرپور حصہ لیا اور کافی عرصے تک اُس وقت کے بیحد ذہین با اثر اور مشتعل ادیبوں کی خاصی بڑی جماعت کا تنہا مقابلہ کرتے رہے۔ انہی ہنگاموں میں انہوں نے بچوں کے رسائل سدا بہار اور پریم بھی نکالے [illegible] مختلف موضوعات پر مضامین، کہانیاں اور نظمیں لکھیں۔

جملہ مشاغل کے پیش نظر یہ تو ظاہر ہے کہ انہوں نے اس ادب کے لیے اپنی توجہ اور صلاحیتوں کا اتنا حصہ ہی دیا ہوگا جسے بمشکل بھاؤ کہا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ اندازہ بھی دشوار نہیں کہ مولانا نے اقتصادی ضرورتوں کے تحت بچوں کے ادب کی طرف دھیان دیا۔ اس زمانے میں بچوں کے اخبارات و رسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس موضوع پر لکھنے والوں کی بھی قلت تھی اور تعلیم میں ترقی کے باعث ایسے ادب کی ضرورت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ غالباً مولانا نے اسی ضرورت کے پیش نظر ہفتہ وار "پریم" اور "سدا بہار" جاری کیے، اور بچوں کے لیے نظمیں، کہانیاں اور مضامین لکھے۔

مولانا مرحوم کے ذہنی پس منظر اور علمی و ادبی جہات کا تجزیہ کرنے کے بعد ایک عام قاری بھی اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ اُن کا خاص موضوع ہرگز نہ تھا۔ اُن کا حقیقی میدان تنقید و تحقیق اور اس کے بعد طنز و مزاح تھا۔ شعر میں اُن کی طبیعت غزل کے لیے نہایت موزوں تھی۔ لیکن

فیاض قدرت نے انہیں ایسی طبّاعی اور ذہانت سے نوازا تھا، کہ شعروادب میں جس طرف بھی رخ کرتے تھے محسوس ہوتا تھا یہی اُن کا پسندیدہ موضوع ہے۔ چنانچہ اُن کا بچوں کا ادب بھی اسی ذہانت اور مشق کا مظہر ہے اور بلا مبالغہ ایسا ہے۔ کہ اُن کے معاصرین میں سے جن لوگوں نے اسے اپنا خاص موضوع کہا ہے وہ اُن کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔

اُن کی زبان بے عیب، اسلوب بیان دلکش، موضوعات فائدہ رساں اور نفسیاتی مطالعہ و مشاہدہ کا حامل ہے۔ اندازہ ہوتا ہے اگر وہ اپنے اور مشاغل ترک کر کے صرف بچوں کے لیے کام کرتے تو اردو ادب کی پوری تاریخ میں اُن کا کوئی حریف نہ ہوتا اور اس وقت ہماری لائبریریوں میں بچوں کے ادب کا بیش بہا ذخیرہ ہوتا لیکن افسوس ایسا نہ ہو سکا انہیں مشق سخن سے زیادہ چکی کی مشقت برداشت کرنی پڑی، اور یوں اُن کے دل و دماغ سے پھوٹنے والی کرنیں تاریکیوں کی خوراک بنتی چلی گئیں۔

اس سے پہلے کہ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں مولانا کی وہ نظمیں، کہانیاں اور مضامین درج کریں جو انہوں نے بچوں کے لیے لکھے یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اپنے مزاج اور ضرورتوں کے لحاظ سے بچوں کے ادب کی دو نمائندہ حیثیتیں ہیں:

۱۔ درسی کتب کی صورت میں بچوں کا ادب

۲۔ وہ ادب جو بچوں کی عام دلچسپی اور تہذیب و تربیت کے لیے معرض وجود میں لایا جاتا ہے۔

ان دونوں میں بظاہر کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ درسی کتابوں میں بھی تقریباً ویسی ہی کہانیاں، نظمیں اور مضامین شامل کیے جاتے ہیں جیسے عام ادبی کتب و رسائل میں ہوتے ہیں لیکن حقیقتاً ان میں کافی فرق ہوتا ہے۔ نصابی کتب خاص منصوبہ بنا کر اور حدود متعین کر کے مرتب کی جاتی ہیں اور ان کی ایک بہت بڑی ضرورت یہ بھی ہوتی ہے۔ کہ بتدریج الفاظ کا ذخیرہ بڑھایا جائے جس سے بچوں کی علمی استعداد بڑھتی چلی جائے لیکن عام ادبی کتب میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہوتی، یہ فرق اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے کہ درسی کتب کے مضامین کو بچے کڑوی دوا کی طرح قبول کرتے ہیں اور ایک طرح کی سزا سمجھ کر زیر مطالعہ لاتے ہیں لیکن عام ادبی کتب کا مطالعہ اُن کے لیے تفریح طبع کا سبب بنتا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے درسی کتب کی تصنیف و تالیف نسبتاً مشکل کام ہے۔ مولانا تاجور نے اپنی مصروف ادبی زندگی میں یہ مشکل بلکہ مشکل تر کام بھی انجام دیا۔ اگرچہ انہیں اپنی اس کاوش کا خاطر خواہ فائدہ نہ پہنچ سکا لیکن انہوں نے پہلی سے دسویں جماعتوں کے طلبا کے لیے اردو ریڈروں کے کئی سلسلے لکھے۔

وفات سے کچھ ہی عرصہ پہلے مولانا نے ایسی کتب کا ایک سیٹ نہایت محنت اور توجہ سے مرتب کیا تھا اور ایک اطلاع کے مطابق یہ سلسلہ منظور بھی کر لیا گیا تھا لیکن ایک اور فریق نے جو اُس زمانے میں بے پناہ سیاسی اثر و رسوخ رکھتا تھا اس منظوری کو نامنظوری میں بدلوا کر اپنی کتابیں منظور کرا لیں اور مولانا کے یتیم بچوں کو اس فائدے سے محروم کر دیا جو ان کتابوں کی رائلٹی کی صورت میں انہیں حاصل ہوتا۔

یہاں اس واقعے کا ذکر کرنے سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ بچوں کے ادب میں مولانا کا تجربہ ہمہ گیر اور گرفت کامل تھی۔

اس وضاحت یا تمہید کے بعد مولانا کی نگارشات کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ اعتراف ضروری ہے۔ کہ راقم علامہ مرحوم کی تمام تحریروں کا مطالعہ نہ کر سکا کیونکہ ان کا بہت بڑا حصہ نگاہوں سے اوجھل ہے۔ یہ ادب پارے برصغیر ہند و پاک کے پرانے اخبارات و رسائل کی فائلوں میں تو یقیناً محفوظ ہیں لیکن مرتب صورت میں موجود نہیں۔ جو چیزیں زیر نظر آسکیں انہی میں سے اس مضمون کے دامن کی وسعت کا خیال رکھ کر منتخب کر لی گئیں لیکن اس، مشتے نمونہ از خروارے " ہی سے مولانا کے اس ادب کی افادیت، دلچسپی اور سلاست کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

بچوں کے درسی ادب کے سلسلے میں مولانا کا مطالعہ کتنا گہرا تھا اور وہ تعلیمی ضرورتوں کا کس حد تک خیال رکھتے تھے اس کا اندازہ کرنے کے لیے

اُن کا ایک خط درج کیا جاتا ہے۔

صدر بازار۔ راج ہوٹل۔ ڈلہوزی ۴۸۶

۲۹ جون ۴۲

مکرمی جناب سردار بہادر قبلہ!

نیاز تسلیم۔ مولینا غلام ناصر خاں صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ ابھی تک آپ کی آنکھوں میں تکلیف ہے خدا تعالےٰ جلد شفا بخشے آمین۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ یکم ستمبر کو وہ آپ کے پاس امرتسر پہنچیں گے اور مسودات آپ کو سنائیں گے۔ میں اسی غرض سے وہ اسباق جو میرے پاس تیار ہیں آپ کے ملاحظے کے لئے بھیج رہا ہوں۔ اس مجموعے میں چالیس کے قریب اسباق ہیں اُن کو ملاحظہ فرماتے وقت حسب ذیل امور کو پیش نظر رکھیئے:

(ا) ان میں ذیل کے سات اسباق بالخصوص پنجابی بچوں کے خطرناک کھیلوں پر لکھے ہیں۔ اسباق حسب ذیل ہیں۔

(۱) بچوں کی سرپٹھول۔ یہاں میں مسلمانوں میں عموماً یہ دیکھتا ہوں کہ دو بچوں میں لڑائی ہوتی ہو تو اُنہیں ایک دوسرے سے چھڑانے کی بجائے دو پارٹیاں بنا کر لڑنے والے بچوں کو شہ دیا کرتے ہیں (۲) کھانے پینے کی تمیز سیکھو۔ اس بدتمیزی میں اکثر نوجوان بھی مبتلا ہیں کہ کھاتے پیتے اُن کے منہ سے چپڑ چپڑ کی آواز نکلتی ہے اور یہ انتہائی بدتمیزی ہے (۳) بے تمیزوں سے خدا بچائے " یہ سبق اپنے مسلسل مشاہدات کی بنیاد پر لکھا ہے۔ عورتیں چھوٹے بچوں کو میونسپلٹی کی نالیوں پر بٹھا دیتی ہیں۔

(۴) "حالی نالیں" یہ کھیل بچوں میں عام ہے اور وہ گھر کے ایسے حصوں میں چھپنے کی کوشش کرتے ہیں جن میں سانپ بچھو کا خطرہ ہوتا ہے (۵) آنکھ پھوڑ کھیل۔ گلی ڈنڈے کا کھیل پنجاب اور سارے ہندوستان میں عام ہے اور سینکڑوں واقعات میں گلی کے چھٹنے سے بچوں کی آنکھیں ضائع ہو چکی ہیں (۶) کھیل کھیل میں آنکھ پھوٹ گئی" یہ سبق بھی اسی قسم کا ہے (۷) اُڑنے والی موت پتنگ بازی پر لکھا ہے میں پتنگ اڑانے کے خلاف نہیں لیکن پنجاب کے بچے کوٹھوں کی پتلی پتلی منڈیروں پر چڑھ کر پتنگ اڑانے کے عادی ہیں۔ آپ بھی اخبارات میں پتنگ اڑاتے ہوئے بچوں کی موت کے حادثات پڑھتے رہتے ہوں گے، یہ اسباق پنجابی بچوں کے لئے بالخصوص ضروری اور مفید ثابت ہوں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

باقی میں نے "زبانی امتحان" کے کئی نمبر پہلے مجموعے میں بھی بھیجے ہیں اور چھ نمبر اس مجموعے میں بھی بھیج رہا ہوں۔ اس عنوان کے قائم کرنے کے دو مقصد ہیں (۱) اس طرح ہم ضروری مختلف مسایل پر جو الگ الگ اسباق لکھتے تو کہانیوں کی تمہید پر اسباق لمبے ہو جاتے اور کورس کا حجم بڑھ جاتا یا ضروری مسایل رہ جاتے (۲) سلیبس میں جو لکھا ہے کہ بچوں میں مختلف مسائل پر اظہار خیال اور تقریر کی لیاقت بڑھ جائے۔ نیز یہ بھی کہ بچوں ہی کی زبان سے مسائل پر اظہار خیال ہو تو کورس پڑھنے والے بچوں میں کورس پڑھنے اور تقریر کرنے کا شوق پیدا ہوگا۔ زبانی امتحان کے تمام نمبروں کو دونوں مجموعوں سے نکال کر ایک جگہ کر لیں اور پھر ان پر نمبر ڈال کر مختلف کتابوں میں تقسیم فرما دیں۔

"بستی کیسے بنتی ہے" اس پر تین نمبر لکھے ہیں اور تینوں ضروری ہیں۔ زبانی امتحان کے اس مجموعے کے چھٹے نمبروں میں "دستور حکومت" کی تفصیل بتائی جاتی ہے یہ سلیبس کی رُو سے ضروری تھی۔ غالباً اس سلسلے میں "زبانی امتحان" کے دو نمبر اور لکھنے پڑیں گے۔ بعض اسباق ایک ہی مضمون پر دو دو تین تین اسباق بھی آپ کی نگاہ سے گزریں گے، یہ اس غرض سے لکھے ہیں کہ کوئی اجمالی سبق ابتدائی کتابوں میں دے دیا جائے اور ذرا تفصیلی سبق اسی مضمون پر تیسری، چوتھی یا پانچویں میں دے دیا جائے

پرواشتہ راہداری، ہیڈ ماسٹر کو خط۔ چند خطوط ان کو بھی تقسیم کرنا پڑے گا۔ اردو ادب کی عام زبانی غلطیوں پر دس سبق لکھنے ریویو کے نقطۂ نگاہ سے ضروری ہیں انہیں "زبان کی درستی" کا عنوان دے کر دوسری تیسری چوتھی میں ابھی سے رکھ دیں میں آگر لکھوں گا مطلب یہ ہے کہ ان کی گنجائش رکھیے۔ کھیتی باڑی اور آلات زراعت، زراعتی بیماریاں، زمین کی قسمیں دیہاتیوں کی مقدمہ بازیاں۔ پنجاب زراعتی بنک، امدادی باہمی، سائنٹفک مضامین، مشاہیر عالم، اخبارات کے فائدے، ڈاکخانے اور ریل کے قواعد، پرو نوٹ، منی آرڈر، تندرستی تجربات، موجودہ جنگ کے ہتھیار، فسٹ ایڈ، سکاؤٹنگ، وبائی بیماریوں کی روک تھام، سمندر، زمین، چاند سورج آسمان، جنگل، جمادات، نباتات، حیوانات، حیوانات کی قسمیں، چالیس نظمیں۔ ۲۰ لطیفے۔ ۲۵ پہاڑیں، آٹھ قدیم کہانیاں۔
آٹھ پریوں کی کہانیاں، پہاڑ اور ہمالیہ، ماؤنٹ ایورسٹ، قطب جنوبی و شمالی، دنیا کے بحر اعظم، عرب، چین، سکیمو، یورپ وغیرہ کے بچے، دنیا کی چند اقوام، سامی و آریائی نسلیں، ایفل، مقراہ مینار، بارش ناپنے کا آلہ، زلزلے کا خبر رساں آلہ، پانچ بڑی ہندوستانی ریاستیں، ڈسٹرکٹ بورڈ، صوبائی اسمبلی، مرکزی اسمبلی، ہندوستان آزاد ہو رہا ہے، آبیانہ، پنجاب کی آبپاشی، پنجاب کی آبادی اور اقوام، پنجاب کی نو آبادیاں، پنجاب کی منڈیاں، پنجاب کے آثار قدیمہ، پنجاب یونیورسٹی۔ دربار صاحب، داتا صاحب کا مزار، اردو ادارے، اردو زبان کی تاریخ، ہڑپہ، موہنجوداڑو، میانوالی کے تیل کے چشمے، دہلی و شملہ، پنجاب کے دریا، لاہور، امرتسر، جہانگیر کا مقبرہ، راجہ دیال سنگھ کی فیاضی، سر گنگا رام، پیغمبر اسلام علیہ السلام، راجہ رام موہن رائے، باوا گرو نانک، دیوپٹ لوپٹ مختصر یہ کہ سو کے لگ بھگ اسباق اور لکھے ہیں۔ فٹ بال، کرکٹ، ہاکی، والی بال، کبڈی ان کھیلوں پر بھی اسباق ہوں گے مطلب یہ ہے کہ کتابوں کو مرتب کرتے وقت ان اسباق نوشتہ و غیر نوشتہ کی گنجائش نکالنی ہو گی۔ سر جگدیش چندر بوس، مہاکوی ٹیگور، اقبال۔ مسٹر گوکھلے، جمہوریت، آمریت، فاشیت، اشتراکیت یہ اسباق بھی ضروری ہیں۔
پہلے مجموعہ اسباق پر جو پچھلے دنوں ارسال خدمت کیا تھا اور اس مجموعے میں اکثر اسباق پر میں نے دوسری تیسری، چوتھی کے لئے کا اشارہ کر دیا ہے بعض پر نہیں بھی کیا آپ ہر سبق کو سن کر خود کسی کتاب کے لئے تجویز فرمائیں۔
مجوزہ نئے عنوانات میں سے کوئی عنوان بھی ایسا نہیں جسے چھوڑا جائے۔ اس سے آپ کو میری گزارش کی تصدیق ہو گی کہ ابھی کام بہت باقی ہے۔ اور یہ بہت جلد ہو جانا چاہیئے۔
دستور حکومت، سائنس اور دیگر معلوماتی اسباق میں نے اپنی معلومات کی بنا پر لکھے ہیں بہت ممکن ہے کہ میری معلومات ناقص اور نامکمل ہوں اس لیے ایسے مضامین کو کتابی مضامین سے ملانا پڑے گا۔
اس کے بعد مڈل کورس کے لئے کم از کم ساٹھ مضامین نئے لکھے جائیں گے اور چالیس نظموں کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ مستند قدیم و جدید مصنفین کی کتابوں کا انتخاب ہو گا ان پر نوٹس دیے جائیں گے۔
منشی اعجاز احمد خاں نے جو مسودات نقل کئے ہیں ان پر بھی تفصیلی نگاہ ڈال کر ان میں سے پرائمری اور مڈل کورس کے لئے اسباق لئے جائیں گے۔
جس قدر اسباق ان ڈلہوزی والے دو مجموعوں کے علاوہ پہلے لکھے جا چکے ہیں اس وقت ان کی موجودگی میں ان اسباق پر بھی نظر ثانی کر لیجئے تاکہ سب اسباق پر ایک تازہ نظر صحیح توازن اور انتخاب میں امداد دے سکے۔ ضرورت ہے کہ ہم مڈل کورس ہندو پیریڈ، مغل پیریڈ اور سکھ پیریڈ کے دستور حکومت، طریقۂ لگان، مال و فوجداری کے معاملات پر بھی کچھ لکھیں، اس طرح طلبہ کو موجودہ دور حکومت سے گزشتہ عہدہائے حکومت کے طریقہائے حکومت کا مقابلہ کرنے کی ترغیب پیدا ہو سکے گی۔

مولینا بنارسی نے ۲۵ نظمیں پرائمری کے لئے لکھ لی ہیں۔ کچھ نظمیں میری اور دوسروں کی پہلے سے موجود ہیں۔ مولینا بنارسی کی ۱۷ نظمیں نظرثانی کے بعد مجھے موصول ہو چکی ہیں۔

پہلی اور دوسری کے اگلے پچھلے اسباق تمام مجموعوں اور مسودات سے الگ الگ کر کے پھر انہیں بغور مطالعہ فرما کر مجوزہ مضامین کی گنجائش نکالتے ہوئے پھر از سر نو ان کتابوں کو مرتب فرمائیں۔ میں نے اس آخری مجموعے میں پہلی کتاب کے لئے ابتدا میں رکھنے کی خاطر چند بہت چھوٹے چھوٹے اسباق لکھے ہیں۔

سنا ہے کہ ۵-۶ ستمبر تک سڑک درست ہو جائے گی لیکن اس بشارت کے ساتھ یہ دردناک خوشخبری اخبارات نے سنا دی ہے کہ حکومت لاریوں کو پٹرول کی سپلائی بند کر رہی ہے۔ یہاں کے لاری والے خود بھی اس اعلان سے گھبرا رہے ہیں اور دوسروں کو بھی پریشان کر رہے ہیں۔ اگر خدانخواستہ پٹرول کی سپلائی بند کر دی گئی تو ڈلہوزی کے پانچ ہزار وزیٹرز ڈلہوزی ہی میں رہ جائیں گے۔ میرے اہل و عیال ڈلہوزی کو قید خانہ تصور کر رہے ہیں۔ سخت مضطرب ہیں مگر چارہ کار بھی تو سمجھ میں نہیں آتا۔ کشمیر لاہور یہاں بند پڑے ہیں اور لاہور پہنچنے کے لئے گھبرا رہے ہیں۔ سڑک کی آمد و رفت بند ہونے سے سامان غذائی پٹھان کوٹ میں رکا پڑا ہے۔ یہاں گرانی حد درجے ترقی کر گئی ہے۔ کوئلہ سات روپے من ہے، لکڑی ملتی نہیں، مٹی کا تیل ناپید ہے۔ ایک انڈا چھ آنے میں مل رہا ہے۔ کشمیر کو دو انڈے بارہ آنے میں ملتے ہیں تو وہ بہت چیں بچیں ہوتا ہے۔ میرے پاؤں پر آفت آئی ہوئی ہے مختصر یہ کہ ایک قید بے میعاد میں پڑے تڑپ رہے ہیں بلا ناغہ موسلا دھار بارش ہو جاتی ہے جس کے سبب بنی بنائی سڑک پھر بہہ جاتی ہے۔ ڈلہوزی سے سات میل راوی بہہ رہا ہے۔ ڈلہوزی کی بارش ہی نے لاہور میں راوی کو طوفانی بنا رکھا ہے۔

بہ کرم میرے حاضر ہونے سے پہلے تمام اگلے پچھلے اسباق پر تعمق کی نگاہ ڈال لی جائے اور انہیں تقسیم بھی کر لیا جائے۔ اگر مجھے حاضر ہونے کی قدرت نے اجازت دی تو اس وقت آپ کے مزید مشوروں سے مستفید ہو سکوں گا۔

عدہ نیاز - بچوں کو دعا

خادم تاجور

اس خط کے مطالعے سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ انہوں نے جو درسی کتب مرتب کیں اور اس ضرورت کے لئے جو مضامین نظم و نثر لکھے وہ کس پائے کے ہوں گے۔

مولانا کی عام ادبی تحریروں میں نظموں اور اصلاحی مضامین کو خاص درجہ حاصل ہے۔ موجودہ ماحول میں یہ تحریریں شاید اجنبی محسوس ہوں لیکن جب لکھی گئیں ملکی اور قومی ضرورت کے عین مطابق تھیں۔ حصول آزادی سے پہلے برصغیر کی سب سے بڑی سیاسی اور ادبی ضرورت یہ تھی کہ اس کی حدود میں زندگی گزارنے والی قوموں کو ایک محاذ پر جمع ہو کر پوری قوت سے جنگ آزادی لڑنے پر آمادہ ائے کیونکہ ان قوموں کا انتشار ہی اس ملک کی غلامی کا باعث بنا تھا اور یہی ان زنجیروں کو اور مضبوط کر رہا تھا۔ مولانا غیر سیاسی آدمی ہونے کے با اس حقیقت سے بخوبی آشنا تھے اور حب الوطنی اور حب اسلام کے جذبات قومی اتحاد کے علمبردار تھے۔ مندرجہ ذیل حمد انہی جذبات کی مظہر ہے۔

ایشور پرارتھنا

ہے ایشور تو داتا سب کا — سب کا تجھ سے ناتا سب کا
کل سنسار میں ست ہے تجھ سے — ہر پرکاش جگت ہے تجھ سے

سبزے میں ہریالی تو ہے　　　باغ کی ڈالی ڈالی تو ہے
تو دنیا کا ، دنیا تیری　　　جگت سبھا میں شوبھا تیری
چھاؤں میں تو ہے دھوپ میں تو ہے　　　ہاں پر گھٹ ہر روپ میں تو ہے
ٹوٹے دل کو آس ہے تیری　　　کلی کلی میں باس ہے تیری
موروں کی جھنکار میں تو ہے　　　پھولوں کی مہکار میں تو ہے
بستی تیری ، جنگل تجھ سے　　　جنگل میں ہے ، منگل تجھ سے
گیان میں تو ، وگیان میں تو ہے　　　ہر گیانی کے دھیان میں تو ہے
رشی منی سب تیرے سیوک　　　راجا ، پرجا کا تو رکھشک
سری کرشن اوتار ہے تیرا　　　رام کے من میں پیار ہے تیرا
نانک کے اپدیش میں تو ہے　　　نارائن ! ہر دیش میں تو ہے
اپنے بھگ کا تجھ سے ناتا　　　مجھ سے بھکاری کا تو داتا

ہفتہ وار پریم مئی ۱۹۴۲ء

اس کے بعد مولانا کی ایک اور بلند پایہ نظم ملاحظہ فرمائیے :-

صبح

لو مشرق میں ہوا اُجالا　　　رات نے سب اسباب سنبھالا
ہو گئے سب تارے رخصت　　　رفتہ رفتہ سارے رخصت
صبح سویرے ٹھنڈی ہوا نے　　　لوٹ لئے خوشبو کے خزانے
پھرتی ہیں اب گھر گھر کرنیں　　　پہنے ہوتے تاج زر کرنیں
شبنم موتی لے کر آئی　　　آئی کرنوں کے گھر آئی
گلشن اور بیاباں چمکے　　　ذرے چمکے میداں چمکے
نور کی اک چادر سی بچھی ہے　　　روشنی ہر سو پھیل رہی ہے
محو پرندے ذکر و ثنا میں　　　کھیل رہے ہیں گیت ہوا میں
گاتے ہیں یہ مل کر سارے　　　گیت ہیں ان کے پیارے پیارے
جاگے سونے والے جاگے　　　نیندوں کے متوالے جاگے
دھوبی دریا پر جا پہنچے　　　کپڑوں کو لے کر جا پہنچے
اٹھے کاروباری اٹھے　　　اٹھے سب بیوپاری اٹھے
ننھا بچہ سو کر اٹھا　　　اٹھا ، ہاں خوش ہو کر اٹھا
جاگ رہی ہے ساری دنیا　　　دنیا دنیا پیاری دنیا

ہفتہ وار پریم جون ۱۹۴۲ء

ہفت روزہ پیام میں مولانا نے بچوں کے نام خطوط کا ایک نہایت مفید اور دلچسپ سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس سلسلے کا ایک خط ملاحظہ ہو:

ابن پیام کا خط — اپنے چھوٹے بیٹے شاہد جاوید درانی کے نام

ننھّے مُنّے شاہد!

آج تم سوتے سوتے چارپائی سے نیچے گر پڑے میں نے دیکھا کہ نیند کی غفلت کے باوجود گرتے ہوتے تم نے پلنگ کی چادر کو ایک ہاتھ میں پکڑے رکھا۔ اپنے سنبھلنے کے لیے یہ تمہاری پہلی معصومانہ کوشش تھی۔ تم اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے گر پڑے چوٹ کھائی اور تم نے رونا شروع کر دیا۔ تمہاری ماں نے بجلی کی تیزی کے ساتھ تمہیں زمین سے اُٹھالیا، چمکارا پیار کیا اور جھنجھنا بجا کر درد کے احساس کو مٹانے کی تدبیر کی۔ تمہارا دھیان بٹا اور تم اپنے فطری تقاضے سے ہنسنے لگے۔ یہ سارا ڈرامہ دو تین منٹ میں ختم ہو گیا۔ اب تمہیں اپنی حسین و معصوم فضا میں اپنا گرنا۔ چوٹ کھانا اور رو دینا یاد بھی نہیں۔ کسی غیر مفہوم مسرت کے احساس سے ہنس رہے ہو۔ ہنستے چلے جاتے ہو۔

بیٹے زندگی کی کہانی بھی اس ڈرامے سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔ اس ڈرامے کو ذرا اور پھیلاؤ تو ساری انسانی زندگی اس کے ایکٹوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

انسان اپنی زندگی کی دوڑ میں اکثر خطرات محسوس کرتا ہے۔ اس سے بچنے کی سعی کرتا ہے۔ کبھی کبھی اس کی سعی کسی خطرے سے مغلوب بھی ہو جاتی ہے تو فطری احساس اُسے رُلا بھی دیتا ہے پھر وقت کہ انسان کے لئے ایک مادرِ مشفقہ ہے، احساسِ الم کو اس کے دل سے مٹا کر اسے زندگی کی دوسری دلچسپیوں میں مشغول کر دیا کرتا ہے۔ وہ ان دلچسپیوں میں محو ہو کر بھول جاتا ہے کہ اسے کبھی خطرے کا سامنا ہوا تھا اور زندگی اس کی منزلِ مقصود کو اس سے قریب تر کر دیتی ہے۔

پیارے شاہد! زندگی اور خصوصاً کامیاب زندگی کا راستہ خطرات سے پٹا پڑا ہے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ بساط بھر ان خطروں سے بچاؤ کی کوشش کرو۔ ان خطرات سے گھبرانے کی بجائے ان سے بچنے کی سعی ضروری ہے۔ مگر ان سے ڈر کر آگے بڑھنے سے ہچکچانا انتہا درجے کی بزدلی ہے اور بزدل کی زندگی کوئی زندگی نہیں۔ تمہارے ڈرنے سے راہِ زندگی کے خطرات ٹل نہیں سکتے۔ ان سے ڈر گئے تو تمہارے نصب العین کے سامنے دیوار حائل بن جائیں گے۔ زندگی کے راستے کو طے کرنے ہی میں زندگی کا لطف ہے۔ بہادر انسان ان خطروں کو روندتے ہوئے منزلِ مقصود پر جا پہنچتے ہیں اور خطرات منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ جو لوگ ان خطرات سے گھبرا کر رہ گئے۔ ان کے لئے پھر زندگی بجائے زندگی بن جاتی ہے۔ یہ ناکام زندگی بزدل ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ قدرت کی امانتوں میں خیانت کرنے والے بھی۔ کیونکہ قدرت نے ہر انسان کو زندگی کے نصب العین کے لئے ایک راستہ اور اس راستے کو طے کرنے کے لیے راہِ ہمت۔ اولوالعزمی، جفاکشی، بے خوفی جیسی انمول طاقتیں عنایت کی ہیں اور ان طاقتوں کی آزمائش کے لئے راہِ زندگی میں خطرات کا جال بھی بچھا دیا ہے۔

جو اپنی طاقتوں سے کام نہیں لیتا وہ گویا قدرت کی امانت میں خیانت کرنے کا مجرم گردانا جاتا ہے۔

بہادر افغان زادے! تو ایک بہادر قوم کا فرد اور ایک بہادر خاندان کا ممبر ہے۔ پانی پت کا میدان تیری خاندانی شجاعت کا گواہ ہے۔ تیری قوم اور تیرے آباؤ اجداد نے کبھی اس برِعظیم ہندوستان کا جغرافیہ بدل دیا تھا۔

تجھے بھی وہ تمام صفات جو تیرے اعلیٰ خاندان کی روایات کو زندہ رکھ سکتی ہیں قدرت نے آبائی ورثے میں بخشی ہیں۔ تو ان

نعمتوں کا امانت دار ہے ۔

اِس دردناک حالت کو نہ بھول، کہ تیرا ملک غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ آزاد قوموں کی محفل میں اس کے لئے کہیں سر اونچا کر کے بیٹھنے کی جگہ نہیں ۔

تو اسلام کا پیرو ہے ۔ اور اسلام غلامی کو بہت بڑا کفر قرار دیتا ہے تو افغان قوم سے تعلق رکھتا ہے اور افغان غلام ہو کر جینا کبھی پسند نہیں کیا کرتا ۔

مختصر یہ کہ تیرے قومی خصائل اور تیرے مذہبی احکام غلامی کی ذلیل اور کافرانہ زندگی پر عزت کی موت کو ضروری قرار دیتے ہیں ۔

میرے پیارے بیٹے! اس واقعیت کو ہمیشہ یاد رکھنا کہ تیرا وطن ہندوستان ہے۔ تو ہندوستانی ہے اور وطن کے حقوق تیرے ذمے تیرے مذہب اور قوم کا ایک قرض ہے جسے ادا کرنا تیرا پہلا فرض ہے۔ اِس فرض کی ادائیگی کے راستے میں مشکلات خطرات اور حادثات بھی پیش آئیں گے۔

بہادر ہندوستانی بچے! بحیثیت قومی کا تقاضہ یہ ہے کہ زندگی وطن کی آزادی کے لئے وقف کر دے۔

وطن کی آزادی تیری زندگی کا نصب العین ہونا چاہیئے۔ مشکلات کو روندتا ہوا خطرات سے بے پروا حادثات کی طرف سے آنکھیں بند کر کے آگے بڑھتا چلا جانا۔ اِس سفر میں اہل وطن کی دعائیں۔ عالم انسانیت کی ہمدردیاں۔ تیری خداداد طاقتیں یہاں تک کہ خدا بھی تیرے ساتھ ہوگا۔

شاہد! رسول کریم علیہ التسلیم کے اس ارشاد کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا۔ زندگی کی طرح ضروری بنا لینا،

"حب الوطن من الایمان"

یعنی اپنے وطن سے محبت کرنا ایمان میں داخل ہے ۔ پیارے وطن! خدا تجھے آزادی کی نعمت بخشے !

تاجور

(منقول از پریم)

بچوں کے حسب حال اور حسب ضرورت موضوع چننے اور عنوان لکھنے میں مولانا کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ چند عنوان دیکھیے:۔

زبان کی کھیتی۔ جینے کا گر۔ بچپن کی خیرات۔ ریل کی ریل پیل۔ بڑا آدمی کون۔ تم بڑے آدمی بنو گے۔ میں کسان کا بیٹا ہوں۔ میرا گاؤں میری بہشت۔ کھیل کود۔ میرا ووٹ انمول ہے، وغیرہ ۔

مولانا کے اسلوب اور نقطۂ نظر کا اندازہ کرنے کے لئے یہ مضمون ملاحظہ ہو:۔

آدابِ گفتگو

تم جب تک چپ اختیار کئے ہوئے ہو، اُس وقت تک کوئی نہیں جان سکتا کہ تم کیسے آدمی ہو، کس رتبے کے ہو کون ہو کیا ہو، تم نے زبان کھولی، کچھ بات چیت کی اور پرکھنے والے پرکھ گئے کہ تمہاری قیمت کیا ہے ؟ تم کتنے پانی میں ہو ؟ اچھے ہو یا بُرے ؟ کام کے ہو یا نکمے ؟ سمجھ بوجھ والے ہو یا عقل کے کورے ۔ تمیزدار ہو یا بے تمیز ؟ پڑھے لکھے ہو کہ اَن پڑھ ؟ مختصر یہ کہ آدمی کی گفتگو سے اُس کی قدر و قیمت کا پتہ چلا کرتا ہے۔ اُس کے مرتبے یا درجے کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ کسی کی گفتگو اچھی ہے یعنی وہ بات چیت کے طریقوں سے واقف ہے تو لوگ اُس کی عزت کریں گے۔ ضرورت پڑنے پر اُس کی امداد کریں گے۔ ہر ایک اُس سے ملنا چاہے گا۔ اُس کا دوست بنے گا اور اُسے اپنا دوست بنائے گا۔ اور اگر کوئی گنوار لٹھ ہے۔ بات کرنے کی سمجھ نہیں رکھتا۔ گفتگو کے آداب سے واقف نہیں۔ لوگوں کے درجے کے مطابق اُن سے بات کرنا نہیں جانتا سب کو ایک لاٹھی سے ہانکتا ہے تو اُس سے

کوئی بات کرنا پسند نہیں کرے گا۔ کوئی اُسے منہ نہ لگائے گا۔ ہر ایک اُس سے کترائے گا۔ نہ کوئی اُس کا دوست بنے گا نہ اُسے اپنا دوست بنائے گا۔ وہ اس بستی بستی دنیا میں اپنے آپ کو اکیلا پائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر آدمی کو بات چیت کے طریقے اور گفتگو کے آداب سیکھنے چاہئیں۔ تبھی اُسے زندگی کی کامیابی حاصل ہوگی۔ وہ زندگی کو راحتوں اور خوشیوں سے مالا مال بنائے گا اور زندگی کی ناکامیوں اور مصیبتوں سے بچ سکے گا۔

پیارے بچو تم بھی بولنا سیکھو۔ تم کہو گے ہم تو بولنا جانتے ہیں۔ بولتے ہیں جب سے جنم لیا ہے بول رہے ہیں، بولتے چلے جاتے ہیں، جب تک جئیں گے بولتے رہیں گے۔ نہیں نہیں پیارو! غلط کہتے ہو۔ دھوکا کھا رہے ہو تم بولتے ضرور ہو مگر بولنا نہیں جانتے۔ ایسے بولنے کو تو تمہیں کیا جنگلی جانور بھی اپنی اپنی بولی بولتے ہیں لیکن یہ تو ان انسانوں کے بولنے کے کچھ اور طریقے ہیں۔ انہیں جانے بغیر بولنا بیکار ہے۔ بے کار ہی نہیں، جان کا آزار ہے۔ دیکھو اگر کوئی بدتمیز کسی راہ چلتے کو گالی دے رہا ہو تو بول کہنے کو تو وہ بھی بول رہا ہے۔ لیکن اُس کی بولی اُسے کبھی نہ کبھی ذلیل کرائے گی۔ میاں! بولنا وہ ہے کہ تم بولو اور سننے والے تمہاری عزت کریں، تمہیں اچھی نظروں سے دیکھیں، دوست بنیں۔ اب آیا تمہاری سمجھ میں بولنے بولنے میں بڑا فرق ہے۔ ایک بولنا تو آدمی کو ذلیل کرا دیتا ہے اور ایک بولنا ایسا ہے جس سے بولنے والے کی عزت بڑھتی ہے۔

تمہیں چاہیے کہ بولنے کے طریقے اور گفتگو کے آداب سیکھو تاکہ جب کسی سے بات کرو وہ تمہاری عزت کرے، تمہارا دوست بنے تمہیں شریف انسان خیال کرے۔

بولنے اور گفتگو کرنے کے قاعدے ہم نے سیکھو اپنی گفتگو میں ان طریقوں کو برتو گے تو اپنی زندگی کو کامیاب بناؤ گے۔ تو پھر ذرا توجہ سے سنو!

(۱) پہلی سو باتوں کی ایک بات تو یہ ہے کہ بہت کم بولا کرو۔ زیادہ اور بے ضرورت بولنے والے باتونی کہلاتے ہیں۔ اور باتونی کی کوئی عزت نہیں کیا کرتا۔ جو زیادہ باتیں کرنے کی عادت ڈال لیتا ہے وہ اکثر اپنی کسی نہ کسی بات کے کارن نقصان اٹھاتا ہے ایسے بولنے سے نہ بولنا اچھا ہے

(۲) جب کسی سے بات کرو! اُس کے درجے اور رتبے کا لحاظ کر کے بات کرو یعنی اگر وہ تم سے چھوٹا ہے تو اس کے لیے تم کا لفظ بولو، بڑا ہے تو آپ۔ تمہارا ہمجولی اور بے تکلف دوست ہے تو مناسب تو یہی ہے کہ آپ ہی کا لفظ اور آپ نہ کہنا چاہو تو اُس کے لیے تم کا لفظ بولو۔

دیکھو اگر تم اپنے چھوٹوں سے آپ آپ کرو گے تو وہ مذاق سمجھیں گے، بڑوں سے تم کا لفظ بولو گے تو وہ خیال کریں گے کہ تم بے تمیز بھی ہو اور گستاخ بھی۔ رہا تُو کا لفظ بھی اسے تو تم اپنی زبان تک آنے ہی مت دو۔ اسے برتنے میں اکثر غلطی ہو جاتی ہے اور غلطی سے بچنا ضروری ہے۔

(۳) میٹھی زبان بولنے کی عادت ڈالو! میٹھی زبان بولنے والے سدا سکھ سے رہتے ہیں۔ کبھی دکھ نہیں جھیلتے۔ تم نے ایک محاورہ سنا ہوگا "زبان شیریں ملک گیری" اس کا مطلب یہ ہے کہ میٹھی زبان بول کر تم ملک پر فتح پا سکتے ہو۔ بھئی یہ ہے بھی سچ کیوں کہ تم جب ہر ایک سے میٹھی زبان سے بولو گے وہ تم سے خوش ہوگا اور جگہ جگہ تمہارے اچھے اخلاق کی تعریف کرتا پھرے گا اور اس طرح تمہارے دوستوں کی تعداد بڑھے گی، دشمنوں کی گھٹے گی، دشمن بھی دوست بن جائے گا۔ اور تمہاری نیک نامی بڑھتے بڑھتے سارے ملک پر چھا جائے گی۔ ملک کے فتح کرنے کا یہی مطلب ہے کہ ملک میں رہنے والوں کے دل جیت لئے جائیں اور میٹھی زبان

بول کر تم ہر ایک کا دل جیت سکتے ہو۔

دیکھو بچو! جو بات کر رہا ہے اُسے اونچی پڑھے لکھوں کی زبان میں مُتکلّم م ت ک ل ِ ام یعنی کلام کرنے والا۔ اور جو بات سن رہا ہے وہ مُخاطَب م خ ا طَ ب کہلاتا ہے تم جس سے بول رہے ہو وہ تمہارا مُخاطَب ہے اور تم مُتکلّم۔

اب توجہ سے سنو! خیال رکھو کہ جس کسی سے تم بات کرو تمہاری گفتگو میں کوئی ایسا لفظ نہ آنا چاہیئے جسے سن کر تم سے رُوٹھ جائے یا تمہاری بات سے اُس کا دل دکھے یا اُسے وہ اپنی بے عزتی سمجھے یا تمہیں بے تمیز خیال کرے۔ ایسا ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالو جس سے تمہارا کوئی چھپا ڈھکا بھید کھل جائے اور پھر تم پشیمانی اٹھاؤ۔ اس لئے ضروری ہے کہ تم جو بات کہو سوچ سمجھ کے کہو، اپنے لفظوں کو پہلے تول لو پھر بولو!

(۴) اپنے مخاطب (بات سننے والا) کو جو سمجھانا چاہو صاف سیدھے لفظوں اور واضح طریقے سے سمجھاؤ۔ اپنے مطلب کو پیچ دار الفاظ اور پیچیدہ انداز میں ادا نہ کرو! بس تمہاری بات کا ایسا انداز ہو کہ تمہارے منہ سے نکلے اور مخاطب سمجھ جائے۔

(۵) کسی کی بات کے جواب دینے کا اصول یہ ہے کہ پہلے اُس کی پوری بات سن لو، اس کا مطلب سمجھ لو پھر تہذیب کے ساتھ اُس کا جواب دو! (نا تمام)

مختلف موضوعات کے مفید مضامین لکھنے کے علاوہ مولانا نے بچوں کے لئے دلچسپ کہانیاں بھی لکھیں۔ ان میں سے کچھ کتابی شکل میں شایع ہو چکی ہیں لیکن زیادہ ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح منتشر ہیں۔ اگر اس پورے ذخیرے کو سلیقے اور اہتمام سے شایع کرنے کا انتظام ہو سکے تو ہماری نئی نسلوں کی تربیت میں اس سے بیش بہا امداد ملے گی۔ کاش ایسا ہو سکے!

"شاعر پیدا ہوتا ہے بنایا نہیں جاتا

اس مقولے نے جدید روشنی کے نوجوان شعراء کو بہت گمراہ کر رکھا ہے۔ وہ عموماً اس کا یہ مطلب سمجھتے ہیں۔ کہ ایک شاعر کو شاعر بننے کے لئے کسی استاد یا رہنما کی مطلق ضرورت نہیں۔ اور پھر اپنی تمام شاعرانہ زندگی میں کسی ماہرِ فن استاد کی رہنمائی اور اصلاح سے بے نیاز رہتے ہیں۔

اس بے نیازی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ زبان کی — الفاظ کی — اسلوبِ بیان کی — فصاحت و بلاغت کی — فنِ عروض و قافیہ کی — مختصر یہ کہ جن خامیوں اور غلطیوں کو وہ کسی ماہر فن کی دو سالہ رہنمائی و اصلاح سے دور کر کے اپنے آپ کو تاریخ شعر و شاعری کا ہیرو بنا سکتے تھے۔ برقرار رکھتے ہیں اور اپنی شاعری کو اغلاط کا البم بنا لیتے ہیں"

(علامہ تاجور)

مزارِ تاجور

پر

چند لمحے

★ جگن ناتھ آزاد

اے دل! ادائے جلوۂ برشتہ و بریں
کس رنگ میں ہے آج تری محفلِ کہن

تو تاجور اپنی ذات میں تھا ایک انجمن
خاموش اب ہے خاک میں وہ بلبلِ سخن

اب آس کے یادگار زمانوں کا ذکر کیا
ماضی کے دل نواز فسانوں کا تذکرہ کیا

اے دل نہ چھیڑ دورِ گزشتہ کا ماجرا!
قصّہ سنوں تمام نہیں مجھ میں حوصلہ

تو اتفاق سے جو یہاں تک ہے آگیا
آنسو غرورِ شوق میں اس خاک پر گرا

اے دل! یہاں ہے خاک میں پنہاں اک انجمن
یہ ہے مزارِ تاجورِ کشورِ سخن

اے رہنمائے قافلۂ شعر السّلام
اے زندہ دارِ دولتِ شعر السّلام

مجھ میں ہے تجھ سے حوصلۂ شعر السّلام
آساں تجھی سے مرحلۂ شعر السّلام

غنچے کو اک نگاہِ محبت سے پھول کر
آزاد کا سلامِ عقیدت قبول کر!

روحِ تاجور کی آواز

تو جو پھر لاہور میں وارد ہوا ہے اے جگن[1]
نکہتِ گل لوٹ کر آئی ہے پھر سوئے چمن

---

[1] مولانا تاجور مرحوم مجھے بالعموم اسی نام سے پکارتے تھے۔

آج اپنے دیس میں آنا مبارک ہو ترا
اس فضا میں نغمے برسانا مبارک ہو ترا

دورِ کہنہ کا فساد و عصرِ نو کی داستاں
پھول ہے کس باغ کا تو جا کے مہکا ہے کہاں

اے پسر! اے نوجواں! اے شبلِ پیرانِ پختہ کار
بیٹی شعر و سخن کی محفلوں کے رازدار

فیض لو تو نے اٹھایا ہے مرے افکار سے
دل ترا وابستہ ہے اقبال کے اشعار سے

اے پسر! یہ ہے ترے حق میں دعائے تاجور
فکر ہو تیری مصافِ دہر میں سینہ سپر

تا قیامت دل ترا تاثیر کا مسکن رہے
ہاتھ میں اقبال کے افکار کا دامن رہے

روشنی اقبال کے افکار کی، اشعار کی
ہر گھڑی ہو رہنما تیرے دلِ بیدار کی

نغمۂ اقبال تجھ پر کیف برساتا رہے
تو اسی نغمے کی دھن پر ناچتا گاتا رہے

گلشنِ لاہور کے پھولوں کی اے رنگیں بہار
گلستانِ ہند کی تجھ کو فضا ہو سازگار

اس طرح ہندوستاں میں ہو ترا نغمہ بلند
طول و عرضِ ہند تیری ذات سے ہو ارجمند

یہ نئی دنیا تری، یہ خطۂ گنگ و جمن
یہ دیارِ بدھ یہ گاندھی یہ نہرو کا وطن

گلستانِ علم و حکمت کا مہکتا پھول ہے
مہر و الفت کا محبت کا مہکتا پھول ہے

یہ نئی دنیا تری تہذیب کی ہے انجمن
دیکھ پاکیزہ رہے اس انجمن کا بانکپن

آج داخل ہے یہ محفل ایک نازک دور میں
اک تغیر سا ہے اس کی زندگی کے طور میں

بے توازن سا نظر آتا ہے آج اس کا سرور

ظلمتیں بھی جادہ پیما ہیں یہاں ہمراہِ نور
سرپھرے بھی اس میں ہیں کچھ نیک انسانوں کے ساتھ
چند دیوانے بھی ہیں موجود فرزانوں کے ساتھ
آج بھی کچھ کچھ نظر آتی ہے ایسوں کی نمود
ناگوار جن کو تھا گاندھی سے انساں کا وجود

اے کہ ہے ﷺ[1] محرّم کا اخلاق سرمایہ ترا
ان فضاؤں سے بہت اونچا رہے پایہ ترا
ہو کشادہ اپنے والد کی طرح تیری نظر
تنگیٔ دل کی کدورت سے رہے تو دور تر
بیخِ افکار تیرے دل کے مسکن میں نہ ہو
ناروا داری کا کانٹا تیرے گلشن میں نہ ہو
ہو ترے شایانِ شاں تیرا ہر اک اندازِ فکر
سے صدا برگزیدگی و رت کی نہ تیرا سازِ فکر
جانتا ہوں میں تعصب سے بہت بالا ہے تو
اس زمانے میں بہت ارفع بہت اعلیٰ ہے تو
پھر بھی رستے سے بھٹک جاتے ہیں اکثر نوجواں
جوش کے ہاتھوں میں دے دیتے ہیں جب اپنی عناں
نعرہ بازی رہنما بنتی ہے جب انسان کی
آبرو ہوتی ہے رسوا دہر میں ایمان کی
گرچہ تجھ پہ نعرہ بازی کا اثر کچھ بھی نہیں
جاہلوں کی فتنہ سازی کا اثر کچھ بھی نہیں
پھر بھی لازم ہے کہ تو اس امتحاں کے دور میں
ہو بہت محتاط اپنی زیست کے ہر طور میں
تنگیٔ دل کی طرف ممکن نہ ہو تیرا گذر
دیکھ حرف آنے نہ پائے خانداں کی لاج پر
اور وضاحت امتحاں کی یہ ہے اے میرے عزیز
اے مرے نورِ نظر! اے نوجوانِ باتمیز
ہند میں مسلم کو بیگانہ کوئی کہنے نہ پائے
یہ غلط بنیاد افسانہ کوئی کہنے نہ پائے

---

[1] آزاد صاحب کے والدِ محترم لالہ تلوک چند محروم

اس طرح مسلم رہے ہندوستاں کی گود میں
جس طرح رہتا ہے بچہ اپنی ماں کی گود میں

بربریت کا زمانہ ہند میں واپس نہ آئے
خون آلودہ ترانہ ہند میں واپس نہ آئے

بھیڑیئے پھرنے نہ پائیں آدمی کے بھیس میں
آبروِ مسلم کی ہو محفوظ تیرے دیس میں

بے خطر ہو جان بھی مسلم کی اور ایمان بھی
مال بھی اُس کا حفاظت میں ہو اس کی آن بھی

یہ تحفظ ہو تو پھر اس کی وفاداری کو دیکھ
دیکھ اپنے خون سے پھر اس کی گلکاری کو دیکھ

جان لڑا دے گا یہ خود ہندوستاں کے واسطے
جس طرح مٹتا ہے بلبل گلستاں کے واسطے

یہ سراسر پیکرِ جذبات ہے، دیوانہ ہے
شمع ہو اخلاص کی روشن تو یہ پروانہ ہے

اس طرح مرتا ہے یہ جذبِ وفا کے نام پر
عورتیں جس طرح مرتی ہیں حیا کے نام پر

اس کی فطرت سے پرے ہیں عصرِ نو کے جوڑ توڑ
اس کو اپنا کہہ تو پھر جس طرح چاہے اس کو موڑ

شرط صرف اتنی ہے اس کو اس قدر احساس ہو
بس یقیں کا اس قدر سرمایہ اس کے پاس ہو

اس وطن میں اک حقیقت ہے یہ افسانہ نہیں
یہ اسی گلشن کا ہے اک پھول بیگانہ نہیں

ہاں تو مقصد اس قدر ہے بس مری تقریر کا
مدعا واضح ہو تیرے عالمِ تحریر کا

تیرا نغمہ فکر کی دنیا میں آوارہ نہ ہو
آسمانِ علم کا ثابت ہو سیارہ نہ ہو

مقصدِ اعلیٰ ترے نغمے سے وابستہ رہے
اپنے دل میں سوچ لے اچھی طرح جو کچھ کہے

تیرا نغمہ زندگی کے درد سے معمور ہو

ظلمتوں کو چیرتا جائے سراپا نور ہو
پھول کی خوشبو لطافت میں تیزی میں کٹار
تیرا نغمہ ہو گلستانِ محبت کی بہار

اس بہاریں کیف پر بھی یہ قوی ہو اس قدر
ارتقا کے ہاتھ اس نغمے سے ہوں مضبوط تر

کیوں کہ ان ہاتھوں سے وابستہ ہے مسلم کا وقار
عظمتِ ہندوستاں کے ہیں یہی سرمایہ دار

لیکن اے آزاد تو جانے سے پہلے ایک بار
اپنے نغمے سے کر اس ماحول کو پھر کیف بار
جس سے میرے کان مدت تک رہے ہیں آشنا
پھر سنا اک بار وہ تعلیمِ "فرمانِ خدا"

فرمائش پہ آزاد کی نغمہ سرائی

فرمانِ خدا

فرشتوں سے

محتاج و غنی میں جو تفاوت ہے مٹا دو
انساں کو انساں کا ہمدرد بنا دو

اربابِ رعونت کو رعونت کی سزا دو
"اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو"

پیدا کرو انوارِ عمل روئے زمیں سے
بڑھ کر ہوں چمک میں جو ستاروں کی جبیں سے

تعمیر ہو اک عالمِ پائندہ یہیں سے
"گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو"

ہر لب پہ ہو آزادیٔ کامل کا ترانہ
اس دور میں شاہوں کی حکومت ہے فسانہ

---

[1] مولانا کی ایک پسندیدہ نظم

درکار ہے اس قصر کے گرنے کو بہانہ
"سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو"

جب نورِ ازل مژدۂ پیغامِ سحر دے
ظلمت کدۂ آفاق میں یوں نورِ بشر دے

مابین جو پردے ہیں کوئی چاک انہیں کر دے
"کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو"

یہ عالمِ نو جانبِ الحاد رواں ہے
بے راہ روی اس کی تباہی کا نشاں ہے

افزائشِ سامانِ طرب کاہشِ جاں ہے
"تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو"

تاجور

یہ تو اے آزاد! تیری اک پرانی نظم ہے
گرچہ اس میں شک نہیں ہے جاودانی نظم ہے
لیکن اب اپنی کوئی تازہ غزل مجھ کو سنا
تاکہ فنِ شعر میں دیکھوں میں تیرا ارتقاء

مولینا کی دوسری فرمائش پر اشعار

نسیم شعلہ بنی اور شاخِ گل تلوار
کچھ اس طرح گلستاں میں آئی فصلِ بہار
سکوں ملا جو نظر کو تو دل تڑپ اٹھا
دل و نظر کو بہم مل سکا کبھی نہ قرار
خزاں کو صحنِ چمن سے گئے زمانہ ہوا
ابھی فضائے گلستاں میں اُڑ رہا ہے غبار
مقامِ وعظ کہاں اور مقامِ راز کہاں
مقامِ وعظ ہے منبر مقامِ راز ہے دار

شمس العلماء مولانا احسان اللہ خاں
تاجور نجیب آبادی

★
حکیم احمد شجاع
(ستارۂ امتیاز)

مجھے مولانا تاجور کی خدمت میں پہلی مرتبہ اس زمانے میں شرف نیاز حاصل ہوا جب وہ رسالہ "ہمایوں" کے ایڈیٹر تھے اور سناتن دھرم ہائی اسکول میں پڑھاتے تھے۔ یہ سکول اس زمانے میں تحصیل بازار اور سید مٹھا بازار کے درمیان ایک گلی میں واقع تھا جو بھابڑیوں کی گلی کہلاتی ہے اور اس کے ہیڈ ماسٹر لالہ رگوناتھ سہائے تھے۔ انہیں کے ایما سے اور انہیں کی سوچی ہوئی سکیم کے مطابق چھوٹی عمر کے بچوں کے لئے مولانا تاجور نے رسالہ جاری کیا اگر یہ کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا کہ یہ رسالہ اس عظیم الشان درخت کا بیج تھا جو ایک عرصے کے بعد پھول پھل لایا اور جس کے زیر سایہ پنجاب میں اردو ادب نے فروغ پایا۔

اس مقام پر اگر اس پس منظر پر ایک ہلکی سی روشنی ڈال دی جائے تو مولانا تاجور کی اس ادبی تحریک کا محرک ہوا تو اس زمانے کے ادبی نقوش ابھر کر نظر آنے لگیں ۔ جس میں مولانا تاجور نے دن رات ایک کرکے اپنے خون جگر سے رنگ بھرا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جب شاہ جہان آباد کی نگری اجڑ گئی تو اس کے کھنڈر کی گود کے کچھ چند ایسے جن میں ہر ایک آسمان علم و ادب کا آفتاب و ماہتاب تھا پنجاب کے دامن میں آگرے۔ ان میں مولانا محمد حسین آزاد کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اگرچہ ان کے آنے سے پہلے لاہور میں "انجمن پنجاب" قائم ہوچکی تھی اور یہاں کے رہنے والوں میں اردو ادب کا ذوق بھی پیدا ہوچکا تھا۔ مگر اس میں نمو کی وہ شگفتگی اور عزم کی وہ جرات نہ تھی۔ جو ہر قسم کی تحریک کی کامیابی کی ضامن اور اس کی ترقی کی کفیل ہوتی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں جو اس زمانے میں پنجاب کے محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے۔ سب سے پہلے مدارس کے لئے اردو نصاب کی کتابیں لکھیں اور اپنی نثر اور نظم میں کچھ ایسی جدت پیدا کی کہ ہر کہ و مہ ان کے اسلوب نگارش کا شیدا اور ان کی طرز تحریر کا دلدادہ ہوگیا۔

یہ انہیں کے دم قدم کی برکت تھی کہ لاہور میں جگہ جگہ مشاعروں کی محفلیں آراستہ ہونے لگیں اس سلسلے میں میرے والد مرحوم حکیم شجاع الدین نے اپنی زیر صدارت ایک مجلس قائم کی جس کے سیکرٹری مولانا محمد حسین آزاد کے ایک شاگرد رشید خان احمد حسین تھے۔ یہ مجلس "شور محشر" کے نام سے ہر مہینے اردو کا ایک رسالہ شائع کرتی تھی جس میں ان شعراء کا کلام ہوتا جو اس محفل مشاعرہ میں شریک ہوتے۔ غالباً پنجاب میں اردو زبان کے ادبی جریدوں کی ابتدا اسی رسالے سے ہوئی۔ اس کے بعد ایک زمانہ گزر گیا اور سر عبدالقادر مرحوم نے اپنا مشہور زمانہ رسالہ "مخزن" شائع کرنا شروع کیا۔ اس رسالے کی اشاعت سے ان کا مقصد نہ صرف اردو زبان کی ترویج تھا بلکہ وہ اپنے اس یقین واثق کو ہندوستان کے ہر پڑھے لکھے شخص کے ذہن نشین کر دینا چاہتے تھے کہ ہندوستان بھر میں کوئی علاقہ ایسا نہیں جہاں اردو زبان بولی یا سمجھی نہ جاتی ہو۔ اس باب میں اردو ادب کی جو خدمت "مخزن" نے کی ہے وہ اردو زبان کی ترقی اور مقبولیت کے لحاظ سے ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ اس رسالے کی وساطت سے وہ نامور ادیب اور شعراء دنیائے علم و ادب سے متعارف ہوتے جن کے نتائج فکر سے اردو نظم و نثر کے اوراق روشن ہیں۔ اس کے بعد مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے اپنے جریدہ فریدہ "پنجاب ریویو"

کے افکارِ عالیہ سے گیسوئے اردو کی وہ مشاطگی کی کہ اس کی عنبر بیز لپٹوں سے آج تک مشامِ علم و ادب معطر ہے۔

جب سر عبدالقادر مرحوم اپنی سرکاری ملازمت کی مصروفیتوں کے باعث "مخزن" سے اور مولانا ظفر علی خاں مرحوم اخبار "زمیندار" سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کی بنا پر "پنجاب ریویو" سے دستبردار ہو گئے۔ تو ۱۹۱۹ء میں میں نے "ہزار داستان" کے نام سے ایک پندرہ روزہ رسالہ شائع کیا جس کا مقصد بھی اپنے پیش رو ادبی رسائل کی طرح اردو زبان کی ترویج اور اردو نظم و نثر کے حلقہ اثر کی توسیع ہی تھا۔

اسی زمانے میں مولانا تاجور نے مختلف اوقات میں کئی ادبی رسائل شائع کئے جن میں "ادبی دنیا" اور "شاہکار" صاحبانِ ذوق کی نظر میں بڑی اہمیت اور وقعت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے "انجمن اربابِ علم" کے نام سے ایک مجلس مشاعرہ کے مسلسل انعقاد کا اہتمام کیا۔ یہ محفل مشاعرہ ہر ہفتہ موری دروازے کے باہر ایس۔ پی۔ ایس۔ کے۔ ہال میں منعقد ہوا کرتی تھی۔ اس سے پہلے جتنے مشاعرے ہوتے تھے۔ ان کا حلقہ اثر محدود اور مخصوص تھا۔ لیکن مولانا تاجور نے اپنے مشاعروں پر عمومیت کا کچھ ایسا رنگ چڑھایا کہ خاص و عام بڑے ذوق و شوق سے ان میں شریک ہونے لگے۔ اس وقت سے لے کر اپنی عمر کے آخری ایام تک مولانا تاجور اسی سعی پیہم میں سرگرداں رہے کہ پنجاب اردو زبان کی نشاۃ ثانیہ کا گہوارہ بن جائے اور آگے چل کر اردو ہی پنجاب میں بسنے والوں کی مادری زبان کی صورت اختیار کر لے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ادب کے ہر شیدائی کی نثر اور نظم کی اصلاح اس انہماک سے کی جیسے کوئی ایک مقدس فرض ادا کرتا ہے۔ یا جیسے یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا مشن ہو۔ مجھے اس امر کے اعتراف میں کوئی تامل نہیں کہ دورِ حاضر میں اردو زبان کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے جب اس کی تاریخ مکمل کی جائے گی تو سر عبدالقادر مولانا ظفر علی خاں اور مولانا تاجور کے اسماء گرامی زریں حروف میں لکھے جائیں گے اور میں ذاتی علم کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ مولانا تاجور نے اپنی زندگی، اپنی صحت اور اپنی عمر بھر کی کمائی اسی بازی پر لگا دی۔ اور اس دھن میں مٹا دی۔ کہ اردو زبان کو پنجاب میں روز بروز زیادہ فروغ حاصل ہو اور اردو کے لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد میں نت نیا اضافہ ہوتا چلا جائے۔

آج وہ خود موجود نہیں مگر وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ ان کی محنت اور کاوش رائیگاں نہیں گئی اور اردو زبان کا وہ عشق جو ان کے دل و دماغ میں ایک جنون کی طرح طاری ہو چکا تھا۔ آج رنگ لا کر ہی رہا۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

یہ تجلیوں کا ہجوم تھا تری جلوہ گاہِ جمال میں
کہ نگاہِ شوق سے اس ہجوم میں انتخاب نہ ہو سکا
تری بارگاہ میں اذنِ عام ہے اہلِ شوق کو ایک میں
فقط ایک میں ہوں وہ بدنصیب جو باریاب نہ ہو سکا

علامہ تاجور

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

تاجور سے یکجائی کی یاد

اڑتیس سال پہلے کا ذکر ہے میں دوسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ ایک دن ہاتھ میں بلا، گیند اور ایک وکٹ لے کر سیڑھی سے اترا۔ راستے میں گرا۔ ایک وکٹ پیٹ میں دھنس گئی۔ انتڑیاں باہر نکل آئیں۔ آناً فاناً ہسپتال پہنچایا گیا اسی رات پیٹ کا اپریشن بھی ہوا۔ دو مہینے کے بعد چلنے پھرنے کے قابل ہوا۔ گھر لوٹا تو رسالہ "پریم" ملا۔ جو بچوں کے لئے پنڈت جی ہری لال ماتھر نکالتے تھے اور مولانا تاجور نجیب آبادی ایڈٹ کرتے تھے۔ اس رسالے میں مولانا نے میرے حادثے کا ذکر کیا تھا۔ میرے لئے دعائے صحت فرمائی تھی۔ اور بچوں کو تلقین کی تھی۔ کہ کوئی نوکدار چیز لے کر سیڑھیوں سے نہ اتریں۔ گویا حضرت تاجور وہ پہلے بزرگ تھے جنہوں نے مجھے سات سال کی عمر میں پبلسٹی دی۔

والد مرحوم مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا تاجور میں دوستی اور محبت کے گہرے مراسم استوار تھے۔ اس کے بعد کچھ ادبی جھگڑے ہوئے۔ دونوں الگ الگ ادبی جماعتوں سے وابستہ ہوتے اور جیسا کہ اکثر ہوتا ہے ان دونوں میں کھنچاؤ پیدا ہو گیا۔ جو مدتوں جاری رہا۔ ایسی فضا میں کوئی موقع ایسا پیدا نہیں ہو سکتا تھا کہ مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوتی۔ بہر حال غالباً ۱۹۳۷ء کا ذکر ہے کہ یہ موقع پیدا ہو گیا، میں اسلامیہ کالج یونین کا سیکرٹری تھا۔ یونین کے اہتمام میں ایک ماڈل مباحثہ کرایا۔ جس میں مولانا تاجور کو بھی مدعو کیا۔ یہ اُن سے میری پہلی ملاقات تھی۔

غالباً ۱۹۳۸ء کا ذکر ہے۔ مزنگ میں ایوانِ ادب کے نام سے ایک ادبی مجلس قائم تھی۔ جو وقتاً فوقتاً مشاعرے برپا کرتی تھی۔ ایک دن دوستوں کی محفل لگی تھی۔ حمید نسیم تھے۔ ظہیر کاشمیری تھے۔ عبداللہ بٹ اور مولوی عبدالقدیر نعمانی تھے۔ اور میں تھا۔ میں نے نسیم اور ظہیر سے کہا۔ یار یہ کیا غضب ہے تم شاعر بنے بیٹھے ہو اور ہم شعر کی حس ہی سے عاری ہیں۔ کبھی شعر کی زکوٰۃ نکالو اور ہمیں بھی شاعر بنا دو۔ ظہیر کہنے لگے۔ ضرور! عبداللہ بٹ نے کہا تو پھر آج ہی بسم اللہ ہو جائے۔ شام کو مولانا تاجور کی صدارت میں ایوانِ ادب کا مشاعرہ ہے وہیں سے ہماری شاعری کا افتتاح ہو جائے۔ ظہیر کاشمیری نے اپنا گیت "رقاصہ" مجھے عنایت فرمایا۔ نسیم نے بٹ اور نعمانی کو دو غزلیں دے دیں۔ اور ہم خراماں خراماں ایوانِ ادب کے مشاعرے میں جا پہنچے اور اپنے نام صدرِ مجلس کو بھیج دیئے۔ ہم پانچوں نے بڑے دھڑلے سے اپنا کلام سنایا اور داد پائی۔ مولانا تاجور نے مجھے بہت پیار کیا اور دعا دی۔ کہ میں ظہیر کر کے اپنے والد کے نقشِ قدم پر چل رہا ہوں۔

مولانا تاجور سے اُس وقت تک خاصا تعارف ہو چکا تھا۔ بالخصوص اُن کے رسالوں کی وجہ سے انہوں نے پہلے "ادبی دنیا" جاری کیا اور بڑی دھوم دھام اور شان و شوکت کے ساتھ جہازی تقطیع اعلیٰ درجے کا سفید کاغذ، آرٹ پیپر کا رنگین سرورق عمدہ کتابت اور طباعت اور مواد بھی بلند پایہ۔ کچھ عرصہ بعد اسے بیچ ڈالا اور پھر "شاہکار" جاری کیا وہ ظاہری اور باطنی بانکپن میں "ادبی دنیا" سے بھی کچھ بڑھ کر تھا۔ مگر تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا اور مولانا نے مالی پریشانیوں کی بنا پر اسے بھی بیچ ڈالا۔ ان دونوں رسالوں کی وجہ سے نئی پود کے اکثر نوجوان اُن کے مداح تھے۔ انہی میں میں بھی شامل تھا۔

۱۹۴۳ء میں میری زندگی کا ایک ایسا موڑ آیا۔ جس نے مجھے مولانا تاجور کے عین سامنے لا بٹھایا۔ بات یوں ہوئی کہ میں ایک

سرکاری ہفت روزہ "پنجابیت" کا ایڈیٹر تھا۔ اتنے میں حکومت پنجاب نے فیصلہ کیا۔ کہ تمام سرکاری نشر و اشاعت یک جا کر دی جائے۔ چنانچہ محکمہ تعلقات عامہ وجود میں آیا اور اس کے اہتمام میں "ہمارا پنجاب" کے نام سے ایک شاندار با تصویر ہفت روزہ جاری کیا گیا۔ اور مجھے حکم ملا کہ "پنجابیت" سے بوریا بستر گول کرو۔ اور "ہمارا پنجاب" کے ادارتی عملے میں کام کرو! وہاں چیف ایڈیٹر کے عہدے پر پہلے پروفیسر لاجپت رائے نیر اور پھر پارسی کمپنی کی حکومت والے مقرر ہوتے۔ مولانا تاجور لٹریری ایڈیٹر بنے اور صادق قریشی اور میں اسسٹنٹ ایڈیٹر بنائے گئے۔ ہم سب ایک ہی کمرے میں بیٹھتے تھے۔ پہلے پہل میں مولانا تاجور سے کچھ کھنچا کھنچا سا رہتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی۔ کہ مجھے "ہمارا پنجاب" میں "پنجابیت" کا ادغام پسند نہیں تھا۔ اور دوسری وجہ یہ تھی۔ کہ والد سے کشیدگی تعلقات کی وجہ سے میں مولانا تاجور سے کچھ بدظن تھا۔

لیکن وہ زمانہ اور تھا۔ بزرگوں کی وضع داری قائم تھی۔ آج تو لوگ باپ سے دشمنی کا انتقام بیٹوں سے بلکہ بعض صورتوں میں پوتوں سے بھی لیتے ہیں۔ اُس زمانے میں وضع دار بزرگوں کی کشیدگی تعلقات سے اُن کی اولاد نہیں متاثر ہوتی تھی۔ بلکہ بسا اوقات حریف کی اولاد پر شفقت کی بوچھاڑ کر دی جاتی تھی۔ اور مولانا تاجور اسی قسم کے بزرگ تھے۔ میں جتنا کھنچتا تھا۔ وہ اتنے ہی زیادہ قریب آتے تھے۔ میرے پہنچتے ہی انہوں نے پیار کی ایسی بوچھاڑ کر دی۔ کہ میں بے بس ہو گیا۔ چائے پلائی۔ پان کھلایا۔ پیاری پیاری باتیں کہنے لگے۔ مجھے تمہارے باپ سے محبت ہے۔ تم نہیں جانتے ہم میں کتنا پیار تھا۔ پر تو عزیزوں نے ہمیں جدا کر دیا۔ اور میاں انہیں شاید یہ بھی معلوم نہ ہو کہ جتنے لذیذ پراٹھے تمہارے گھر کھاتے ہیں۔ اور کہیں نہیں کھاتے۔ چائے اور پان روزمرہ کا مشغلہ بن گیا اور چائے کا بل ادا کرنے کی پیشکش مولانا تاجور کی بارگاہ میں کبھی قبولیت کا شرف حاصل نہ کر سکی ایک دن مولانا اپنے ہاتھ میں دو فارم لے کر آئے اور فوراً مجھے اور صادق قریشی کو حکم دیا۔ کہ انہیں پُر کر دو۔ یہ فارم ادیب عالم کی ممتحنی کے تھے۔ میں یہ احسان قبول کرنے سے ہچکچایا تو مولانا فرمانے لگے "میاں کیا کرتے ہو۔ قابل باپ کے بیٹے ہو قابل ہو۔ ذہین ہو۔ تم ہر لحاظ سے اس کام کے اہل ہو۔ اور ساتھ پیسے آئیں گے۔ آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔ میں نے فارم پر کر دیا۔ اور تین سال تک ممتحن بنا رہا۔

اتنے میں محکمۂ اطلاعات عامہ کا بستر بھی گول ہو گیا اور اس کے عملے کے ارکان ہمارے ہاں آ گئے۔ انہی میں میرے عزیز دوست سجاد حیدر بھی تھے جو لاہور ریڈیو کے دیہاتی پروگرام کے انچارج تھے۔ وہ بھی اس کمرے میں برا جمان ہوئے۔ اب پارسی، سجاد اور میں پنجابی زبان کے رسیا تھے۔ اور مولانا تاجور اسے گنواروں کی بولی کہتے تھے۔ اس مسئلے پر بہت دلچسپ مناظرے ہوتے لیکن ایک واقعہ خصوصی دلچسپی کا حامل ہے۔ پنجابی کی مشہور شاعرہ امرتا پریتم نے "پنکاری" کے نام سے گورمکھی رسم الخط میں ایک سہ ماہی مجلہ جاری کیا۔ سجاد کے ذمے یہ کام ہوا۔ کہ وہ اس کے پچیس سالانہ خریدار بنائیں۔ ہم تینوں دوستوں نے سازش کی کہ مولانا کو بھی خریدار بنایا جائے۔ جب ہم نے اُن سے سالانہ چندے کے چار روپے مانگے۔ تو انہوں نے کانوں پر ہاتھ دھرے کہنے لگے۔ اسے میاں! میں ساری عمر اردو کے لئے کام کرتا رہا۔ اب بڑھاپے میں یہ خرابی نہ کراؤ" اور مجھے خطاب کرتے ہوئے فرمانے لگے۔ اسے تو بھی ان فتنہ پردازوں میں شامل ہو گیا۔ تیرا تو باپ بھی اردو کے بڑے حامیوں میں شامل ہے" میں نے کہا "مولانا۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ باپ یونینسٹ ہوتے ہیں۔ اور بیٹے کمیونسٹ (میرا اشارہ نواب مظفر خان اور نواب احمد یار دولتانہ کے فرزندوں کی طرف تھا) ایسے میں اگر میں پنجابی کا حامی بن گیا۔ تو کیا ہوا؟ اس پر بولے "لیکن مجھے تو گورمکھی رسم الخط سے وحشت ہوتی ہے۔ جب اسے پڑھنے ہی سے قاصر ہوں۔ تو خریدار بننے سے فائدہ؟ اس پر میں نے کہا "تو ہمیں کون سا گورمکھی رسم الخط سے پیار ہے۔ امرتا پریتم سے سجاد کی دوستی ہے اور سجاد سے ہماری دوستی ہے۔ اسی لئے خریداری پر اصرار ہے۔ مولانا لاجواب ہو گئے

اکاؤنٹنٹ کو بلایا اور کہا۔ میرے حساب میں سے چار روپے ان دونوں کو دے دو۔

مولانا کبھی شعر نہیں سناتے تھے۔ کہ ہم شعر کے ذوق سے عاری تھے۔ کئی مرتبہ اصرار کیا۔ اور ہر مرتبہ انکار ہوا۔ سجاد کی عادت تھی کہ غلط کو ہمیشہ غلط بولتے۔ اور مولانا ہمیشہ مسکرا کے انہیں کہتے۔ میاں غلط نہ کہو غلط کہو۔ اور سجاد کہہ دیتے۔

مولانا مرحوم نوجوانوں میں جوان بن جاتے تھے۔ اس زمانے میں سجاد کو کسی لڑکی سے عقیدت تھی اور عقیدت بھی کیا تھی یونہی دلچسپی سی تھی۔ اور ہم نے بات کا بتنگڑ بنا رکھا تھا۔ ہم دوستوں میں اس لڑکی کے بارے میں کچھ کرید چھیڑ ہوتی تو مولانا چونکنا ہو جاتے بہرحال ہمیں اس کا احساس نہ ہوتا۔ ایک دن یونہی گپ ہو رہی تھی۔ کہ مولانا نے سجاد سے کہا "میاں ادھر ادھر آؤ تا سجاد قریب گئے۔ تو مولانا بولے "میاں! کیوں ٹکریں مارتے پھرتے ہو۔ وہ لڑکی تمہارے ہاتھ نہیں آنے کی۔ یہ سنتے ہی ہم نے قہقہے لگائے۔ اور سجاد کچھ پریشان سے ہو گئے۔

یہ چند یادیں ہیں۔ جو ذہن میں محفوظ رہ گئی ہیں۔ ورنہ مولانا تاجور جیسے شفیق بزرگ کی مہربانیاں تو بے حساب ہیں۔ میں سمجھتا ہوں۔ ان کی صحبت میں کام کرنے کا جو شرف مجھے حاصل ہے وہ زندگی کا ایک اہم سرمایہ ہے اور مجھے اس پر ناز رہے گا۔

علامہ تاجور ہوش بلگرامی کی نظر میں

(خط بنام مہاراجہ کشن پرشاد وزیر اعظم حیدرآباد دکن)

سرکار والا!

مولانا تاجور وہاں تشریف لا رہے ہیں جہاں کے بیٹے ہیں تشریف لا رہے ہیں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ مولانا تاجور اس آستانہ پر حاضر نہ ہوں جو دکن میں اہل علم کا آخری سہارا ہے۔ مولانا تاجور دیوبند کے فاضل اور پنجاب یونیورسٹی کے فاضلین میں ہیں۔ انشا پرداز ہونے کی حیثیت سے اور بحیثیت شاعر ہونے کے لحاظ سے ان کا رتبہ بہت بلند ہے۔ پھر علم تفریق کے فاضل اور عربی ادب کے متبحر عالم ہونے کی حیثیت سے ان کے بلند و وسیع ہونے پر مجھے رشک آتا ہے۔ ان کی ہی خوش ذوقی کی داد میں کیا دوں، لاہور کا بچہ بچہ دے رہا ہے اور ہندوستان کا گوشہ گوشہ مولانا تاجور کی علمی خدمات سے واقف ہے۔ پھر مولانا تاجور مرحوم کی شہرت یہی "بلبل الملک" بھی۔ ہمایوں پنجاب کا خوبصورت رسالہ انہیں کے سلسلے میں سربلند ہو رہا ہے۔ سرکار گو صورتاً تو ان سے واقف نہ ہوں، مگر ان کو شاعر انشا پرداز ہونے کی حیثیت سے خوب جانتے ہوں گے۔ مجھے امید ہے کہ سرکار ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ امیرالامرا نواب نجیب الدولہ کے خاندان سے ان کا خوش قسمتی سے تعلق ہے۔ میں ان سے بہت جل رہا ہوں اور ان پر رشک اس لئے کرتا ہوں کہ یہ سرکار کی بارگاہ میں ہوں گے۔ جہاں میں بھی حاضر رہا کرتا تھا۔ آہ یاد ایام!

مولانا لاہور (جو سرکار کا پیارا وطن ہے) کے ایک بڑے کالج کے پروفیسر ہیں اور ارادہ کر رہے ہیں کہ اپنی علمی پیاس مصر میں جا کر بجھائیں۔ زیادہ حد ادب ؛

خادم دیرینہ ہوش بلگرامی (رامپور اسٹیٹ) ۲۰۔ جولائی ۱۹۲۴ء

(خط بشکریہ مولانا محمد عبداللہ قریشی صاحب)

علامہ تاجور کی یاد میں

(اکبر لاہوری)

آج سینے کے لئے ضبطِ الم بیداد ہے
یعنی میرے لب پہ اکبر ماتمِ استاد ہے

جب زباں میں عرضِ مطلب کی ذرا قدرت نہ تھی
اس گھڑی اپنے مسیحا کا کرشمہ یاد ہے

اس کے فیضِ تربیت سے دل پہ یہ عقدہ کھُلا
تربیت فن کی نہ ہو تو زندگی برباد ہے

کھلتے ہیں شاعر کے جوہر صحبتِ استاد میں
گرچہ وہ پروردۂ فطرت ہے، مادر زاد ہے

آج جب بزمِ سخن میں وہ ادب پرور نہیں
ناشناسا دوستوں کی داد بھی بیداد ہے

○

علامہ تاجور ۰ اور انکی شاعری

از:- افضل حسین خاں نظیر لدھیانوی

شمس العلماء علامہ احسان اللہ خاں تاجور آسید نجیب آباد (یوپی) کے ایک معزز پٹھان گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے آباؤ اجداد حضرات احمد شاہ ابدالی کے لشکر کے ہمراہ ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ علامہ نے دارالعلوم دیوبند سے سند فضیلت حاصل کی، اور فن شعر میں حضرت رسا رامپوری سے استفادہ کیا۔ مولانا پہلی جنگ عظیم کے آخری ایام میں لاہور چلے آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کئے۔ ابتداء میں آپ دیال سنگھ ہائی سکول میں اردو کے مدرس مقرر ہوئے۔ اور عرصے تک غیر مسلم بچوں کو اردو پڑھاتے اور اردو ادب کی تعلیم دیتے رہے۔ بعد میں آپ کو دیال سنگھ کالج میں اردو ادبیات کا استاد مقرر کیا گیا۔ آپ ۱۹۵۱ء تک یہ فرائض ادا کرتے رہے تقسیم ملک کے بعد سید عابد علی عابد کو کالج کا پرنسپل اور مولانا کو دیال سنگھ لائبریری کا لائبریرین مقرر کیا گیا۔

مولانا کو شعر و ادب اور زبان اردو کی نشر و اشاعت کا ابتداء ہی سے شوق تھا۔ دارالعلوم دیوبند میں طالب علمی کے زمانے میں شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ چنانچہ ان کا اس زمانے کا ایک مطلع مجھے آج تک یاد ہے جو یہ ہے:-

جواب حسن نورانی جبیب لعل روئے جاناں تھا
وفورِ شوق سے بے تاب و مضطر ابنِ عمراں تھا!

جرائد کی ادارت

غالباً ۱۹۱۸ء میں اردو کے مشہور و قدیم ماہنامہ "مخزن" کی عنانِ ادارت آپ کے سپرد کی گئی۔ ۱۹۲۲ء میں میاں بشیر احمد بار ایٹ لاء نے اپنے والد مرحوم میاں محمد شاہدین کی یادگار کے طور پر ماہنامہ "ہمایوں" جاری کیا تو مولانا ۱۹۲۷ء کے اواخر　　اس کے جوائنٹ ایڈیٹر رہے۔ چنانچہ مولانا گرامی مرحوم نے "ہمایوں" کی پیشانی پر درج کرنے کے لئے جو شعر عطا کیا۔ وہ دراصل مولانا کی　　میں تھا۔ شعر یہ تھا:-

لسانِ تاجور نکتہ سنجاں ار ہمند آمد!
تعالی اللہ ہمایوں دیو گیر دیوبند آمد!

یہ شعر ہمایوں کے ٹائیٹل پر عرصہ تک چھپتا رہا۔ بعد ازاں میاں شاہ دین کا یہ اپنا شعر چھپنے لگا:-

اٹھو ورنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی!!
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا!

اس دوران میں مولانا نے انجمن ارباب علم پنجاب کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کی جس کے دائمی صدر سر شیخ عبدالقادر تھے۔ اس انجمن کے مشاعرے گاہ گاہ لاہور میں اور کبھی کبھی پنجاب کے دیگر اضلاع میں منعقد کرتے تھے۔ اس انجمن کی شاخیں بعض دوسرے اضلاع میں بھی تھیں۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں میں نے لودھیانے میں انجمن ارباب علم کی شاخ قائم کی جو آگے چل کر لودھیانے کے

تشنگانِ ادب کے لیئے چشمۂ حیات ثابت ہوتی۔ انجمن ارباب علم کی بڑی خصوصیت یہ تھی۔ کہ اس کے جلسوں میں نثر کے مضامین بھی پڑھے جاتے تھے۔ اس انجمن نے ادبی جلسوں اور مشاعروں کی بدولت ملک کے نوجوانوں میں شعروادب کا ذوق اور ادبی انجمنیں قائم کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اسی انجمن کے ایک جلسے میں مولانا کو بلبلِ الملک کا خطاب دیا گیا۔

اردو مرکز

اگست ۱۹۲۵ء میں مولانا نے سلطر چند کپور اینڈ سنز تاجرانِ کتب لاہور اور خان بہادر شیخ نور الٰہی انسپکٹر مدارس لاہور ڈویژن کے اشتراکِ عمل سے اردو مرکز قائم کیا۔ اس ادارے کے نگران اور مالکِ کل دراصل مولانا ہی تھے۔ ارکان میں اختر شیرانی۔ اصغر گونڈوی۔ جگر مراد آبادی۔ یاس یگانہ چنگیزی۔ سیفی سہواروی۔ دردنکودری۔ سردار داود سنگھ شائق۔ پنڈت میلا رام وفا۔ پنڈت دتاتریا کیفی دہلوی اور راقم الحروف شامل تھے۔ اس ادارے کی نگرانی میں تمام پرانی ادبی تصانیف کا جائزہ لیا گیا۔ اور ان میں جاندار چیزوں کے انتخابات شائع کیئے گئے۔ میر۔ سودا۔ دبیر۔ انیس وغیرہ اساتذہ کے چیدہ کلام کے مجموعے چھاپے گئے۔ بہترین افسانوں کے مجموعے مرتب کیئے گئے "فسانۂ آزاد" سے "خوجی کے کارنامے" کے نام سے خوجی کے حالات میں ایک کتاب کئی حصوں میں شائع کی گئی۔ یہ تمام کتابیں آج بھی برصغیر کی لائبریریوں اور پرانے مدارس کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

ہفت روزہ اتحاد

اردو مرکز کے زیرِ اہتمام ایک غیر سیاسی ہفت روزہ جاری کیا گیا۔ جس کا مقصد ہندو مسلم اتحاد تھا۔ یہ پرچہ مولانا مرتب کرتے تھے اور یہ عرصے تک برصغیر کے مدارس میں مقبول رہا۔

ہفت روزہ پریم

اردو مرکز کے زیرِ اہتمام ہفت روزہ پریم بچوں کے لئے جاری کیا گیا۔ یہ پرچہ پورے برصغیر میں مقبول تھا۔ اس میں کہانیاں۔ نظمیں۔ سائنس اور علمی مضامین نہایت آسان زبان میں شائع ہوتے تھے۔ اردو مرکز کے خاتمے کے بعد بھی یہ پرچہ کامیابی کے ساتھ جاری رہا ہے۔ اور ملک کی تقسیم کے وقت تک چھپتا رہا۔ ابتدا میں اس کے ایڈیٹر سیفی سہواروی تھے۔ جنہیں بچوں کا ادب لکھنے میں بڑی مہارت حاصل تھی۔

ادبی دنیا

مولانا نے السٹریٹیڈ ویکلی کے سائز پر "ادبی دنیا" کے نام سے ایک شاندار معیاری مصور رسالہ جاری کیا۔ جس کے طویل سائز رنگین تصاویر اور گوناگوں مضامین نظم و نثر سے دنیائے ادب میں تہلکہ مچ گیا۔ اہل صحافت کو حیرت تھی۔ کہ مولانا ان گراں بہا اخراجات کے متحمل کیونکر ہوتے ہیں۔ جب کہ پرچے کی قیمت وہی ہے جو دوسرے معمولی پرچوں کی ہے۔ کچھ عرصے کے بعد مولانا نے ادبی دنیا کو منصور احمد مرحوم کے حوالے کر دیا۔ بعد ازاں وہ مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کی تحویل میں گیا۔ اور اس کا سائز عام رسالوں کا سا ہو گیا۔ مولانا صلاح الدین تادمِ مرگ ادبی دنیا کو چلاتے رہے۔

شاہکار

ادبی دنیا منصور احمد مرحوم کے حوالے کرنے کے بعد مولانا نے اسی پیمانے پر شاہکار نامی مصور رسالہ نکالا۔ جس کی ظاہری اور معنوی خوبیاں ادبی دنیا سے بھی زیادہ تھیں۔ مولانا یہ رسالہ عرصے تک اختر شیرانی مرحوم کی معاونت سے چلاتے رہے بعد ازاں انہوں نے شاہکار عبدالحلیم انصاری مرحوم کے حوالے کر دیا۔ اور ۱۹۴۷ء تک راقم الحروف شاہکار کو مرتب کرتا رہا۔

ہمارا پنجاب

آخر میں حکومت پنجاب کے ہفتہ وار مصور پرچے "ہمارا پنجاب" کی عنانِ ادارت مولانا کے سپرد ہوئی۔ غرض مولانا کی ساری عمر پنجاب میں ادب اردو کی خدمت کرتے گزری۔ اگر پنجاب میں آپ کو بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق ثانی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ آپ نے ادبی انجمنیں بنائیں، شاندار ادبی جرائد و رسائل جاری کئے۔ بے شمار نوجوانوں کو اردو پڑھایا اور ادب کی تعلیم دی۔ بیسیوں شاعروں کے کلام پر اور متعدد ادیبوں کے مضامین پر اصلاحیں کیں۔ گمنام انشاپردازوں کو دنیا سے روشناس کرایا۔ جا بجا آل انڈیا مشاعرے منعقد کئے اور بارہا پورے برصغیر کے اساتذہ کو ایک مجلس میں جمع کر دیا۔ اس لحاظ سے آپ کو ادب آفریں اور شاعر گر کہا جا سکتا ہے۔ حکومت نے آپ کو ادبی خدمات کے صلے میں شمس العلماء کا خطاب عطا کیا۔

مولانا کی ادبی صلاحیت

مولانا کو نظم و نثر دونوں پر قدرت حاصل تھی۔ جن لوگوں نے مخزن، ہمایوں، ادبی دنیا، شاہکار اور ہمارا پنجاب میں آپ کے مضامین کا مطالعہ کیا ہے۔ انہیں بخوبی علم ہے کہ مولانا کا قلم نثر کے میدان میں بے تکان دوڑتا تھا اور آن کی آن میں صفحہ کاغذ پر الفاظ کے پھولوں کے انبار لگا دیتا تھا۔ غالباً بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ مولانا بلا کے ظریف الطبع تھے۔ اور ظرافت کے میدان میں پنجاب میں شاید اُن کا کوئی حریف نہ تھا، رسالوں میں علامہ ظریف کے نام سے جو بلند پایہ ظریفانہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ وہ مولانا ہی کے زندہ جاوید قلم کے نقوش ہیں۔ مولانا کی عام گفتگو میں بھی ظرافت کا رنگ پوشیدہ نہیں تھا۔ روتوں کو ہنسانا اُن کا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

کلام

مولانا نے اپنی زندگی میں اپنے کلام کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں کیا اس لئے آپ کی شاعری پر بسیط تبصرہ کے لئے بہت سا وقت اور محنت درکار ہے۔ جو میرے جیسے عدیم الفرصت مدیر اخبار کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس وقت میرے پاس ادبی دنیا اور شاہکار کے وہ مجلدات موجود نہیں۔ جن میں مولانا کا کلام یا مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس وقت میرے سامنے رسالہ ہمایوں کی ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۳ء کی ۲ جلدیں ہیں۔ آپ کے کچھ اشعار میرے حافظے میں محفوظ ہیں۔ مجبوراً انہیں پر اکتفا کرتا ہوں۔

غزل

دنیائے ادب میں میر کو سب سے بڑا غزل گو شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔ اگرچہ اردو میں مصحفی۔ سودا۔ ناسخ۔ ذوق۔ مومن۔ داغ وغیرہ غزل گوئی

میں بہت بلند پایہ رکھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی آج تک میر کا جواب پیدا نہیں ہوا۔ ناسخ کہتا ہے۔ ع
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں!

غالب ناسخ کے اسی قول کو دوہراتے ہوئے کہتا ہے ؎

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

دوسری جگہ کہا ؎

ریختی کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ذوق کا قول ہے ؎

نہ ہوا پہ نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

آخر میر کا وہ کیا اندازِ تغزل تھا جو دوسروں کو حاصل نہ ہوا؟ بات یہ تھی کہ میر کے کلام میں بلا کا سوز و گداز۔ انتہا کا درد و کرب اور پیم ریختگی اور مایوسی کی کیفیت ہے اور دوسرے اس لذت دکرب سے محروم ہیں۔ گویا اردو ادب میں میر کا کلام ایک معیار تغزل بن گیا ہے۔ میر عیش و نشاط سے کوسوں دور تھا۔ اس کے دل کی کلی کبھی نہیں کھلی۔ کہتا ہے ؎

چھائی قفس میں داغ سے ہو کیوں نہ رشکِ باغ!
جوشِ بہار تھا کہ ہم آتے اسیر ہو

آیئے ہم اسی معیار پر مولانا کی غزل کو پرکھیں۔ مولانا کا کلام زبان و بیان کے اعتبار سے تو شگفتہ و شیریں ہے ہی معانی کے لحاظ سے بھی بیشتر حصے درد و کرب، یاس و حزن اور حسرت و ملال کے مضامین سے پُر ہیں۔ مولانا کی ایک قدیم غزل کے دو شعر سنئیے کہتے ہیں ؎

سچ ہے کہ دل فریبیٔ رنگ رخ بہار کیا
حسن پہ اعتماد کیوں وقت کا اعتبار کیا

کھوتے گئے جو عشق میں ان کا نشان نہ پائیگی
ان کو تلاش کرتی ہے گردشِ روزگار کیا

ایک اور غزل کے چند اشعار نقل کرتا ہوں۔ جو حسرت و یاس کے آئینہ دار ہیں ؎

حشر میں پھر وہی نقشہ نظر آتا ہے مجھے
آج بھی وعدۂ فردا نظر آتا ہے مجھے

رہتی ہے غمکدۂ دل میں تجلی اس کی
دل میں اک داغ تمنا نظر آتا ہے مجھے

دیکھکر تجھ کو ہوتے نذرِ تحیر سر سے ہوش
کیا بتاؤں تجھے تو کیا نظر آتا ہے مجھے

بچ رہا تھا فقط اک تاجورِ شعلہ طرازنہ
وہ بھی برباد تمنا نظر آتا ہے مجھے

دنیا کے حسرت انگیز آل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا نے ایک قطعہ لکھا تھا۔ اس کے چار اشعار پیش کرتا ہوں۔ ان میں بھی میر کا سوز موجود ہے ؎

ستانہ مجھ کو محبت کی خود فراموشی
کہ اپنے بھولنے والے کی یادگار ہوں میں

ہے میری سادگیٔ عشق رحم کے قابل
کہ بے وفا سے وفا کا امیدوار ہوں میں

ہوا پامال سبزۂ خوابیدہ وقفِ پائمالی
چمن میں رہ کے بھی بیگانۂ بہاروں میں

فریبِ وعدۂ صبر آزما خدا کی پناہ
کہ ایک عمر سے پامالِ انتظاروں میں

اس قطعے کے ساتھ علامہ اقبال کا وہ قطعہ بھی پڑھیے ۔ ع

یہ شاخسار میں اک برگِ زرد کہتا تھا

ایک اور غزل کے چند شعر سنیے ۔ ان میں بھی میر کا تغزل ہے اور کچھ قلندرانہ رنگ ہے ؎

تو فراموشِ محبت کو بھی کرتا ہی یاد
اور مرے وعدہ فراموش اگر یاد رہے

غم نوازی نے تری کر دیا غم دوست ہمیں
شاد ہم تیری بدولت دلِ ناشاد رہے

دلِ ناشاد محبت کو نہ بھلا دے ظالم
یہ کبھی شاد رہا ہے نہ کبھی شاد رہے

ایسی گل گشت سے زنداں کی اسیری اچھی
جیسے چمن میں بھی نہ اہلِ چمن آزاد رہے

ایک نظم میں شہنشاہ جہانگیر سے خطاب کیا ہے ۔ لیکن اس میں بھی سوز و ساز اور درد و یاس کا رنگ غالب ۔ فرماتے ہیں ؎

داستانِ عہد کے قصے بن گئے ہیں نقشِ آب
لیلیٰ و مجنوں کے افسانے ہیں مدفونِ کتاب

داستانِ خسرو و شیریں ہے اک بھولا سا خواب
الغرض تاریخِ حسن و عشق ہے رودادِ کتاب

ہاں مگر تیرے سبب سے شہریارِ حسن و عشق
آج تک ہے شہرۂ ہنگامہ زارِ حسن و عشق

غم پرستوں کی خبر لے اے شہِ عشرت پرست
فاقہ مستوں کو بھی دیکھ اے شہریارِ بادہ مست

تیرے ہندوستان کا زیر و زبر ہے بند و بست
جس کو دیکھو پھر رہا ہے آج وہ خنجر بدست

خوابِ راحت سے اٹھ اے آسودۂ خوابِ گراں
دیکھ اپنی آنکھ سے بربادیٔ ہندوستاں

مولانا نے یہ نظم تقسیمِ ملک سے پچیس تیس سال پہلے لکھی تھی ۔ لیکن اس میں آج کے ہندوستان کی جھلک نظر آتی ہے آپ نے آخر میں کہا ہے ؎

کل کے اس جنت نشان ہندوستان کو آج دیکھ
آہ اس گلزارِ تاراجِ خزاں کو آج دیکھ

کھول آنکھ اس عبرت آبادِ جہاں کو آج دیکھ
اس کو دیکھ اس کے زمین و آسماں کو آج دیکھ

ہر روش اس کی مجسم شکوۂ تقدیر ہے
پتہ پتہ اس چمن کا درد کی تصویر ہے

وہ شعرا جنہیں قدرت سے سوز و گداز کی نعمت نہیں ملی وہ دعائیہ اشعار لکھنے میں اکثر ناکام رہتے ہیں ۔ ایک زمانے میں آغا حشر کی وہ دعا [illegible] رہ جانے کے لئے "بہت موثر" سمجھی جاتی تھی ۔ مولانا کو چونکہ فطرت سے درد کی نعمت ملی تھی ۔ اس لئے مولانا کی دعا سراپا درد ہے ۔ اپنی نظم غازیٔ اسلام (مصطفےٰ کمال) میں فرماتے ہیں ؎

جب مصیبت بڑھ گئی حد سے دلِ ناشاد پر
تب کیا مجبورِ فطرت نے خدا کی یاد پر

اس کو ڈھونڈا اپنے بیگانوں کو آخر چھوڑ کر
اس سے جوڑا رشتۂ امید سب سے توڑ کر

اس کے در پر جھک گئی ہر ایک کی پیشانیٔ ناز — اس سے رو کر عرض کی سب نے کہ اے بندہ نواز
مسلموں کو شکوۂ مہر و محبت تجھ سے ہے — آہ تیری بے نیازی کی شکایت تجھ سے ہے
امتِ احمد کی دردانگیز بدحالی تو دیکھ — اپنے کعبے کے نگہبانوں کی پامالی تو دیکھ
ہم سے تیری امتِ عاصی اس قدر کیوں دور ہے — کچھ نہیں معلوم تو ہو کیا تجھے منظور ہے

۱۹۱۹ء میں جب اتحادیوں نے ترکی پر قبضہ کر لیا، اور خلیفۂ اسلام کو نظر بند کر دیا۔ عرب ممالک پر پہلے ہی اتحادیوں کا فوجی قبضہ تھا۔ ساری دنیائے اسلام میں اتحادیوں کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ رہی تھی۔ مولانا نے اس یاس انگیز وقت میں ایک دردناک نظم لکھی۔ جس کا ایک ایک حرف درد میں ڈوبا ہوا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

کیسا ٹوٹا ہے ہم پر یہ کوہِ الم سچ یہ ہے موت کا سامنا ہو گیا
لٹ رہی ہے خلافت اب اسلام کی دار الاسلام کا خاتمہ ہو گیا

اے مسیحائے چرخِ چہارم نشیں تو نے مردے جلائے ذرا شک نہیں
تیری امت کے جور و ستم سے مگر آج زندوں کو جینا بلا ہو گیا

تیری امت کی بھیڑیں تھیں بھیڑیں کبھی اب تو دنیا کی حالت بدل سی گئی
تیری ہر بھیڑ خونخوار ہونے لگی تیرا ہر امتی بھیڑیا ہو گیا

اے طبیبِ عجم اے مسیحِ عرب لے رہے ہیں سنبھالے ترے جاں بلب
اہلِ اسلام کا آخری وقت ہے دردِ اسلام اب لا دوا ہو گیا

منتظر ہیں نویدِ مسرت کے سب جوش دریائے رحمت میں آئے گا کب
شافعِ روزِ محشر ہے تیرا لقب اٹھ کہ دنیا میں محشر بپا ہو گیا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد اتحادی ممالک نے ترکی اور عرب ممالک پر قبضہ کر لیا۔ ایران اور افغانستان پر بھی انگریزوں کی سیادت تھی۔ گویا ساری دنیائے اسلام اتحادیوں کے قبضے میں آ چکی تھی۔ ترکی کو تھوڑے عرصے میں غازی اعظم مصطفےٰ کمال اتاترک نے آزاد کرا لیا اور انقرہ میں ترکی کی آزاد جمہوری حکومت قائم کر لی۔ عالم اسلام کو آزاد کرنے کے لئے برصغیر میں تحریک خلافت کے نام سے ایک ہمہ گیر تحریک چلائی گئی۔ جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ انہیں ایام میں مولانا نے ایک طویل نظم غازیٔ اسلام کے عنوان سے لکھی۔ اس میں آپ نے تحریک خلافت کا پس منظر بیان کیا ہے مولانا نے نہایت بے باکی سے کہا ؎

کشورِ برطانیہ کا وہ خدائی فوجدار — زندگیٔ چند روزہ کی طرح بے اعتبار
حکم برداری ہے جس کے جور کا مشہور نام — قوم اٹلی سے لیتا تھا صلیبی انتقام
مجلسِ اقوام میں وہ اہلِ عالم کے کفیل — کر رہے تھے قوم عثمانی کو برباد و ذلیل
آہ لائڈ جارج کی دنیا میں بدنامی نہ پوچھ — گرگِ باراں دیدۂ یورپ کی ناکامی نہ پوچھ
مسلم آزادی کی دھن میں اپنی عزت کھو گیا — چاہ کن را چاہ در پیش آخر شد سچ ہو گیا
اے وہ یورپ نام جس کا ایشیا آزار ہے — اے کہ دنیا کے لئے اک فتنۂ بیدار ہے
بڑھ چلا ہے حد سے تیری بربریت کا جنوں — مغربی تہذیب سے آنے لگی ہے بوئے خوں۔

نقش کر دی پر کرے تاریخ کا قرطاس ہے
جو رہی مظلوم کی امداد کا سامان ہے

اس نظم میں مولانا نے مصطفیٰ کمال اتاترک سے یوں خطاب کیا تھا ؎

اے سپہ سالارِ اعظم اے دبیرِ بے نظیر
اے خدیوِ سیف و قلم اے غازیِ مردانِ سریر

غازیِ اسلام فخرِ قومِ عثمانی ہے تو
شک نہیں امت کے حق میں خالدِ ثانی ہے تو

جمع تجھ میں شانِ دارا شوکتِ اسکندری
عزمِ طارق سطوتِ فاروق زورِ حیدری

یورپ افگن ہے ادب آموزِ قسطنطین تو
دورِ حاضر کا ہے سلطانِ صلاح الدین تو

خود سری یورپ کی رکھی رہ گئی سب طاق میں
تو نے ہلچل ڈال دی معمورۂ آفاق میں

دھاک یورپ میں بٹھا دی تو نے اپنے نام کی
لاج رکھ لی تیری تیغِ تیز نے اسلام کی

ان اشعار میں مولانا کا جوشِ زندگی اور جوشِ کلام دیکھنا ہے یہ عجیب بات ہے کہ مولانا کی غزل سوز و گداز درد و غم اور حسرت ملال کی تصویر ہے۔ لیکن نظم سراپا گلشنِ زعفران اور قہقہہ زار۔ ان دو متضاد صفات کا ایک طبیعت میں جمع ہونا تعجب انگیز ہے۔ مولانا کی زبان نہایت شیریں سادہ اور شگفتہ ہے۔ کلام میں جا بجا محاورات کے موتی منسلک ہیں۔ بعض اوقات نہایت سہل زبان میں شعر کہتے ہیں۔ مثلاً سودا کی مشہور غزل ہے ؎

ساقی کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

اس زمین میں کہتے ہیں ؎

کیا مے ہیں چھلکتے ہوئے سرجوش یہ اے شیخ
اللہ سے ڈر توڑ نہ طوفان ارے کیا میں !

پھر کہتے ہیں ؎

دلِ مایوس مسرت کو نہ بہلا ظالم
یہ کبھی شاد رہا ہے نہ کبھی شاد رہے

دیکھ کر تجھ کو ہوتے نذرِ تحیر مرے ہوش
کیا بتاؤں تجھے تو کیا نظر آتا ہے مجھے

نہ دل بہلا نہ دل کی آرزو بدلی نہ وہ دن بدلے
میں کیونکر اعتبارِ انقلابِ آسماں کر لوں

روح پرواز کرے کیا قفسِ عنصر سے
نہیں بلبل میں اگر طاقتِ پرواز نہ ہو

ہے غمِ مرگ بے کسی جان ترے سپرد ہے
دوستِ بہانہ ساز کا کیجیے انتظار کیا

مان لیا کہ تاجور وہ نہیں اعتبار میں
کہیے تو اپنے دل پہ ہے آپ کو اختیار کیا

ترے دل کا جام مثالِ جامِ جہاں نما ہے ترے لئے
اسے اپنا ساغرِ جم سمجھ اسے اپنا ساغرِ جم بنا

مولانا کے کلام میں بلا کا جوش ہوتا ہے۔ بندشیں بہت چست۔ مصرعے حشو و زوائد سے پاک۔ اور زبان سادہ شیریں اور گنجلک سے مبرا۔

خالد بزمی ایم اے

علامہ تاجور کی شخصیت اور شاعری

بہت پچھتاؤ گے مجھ کو مٹا کر، خوب سن رکھو
کہ شاعر سینکڑوں ہوں گے، نہ ہوں گے تاجور پیدا

مجھے جب یہ خیال آتا ہے کہ تاجور آج اس دنیا میں موجود نہیں ہیں تو میرے
منہ سے بے اختیار یہ نکلتا ہے کہ ——— آہ تاجور! لیکن اس کے بعد جب
اُن کی علمی خدمات اور ادبی کارناموں کا تصور کرتا ہوں تو میری زبان پر
آتا ہے کہ ——— واہ تاجور!

علامہ تاجور مرحوم کا اصلی نام احسان اللہ خان تھا، وہ نسلاً نجیب آباد کے روہیلوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے سالِ پیدائش کے بارے میں ۱۸۹۴ء پر اتفاق ہے۔ جہاں تک اُن کے مقامِ پیدائش کا تعلق ہے تو یہ فخر مشہور صحت افزا مقام نینی تال کو حاصل ہے لیکن علامہ موصوف اپنے مستقل وطن نجیب آباد (یو پی) کی نسبت سے مشہور ہیں۔

اُنہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم کے بعد دیوبند میں پڑھا اور وہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اُنہوں نے مولوی فاضل اور منشی فاضل کی اسناد بھی حاصل کریں۔ کچھ عرصہ بعد وہ دیال سنگھ کالج لاہور میں فارسی کے استاد مقرر ہو گئے اور وفات سے کچھ پہلے تک اسی ادارے سے وابستہ رہے۔ اُن کی تاریخ وفات ۳۰ جنوری ۱۹۵۱ء ہے۔

میرے دل میں اُردو کے جن شاعروں اور ادیبوں کے لئے عقیدت کی حد تک احترام موجود ہے، اُن میں مولانا تاجور مرحوم کو بھی ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ وہ بلاشبہ اُردو کے عظیم محسنوں میں شامل تھے۔

تاجور مرحوم کے نام سے میں پہلی بار پاکستان بننے کے فوراً بعد، ۱۹۴۷ء میں آشنا ہوا۔ یہ آشنائی کسی کی زبان سے اُن کا نام سن کر بلکہ کتاب میں پڑھ کر ہوئی۔

اِس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اُنہی دنوں مجھے "دیوانِ حالی" کا ایک ایسا نسخہ ملا، جو مشہور ہندو اُردو نواز پروفیسر پرشوتم لعل ضیاء نے مرتب کیا تھا۔ اِس نسخے کی یہ خصوصیت تھی کہ اُس کے مرتب نے مولانا حالی مرحوم کے بعض شعروں کی وضاحت کے خیال سے کہیں کہیں دیگر شعراء کے مشترک المفہوم یا قریب المعنی اشعار دے دیئے تھے۔ اِس سلسلے میں جہاں مولانا حالی کا یہ شعر تھا کہ ؎

تیغ ہیں بُرّش یہ اے حالی! نہیں
جس قدر تیری زباں کرتی ہے کاٹ

وہاں اس کے حاشیے میں تاجور مرحوم کا یہ شعر درج تھا:

تاجور! اشعر ترے سن کے تڑپ جاتا ہوں
ہائے جو تیری زباں پہ ہے وہ خنجر ہی نہیں

یہی وہ شعر ہے جو پڑھ کر میں پہلی بار تاجور مرحوم کے نام سے آشنا ہوا تھا۔ یہ شعر اپنے مفہوم کے اعتبار سے ایسا ہے، جو پڑھنے یا سننے کے بعد تاجور کے باقی اشعار بھی پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ میرے دل میں اُن کے اور اشعار پڑھنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔

تاجور کے نام سے اس آشنائی کے کچھ ہی عرصہ بعد مجھے اُن کی زیارت کے مواقع بھی مل گئے۔ یہ غالباً ۱۹۴۸ یا ۱۹۴۹ء کی بات ہے کہ میں دیال سنگھ پبلک لائبریری میں اخبارات و رسائل کے مطالعے کی غرض سے نسبت روڈ پہ جایا کرتا تھا۔ اُن دنوں میں اکثر لائبریری سے باہر بنچ پر ایک منفرد وضع و ہیئت کے شخص کو دیکھتا، جو عام طور پر سرخ رومی ٹوپی اور سفید لباس پہنے ہوتا تھا۔ وہ شخص وہاں اکیلا ہی نظر آتا تھا اور شاید آنے جانے والوں کی نگرانی کے خیال سے وہ باہر بیٹھا ہوتا تھا۔ میں وہاں اکثر آتا اور کچھ دیر پڑھنے کے بعد چپ چاپ واپس چل دیتا تھا۔

ایک روز میرے ایک دوست نے بتایا کہ اُن کا نام تاجور ہے اور یہ لائبریری کے اوپر کی عمارت میں اہل و عیال کے ساتھ رہتے ہیں۔ مجھے جب یہ بات معلوم ہوئی تو قدرتی طور پر میں بہت خوش ہوا۔ اس کے بعد میں موقعہ پا کر اُنہیں سلام بھی کر دیتا تھا۔ لیکن خواہش کے باوجود مجھے اُن کے نزدیک جا کر اُن سے گفتگو کی جرأت نہ ہو سکی۔ میرے ذہن پہ اُن کی علمیت و فضیلت کا جو رُعب تھا، یہ غالباً اُسی کا اثر تھا جس کے باعث میں دل سے اُن کے قریب ہونے کے باوجود اُن سے دُور رہا اور ہم دونوں کا تعلق آخر تک "السلام علیکم" اور "وعلیکم السلام" سے آگے نہ بڑھ سکا۔

اُنہی دنوں کی بات ہے کہ میں ایک روز اپنے سکول کی لائبریری میں گیا تو میں نے وہاں "پریم" کے بہت سے شمارے دیکھے۔ میں اُن دنوں اسلامیہ ہائی سکول (خزانہ گیٹ) وچھووالی لاہور کا طالب علم ہوتا تھا۔ اس کی عمارت میں پاکستان کے قیام سے پہلے سناتن دھرم ہائی سکول ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے کے ہندو ماسٹر اپنے طلبہ کے لئے "پریم" خاص طور پر منگواتے تھے۔

اس رسالے کے ادارے میں جن حضرات کے نام شامل تھے وہ مولانا تاجور نجیب آبادی، پنڈت میلا رام وفا اور سورج پرکاش نقاد تھے۔
اس رسالے کے روحِ رواں دراصل تاجور مرحوم ہی تھے۔ "پریم" کے مختلف شمارے دیکھ کر مجھے تاجور کے بارے میں کچھ اور باتیں جاننے کا موقعہ ملا جن سے اُن کی ادبی خدمات کا ایک خاص پہلو میرے سامنے آ گیا۔ یہ پہلو اس اعتبار سے خاص طور پر قابلِ قدر ہے کہ مولانا مرحوم نے ہندوؤں اور سکھوں کو ساتھ ملا کر اُن کے دلوں میں بھی اُردو کی ایسی محبت پیدا کر دی جو اٹوٹ اور اٹل تھی۔

تاجور مرحوم کے شاگردوں میں جہاں مسلمان کثیر تعداد میں شامل تھے، وہیں کئی ہندو اور سکھ بھی تھے۔ دیکھا جائے تو یہ مرحوم کا بہت بڑا کمال تھا کہ اُنہوں نے اپنی کوشش سے غیر مسلموں کے دلوں میں بھی اُردو سے لگاؤ پیدا کر دیا۔ یہ لگاؤ بعض صورتوں میں اس قدر پائیدار اور لازوال تھا کہ اُس کے نتیجے میں آج بھی بعض ہندو اور سکھ اُردو کی بقا اور ترویج کے لئے پروانہ وار جاں نثاری کا ثبوت دے رہے ہیں۔

مولانا تاجور مرحوم نے لاہور کے مشہور کتب فروش ادارے میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز کے تعاون سے "اردو مرکز" کے نام سے ایک دارالاشاعت قائم کیا اور اس کے زیرِ اہتمام لائبریریوں کے لئے مفید اور معلوماتی مجموعے شائع کئے۔ ان مجموعوں میں تصویرِ مناظر، پیامِ زندگی اور اردو افسانے وغیرہ شامل ہیں۔ یہ مجموعے آج بھی بعض لائبریریوں میں موجود و محفوظ ہیں۔

مولانائے موصوف نے شعر و سخن کے علاوہ صحافت کے میدان میں بھی بہت مفید کام کیا ہے۔ اُنہوں نے وقتاً فوقتاً جن جرائد و رسائل کی

ادارت کے فرائض سر انجام دیئے۔ اُن میں مخزن، ہمایوں، شاہکار اور ادبی دنیا کے علاوہ آفتاب، اُردو اور تاج الکلام بھی شامل ہیں۔

ان میں سے "ادبی دنیا" مولینا مرحوم کے زمانے میں کافی بڑے سائز پر چھپتا تھا، جسے اب عام طور پر "جہازی سائز" کہا جاتا ہے، بعد میں یہ رسالہ منصور احمد (مرحوم) اور مولینا صلاح الدین احمد (مرحوم) نے خرید لیا تھا۔

"شاہکار" کے زمانۂ ادارت میں اختر شیرانی مولینا کے دستِ راست کے طور پر کام کرتے رہے ہیں۔ یہاں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ اختر کے والد حافظ محمود شیرانی اگرچہ تاجور کے مخالفین میں شامل تھے، لیکن اس کے باوجود اختر اُن کے مداحوں میں شریک تھے۔

تاجور مرحوم صلح جو قسم کے انسان تھے کچھ لوگ اُن کی ادبی شہرت کے باعث اُن کے مخالف بھی ہو گئے تھے، لیکن وہ انتہائی مخالفت کے باوجود اپنے مخالفوں کا ذکر کرتے ہوئے انسانیت کے درجے سے نہیں گرتے تھے۔

عبدالمجید سالک بھی کسی زمانے میں مولینا تاجور کے مخالفین کی فہرست میں شامل تھے اور وہ حسبِ عادت تاجور کے بارے میں بھی کبھی کبھی افکار و حوادث میں چھیڑ چھاڑ کر دیتے تھے، لیکن اس کے باوجود جب تاجور اُن سے ملتے تو اُن کا خلوص سب کچھ فراموش کر دیتا تھا۔ اس بات کا اعتراف خود سالک مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔

مجموعی طور پر تاجور مرحوم کی شخصیت متعدد اوصاف کا حسین مجموعہ تھی۔ وہ بیک وقت ایک ممتاز شاعر، منفرد ادیب اور مشاق صحافی تھے پھر ان سب سے بڑھ کر وہ ایک "عظیم انسان" تھے، جو اُن کی شخصیت کی سب سے بڑی خوبی تھی۔

اگر مولینا تاجور مرحوم کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے شعر و ادب، صحافت، تصنیف و تالیف وغیرہ ہر میدان میں قابلِ قدر کام کیا ہے۔

میں چونکہ سب سے پہلے اُن کی شاعری ہی کے باعث اُن سے متاثر ہوا ہوں، اس لئے اس مختصر مضمون میں خاص طور پر اُن کی شاعرانہ حیثیت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

تاجور مرحوم شعر کے میدان میں صفِ اوّل کے شاعر تھے۔ اُن کے شعر میں تاثیر کا جوہر نمایاں تھا۔ اُن کے اکثر اشعار میں گہرائی اور گیرائی دونوں اوصاف موجود ہیں۔ کسی نقاد نے کہا ہے کہ "اچھا شعر وہ ہے جو سنتے ہی یا پڑھتے ہی دل میں اُتر جائے۔" میرا خیال ہے کہ تاجور کے اکثر شعروں میں یہ خوبی موجود ہے، یہی وجہ ہے کہ تاجور کے کئی اشعار ایک ہی بار سُن کر یا پڑھ کر ہمیشہ کے لئے حافظے کا حصہ بن جاتے ہیں۔

میں اُن کے جن شعروں سے زیادہ متاثر ہوا ہوں، وہ ذیل میں درج کرتا ہوں۔ دیکھئے اُن میں کس قدر روانی اور جولانی ہے۔

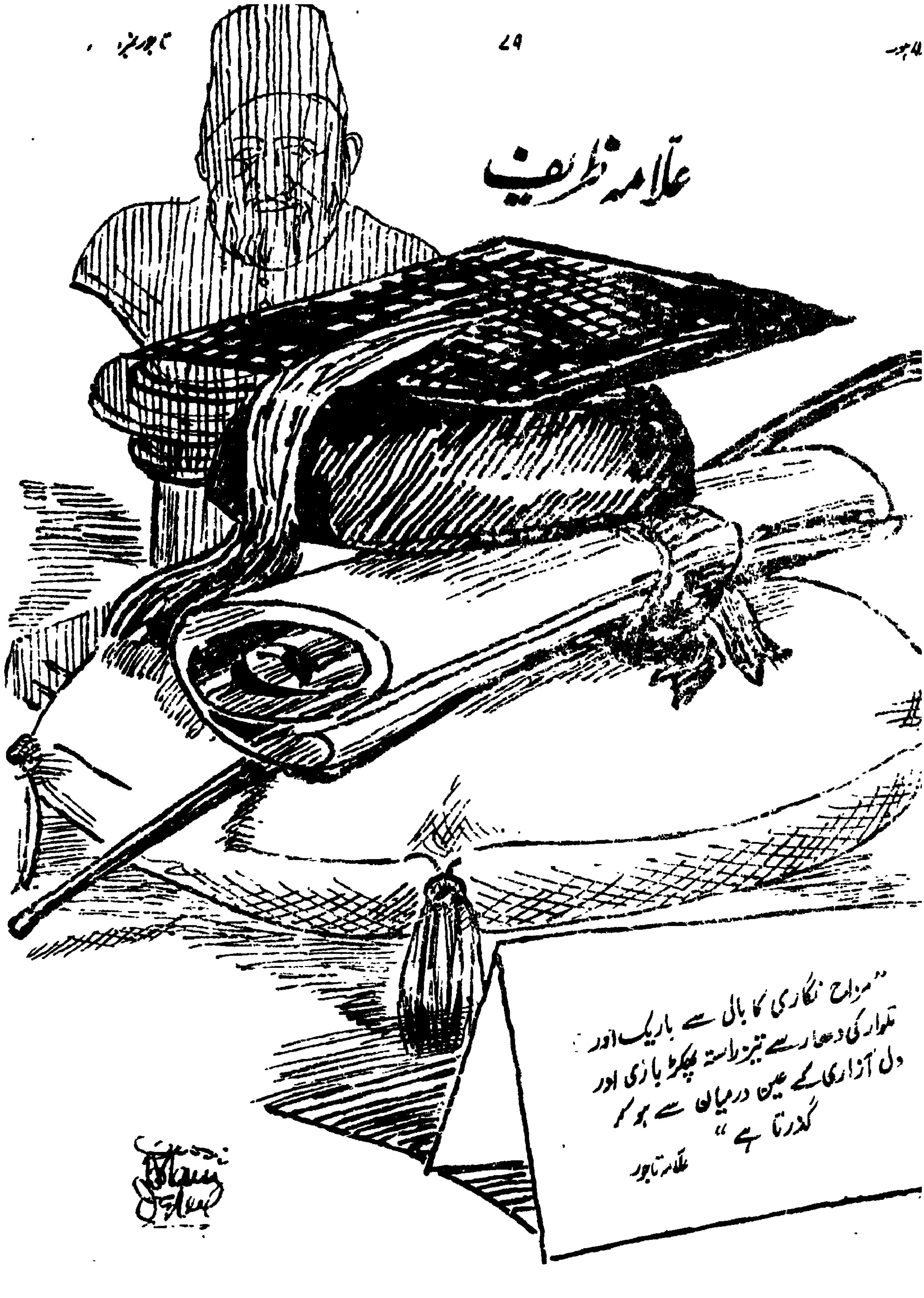
ایک غزل میں فرماتے ہیں:

محبت میں زباں کوئی فوا سنج فغاں کر لوں
شکستہ دل کی آہوں کو حریفِ آسماں کر لوں

نہ دل بدلا، نہ دل کی آرزو بدلی، نہ وہ بدلے
میں کیسے اعتبارِ انقلابِ آسماں کر لوں

(باقی صفحہ ۲۵۰ پر)

لے اختر شیرانی مرحوم مولینا کے شاگرد تھے۔


علامہ ظریف
"مزاح نگاری کا بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے تیز راستہ پھکڑ بازی اور دل آزاری کے عین درمیان سے ہو کر گذرتا ہے"
علامہ تاجور

علامہ تاجور علامہ ظریف کے روپ میں

ادب میں طنز و مزاح کی حیثیت ایسی ہے جیسے کھانے میں نمک کی ہوتی ہے۔ جس طرح نمک کی کمی یا زیادتی کھانے کو بے مزہ کر دیتی ہے اسی طرح مزاح نویسوں کی بے اعتدالی ادب کو کیف و کم سے عاری بنانے کا سبب بنتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے یہ صنف تمام اصناف سے زیادہ لطیف اور نازک ہے۔

عام طور پر طنز و مزاح اس بات کو سمجھا جاتا ہے۔ کہ کوئی صاحب نوکِ قلم سے لوگوں کے قلوب کو مجروح اور چہروں کو لہو لہان کرتے چلے جائیں۔ کسی کے خاندانی عیوب بیان کریں اور کسی کی جسمانی خامیوں کو ہدفِ تنقید بنائیں۔ چنانچہ ہمارے ہاں مزاح نویسوں اور طنز نگاروں کی ایک بڑی تعداد اسی راستے پر گامزن ہے۔

اس سلسلے میں علامہ تاجور کا انداز سب سے الگ ہے۔ انہوں نے مختصر الفاظ میں طنز و مزاح کی تعریف یہ بیان کی ہے۔ کہ مزاح نویس جس کے بارے میں لکھے وہ بھی اس کی تحریر پڑھ کر محظوظ ہو۔

مولانا نے علامہ ظریف کے قلمی نام سے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا ایک طویل سلسلہ قلمبند کیا بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اپنی یہ ادبی حیثیت انہیں نسبتاً پسند تھی۔ ان صفحات میں ہم علامہ مرحوم کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا انتخاب پیش کر رہے ہیں۔ ان تحریروں کی اس مسلمہ حیثیت کے علاوہ۔ کہ یہ طنز و مزاح کے صحیح معیار پر پوری اترتی ہیں ایک بات قابلِ ذکر ہے۔ کہ یہ افادیت کے اعتبار سے بھی قابلِ قدر ہیں۔

اپنی کہانی اپنی زبانی

خوشتر گرامی کا حکم ہے کہ "بیسویں صدی" کے خاص نمبر کے لیے اپنے حالات زندگی لکھ کر دیجیے۔ میرا حال یہ ہے کہ کوئی حال ہی نہیں رکھتا۔ بے حالی، خوش حالی، بس بے حالی میں زندگی بیت رہی ہے۔ خوشتر کا خوف نہ ہوتا تو صاف انکار کر دیتا۔ مگر ڈرتا ہوں کچھ حالات ہوں یا نہ ہوں بنانے پڑیں گے۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ کیا ہے کہ ذرا سی بات کے لیے بھلا خوشتر کا کیا خوف۔ درست ہے۔ دیکھی (آپ نے) بھی ہے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ یہ کام بھی چھوٹا نہیں۔

آپ کو خوشتر سے واسطہ نہیں پڑا۔ اس لیے خوشتر کا خوف آپ کے لیے بے حقیقت چیز ہے اور بدقسمتی سے مجھے اس سے واسطہ پڑ چکا ہے پر تو ہوا ہے! حق الیقین، علم الیقین یہ ہے کہ جن جن بدنصیبوں کو اس سے واسطہ پڑ چکا ہے خوشتر کے ساتھیوں ان کے تراشے آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ "ترکی چھٹے اور تازی پہنچے" کی مثل آپ نے بھی سن رکھی ہوگی۔ بس کچھ ایسی ہی بات ہے۔ خوشتر کا خوف نہ ہوتا تو اس سلسلے میں کچھ تفصیلات بیان کرتا۔ اچھا جانے دیجیے اس قصے کو۔ لیے دیے اکھیڑنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ بس سب اپنے آپا ہی آرا ہے۔

ہاں تو حالات زندگی! ظالم نے کیا بے موقع سوال کیا ہے جب کہ اصل زندگی ہی کوئی زندگی نہ رہی۔ حالات کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ حالت یہ ہے کہ بے بال سپید ہو چکے ہیں اور داڑھی مونچھ کے بھی۔ ایک داڑھی مونچھ ہی پر کیا ہے بالوں کی کھیتی پر برف پڑی ہے ڈر یہ ہے کہ پلکیں اور بھویں بھی کہیں اس لپیٹ میں نہ آجائیں۔

اگرچہ عمر کے لحاظ سے میں ابھی بوڑھا نہیں ہوا مگر کچھ حالات اور بہت کچھ صدمات نے بوڑھوں سے بدتر بنا دیا ہے۔ خوف یہ ہے کہیں سر نہ ہلنے لگے، اس خیال سے مجھے بڑی وحشت ہوتی ہے۔

بچپن میں سر ہلتے بوڑھوں پر ہنسا کرتا تھا۔ یعنی بوڑھوں کو اقراری انداز میں آگے ہی جانب سر ہلاتے دیکھا تو بات بنائی کہ یہ کہتے ہیں "ہاں ہاں موت ضرور آئے گی"۔ کچھ بوڑھوں کو دائیں بائیں سر ہلاتے دیکھا تو کہہ دیا کہ یہ کہہ رہے ہیں "نہیں نہیں موت کبھی نہیں آئے گی۔" اب کہ میں خود بھی سر ہلانے والی آبادی میں داخل ہو رہا ہوں ڈرتا ہوں کہ کہیں اثبات یا نفی میں سر نہ ہلانے لگوں اور وقت کے بے تمیز بچے میرے سر ہلانے سے میری طرح فلسفیانہ نکتے نکالنے لگیں۔ خیر۔ جو کچھ نہ دیکھنا تھا ناچار دیکھا۔

میرا جسم بھاری واقع ہوا ہے اور ہاتھ چھوٹے چھوٹے۔ اس سے پہلے خود مجھے بھی خبر نہ تھی۔ بیس برس پہلے ایک ہمسائی نے میری بیوی سے کہا "آپ کے مولینا صاحب وہی ہیں نا جن کے ہاتھ چھوٹے چھوٹے ہیں"۔ بیوی عقلمند نے یہ کہانی مجھے سنا دی۔ اس پر مجھے شبہ ہوا کہ شاید وہ سچ کہتی ہے۔ اب یہ شبہ بڑھتے بڑھتے یقین کی حد تک پہنچ چکا ہے کہ واقعی میرے ہاتھ جسم کے مقابلے میں کچھ چھوٹے ہیں۔

اب میری بوڑھی خواہشوں میں سے یہ تمنا بھی اکثر سر ابھارتی ہے کہ کاش میرا جسم دبلا ہو جائے اور ہاتھ لمبے۔ جانتا ہوں کہ جب جائز آرزوئیں ہی پوری نہیں ہوتیں تو زندگی کا یہ معجزہ کیونکر نمودار ہو سکتا ہے کہ جسم دبلا ہو جائے اور ہاتھ لمبے۔ خیر جسم تو فاقہ کشی سے دبلا بھی ہو جائے ہاتھ بھلا کیسے لمبے ہو جائیں گے۔ اور اول تو جسم کا دبلا ہونا بھی میرے لیے دشوار ہے۔ کیونکہ فاقہ کشی پولیس کی ہتھکڑیوں کے بغیر مجھ سے نہیں ہو سکے گی۔

اب رہا پیٹ کا سوال تو یہ بھی "خود کردہ را علاجے نیست"۔ جو آدمی دن رات مرغن غذائیں کھائے اور بہر چائے کو جھنجھٹ سمجھتا ہو اس کا پیٹ بڑھے گا یا گھٹے گا۔ تو جناب آپ کو اچھا معلوم ہو یا برا۔ پیٹ تو نہ گھٹے بڑھے ہی جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ آپ مجھے دیکھا کریں [illegible]۔

ف۔ مدیر "بیسویں صدی" دہلی۔ سابق لاہور

بوٹے پیٹ سے واسطہ نہ رہیں،

رنگ روغن: جوانی میں میرا رنگ سرخ تھا۔ اب بڑھاپے کے ساتھ رنگ بدل رہا ہے، پہلے زرد پڑا، پھر سنبل اور اب سیاہ ہو کر رہ گیا ہے، آدمی کے رنگ روپ کی یہ آخری ترقی ہے۔

دانت: عہد جوانی میں میرے دانت خوبصورت سمجھے جاتے تھے، گھر کی عورتیں کہا کرتی تھیں کہ ماشاءاللہ دانت ہوں تو ایسے ہوں، جیسے چنیاں جڑی ہوئی۔ اب کیا پوچھتے ہیں؟ بدقسمتی سے ایک ماہر امراض دندان کو دوست بنانے کا نتیجہ ہے کہ منہ اُن مرحوم چنیوں سے خالی ہو چکا ہے، اب تو اُن ہیروں کی چنیوں کی جگہ ایک چھوٹی سی کوڑی اوپر کے جبڑے میں قبر کے مجاوروں کی طرح گم شدہ ہیروں کا ماتم کر رہی ہے۔ اور نچلے جبڑے میں چار پانچ دانت نام کے بدشکلے ٹکڑے پل رہے ہیں۔ البتہ اناڑی دنداں سازوں نے کسی مردے کا جبڑا منہ میں ضرور فٹ کر دیا ہے، جسے کھانے کے وقت منہ سے الگ کرنا پڑتا ہے۔

آنکھیں: مرحوم آنکھیں جب زندہ تھیں، خوبصورت سمجھی جاتی تھیں، کہتے ہیں ان میں بڑا رس تھا اور اب رس دس تو نام کو بھی نہیں۔ ہاں دیکھنے کا کام ضرور کچھ نہ کچھ دیتی ہیں، دور کی بینائی عمر کے لحاظ سے بہت تیز ہے، دن کا وقت ہو تو باریک تحریر بھی عینک کے بغیر پڑھ لیتا ہوں، جب سے انہیں آنکھوں کی بیماری کے ماہر ڈاکٹر دولت رام کے سپرد کیا ہے، انہوں نے اندھا ہونے کی خوشخبری سنا دی ہے، بائیں آنکھ پر کچھ ویلاگ ساطاری ہے، انگریزوں نے دونوں آنکھوں میں پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔

ایک دن بھولے سے ایک دوست کے غلط مشورے کا شکار ہو کر پرل کلوریم آئی ڈراپ کے دو قطرے ڈال بیٹھا تھا، وہ دو قطرے تھے یا لوہے کے دو تپتے، نہ جانے کیا تھے جو آنکھ ہی نکلنے پر تیار ہو گئے۔ سر پیٹ لیا اور آنکھیں بھی۔ دو سال ہو چکے وہ تڑپ ابھی تک یاد ہے۔

پھر کسی دوست نے آنکھوں کی مشہور دوا ریڈیم آئی ڈراپس کی تعریف کی، اس شریف دوا نے آنکھیں چھیننے کی کارروائی تو نہیں کی، البتہ اتنا ضرور ہوا کہ نظر شاید ضرورت سے بہت زیادہ تیز ہو گئی یعنی ایک ایک کے دو دو دکھائی دینے لگے، کسی نے ایک روپیہ دیا تو مجھے دو روپے ملے اور خود کسی پر مہربان ہوتے جیب سے روپیہ نکالا تو وہ ایک کے دو دکھائی پڑے، پھر جیب میں ڈال لیا کہ ایک کی جگہ دو دینے کی گنجائش نہ پائی۔

رات کو سو کر صبح جاگتا ہوں تو رطوبت کے ہجوم سے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ گھر کا ننھا بچہ اور میں اس پہلو میں ایک سے جیسے ہیں، مگر بچے کی ماں تو اُس کی آنکھیں یہ گیت گاتے ہوئے دھلاتی ہے کہ

"چیچی چیچی کوا کھائے۔ دودھ ملائی میرا ننھا کھائے"

اب بتائیے میں کس کی ہائے کہاں کہوں، گھر میں کسی کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ میری آنکھیں دھلائے اور یہ گیت گاتے کہ

"چیچی چیچی کوا کھائے۔ دودھ ملائی میرا بڈھا کھائے"

ہائے بڑھاپا وائے جوانی!

ذیابیطس: گزشتہ جنگ کی مصیبتوں میں سے راشننگ کی مصیبت سب پر طاری ہے۔ قدرت کو یہ بات پسند نہ آئی، شکر کا راشن دیکھ کر شکر کم کھلی تو دے کر دی۔ اب بھلا شکر کی کیا کمی، ہو شکر ہی شکر، کر جسے کھائے جائیں تو وہ بھی شکر بن جاتے ہیں۔

وہی کہاوت کہ "پیسہ والے کے سو یار" شکر کا بازار چڑھا تو اس نے دوسرا دروازہ کھول دیا، اب محلے میں جسے شکر نہ ملے وہ مجھ سے بات کرے۔

ابھی یہ ہے میری زندگی اور یہ کچھ ہیں اس کے حالات! بات ختم ہوتا ہے داستان یہ ہے کہ انیسویں صدی دم توڑ رہی تھی کہ میں نے زندگی کو دم دینا شروع کیا اور اب کہ بیسویں صدی کا نصف پہنچ رہی ہے زندگی کی سڑک پر بھاگتے بھاگتے میرا دم خفا ہو رہا ہے۔ غرض کہ

"ہمارا حال یہ ہے تم بھی ہنس دینے سن کر
اب اور اس سے زیادہ خراب کیا ہوگا"

علامہ [illegible]

کیا ہم بوڑھے ہو رہے ہیں؟

پچھلے دنوں سے یار دوستوں میں ہماری عمر کے متعلق سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ اصل یہ ہے ہماری عمر ہی کچھ ایسی ہے اور جب ہم اپنی عمر بتاتے ہیں تو زیر لب [illegible] ہیں ایک دوسرے کو رمزو کنایہ سے دیکھنے لگتے ہیں [illegible] ہمیں سخت صدمہ ہوتا ہے [illegible] ان کے پرائیویٹ حالات سے تعلق [illegible] یہ لوگ ذرا اس بات کا لحاظ نہیں کرتے کہ کون سی بات پوچھنی چاہیے اور کس بات کو پوچھنا [illegible] ہے کہ دس پانچ دن ناغہ ڈالا اور بات سے بات پیدا کرنے لگے پوچھنے لگے آپ کی عمر کیا ہو گئی [illegible] ہم جواب دیتے ہیں یہی کوئی ۴۰ سال [illegible] تعجب کا اظہار کرتے ہیں ۴۰ سال کل ۴۴ [illegible] ماشاء اللہ ابھی جوان ہیں [illegible] لگتے ہیں

[illegible] کوئی پوچھے کہ اگر ہم ۴۰ سال کے ہیں تو [illegible] کا اظہار کرنے کا کیا حق ہے؟ [illegible] جوان [illegible] کس بات کا [illegible] ہے؟ ہم [illegible] جوان ہیں تو یہ لوگ [illegible] ہو جاتے ہیں؟ ارے صاحب [illegible] جوان پھرتا [illegible] جوان ہونا کوئی [illegible] تو نہیں [illegible] دوستوں کے پاس [illegible] دیکھتے دیکھتے ہم [illegible] ہیں اور اب [illegible] ہیں کہ شہر میں سب سے الگ اور گمنام گوشے میں کوئی مکان کرایہ پر لے کر رہنے لگیں۔ جہاں یہ لوگ پہنچ نہ سکیں مگر مشکل یہ آ پڑی کہ ہندوستان کے جس شہر کو دیکھو اس کے ہر گوشے میں ایک ہولناک قبرستان نظر پڑتا ہے۔ اور قبرستان کو دیکھ کر [illegible] اُدھر جا نکلتے ہیں خواب میں رات بھر قبریں ہی قبریں دکھائی دیتی ہیں۔ اور ہمارا دل زور زور سے دھڑکنا شروع کر دیتا ہے۔ بلکہ خواب کا تسلسل بعض اوقات بڑا اندیشہ خیز ہو جاتا ہے۔ جب ہم خواب میں دیکھتے ہیں کہ لوگ ہمارا جنازہ لئے جا رہے ہیں۔ ہمیں دفن کر رہے ہیں یا دفن کر کے رخصت ہو گئے اور اندھے بہرے دو فرشتے قبر میں نازل ہو گئے ہیں، ہمیں بغیر سلام و دعا پیٹنا شروع کر دیا ہے۔ ہزار شور مچاتے ہیں، وہ پیٹتے ہی چلے جاتے ہیں، ہم خوشامدیں کرتے ہیں اور مجبور ہو کر گالیوں پر اتر آتے ہیں مگر وہ ہجو و ستائش سے بے نیاز دھواں دھو ہمیں پیٹتے ہی چلے جاتے ہیں، ہم زور سے چیخ لگانے ہیں اور آنکھ کھل جاتی ہے پھر [illegible] کو جگاتے ہیں۔ وہ چونکہ ان واردات سے واقف ہو چکی ہیں تسلی دلاسا دیتی ہیں۔ لاحول پڑھتی ہیں ہم سے لاحول پڑھواتی ہیں اور کہتی ہیں۔ معدے سے بخارات دماغ کو چڑھتے ہیں تو بُرے بُرے خواب نظر آیا کرتے ہیں۔ بس بھول جاؤ خواب کو۔ لاحول پڑھو، خدا کا نام لو! پریشان خوابی سے متاثر نہ ہونا چاہیے!

بیوی کے ان تسلی آمیز فقروں سے عموماً ہماری خوابی وحشت دور ہو جایا کرتی ہے۔

ہاں تو ہم یہ کہہ رہے تھے، آج کل کے یار دوستوں کی ستم ظریفیوں سے بہت تنگ آئے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کو اور کوئی مذاق ہی نہیں سوجھتا، بات کا پھونکا اڑا اور ہماری عمر کی چھان پھٹک کرتے۔ اِدھر ہم کچھ دنوں بلکہ برسوں سے ایسے وہمی مزاج ہو رہے ہیں کہ جہاں کسی نے عمر کا نام لیا اور ہم سچ مچ بڑھاپا اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں۔ حالانکہ بفضل ایزدی ہم بالکل جوان ہیں اور مستقبل قریب میں بھی جوانی کو الوداع کہنے کا کوئی خطرہ نہیں دیکھتے۔

مگر خدا جانے یہ کوئی اعصابی کمزوری ہے یا دماغی کہ ہم سے کسی نے عمر کے متعلق پوچھا اور ہم چراغ پا ہو گئے۔

پرسوں کی بات ہے ہم اپنی جوانی کے نشے میں سرشار اپنی بہادری کے کارنامے اپنی بیگم صاحبہ کو [illegible] سے داد لے رہے تھے کہ [illegible] قدرت۔

کو ہماری یہ بلند آہنگی کیا بری لگی کہ باہر سے آواز آئی:

رشید!

رشید: حاضر ہوا۔

رشید باہر گیا اور وہاں سے خبر لایا کہ حافظ عبداللہ[1] تشریف لائے ہیں۔ آنے والے کا نام سن کر ہمارا ماتھا ٹھنکا کیوں کہ بزرگوار ہمارے ہم جماعت ہیں اور بڑے بے تکلف۔ اپنے آپ کو عمر رسیدہ خیال کرتے ہیں اور ہماری جوانی پر آوازے کسنے شروع کر دیا کرتے ہیں۔

پہلے تو جی میں آیا کہ رشید سے کہلا دیں کہ "علامہ صاحب کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں" مگر وہ ظالم یہ کہہ آیا تھا کہ گھر میں تشریف رکھتے ہیں۔ بمجبوراً اُٹھے اور باہر آئے۔ باہر آ کے دیکھا تو اُن کے ساتھ دو چار احباب اور تھے۔ سلام سے پہلے ہی بولے، ارے بابا بوڑھے ہونے آئے اب بھی خانہ نشینی سے جی نہیں بھرا۔ جب آؤ گھر ہی میں نظر آتے ہو۔ کبھی باہر نکل کے بیٹھا کرو گھر گھسنے لوگ اچھے نہیں ہوتے۔

ہم: تم بوڑھے ہونے کو آئے ہوگے ہم تو بڑھاپے کی زندگی کو پسند نہیں کرتے۔

وہ: اچھا تو آپ ابھی تک اپنے آپ کو جوان ہی سمجھے بیٹھے ہیں۔

ہم: جوان نہیں تو کیا خدانخواستہ بوڑھے ہیں ہم؟

وہ: اے میاں تمہاری ہماری عمر ایک۔ پھر ہم تو بوڑھے ہوگئے تم جوان کیسے رہے؟

ہم: تم بوڑھے ہوگئے ہوگے ہم تو اللہ کے فضل سے جوان ہیں۔ پھر تمہاری ہماری عمر بھی ایک نہیں؟

وہ: اچھا کیا ہے عمر آپ کی؟

ہم: کوئی چونتیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔

وہ: ۳۵ء میں بھی تم نے اپنی عمر یہی بتائی تھی۔ ان دس سال کو کیوں نگل گئے؟ تم طالب علمی میں بھی مجھ سے زیادہ عمر کے تھے۔ اب میری عمر چوالیس کے قریب ہے، دو سال بھی بڑے ہو تو چھیالیس کو پہنچ چکے ہو گے اور اس کے بعد کلمۂ شہادت"

ہم: چلو باتیں نہ بناؤ۔ خدا جانے کن کن غلط کاریوں میں زندگی خراب کر چکے ہو۔ بڑھاپے سے پہلے بڑھاپا خرید لیا۔ تمہاری عمر زیادہ سے زیادہ $\frac{35}{4}$ کی ہوگی اور ہم تم سے علم و فضل کے لحاظ سے بڑے تھے، نہ کہ عمر میں بھی۔ تم بوڑھے بن چکے ہو تو ساری دنیا بوڑھی ہی نظر آتی ہے۔ ہمارا بڑھاپا تو کہیں بیس پچیس برس کے بعد شروع ہوگا۔

وہ: اُس وقت تک تو دوست تمہیں مرے ہوئے پندرہ سال ہو چکے ہوں گے۔ بوڑھے ہو چکے ہو۔ ہندی کی مثل ہے۔ بچپن کے بعد جوانی، جوانی کے پیچھے بڑھاپا اور اس کے بعد موت! تو علامہ صاحب اب بس آخری منزل قریب ہے۔

ہم: تمہاری ہوگی آخری منزل قریب کیوں کہ بوڑھے بن گئے ہو، ہم تو جوان ہیں جوان سنا آپ نے؟

وہ: بالوں میں سپیدی دوڑ رہی ہے۔ اب کوئی دن میں ہوئے بگلا بھگت۔ دانت کچھ نکل گئے کچھ ہل رہے ہیں دو چار سال میں پوپلے بھی ہو جاؤ گے، چہرے پر جھریاں پڑ رہی ہیں، دو قدم چلتے ہو تو سانس پھول جاتا ہے۔ یہی بڑھاپا ہے یا بڑھاپے میں سینگ نکلا کرتے ہیں۔

ہم: بالوں میں سپیدی کی جو کہتے ہو تو وہ بڑھاپے کی وجہ سے نہیں بلکہ ہم نزلی مزاج واقع ہوئے ہیں۔ تم جانتے ہو نزلہ بالوں کو سپید کر دیا کرتا ہے، رہا دانتوں کا ہلنا اور اکھڑنا۔ پائیوریا کا کوئی علاج ہوتا تو دانت ہلتے نہ اکھڑتے۔ ہم نے پائیوریا سے نجات پانے کے لئے دانتوں سے دست بردار ہونے دی۔ زمانے کا رواج ہے اور کچھ نہیں تم نے سنا نہیں امریکہ میں نوجوان لوگ بھی دانتوں کو اکھڑوا کر مصنوعی لگا لیا کرتے ہیں اور یہ ایک فیشن سا ہو گیا ہے۔ تمہیں

---

[1] مولانا حافظ عبداللہ ایم۔ ایل۔ اے (لائلپور)

کہو تمہارا کوئی دانت نہ ہلتا ہے نہ نکلوایا گیا تو کیا اس سے تم جوان کہلانے لگو گے؟ ہم دانتوں کو جوانی کے لئے ضروری نہیں سمجھتے رہی بالوں کی سپیدی، یہ بھی عمر رسیدگی کی وجہ سے نہیں۔ ہمارے بھانجے جیون کے بال سپید ہونے لگے حالانکہ ابھی اُسے پندرھواں سال لگا ہے، ہمارے شاگرد فاخر[1] کے دانت ہل رہے ہیں اس کا سبب یہ تو ابھی جوانی بھی پورے طور پر نہیں آئی۔

مختصر یہ کہ احباب ہمارے جواب سے مطمئن نہیں ہوتے حالانکہ ہم غیر معقول اور غیر مدلل باتیں کرنے کے عادی نہیں۔ ہمارے بڑھاپے کے متعلق ان کا اصرار بڑھتا جاتا تھا اور ہمارا انکار۔ ہم نے بہت سوچا، آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ آئینہ بھی کم بخت دشمنوں کی سازش میں شریک معلوم ہوا۔ ہمارے منہ پر کہیں بھی جھریاں قطعی نہیں مگر آئینے میں جو چہرہ اپنے سے ملتا جلتا ہم دیکھتے ہیں اُس پر بہت سی جھریاں دکھائی دیتی ہیں۔ یقیناً وہ ہمارا چہرہ نہیں۔ یہ بھی کیسے سکتا ہے جوان آدمی کے چہرے پر جھریاں نہیں ہوا کرتیں ہم جوان ہیں، بخدا بالکل جوان، پھر آئینے میں جو صورت دکھائی دیتی ہے وہ کس کی ہے؟ کسی کی ہو گی ہماری تو نہیں، ہے ایک دن یہ سمجھ کر کہ ہمارا آئینہ غلط بیانی کر رہا ہے کوکب صاحب کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ اس شریر نے بھی ہمارے سامنے ہماری بجائے کسی بوڑھے کا چہرہ پیش کر دیا۔ ہم حیران ہیں کہ آئینے ہمارے خلاف کب سے ہو گئے۔ ان کم بختوں کا ہم نے کیا بگاڑا ہے پچھلے سال صوبے کے ایک وزیر نے کہا تھا کہ "علامہ ظریف ابھی "نوجوان" ہیں ورنہ ان کے علم و فضل اور خدمات علمیہ کا تقاضا یہ تھا کہ اُن کے لئے خطاب کی سفارش کی جاتی"۔

واقعہ ہے ہر شخص اس کی تصدیق کر سکتا ہے۔ آخر انہیں بدنیتی کیا پڑی تھی کہ ہمیں بے وجہ "نوجوان" بتاتے: "نوجوان" پایا تو بتایا۔ "تا نہ باشد چیزکے مردم نگویند چیزہا"

بات یہ ہے کہ آج کل ہم عصروں میں حسد کا مادہ زیادہ ہو گیا ہے۔ اسی لئے تو ہمارا ہر ساتھی ہمیں بوڑھا بتاتا ہے۔ ادھر ہم ہیں چونکہ خدا کے فضل سے کوئی اور عیب ہے نہیں۔ لوگوں کو جب کوئی اور برائی ہم میں نہیں ملتی تو بوڑھا کہہ کر اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنا چاہتے ہیں، ورنہ دل سے ہمیں کوئی بوڑھا نہیں سمجھتا۔ سمجھے بھی کیسے خدا نہ کرے ہم ابھی سے بوڑھے کیوں ہونے لگے!

کل کی بات ہے، ہماری شادی رچائی جا رہی تھی، گھر کے بڑے بوڑھے سر پر سہرا باندھ رہے تھے۔ پیارا رنگ سہرے کے پھولوں سے چھلک رہا تھا۔ ہم سسرال میں گئے تو ڈومنیوں نے گانا شروع کر دیا:

"میرا رنگیلا بنا، رنگیلا بنا آیا ری یہ چھیلا بنا"

ہم عروسی جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے، ہم پر جوانی پھٹ پڑی تھی، صحت سیبے کی طرح ہمارے ہر عضو بدن پر طاری تھی۔ اس بات کو زیادہ سے زیادہ بارہ تیرہ برس گزرے ہوں گے۔ بھلا کوئی پوچھے اتنی سی دیر میں ہم بوڑھے ہو گئے؟ کیا واہیات خیال ہے۔ اب بھی اگر ہماری دوسری بیوی خودکشی کی دھمکی دینی چھوڑ دیں تو ہم ایک اور شادی کرنے کو تیار ہیں۔ پھر کہیں بوڑھے بھی شادیاں کیا کرتے ہیں۔ نہیں ہم بوڑھے ہرگز نہیں ہیں۔ جو ہمیں بوڑھا بتاتا ہے وہ خود بوڑھا ہو گا۔

لیکن ہم یہ ضرور دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے بڑھاپے کے متعلق دوست دشمن اپنے اپنے انداز میں یک زبان ہو رہے ہیں۔ یاد ہوگا جب ہم اپنی دوسری بیگم کو بیاہ کر لائے تو ایک دن ہم نے باتوں باتوں میں کہا کہ بیمہ کمپنی کا ایجنٹ پھر رہا ہے، کہو تو بیمہ کرالیں؟ بیوی بولیں "بیمہ کیا ہوتا ہے؟" ہم نے کہا زندگی کا بیمہ کئی کمپنیاں کرتی ہیں، مثلاً ہم دس ہزار روپے کا پچیس برس کے لئے بیمہ کرالیں۔ جیتے رہے تو ہر تیسرے مہینے ستر روپیہ پریمیم کا ادا کرنا پڑے گا اور پچیس برس بعد سود در سود ملا کر پندرہ سولہ ہزار روپیہ ہمیں مل جائے گا۔ اور اگر خدانخواستہ کسی وقت ہم مر جائیں تو دس ہزار روپیہ اُسی وقت بیوہ کو مل جائے گا۔" ہم ابھی یہ فقرہ پورا کرنے بھی نہ پائے تھے کہ بیوی نے چمک کر کہا "تو یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟ ہم بیمہ دیمہ نہیں کراتے۔ بس اب اس کا ذکر میرے سامنے نہ کرنا بدشگونی ہوتی ہے، مریں تمہارے دشمن برا چاہنے والے، تم جیو ہزاروں برس، دیکھنا مجھے رنج ہوتا ہے بیمہ ہرگز نہ کرانا" ہم نے کان پر ہاتھ رکھے کہ اب یہ ذکر بیگم سے نہیں کریں گے۔ اس بات کو تیرہ چودہ سال گذرے ہوں گے، لیکن دیکھئے زمانے کا انقلاب کل پرسوں ہی کی تو بات ہے

[1] مولانا کے محبوب شاگرد فاخر ہریانوی

ہاں کل پرسوں کی کل چودہ برس کے بعد بیوی صاحبہ نے خود ہی انجان بن کر ہم سے پوچھا، یہ بیمہ کیا ہوتا ہے؟ حالانکہ وہ سب کچھ جانتی ہیں، اُن کے سامنے ہی ہمارے بڑے بھائی بیمہ کرا چکے ہیں، ہاں تو ہم نے جواب دیا کہ چھوڑو بھی اس تذکرے کو، بدشگونی ہوتی ہے۔ کہنے لگیں کہ موت کوئی کالی کا نام نہیں، جوان جوان مرتے چلے جا رہے ہیں، اور تمہارا تو۔۔۔ ۔ ۔ چھوٹی بات ہے کہ پچیس برس کے بعد روپیہ یکمشت مل جاتا ہے۔ بڑھاپے میں کام آئے گا۔ سنا تم نے؟ بس بیمہ کرا ہی لو احتیاط اسی میں ہے، دیکھتے نہیں ہو؟ بڑے بھائی صاحب نے آخر بیمہ کرا ہی لیا۔ اُن کا روپیہ بیوی کے نام جمع ہو رہا ہے۔ آج کل کی بدنصیب بیواؤں کو سینے پرونے کی بھی محنت نہیں ملتی۔ مٹے ان کی صورت۔ سنگر مشینیں چل پڑی ہیں، چکی کی مشقت باقی تھی وہ خراسوں اور پن چکیوں نے ہتھیا لی۔ ان دکھیوں بیواؤں کے لیے در در کی بھیک یا نکاحِ ثانی باقی رہ گیا ہے، اور اللہ کا نام۔

وہ کتھا کی طرح بیوگی کی داستانیں ایک سانس میں سناتی چلی جاتی تھیں اور ہم اُن کا منہ دیکھ رہے تھے سوچتے تھے اللہ میاں چودہ ہی سال میں یہ انقلاب! ایک وہ دن بھی تھا کہ اسی نیک بخت بیوی نے ہمیں اس منحوس ذکر سے روکا تھا آج منہ بھر بھر کر موت، بیوگی، نکاحِ ثانی کا نام لیے جا رہی ہیں، ذرا نہیں جھجکتیں، ہمارا پاسِ خاطر بھی نہیں رہا۔ تو کیا واقعی ہم بوڑھے ہو رہے ہیں! ہم اُٹھے اور ہال کمرے کے بڑے آئینے کو دیکھا، اُس کی شرارت دیکھئے بدتمیز بیوی کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔ ہم نے اُس کا منہ چڑا دیا، اُس نے بھی "جیسے کو تیسا" پر عمل کیا۔ ہم نے یہ کہا، ہیں ٹیڑھا کہیں کا؟ منہ لگانے کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ جی میں آیا چھوٹا آئینہ دیکھیں۔ اُسے جھاڑ پونچھ کر ہم اندر [illegible] رکھ کے دیکھا تو اُس کمبخت کی گستاخی بھی نہ دیکھی جاتی، جھٹ ہمارے روبرو ایک بوڑھا چہرہ کر دیا۔ اُسے بھی بڑے تیکھا [illegible] اتنے میں [illegible] گیا دل نے کہا چھوڑو، کہاں آئینہ دیکھیں گے، وہ تو [illegible] اور تمیز دار بھی۔

اُس کا آئینہ بیٹھے [illegible] ساتھ کا بچارہ قاشوں میں تقسیم ہو رہا تھا۔ آہستہ دیکھا تو ایک کی بجائے چار [illegible] بڑے نظر پڑے، بس ہم سمجھ گئے۔ آئینوں تک ہمارے خلاف سازش ہو رہی ہے۔ حجام کو [illegible] حجامت بنوائے بغیر رخصت کر دیا اور ہم گھر میں پیچھے آگئے۔

اب تو گھر میں قدم رکھتے ہوئے بھی ہم [illegible] لگے ہیں یا تو ہم باہر ہی [illegible] گزارتے تھے۔ [illegible] گھر [illegible] گئے تھے۔ لیکن اب [illegible] گھر سے اُس میں قدم رکھتے خوف معلوم ہوتا ہے۔ [illegible] گلی کی [illegible] بوڑھی عورتیں ہر وقت گھر میں آتی جاتی دکھائی دیتی ہیں۔ ہم نے گھر میں قدم رکھا، انہیں سلام کیا اور لگیں اُلٹی سیدھی دعائیں دینے:

"اللہ بیٹوں کی بہاریں دکھائے، اُن کا بیاہ کرنا نصیب ہو، بیٹے تمہارے سامنے پروان چڑھیں۔ ان کی دلہنیں بیاہ کر لاؤ۔"

کہنے کی تو بات نہیں مگر ہمیں ان دعاؤں سے چڑ سی ہو گئی ہے۔ کوئی بھلی مانس یہ دعا نہیں دیتی کہ "اللہ تمہیں اپنی بہاریں دکھائے، دلہنوں پہ دلہنیں لانی نصیب ہوں، اپنی شادیوں پر شادیاں رچاؤ، جوانی کے سارے ارمان پورے کرو۔" اسی لئے ہم نے اب ان کمبختوں کو سلام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ دعائیں ڈھنگ کی نہیں دینا جانتیں بدتمیزیں۔

پچھلے سال جو ہم پہلا مکان بدل کر اس نئے مکان میں آئے تو گلی کی ان قطامہ بڑھیوں نے غضب ہی ڈھا دیا، گھر میں ہماری بیٹی کو جوان پایا اور ہمارے برادرِ نسبتی کو بھی جوان دیکھا۔ اِدھر ہماری [illegible] ذرا عمر سے کھچی ہوئی ہیں اپنے میاں سے پندرہ بیس سال بڑی ہیں، ہم سب کو دیکھ کر ایک بڑھیا ہماری بیوی سے کہنے لگیں۔ تمہارے ابا کے چہرے پر تو بڑا نور برستا ہے، ہماری بیوی سمجھیں اپنے باپ کو، کہیں کہ آپ نے [illegible] دیکھ کر بھی ہر ایک کا پڑھنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ بولیں ہاں بیبی، ابا ایسے نمازی پرہیزگار ہیں تہجد کبھی قضا نہیں کرتے، ہر وقت تسبیح پڑھتے رہتے ہیں، مگر تم نے [illegible] انہیں کہاں دیکھا؟ وہ تو رام پور میں ہیں۔ کہنے لگیں اے بیٹا! کون ہیں جو باہر سامان کے پاس کھڑے ہیں؟ تو تمہارے ابا ہی معلوم ہوتے ہیں [illegible] کہنے لگیں وہ تو میرے ابا نہیں، ان بچوں کے باپ ہیں۔

بڑھیا نے [illegible] کے پوچھا "[illegible] یہ بچے ان [illegible] ہم تو تمہارے [illegible] سمجھے تھے، بیوی پھر [illegible] جتنے [illegible] بنا رہی ہو یہ میری بھاوج ہیں، یہ سن کر کمبختوں نے ذرا لحاظ بھی نہ کیا، پوچھتی [illegible]

"بیٹا تو کیا تمہارے ان بھائی کی شادی ہو گئی؟ ان کی شادی کی عمر تو نہیں معلوم ہوتی۔ ہم تو انہیں کنوارا سمجھ رہے تھے۔ میری آنکھوں میں خاک ان کے چہرے پر کالک پا لگے۔ جبھی بتا رہا ہے کہ یہ ابھی کنوارے ہی ہیں۔ اسے میری مذاق تو نہیں کر رہی ہو۔ بھلا یہ تمہاری بھاوج کیسے ہو سکتی ہیں تم ہم سے کیا چھپاتی ہو، وہ تو مارے بیٹے کے ان سے زیادہ بڑی ہوں گی۔ ان کے بیٹی ہے یہ تمہاری بھتیجی نہیں ہے؟"

دوسرے چاری ہوش ہی بیٹی کو بیٹی ہی سی دیکھ رہی تھی۔ بیٹیوں ہی کی تنگ ہوتی ہے۔ اب تو ہماری نے ایک دوسری کا منہ دیکھا شروع کر دیا۔ آخر میں جو کچھ ہم نے سنا۔ سب نے یہ کہہ کر عقیق کھڑی ہوگئیں۔ انکل ہم کہ دیکھتے تمہارے ۔ آرہے ہیں یہ فرشتے ہی ہمارا ماتھا ٹھنکا، دل میں سوچا نہ معلوم اب یہ سمجھتے ہوں۔ نہیں رکا، داڑھی بنگلے کے پردہ جیسی ہو گئی ہے۔ بڑی غلطی کی تھی۔ جب ہی تو صاحب نکال کے آنا چاہیے تھا، ورنہ اس تانگے والے نے بھی یہ بات کہی ہوتی۔

(۱۴)

آج سے چند سال پہلے۔ جب ہماری داڑھی کالی کلوٹی تھی جسم بھی تاپو نہ ہوا تھا، چال میں بھی بے تاسفی نہ تھی، اور ہم بازار کے بیچ میں چلنے کے عادی تھے، تانگے والے ہمیں اپنی زد میں دیکھ کر پکارا کرتے تھے،

"بابو جی تانگے سے بچ کے چلیے"!

آج جب نوے سے داڑھی کھچڑی کردی، مٹاپے نے جسم کو گٹھڑ بنا دیا۔ چال اور ارادے میں کشمکش شروع ہو گئی، اور ہم ازراہِ احتیاط فٹ پاتھ پر چلنے لگے ہیں۔ اب وہی تانگے والے یہ کہہ کر ہمیں خبردار کرتے ہیں

"بابا جی بچ کے"!

ہم حیران ہیں کہ اتنی جلدی ہم بابو جی سے بابا جی کیسے بنا دیئے گئے؟ کون سی ایسی تبدیلی پیدا ہو گئی ہم میں؟ اب کبھی کسی ہمراہی کے ساتھ تانگے پر سوار ہونے کا اتفاق ہوتا ہے تو تانگہ چلانے والا بے سوچے سمجھے کہنے لگتا ہے۔

"بڑے میاں آپ آگے آ بیٹھیں تانگہ الال ہو جائے گا"

ہم دل میں بہت جز بز ہو کر آگے بیٹھ جاتے ہیں تو پھر نا معقول یہ شکایت کرتا ہے،

"بابا جی تانگہ دبا ہو گیا آپ پیچھے بیٹھ جائیں"

یہ تار چڑھاؤ ان آداب القاب کے ساتھ ہمیں بہت ناگوار ہوتا ہے۔ مگر ان بے ترتیب لوگوں سے کون روز کی لڑائی مول لے۔

پرسوں کی بات ہے ہم مال روڈ سے آ رہے تھے ریگل کے قریب کسی بات پر دو آدمیوں میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ ہماری جو شامت آئے کھڑے ہو کر تماشا دیکھنے لگے۔ ہمیں کیا خبر تھی دونوں ہم پر مہربان ہو جائیں گے۔ دیکھتے ہی ایک بولا:

"بابا جی آپ انصاف کریں میرا، اور میرا قصور ہو تو آپ باپ کی بجائے ہیں میرے پانچ جوتے ماریں۔"

جی میں تو آیا کہ پہلے اس سعرے کی جوتوں والی فرمائش پوری کر دیں۔ مردک کہیں کا ہماری عمر سے ملی نکلتا ہوا۔ ہمیں بابا جی اور باپ کی بجائے کہتا ہے، ہم یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے کہ ہمیں فرصت نہیں کسی اور سے جھگڑا طے کرا لو!

اور تو اور ہمارے اہل دفتر بھی ہمیں بڈھا سمجھے بیٹھے ہیں، کوئی بات ہو، کسی کی ہو، ٹیپ کا بند ہمارے متعلق ہوتا ہے کہ

"علامہ صاحب آپ ٹھہرے ہمارے بزرگ، ہم آپ کے بچوں کی جگہ آپ کی ریس ہم سے تو نہیں ہو سکتی"

کیا لوگ ہیں!! چالیس چالیس برس کے ہو گئے مگر اب تک اپنے آپ کو بچہ ہی تصور کرتے ہیں اور دوسروں کو بزرگ کہتے نہیں شرماتے۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ ہم اپنے شاگردوں کو نصیحت کر رہے تھے کہ بھئی! سینما مت دیکھا کرو۔ اِس کا اخلاق پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔" کہنے لگے کہ۔

"قبلہ ہمارا جوانی کا وقت ہے، جوانی دیوانی سنا ہی ہوگا آپ نے! یہی عمر ہے، جب تفریحات سے انسان لطف اُٹھا سکتا ہے۔ آپ کا کیا ہے۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ آج مرے کل دوسرا دن۔"

سُنا آپ نے؟ آداب گفتگو کی توقع تو اِس دَورِ مغرب زدہ میں بھلا کہاں؟ یہ گستاخانہ بیدردی ملاحظہ فرمایئے! یعنی ہم ایسے بوڑھے ہوگئے ہیں کہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ خدارا انصاف کیجئے! اگر ہم خدانخواستہ بوڑھے ہی ہونے شروع ہوگئے ہیں تو فرمایئے! کیا بڑھاپا کسی آنی منقطع کا نام ہے؟ جو چشمک برق کی طرح گذر کر بوڑھے آدمی کو موت کے چارج میں چھوڑ جاتا ہے۔ بہ اعتبار سماجی قاعدے سے تو بارہ برس تک بچپن رہتا ہے بچپن کے بعد آٹھ برس نوجوانی کے۔ پھر بیس سے پینتیس تک جوانی۔ ۳۵ سے ۴۵ تک ادھیڑ رکھ لو! ۴۵ سے کہیں آدمی کا بڑھاپا شروع ہوتا ہے اور ۷۰ برس تک چلتا ہے البتہ ۷۰ سے پھر بڑھاپے اور موت کا ملا جلا موسم شروع ہو جاتا ہے۔ یہ بھی اس لئے کہ آج کل لوگ عمرِ طبیعی کو نہیں پہنچتے، ورنہ پچھلی صدی میں سو سو سوا سوا سو برس کی عمریں ہوتی تھیں۔ اس کے بعد مرنے ورنے کا لوگ بچار کرتے تھے۔ آج کل چونکہ اصلی گھی دودھ کھانے کو نہیں ملتا، حلوائی پانی میں دودھ ملا کر بیچ رہے ہیں اور گھی؟ اصلی گھی تو کسی داموں نہیں ملتا۔ بناسپتی کا یا چربی کا ملاوٹی گھی دھڑا دھڑ بک رہا ہے پھر جب گھی دودھ بھی کھانے کو نہ ملے تو جسموں میں طاقت کہاں سے آئے۔ اور عمر بڑھے تو کیسے بڑھے۔ کمزور گوشت پوست کے لوگ ساٹھ ستر برس بھی جانے کیسے زندہ رہتے ہیں! بہرحال اس گئی گذری حالت میں عام طور پر اچھے ساٹھ ستر برس تک کھنچ جاتے ہیں۔ مگر ہمارے ساتھ یہ ظلم شروع ہوا ہے کہ جوانی ختم ہوئی اور فوراً موت اور بڑھاپے کا گنگا جمنی دور شروع ہو گیا۔ گویا ہمیں نہ ادھیڑ پن نصیب ہوا نہ بڑھاپا۔ آخر یہ کیوں؟ ہم سے قدرت کو خدانخواستہ کوئی ضد ہے کہ ہمیں مارنے کی خاطر اپنے تمام آئین و قوانین توڑ دے گی! پھر کیوں ہمیں لوگ بابا، بڑے میاں اور قبر کے الفاظ سے تکلیف پہنچاتے ہیں؟ ہم اپنے کو جوان بتاتے ہیں تو کسی کا کیا بگاڑتے ہیں؟ جوان ہیں جوانوں کا سا دل رکھتے ہیں، جوانوں کی طرح جی رہے ہیں، جینا چاہتے ہیں۔ کہنے والوں کے علی الرغم جیئیں گے۔

خدا خوش رکھے بیمہ کمپنی کے ایجنٹ ارجن داس کو بے چارہ بڑا ہی شریف آدمی ہے۔ دس برس سے ہم اُسے ۴۲ سال اپنی عمر بتا رہے ہیں، نہ بڑ ٹھنک نہیں کہتا، فوراً تسلیم کر لیتا ہے۔ نہ مسکراتا ہے، نہ تعجب کا اظہار کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ سچا آدمی ہے ہر ایک کو سچا ہی سمجھتا ہے۔ جبھی ہمیں تو اُس سے محبت سی ہو گئی ہے۔ اگرچہ اُس کی خوش بیانی ہماری دو پالیسیاں ضبط کرا چکی ہے، لیکن اِس میں اُس کا کیا قصور؟ پریمیم دیتے رہتے تو کیوں ضبط ہوتیں؟

۱۹۲۵ء میں پہلی بار اُس کے ذریعے زندگی کا بیمہ کرایا تھا۔ اُس وقت ۴۲ سال کی عمر بتائی تھی پھر اُسی کمپنی میں ۱۹۲۹ء میں اُس کی معرفت ہمارا دوسرا بیمہ ہوا۔ اُس وقت بھی ہم ۴۲ ہی سال کے تھے۔ اب ۱۹۳۵ء میں پھر آیا تھا فارم بھر کے گیا تھا اور اس ۱۹۳۵ء میں بھی ہماری عمر ۴۲ سال ہی کی لکھ کر لے گیا ہے۔ واقعی بڑا شریف انسان ہے۔ وہ تو وہ جس کمپنی کا وہ ایجنٹ ہے وہ اُس سے بھی زیادہ شریف واقع ہوئی ہے۔ ملاحظہ کیجئے! ۱۹۲۵ء سے ہمارے بیمہ ۴۲ برس کا لکھنا شروع کیا ہے تو ۱۹۳۵ء تک ۴۲ ہی کا لکھے چلا جاتی ہے۔ میاں جبھی تو اتنے سالوں سے چل رہی ہے۔ بات یہ ہے کہ کاروبار میں سچائی اور نیک نیتی ہی ایک بات ہے۔ جو کاروبار کو چلاتی ہے اور یہ کمپنی بھی اللہ سچائی کے اصول پر مضبوطی سے کاربند ہے پھر کیوں نہ سرسبز ہو۔ بے چارہ ارجن داس جب کبھی بھولا بسرا ادھر آ نکلتا ہے، قدم رنجہ سے یہ کہنا شروع کر دیتا ہے "آہا علامہ صاحب! چشم بددور صحت تو بہت اچھی ہے آپ کی، جوانی چہرے سے پھوٹی پڑتی ہے۔"

بس ایسے ہی راست باز ہندوؤں کو دیکھ کر ہمارے دل میں ہندو مسلم اتحاد کے خیالات جوش زن ہونے لگتے ہیں۔ کیا آدمی ہے خدا کی قسم!! موتیوں میں تولنے کے لائق! پھر ایک خوبی ہو تو سنائیں اُس کی ہزار لعل خوبیوں کا مالک ہے۔ دو تین دفعہ ایم ڈی ڈاکٹروں کو کمپنی کی طرف سے ہمارا ڈاکٹری معائنہ کرانے لایا، ایک دفعہ تو ایسے وقت لایا کہ ہم بواسیری دورے سے نڈھال ہو رہے تھے۔ خون کا آبشار سا جاری تھا رنگ زرد، سانس پھولا ہوا، تیز بخار، کمزوری اتنی کہ ؎

غنچہ چٹکے تو کہیں، سر میں دھمک ہوتی ہے

گا۔ وہ عموماً کہتے ہیں کہ نیکوں کے ساتھ بھی نیک ہوتے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے ہمیں اپنی تشخیص میں چاق و چوبند، جوانوں کی طرح تندرست پایا۔ یہی رپورٹ کمپنی کو دے دی اور ہماری پالیسی منظور ہو کر آگئی۔

واہ رے ۔ ۔ ۔ ۔ انشورنس کمپنی دھن ہے تو! انہی نیکیوں کے کارن تو تیرا جال انڈیا بھر میں پھیل رہا ہے۔

کمپنی نے فارم پر یہ بھی لکھا ہوتا ہے کہ "تمہارے ماں باپ کس مرض میں مرے اور کتنے دن تک بیمار رہے؟" ہم سچے آدمی ہیں، صاف صاف لکھ دی کہ والد نے رمضان شریف کے تیس روزے رکھے، عید کا چاند دیکھا، رات کو ہیضہ ہوا، صبح ہی صبح "کل من علیہا فان" کہتے ہوئے دنیا کی چہل پہل پر لات مار گئے۔ والدہ بھی ایک رات بیمار رہیں۔ والد کی ہمنوائی کرنی پڑی، ہیضے میں مبتلا ہوئیں، مگر عورت ذات تو سخت جان ہوتی ہے، چھ دن "جوائنٹ ٹائم" کے میں بیمار گزارے، ساتویں دن سمجھ گئے وہ آخری منزل پر جا پہنچیں۔

فارم پر ہم نے جو واقعہ تھا لکھ کر بھیج دیا مگر قربان جائیے کمپنی کی معاملہ شناسی اور فکر کاری کے۔ دوسرے دن وہ فارم، برانچ آفس کے سیکرٹری نے اپنے آپ اصلاح کر کے ہمارے دستخط لینے کے لئے واپس کر دیا۔

خط میں لکھا تھا "فارم پر ضروری ترمیم کر دی گئی ہے، نقل کر کے بھیج دیجئے!" ترمیم یہ تھی کہ:

"میرے والد ہیضے میں مبتلا ہوئے، پندرہ دن تک اس مرض میں زندہ رہے، پھر انتقال ہو گیا اور والدہ نمونیہ میں بیمار ہوئیں اور بارہ دن تک زندہ رہیں۔"

ہم نے اس اصلاح کو منظور کر لیا اور بھی بھلا کیسے نہ کرتے!

"جائے استاد خالی است"

فارم واپس کر دیا، برانچ آفس سے اصلاح شدہ فارم بمبئی چلا گیا اور جھٹ سے پالیسی منظور ہو گئی۔ یہ ہوتی ہیں نیکیاں اور ایسی ہوتی ہیں سچے کاروباری!! نیکیاں بیمے مذہب کی بات دوسری ہے۔ ورنہ ہمارا خیال تو یہ ہے اس بیمہ کمپنی کے سارے ایجنٹ جنت میں جائیں گے اور ارجن داس؟ ارجن داس تو ان جنتی ایجنٹوں کا سالار کارواں ہوگا۔ اُن کے چہرے پر ایمان کا نور دھڑا دھڑ برستا ہے۔ آپ پہلی بار دیکھ کر کبھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ ہندو ہے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسجد کا امام ہے۔

مختصر یہ کہ ۔ ۔ ۔ بیمہ کمپنی، اس کے کارکن، اس کے ڈاکٹر، اس کے ایجنٹ، یہ آج کون ہوتے تو یار دوستوں نے واقعی ہمیں بوڑھا بنا دیا تھا، وہی میاں جی والی بات ہو جاتی جیسے لڑکوں نے سازش کر کے بیمار بنا ڈالا تھا۔ بھئی ہم تو ارجن داس اور اس کی کمپنی کو دعا دیتے ہیں کہ اس کے دماغ اور اس کے کاغذات میں ہم ۲۵ء سے ۳۵ء تک ۲۴ ہی سال کے ہیں ورنہ تیرے میرے کے کہنے پر اعتبار کرنے لگیں تو واقعی ہم پچاس کے پیٹے میں شمار ہونے لگیں۔ توبہ استغفار!! ایسی دنیا ہے کسی کو جوان دیکھ ہی نہیں سکتی۔ اچھے بھلے جوانوں کو بوڑھا بنا دیتی ہے اور ذرا نہیں شرماتی۔ مطلق خدا کا خوف نہیں کرتی۔ ان کا حشر میں کیا حال ہوگا!

یہاں تک لکھنے پائے تھے کہ ایک شیخ طریقت نازل ہو گئے، سلام دعا کے بعد نئی روشنی کا ذکر چھیڑ بیٹھے۔ جدید تعلیم کی شان میں غیر منقوط قصیدے پڑھ پڑھ کر شروع کر دیئے۔ اسی کے ساتھ پرانے زمانے کی خوبیاں گنوانے لگے۔ ہمارے وقت میں یہ ہوتا تھا اور یہ بات ہماری یاد کی ہے۔ پہلے نہ ہندو مسلمانوں کے جھگڑے تھے۔ نہ مذہبی لڑائیاں ہوتی تھیں، تعصب کا نام نہ تھا۔ ہندو مسلمان شیر و شکر بن کر رہتے سہتے تھے۔ چھوٹوں پر بڑے شفقت کیا کرتے تھے اور چھوٹے بڑوں کی تعظیم و تکریم ضروری سمجھتے تھے۔ اب زمانے کو کچھ ایسی ہوا لگ گئی ہے، نہ بڑوں کو چھوٹوں پر رحم نہ چھوٹے بڑوں کو خاطر میں لاتے ہیں، ہر ایک کی اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ۔ بیٹے باپ کو نہیں سمجھتے، بھائی بھائیوں میں بیر پڑ رہا ہے۔ اللہ ہی جانے کیا ہونا ہے۔ ہم اور آپ تو سحری چراغ کی طرح ٹمٹما رہے ہیں۔ آج نہ مرے کل مر جائیں گے۔"

گھر پر یہ شخص مہمان نہ ہوتا تو اس بات پر ہم اس کا منہ نوچ لیتے۔ مگر کیا کریں مہمان کا احترام سوسائٹی کا قانون بن چکا ہے۔ ہر آدمی کے سامنے بھرے

کہتا ہے کہ

"ہم اور آپ تو سحری چراغ کی طرح ٹمٹما رہے ہیں"

کوئی پوچھے اس سے کہ اپنے ساتھ دوسروں کو کیوں موت کی بشارتیں دیتا پھرتا ہے؟ بھلے آدمی! تیرے لئے زندگی اجیرن ہو چکی ہے تو چلتا پھرتا نظر آ! تیرے بنا دنیا میں بہتیری گنجائش ہے، وہ گزر گئے تجھے بھی مل جائے گی۔ "سحری چراغ، سحری چراغ" بس لفظ یاد کر لئے ہیں، ان کا استعمال نہ سیکھا! میاں تو سحری چراغ کی طرح ٹمٹما رہا ہے تو لے بجھ چکا۔ کب تک ٹمٹمائے گا؟ ہم تو اللہ کے فضل سے سرِ شام کے دو سو کینڈل پاور کے قمقمے ہیں۔ حدِ نظر تک ساری فضا ہم سے جگمگا رہی ہے، کیوں ہونے لگے ہم سحری چراغ؟ تو ہوگا سحر کا یا اندھیری جو کچھ ہوگا۔

ارے بھائی! مرنا برحق لیکن یہ کون سی شرافت ہے کہ کسی کا جی چاہے نہ چاہے۔ مرنے کا سیزن ہو یا نہ ہو، جوان ہو یا ادھیڑ، سب کو موت کے مشورے دیتا پھرتا ہے۔ مرنے کی خوشخبریاں سناتے پھرنا! یہ بھی کوئی کام ہے۔ کیا کہے سے ہو؟ دماغ میں بھوسا بھرا ہوا، خیالات میں ناہمواری، دل میں افسردگی، باتوں میں گھبراہٹ، صورت پر مُردنی چھائی ہوئی، پھرتے ہیں مارے مارے۔ اور کچھ نہ سوجھا موت کی کہانیاں لوگوں کو سنانی شروع کر دیں۔ کیا لوگ ہیں! سوسائٹی کی دیمک، مجلس کی پریشانی، جہاں بیٹھتے ہیں، زندگی سے لوگوں کو بیزار کر دیتے ہیں۔ تعزیراتِ ہند کی ترتیب ہمارے متعلق ہوتی تو ایسے نیم مردہ نیم زندہ لوگوں کے لئے دفعہ ۱۴۴ کی طرح کوئی خوفناک دفعہ کا اضافہ کر دیتے۔ میاں یورپ میں ہوتے تو اس افسردہ گفتاری پر جیل بھیج دیئے جاتے۔

ہیں!! "چراغِ سحری، ٹمٹماتے ہیں" واہیات۔ مردک! ساری دنیا کو چھوڑ کر ہمیں کو موت سے ڈرانے آیا تھا۔ آگے ہی دوستوں کی مہربانی سے موت کا نام سن کر ہمارے حواس بجا نہیں رہتے۔ اُس پر طرّہ یہ سیلانی لوگ! موت، موت کے نعرے لگا لگا کر ہمیں ڈرانے آ جاتے ہیں۔ پاگل کہیں کے۔ ہمیں تو کچھ دنوں سے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ دنیا ہمارے خلاف ہو گئی ہے، یقیناً وہ ہمارے خلاف ہے۔ پنجاب میں جہاں اجنبی اور راہ چلتے آدمی کو سلام کرنے کا دستور نہیں، ہمیں لوگ دیکھ کر فوراً سلام کر لیتے ہیں۔ آخر یہ کیوں؟ غالباً اس وجہ سے کہ ہماری مولویانہ شکل و صورت پر بڑھاپے کا گرد دیکھ کر بے اختیارانہ طور پر سلام کا آوازہ کس دیتے ہیں اُن کا سلام درحقیقت اس فقرے کا قائم مقام ہوتا ہے، کہ

"اے باعظمت بوڑھے میاں ہم تیرے بڑھاپے کا احترام کرتے ہیں"

ہمیں اس لئے سلام کرنے والوں کی چھیڑ چھاڑ بُری معلوم ہوتی ہے، بھلا کوئی پوچھے۔ یہاں کوئی کسی راہ چلتے کو سلام کرتا ہے؟ نہیں کرتا تو پھر ہمارے ساتھ یہ چھیڑ خانی کیوں؟

لوگ ہمارے واقف نہیں، ہمیں جانتے نہیں، نہ ہم اُنہیں جانتے پہچانتے ہیں، کہ کس کھیت کی مولی ہیں؟ کس خاندان کے چشم و چراغ ہیں؟ پھر کیا سمجھ کے ہمیں سلام کرتے ہیں لوگ؟ آخر ہم وہی تو ہیں جو دس بارہ سال پہلے انہی گلی کوچوں میں انہی لوگوں کی دیکھتی آنکھوں کے سامنے مٹرگشت کیا کرتے تھے۔ مگر اُس وقت ہمیں کوئی سلام نہیں کرتا تھا۔ پھر اب کون سی ہم میں غیر معمولی تبدیلی آ گئی کہ ہم پر نظر پڑی اور جھٹ سلام کا پتھر دے مارا۔ نہیں نہیں، ہم سمجھتے ہیں، آخر یہ بال دھوپ میں ڈھور ڈنگر چراتے ہوئے تو سفید نہیں ہوئے، آدمی آدمی سے ہم واقف ہو چکے ہیں۔

آج کل کے نام نہاد نوجوانو! فرض کر لو! ہم سے ستر پہر دور ہم خدانخواستہ بوڑھے ہی ہو رہے ہیں تو پھر بھی تمہیں ہنسنے کا حق کس نے دیا ہے۔ بڑھاپا ہی ہے نا؟ کوئی ڈاکہ تو نہیں؟ چوری تو نہیں؟ کسی اور صغیرہ کبیرہ گناہ کا نام تو نہیں؟ پھر کیوں بوڑھوں کو دیکھ کر مسکراتے ہو؟ یہ کہاں کی تہذیب ہے!

یہ کیا انسانیت ہے!! ہوش میں آؤ! عقل کے ناخن لو! آدمی بننے کی کوشش کرو! دیکھو! بوڑھوں پر ہنسی اچھی نہیں ہوتی۔ آج کل کے نام نہاد نوجوانو کل بوڑھے تم سے کسی بات میں پیچھے نہیں، تمہاری شکل پر جوانی برستی ہے۔ مگر سینوں میں بوڑھے دل حرکت کر رہے ہیں۔ رگوں میں بوڑھا خون چکر کاٹ رہا ہے۔

وہ جن کو تم بوڑھا خیال کرتے ہو، اُن کے دل اب بھی جوان ہیں، اُن کی تمنائیں آج بھی جوان ہیں، اُن کی آرزوؤں سے جوش جوانی ٹپک رہا ہے۔ اُن کے بالوں کی سپیدی پر نہ جاؤ! یہ سپیدی زمانے کی مہربانی ہے۔ اُن کے سینے چیر کر دیکھو! اُن کے دل کا ایکسرے کراؤ! تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہر بوڑھے کا دل

ایک نگارخانہ ہے۔ ہر بوڑھے کا دماغ اور کچھ کے پاؤں [illegible] عشق کی رزم گاہ ہے۔ بس تم کہنے کو جوان اور نوجوان مگر چہرہ زرد، آنکھیں دھنسی ہوئی گال پچکے ہوئے۔ معدہ کمزور، دماغ [illegible] دل جیسا مرجھایا ہوا پھول۔ ہر خوشی سے [illegible] عشق [illegible] تمہاری [illegible] میں [illegible] [illegible] مگر اصل زندگی تمہیں کہاں نصیب؟

[illegible] نہیں جانتے [illegible] کیسے [illegible] [illegible] جوانی کا نام [illegible] [illegible] میں [illegible] [illegible] جوان [illegible] [illegible] محروم [illegible] [illegible] عشق [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

کیا [illegible] تمہاری [illegible] [illegible] [illegible] جیسے [illegible] [illegible] [illegible] جوانی [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] بالوں [illegible] [illegible] [illegible] نوجوان [illegible] تم [illegible]

"اور امتحاں یعنی نوید آپ کا علام
قائل نہیں جناب سوزِ شیخ و شباب کا"

علامہ ظریف بہ عمر ۴۲ سال
مطابق رجسٹر بیمہ کمپنی - مطابق تصدیق
ارجن داس بیمہ ایجنٹ لاہور

O

حشر میں بیتابیوں سے دل کی اک چکر میں ہوں — مجھ میں محشر ہے خدا جانے کہ میں محشر میں ہوں

گھر سے لائی دشت میں مجھ کو مری دیوانگی — گھر سے ہوں باہر مگر میں پھر بھی اپنے گھر میں ہوں

کشتۂ لب ہوں کسی کے دل میں ہے میرا خیال

لعل ہوں اے تاجور میں بھی مگر پتھر میں ہوں (علامہ تاجور)

ظریفیات

ارون آف ورما ولنگڈن

ایک دبلا پتلا اور ضرورت سے زیادہ لمبا وائسرائے پانچ سال تک حکومت کرکے ۳۵ کروڑ کی ایک دنیا کو ایک ستر سال کے بوڑھے برطانوی کے سپرد کر کے ساحل ہند سے روانہ ہو چکا ہے۔

عید رمضان آمد و ماہ رمضاں رفت صد شکر کہ ایں آمد و صد حیف کہ آں رفت

جانے والے بزرگوار ایک دل ایک دماغ دو آنکھوں اور ایک ہاتھ کے مالک تھے۔ پانچ سال تک پشاور سے راس کماری تک انہی کے نام کا ڈنکا بجتا رہا ہے۔ ان کے عہد میں ہندوستان کی ہر چیز میں ایک جان سی پڑ گئی تھی اور ہندوستانیوں کو نو زندگی کا ہیضہ ہو گیا تھا۔ دیسی اخبارات کو ان کا عہد حکومت بالکل راس نہیں آیا۔ ان کی زندگی کے خلاف بم بازوں کی سرگرمیاں دیکھ کر یورپ کی کئی بیمہ کمپنیوں میں تشویش کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ مگر ہندوستان اور ان بیمہ کمپنیوں کی خدا کو لاج رکھنی تھی کہ بم بازوں کے منصوبے ناکام و نامراد ہو گئے۔ ہماری زبان میں ایک ہاتھ کے آدمی کو ٹنڈا کہتے ہیں۔ اس ملک میں ٹنڈے آدمی کو گداگری کے سوا اور کوئی ہنر نہیں سکھایا جاتا۔ اور کسی ٹنڈے نے یہ بے حمیتی گوارا نہ کی تو زیادہ سے زیادہ چوکیداری کی نوکری تلاش کر لیتا ہے۔

پھر ہمارے ملک میں اس قسم کا جسمانی عیب عموماً آپس میں چھری چاقو سے تبادلۂ خیالات کر بیٹھنے سے پیدا ہو جاتا ہے یا کبھی کوٹھے پر پتنگ اُڑانے چڑھے پتنگ اڑاتے ہوئے نگاہوں کے ساتھ دماغ کو بھی پتنگ کے کنّوں سے باندھ دیا۔ جب آنکھیں اور دماغ زمین پر نہ رہے تو پاؤں نے بھی زمین پر چلنے کی ہتک گوارا نہ کی۔ پھر اُدھر انہوں نے پتنگ کے ساتھ خود اڑنے کی کوشش شروع کی اِدھر زمین کی کشش کے نظریہ کو اپنی صداقت کے اظہار پر اصرار ہوا۔ اس کشمکش کا نتیجہ پتنگ اور پتنگ باز کے حق میں جو کچھ ہوا ہو۔ ملک کے لئے تو یہ نکلا کہ ملک کے اپاہجوں میں ایک ٹنڈے کا اضافہ ہو گیا۔ اب زندگی ہے اور گداگری اور یہ پسند نہ آئی تو مسجد میں اذان دینے کی خدمت یا کسی کے گھر کی چوکیداری۔ اور خوش قسمتی سے بایاں ہاتھ ٹوٹا ہے تو خط نویسی سیکھ لی اور سڑکوں پر جانماز سی بچھا کر آنے جانے والوں کو گننا شروع کر دیا:

"خط لکھوا لو"

کا سائن بورڈ ایک لکڑی پر لٹکایا۔ اور اس طرح صبح سے شام کر کے دو چار آنے کما لیے

زندہ ملکوں کے آدمی ملک و وطن کی خاطر میدانِ جنگ میں ٹنڈے، لنگڑے یا اندھے ہو جاتے ہیں اور پھر اُن کا ملک اُن پر ہمیشہ فخر کیا کرتا ہے اس لئے اُن کا جسمانی عیب اُن کی عزت، قدر و قیمت اور ترقیوں میں اضافہ کا باعث ہوا کرتا ہے نہ ذلت کا۔

لارڈ ارون ایسے ہی ایک ہاتھ کے آدمی تھے۔ ہندوستان میں پیدا ہوتے تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوتا۔ بس پھرتے بازاروں میں آستینیں کھولے ہوئے آنے جانے والوں کو کٹا ہوا ہاتھ دکھاتے۔ پیسے بٹورتے آسمان کی چھت کے نیچے زمین کے فرش پر سونا نصیب ہوتا۔ مگر ایسا کیوں ہوتا انہوں نے پتنگ اڑا کر ہاتھ سے دستبرداری تھوڑا ہی دی تھی۔

ہندوستان کے ۳۵ کروڑ آدمیوں پر حکمران تھے اور ان کا عہدِ حکومت دو ہاتھ والے وائسرایوں سے بھی زیادہ ہنگامہ خیز رہا ہے۔

۲۵ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ، رہنے کو وائسریگل لاج۔ دوروں کا بھتہ تنخواہ سے زیادہ، ریاستوں کی طرف سے نیازیں نذریں۔ بڑے بڑے صاحب کے

معاہدوں سے بھی بڑھ کر نکتی رہیں۔ جب سے شروع کیا ہندوستان کا مرکز ثقل بدل دیا۔ اللہ میاں ایسے دس بیس شگفتے ہماری قوم میں بھی پیدا کردے تو قوم کے نصیب جاگ جائیں۔ ہمارے ہاں منشیوں کی ساری ہسٹری میں صرف ایک شگفتے نے ترقی کی ہے اور وہ اس حد تک کہ ایک ہفتہ وار اخبار نکال لیا۔ برطانوی شگفتے لاٹ صاحب کو ریاستوں کی طرف سے بیش بہا تحفے ملے ہوں گے مگر ہمارے شگفتے اخبار نویس کو بلیک میلنگ کے الزام میں دس دس ہزار روپے کے نوٹس آرہے ہیں۔

ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بکجا

پانچ سال حکومت کر کے لارڈ اروِن چلے تو نئے ستر سالہ نوجوان لارڈ ولنگڈن کی صورت میں پانچ سال تک حکومت کرنے کے لئے آگئے۔

سنا ہے دنیا میں ایک ہندوستانی کو مرے ہوئے بیس برس ہو چکے ہیں اور اگر زیادہ ڈھیٹھ ثابت ہوئے تو آگے ستر سال کے پیٹے میں۔ تو تیس سال کے بعد سے دانت ہلنے شروع ہوئے چالیس سال تک تلے اوپر کے آٹھ دانت بتا جاتے ہیں۔ اور پہلے آشوب چشم پھر موتیا بند اور اس کے بعد اندھے اور اگر کوئی لے بیں "نو" "نا" سے ایک ایک آنکھ کوری بیل کی طرح لمبی چوائی ہیں۔ یوں تو ہندوستانی سانس زندگی کھانسنے میں گزارتا ہے۔ اور بقول لارڈ ماریقہ کاٹ "ہندوستانی آدمی ہر جگہ کھانستا ہوا نظر آتا ہے" لیکن چالیس سے پچاس سال تک کے ہندوستانی کی کھانسی میں ایک عجیب قسم کی موسیقی پیدا ہو جاتی ہے اور پچاس سال سے آخیر تک دمہ والی کھانسی تو بس اللہ دے اور بندہ جھیلے۔

سانس سیٹیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور گھر والے اس سیٹی بجانے والے بوڑھے سے زیادہ زندگی سے بیزار نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ پیریڈ بہت اندوہناک ہوتا ہے۔ حقے کے سوا سب احباب بوڑھے کو چھوڑ جاتے ہیں۔ رہے ہوش و حواس وہ تو پچپن سال کے بعد شاید ہی جاتے ہیں۔ اب بوڑھے کے لئے دنیا کی وسعت اس سانس کے مشغلے مسجد میں نماز اور گھر میں تسبیح اور ان کی بہوؤں سے لڑائی بڑتوں اور بیٹیوں کو دامن پھیلا پھیلا کر بددعائیں دینا۔ حقہ پینا اور کھانسنا صبح سے شام اور شام سے صبح تک ایک سانس کھانسنا۔ اس میں کوئی شاعری نہیں ہے۔ دیکھ لیجئے ننانوے فی صدی ستر سالہ ہندوستانی بوڑھوں کو!

سب کے سب سر ہلتے ہوئے ملیں گے ہاتھ پاؤں میں رعشہ۔ آنکھیں نکلیں۔ کان غائب۔ ہوش و حواس رخصت۔ حقہ پینا کھانسنا اور بیٹے پوتوں سے لڑنا۔ زمانہ اور اہل زمانہ کو گالیاں دینا۔ بس یہ ان کا محبوب مشغلہ ہوگا۔ آزاد ملکوں کے بوڑھوں میں فورڈ۔ ڈاکٹر فیلڈ۔ لائڈ جارج برنارڈ شا اور آغا زاد ہ کے حالات شاید تمہیں افسانہ معلوم ہوں اپنے نئے وائسرائے کو دیکھو ہو ساٹھ اور دس سے پوری ستر بہاریں زندگی کی دیکھ چکا ہے دس سال ہندوستان کے دو صوبوں میں گورنری کر چکا ہے۔ اب بھی کہیں سے گورنری بھگتاتے آرہا ہے۔ اور اب پانچ سال تک ۳۵ کروڑ بشر پر سر عمل پر حکومت کرے گا۔ صبح سے شام تک پانچ سال تک انبار در انبار کاغذات۔ مثلیں۔ اپیلیں روزانہ پڑھے گا۔ ان پر احکام لکھے گا۔ خود دن رات دماغ کو منصوبہ سازی میں صرف کرے گا۔ روزانہ ٹینس لان میں جوانوں کے ساتھ کھیلے گا۔ آئے دن محفل رقص و سرود میں جوانوں کی طرح رقص کرے گا۔ آواز اچھی ہوئی تو گا بھی لے گا۔ پانچ سال کے بعد بھی بجائے پنشن سے ایڈریس سے کر ہندوستان کو کسی نئے بوڑھے کے سپرد کر کے چلتا پھرتا نظر آئے گا مطلب یہ ہے کہ اس ستر سال کے برطانوی مدبر میں ہر ہندوستانی سے زیادہ زندگی چستی پھرتی عقل و ہوش، تدبر، شوق، خدمت فرض شناسی موجود ہے۔ پھر لیڈی ولنگڈن بھی زندہ ہیں اپنے دولہا کے ساتھ آئی ہیں۔ دونوں میں سے کوئی بھی نہیں کھانستا۔ بیٹے بہوؤں سے لڑتا ہے۔ پھر ان دونوں کی دنیا اتنی ہی وسیع ہے جس قدر یہاں کے نوجوان کی دنیا، دونوں نئے مشغلوں میں رتی بھر بھی کمی نہیں آئی۔

وقت پر سونا۔ وقت پر اٹھنا۔ وقت پر چھوٹا حاضری وقت پر بڑا حاضری۔ ٹینس۔ ڈاک۔ دورے۔ پھر شغل رقص میں یہ بڈھی جوڑی جوانوں کے منہ پھیر دیتی ہوگی۔ ہوگی اس لئے کہا کہ لکھنے والا اس مرحلے میں داخل ہونے والا ہے جب کوئی ہندوستانی اندھا اور بہرا بننا شروع ہوتا ہے
آشوب چشم موتیا بند کی آمد کا منتظر ہے ہوش و حواس وقت سے پہلے ہی رخصت ہو رہے ہیں کیونکہ بیٹوں کو نواسوں کے پیچھے کا خطاب دینے کے معنی ہی یہ ہیں کہ بیٹوں کا باپ انسانی چولا بدل کر حیوانیت سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا ہے ؎

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

ادبی دنیا مئی ۱۹۳۱ء

(۲)

اب سے دور ۱۹۱۵ء کا ذکر ہے جب ہم لاہور کے اورینٹل کالج میں پڑھا کرتے تھے۔ اُن دنوں اس کالج کا بورڈنگ شاہی مسجد کے ساتھ حضوری باغ کے شاہی کھنڈرات میں تھا۔ بورڈنگ میں ہمارے کمرے کے برابر والے کمرے میں ولایت حسین نامی ایک بہاری طالب علم مقیم تھے۔ یہ بزرگ طلبہ کی ایک پارٹی کے لیڈر تھے اور اسی لیڈری کے صدقے میں پچھ سات سال سے فیل ہو رہے تھے۔ ہر سال برس کے ۹۵ ۳ دن تمباکو نوشی اور پارٹی بازی میں گذار دیا کرتے اور آخر جب یونیورسٹی کا رزلٹ (نتیجہ) شائع ہوتا آسی پائی لے کر ٹہلا پایا کرتے تھے۔

ہمیں بورڈنگ میں رہتے ہوئے ایک مہینہ ہوا ہو گا کہ ایک دن شام کے وقت اچانک شور و غل ہوا۔ کمرے سے باہر نکلے تو طلبہ کو ولایت حسین کے کمرے کی طرف بھاگتے دیکھا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کا نتیجہ شائع ہوا ہے۔ فیل ہونے کے صدمے میں وہ خودکشی کرنا چاہتے ہیں۔

ہم ایک دیسی مدرسے کے پڑھے ہوئے سرکاری امتحان اور یونیورسٹی کے نام سے کانپنے لگے۔ فوراً ہماری آنکھوں کے سامنے اپنے مستقبل کی تصویر کھنچ گئی۔ اور ہمیں یقین ہو گیا کہ اگلے سال اسی دن ہمارے کمرے کی طرف بھی لوگ بھاگتے ہوئے نظر آئیں گے۔

خیر نعوذ باللہ پڑھتے ہوئے ہم بھی پہنچے۔ بھاگے مولوی صاحب کے کمرے میں پہنچے جا کر دیکھا۔ ایک چھُریا اُن سے طالب علم چھیننا چاہتے ہیں۔ اور وہ چھریا کو ہاتھ سے دینا نہیں چاہتے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس چھریا میں سنکھیا ہے اور مولوی صاحب اسے کھانے پر مصر ہیں۔ طلبہ انہیں سمجھا رہے تھے اور اس افہام و تفہیم کا خلاصہ یہ تھا کہ۔

(۱) خودکشی کرنا انتہا درجے کی بزدلی ہے۔

(۲) پولیس کو خبر ہو گئی تو گرفتار کر کے لے جائے گی۔ وہ رونے جاتے اور ان باتوں کے منطقی جواب دیتے جاتے تھے۔ بزدلی ہو تو ہو میں کوئی تاریخی بہادر نہیں ہوں کہ میرے نام کو بٹہ لگے گا۔ اور جو مرنے پر تلا بیٹھا ہو اُسے پولیس کی گرفتاری کا کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔

دونوں جواب معقول تھے۔ مگر اُن کی معقولیت پر غور کرنے کی مہلت کسے تھی ہم نے دیکھا کہ مولوی صاحب کسی طرح نہیں مانتے۔ اور چھریا چھیننے والوں کے پاس معقولیت کا ذخیرہ ختم ہے۔ ہم ایک مذہبی ادارہ میں گیارہ سال کھو کر آئے تھے۔ مذہب سے ان نے خود متاثر نہیں تھے جتنے دوسروں کو اس نام سے متاثر کرنے کی استعداد پیدا کر چکے تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ مشرقی آدمی کی سب سے بڑی کمزوری مذہب ہے۔ ہم نے اسی دُکھتی ہوئی رگ کو چھیڑا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خودکشی کرنے والوں کی بابت یہ فرمایا ہے۔ قرآن میں ان لوگوں کے لئے یہ وعید ہے۔ فلاں صحابی کا یہ ارشاد ہے، قیامت میں خودکشی کرنے والے خنزیر کی شکل میں اُٹھیں گے۔ اسفل السافلین میں ان کا ٹھکانا ہو گا۔ وغیرہ وغیرہ"

دوسرے کبائر کے متعلق جس قدر وعیدیں آئی ہیں۔ ہم نے سب توڑ مروڑ کے خودکشی کرنے والوں کے متعلق ڈھال دیں اور ہمارا یہ حربہ کارگر ہوا اور انہوں نے پُڑیا ہاتھ سے چھوڑ دی اور مذہب کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

پُڑیا ہمارے سپرد کی گئی اور طلبہ اُن کی زندگی کی طرف سے مطمئن ہو کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

اس واقعے سے مولوی صاحب کو کوئی فائدہ زندہ رہنے کا ملا ہو یا نہ ملا ہو۔ ہم بُرے گھاٹے میں پڑ گئے۔ پہلی مرتبہ سارے بورڈنگ میں ایک مذہبی رہنما کی حیثیت سے روشناس ہوئے اور یہ شہرت نوجوانی کی تمام آزادیوں سے محروم کر گئی۔ دل میں کبیرہ گناہوں کے طوفان اُٹھتے تھے اور حباب کی طرح بیٹھ جاتے تھے۔ ہمارے ہم جماعتی کوئی چھوٹا موٹا گناہ کرنے کا ارادہ بھی کرتے تھے تو اس احتیاط کے ساتھ کہ "بھئی مولانا کو خبر نہ لگے"۔ ہم اپنے مذہبی مرکز سے فارغ ہو کر جب لاہور آنے لگے تو ہمارا دل عریاں اُمیدوں سے معمور تھا۔ دل کی خون شدہ آرزوئیں بھی زندہ شہید بن گئی تھیں۔ ہمارے مدرسے نقاشی، تصویر، آرٹ کی

تھا۔ یہ بنا بنا کر ہمارے مستقبل کو عروسِ نو کی طرح سجا رہا تھا۔

ہم نے یہ سن رکھا تھا کہ لاہور میں ہر ایک کو گناہ کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ طلبہ کے لئے نماز اور روزہ دونوں ضروری نہیں۔ لاہور میں یہ ہوتا ہے، لاہور میں وہ ہوتا ہے۔ ان ہوس خیز افسانوں کو سن کر ہم نے تو یہ منت مان رکھی تھی کہ لاہور پہنچ کر اس جبری نیک کرداری کا پورا پورا انتقام لیں گے۔ مگر قسمت کی محرومی کی کسے خبر تھی کہ وہاں پہنچتے ہی دھر لئے جائیں گے۔

داڑھی، مولویانہ شکل، بے ضرورت بے ضرورت مذہبی دخل در معقولات کی لعنت نے یہ روز بد دکھایا کہ "آزنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے"

اب بتائیے اس سے زیادہ کیا سختی ہو گی کہ زبان سے آزاد منش طلبہ کی رندی و ہوسناکی پہ تبرے اور دل میں اپنی ناکام جوانی پہ گریہ وزاری۔

کوئی لونڈا کہیں کوئی چھوٹا موٹا گناہ کرتا تو مذہبی رہنما کی حیثیت سے ہمارے پاس رپورٹ کی جاتی اور اسے لعن وطعن کرنا ہمارا رہنمایانہ فرض قرار پاتا تھا۔ ہر گناہ کبیرہ و صغیرہ کے متعلق آیات و احادیث انعام و اکرام اور عذاب کے ارشادات ہمیں از بر ہو گئے تھے۔

غرض ہماری جوانی لاہور کے دلفریب و دلنشین مناظر میں احرام باندھ کر گذار دی اور جس طرح فرشتوں اور معصوم بچوں کو گناہ کا کوئی صلہ نہیں ملنا چاہیئے یقیناً ہمیں بھی پارسایانہ جوانی پر قدرت کوئی کریڈٹ نہیں دے گی۔

لاہور آنے سے پہلے ہم مولینا تاجور کے ساتھ دارالعلوم دیوبند میں بارہ سال تک علوم عربیہ کی چھان پھٹک کرتے رہے تھے۔ دیوبند کے طلباء میں اب تو بہت کچھ آزادی اور روشن خیالی آگئی ہے۔ ہمارے عہد طالب علمی میں موجودہ آزادی کا عشر عشیر بھی نہ تھا۔ ہم وہاں سالہا سال تک ظہر کے وضو سے عصر، مغرب اور عشا تین وقت کی نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ گویا عالم بیداری کے روزانہ سات گھنٹے باوضو گذارنے پڑتے تھے۔ نماز عبادت کی بجائے عادت بن گئی تھی اور یہ عادت لاہور میں دو تین سال تک ہمارے لئے وجہ زحمت بنی رہی۔ اب اب کر کے بڑی مشکل سے اس سے پیچھا چھڑایا ہے۔ دیوبند کی آخری یادگار ہمارے پاس داڑھی رہ گئی تھی۔ پورے بارہ سال اس یادگار کو جذبۂ ایمان کی طرح سینے سے لگائے پھرے۔ قسمت ہے کہ بارہ برس کے بعد کوڑی کے بھی دن پھر جاتے ہیں۔ ہمارے چہرے نے بھی بارہ سال اسی ماتمی لباس میں گذارے۔ ۲۵ء میں دہلی کے شریف ہوٹل میں ایک بے مذہب درستی کے استرے نے زیر سایہ برطانیہ ہمارے رخساروں کو داڑھی سے آزادی دلائی۔ اگرچہ اب ہمارے چہرہ پر نہ وہ شباب کی سرخی ہے، نہ رخساروں میں وہ گداز جن کی نمائش میں داڑھی اس وقت سے حارج ہو رہی ہے جب سے اس پر داڑھی کی بجائے سبزۂ خط کا اطلاق ہوتا تھا۔ اور اب کہ گلزار جوانی کا یہ بزو بیگانہ کھچڑی داڑھی تک ترقی کر کے ڈھلے ہوئے پردوں میں تبدیل ہو رہا ہے، تاریخ زندگی کے اس پیریڈ میں نمائش وقار کے لئے اس سپیدۂ سحری کی ضرورت تھی۔ مگر سوسائٹی کے بندھنوں نے اس الجھن سے ہمیں نجات دلوا دی۔ ہمارے لئے داڑھی آزادی انگریزوں سے آزادی کی برابر ہی ضروری بن گئی۔ کیونکہ جس غیر مذہبی فضا اور جن مادیت پرستوں میں ہم رہتے ہیں وہ مذہب کو چھوڑنے سے پہلے مذہبی پروپگینڈے کو بند کرنے پر مصر نظر آتے ہیں۔ عام طور پر داڑھی منڈوانے کا وقت نوخطی کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ جب کہ خط کی ہریالی سیاہی ہونے لگتی ہے اور تیس سال کی عمر تک چہرہ کو شبابی مظاہرہ کی اجازت دی جاتی ہے جہاں تیس سے آگے بڑھے عمر ڈھلتی شروع ہوئی اور جوانی کی ہانسے بو کو "آبا جی" لادو" کی چیخ و پکار نے دبا دیا۔ بس تاریخ اپنے آپ کو دہرانا شروع کر دیتی ہے۔ اب چہرے کی سرحدوں میں کھچڑی خط کی نمائش ضروری سمجھی جاتی ہے۔ خصوصی داڑھی کی پیدائش اسی موسم میں ہوتی ہے۔ ۳۵ کی عمر سے قینچی داڑھی کا زمانہ آجاتا ہے اور اس کے بعد یکشت نمائش اکثری داڑھی کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ ۴۵ کی عمر تک یہ دور جاری رہتا ہے۔ ۴۵ کے بعد سید داڑھی آجاتی ہے۔ اور یہ امانت زندگی کی تمام حسرتوں کے ساتھ قبر میں ساتھ جاتی ہے۔

ہماری داڑھی اس تاریخی انحطاط و ارتقا کی ترتیب سے مستثنیٰ رہی۔ دیوبند میں ایک ہزار شرعی اور مسنون داڑھیوں کے ہجوم میں جبکہ شباب اپنی

تمام رعنائیوں کے ساتھ ہم پر چھا یا تھا اور سچ پوچھئے تو ع

خدا کا قہر تھا اس رنگ میں شباب نہ تھا

دل مچل مچل پڑتا تھا کہ خط سبز کو سبزہ بیگانہ سے پہلے چہرے سے صاف کر دیں، مگر جناب آپ جانتے ہیں سوسائٹی کا دباؤ کہ ڈاڑھی منڈانا چاروں اماموں کے مذہب میں (حلائے حلق) سے حرام ہے ؛

جناب ڈاڑھی رکھنی پڑی۔ اور پھر ڈاڑھی کا جوش نمو اس قدر تھا کہ چہرے کے سارے رقبہ میں اچھی فصل کی طرح پھیل گئی۔ ناک کی جڑوں اور آنکھ کے پپوٹوں غرضیکہ جہاں صاف جگہ پائی بے خطر اُگ آئی۔ وہ وقت کبھی نہ بھولے گا جب سسرال میں پہلی مرتبہ گئے ہیں تو سسرال کی عورتوں نے ہماری اس بے کینڈے ڈاڑھی کو دیکھ کر جو بہرے کی دسعتوں میں بھی نہ سما سکی تھی یہ پھبتی کسی تھی کہ :

"اوئی یہ دولہا ہیں یا سمدھی" ؛

سسرال کے سب چھوٹے بڑے مولانا مولانا کہہ کر ہمیں روحانی تکلیف دے رہے تھے، خدا بخشے سسرال کی دو چار بوڑھی عورتوں کو جنہوں نے ہماری ندامتوں کو اور بڑھا دیا کہ "اری دیکھنا چشم بد دور مولانا کے چہرے پر کیسا نور برس رہا ہے" مختصر یہ کہ جب ڈاڑھی منڈانے کے دن تھے۔ اس وقت ڈاڑھی رکھنی پڑی۔ اور جب ڈاڑھی رکھنے کا موسم آیا تو اُسے اس حد تک خشخشا دیا کہ منڈی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ڈاڑھی کو بارہ سال پرورش کرنے کا ایک نقصان ہم نے مستقل طور پر اٹھایا ہے۔ اور وہ یہ کہ ڈاڑھی کے دور زادہ تسلط اور اقتدار نے چہرہ کی ساخت مولویت کے سانچے میں اس بری طرح ڈھال دی ہے کہ ڈاڑھی منڈانے کے بعد بھی لوگ ہمارے چہرے کو دیکھ کر ہمیں مولوی خیال کرنے لگتے ہیں چونکہ مولویت کی پوزیشن نے عمر بھر ہمیں جذباتی آزادیوں سے محروم کئے رکھا ہے۔ اس لئے ہم اس تاثل سے طبعاً نفور ہیں ۔

سلسلۂ بیان میں الجھ کر ہم کہاں سے یہاں نکل آئے مولویت کی اس جبری زندگی کا رونا تو عمر بھر کا ہے۔ اسے تو پھر چھیڑیں گے، بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ مولوی ولایت حسین خودکشی کرنا چاہتے تھے، اس صحبت میں ہم یہ بیان کریں گے کہ اس خودکشی کی نوعیت کیا تھی ۔

ہاں تو اورنٹیل کالج کے بورڈنگ میں رہ کر رفتہ رفتہ وہاں کے طالب علموں کی عادات و خصائل سے ہمیں واقفیت ہوتی رہی۔ مولوی ولایت حسین اس واقعۂ ہائلہ کے بعد سے ہمارا زیادہ احترام کرنے لگے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی روشناسی دوستی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ہمیں ان سے بہت ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ ایک دن اثنائے گفتگو میں جبکہ ہم امتحان کے نام سے بہت ڈرنے لگے تھے، مولوی ولایت سے پوچھا :-

ہم : مولوی صاحب آپ کیا فقہ کے پرچے میں فیل ہو گئے ؟

ولایت حسین : نہیں تو فقہ کے پرچہ میں تو مجھے سو میں سے ۹۵ نمبر ملے تھے ۔

ہم : پھر منطق و فلسفہ کا پرچہ کچھ مشکل آ گیا تھا ؟

وہ : منطق و فلسفہ تو مولانا میرے خاص مضامین ہیں۔ اسے تو کلاس کا ہر طالب علم جانتا ہے ۔

ہم : تو پھر ادب کے پرچوں میں رہ گئے ہوں گے ؟

وہ : ادب ؛ شروع سے جھک کا ہے میں مارتا ہوں ؛ میں تو سارے سوالات کے جواب عربی میں دیا کرتا ہوں کیونکہ اردو کی بہ نسبت عربی میں مجھے لکھنے کی زیادہ مشق ہے۔ منطق، فلسفہ اور ادب کے پرچوں میں مجھ سے زیادہ یونیورسٹی بھر میں کسی نے نمبر نہ لئے ہوں گے۔

ہم : پھر آپ فیل کس پرچہ میں ہو گئے ؟

وہ : قسمت کی بات ہے انگلیمیٹ میں ۔

انگلیمیٹ کا لفظ سن کر ہم مبہوت ہو گئے۔ ولایت حسین نے اپنے اس یقین کی بنا پر یہ لفظ استعمال کیا تھا کہ یہ قبلہ انگریزی سے بالکل کورے

ہ اور ان کا یقین درست تھا۔ ہم نے انٹرمیڈیٹ کا سلسلہ پوچھنے میں اپنی لیاقت کی رسوائی گوارا نہ کی اور اپنے طور پر یہ نتیجہ نکالا کہ ہم اس امتحان کو پاس نہ کر سکیں گے کیونکہ جب ولایت حسین جیسا قابل ہر پرچے میں سو میں سے ۹۵ نمبر لینے والا فیل ہو گیا تو ہم اپنی تن آسانی اور پیشانی سے واقف تھے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ادب، فلسفہ، منطق اور فقہ میں طاق ہو جانے سے ہم "مولوی فاضل" کا کورس سمجھ بیٹھے تھے کوئی فائدہ نہیں دے سکتا سب سے اصل بس انٹرمیڈیٹ کی کتابیں تیار نہ ہوں۔

غرضیکہ اس "انٹرمیڈیٹ" کی مجہول حقیقت نے تو ہم پہ "خود رفتگی" کی حالت طاری کر دی۔

ہم ولایت حسین کے پاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں پہنچے اور اس سوچ میں غرق ہو گئے کہ امتحان میں فیل ہونے کا نتیجہ خودکشی اور یا اگر پڑیا ہاتھ سے جاتی رہے تو بدنامی، نفرت اور رسوائی ہے اور ہم اس ہستی کو دنیا کو منہ دکھانے کو تیار نہیں تھے۔ رہی بدنامی وہ بھی کوئی ایسی عزت نہیں کہ جان بوجھ کر اسے گنوا دیا جائے۔ لہٰذا گھر والوں کو لاہور کی بے دینی کی حکایات سنا کر سارا کچھ پایا اور داماد بیٹے کی سالگرہ اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لو۔ گھر والوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ہماری تازہ مولویت کا رعب سب پر طاری تھا گو کہ سادہ لوح افراد ہم سے سب سے بعید جھوٹ کو سمجھتے تھے۔ حالانکہ ان کی بات ہے کہ اس وقت جھوٹ ہماری فطرت بن چکی تھی زیادہ ہم سے قریب تھا لیکن ہم یہ بہانہ اگر تراش لیتے تو ہمارے مذہبی اقتدار میں کچھ نہ کچھ فرق ہو جاتا۔

ہم اسی ادھیڑ بن میں لگے ہوئے تھے کہ کمرے کا ساتھی آ گیا اور اس نے متفکر دیکھ کر ہمیں چھیڑنا شروع کر دیا۔

"مولوی صاحب کیوں کس کی یاد ہو رہی ہے؟ معلوم ہوتا ہے اس وقت دیوبند کی فضائیں چشمِ تصور کے سامنے ہیں جبھی تو یہ خود کی سی طاری ہے!"

ہم دل میں بہت جز بز ہوئے کہ یہ مرد آدمی دیوبند کو بھی نا ہو سمجھتا ہے۔ دیوبند کی فضاؤں میں رنگ برنگ کی ڈاڑھیوں اور ساٹھ پہر کی نمازوں کے اور دھرا ہی کیا ہے۔ جو وہ فضائیں یاد آئیں گی۔

خیر ہم نے کہا اپنے انجام کی یاد ہو رہی ہے۔

ساتھی: کیوں انجام کے متعلق کوئی خطرہ ہے؟

ہم: نہیں بالکل نہیں آج یقین حاصل ہو گیا ہے۔

ساتھی: تو پھر خوش ہونا چاہیئے۔ سال بھر بعد آپ کے نام کے ساتھ فاضل دیوبند کے علاوہ مولوی فاضل کا دُم چھلا بھی لگ جائے گا۔

ہم: نہیں بھئی۔ ہم ایسے خوش قسمت نہیں ہیں۔ جب ولایت حسین جیسا قابل آدمی فیل ہو گیا تو ہماری ہستی ہی کیا ہے؟

ساتھی: ولایت حسین فیل ہوا اپنے کرتوتوں سے۔ نامعقول سارا سال ڈنڈے بجاتا ہے۔ اور آخر سال رسم پوری کرنے کے لئے امتحان میں بیٹھ جاتا ہے، پاس کیسے ہو سکتا ہے۔

ہم: سارا سال ڈنڈے بجاتا ہے یا ڈنڈے بجاتا ہے۔ تو ہر پرچے میں ۹۵ فی صدی نمبر کیسے لیتا ہے؟

ساتھی (قہقہہ لگاتے ہوئے): ۹۵ چھوڑ دو تو پانچ فی صدی نمبر لینے کی بھی لیاقت نہیں رکھتا۔ اور آپ نے اتنا نہ سوچا کہ جو ۹۵ فی صدی نمبر حاصل کرے اسے ٹ آنا چاہیئے۔ پھر وہ فسٹ آنے کی بجائے سات سال سے فیل کیوں ہو رہا ہے؟

ہم: فیل تو وہ غریب انٹرمیڈیٹ میں ہو رہا ہے۔

ساتھی: ہیں، یہ کیا بے معنے بات کہہ دی آپ نے۔ ایک شخص ۹۵ فی صدی نمبر لیتا ہے اور انٹرمیڈیٹ میں فیل ہو جاتا ہے۔ اس کے کیا معنے؟

ہم: اس کے معنے یہ ہیں کہ انٹرمیڈیٹ کا کورس اس نے تیار نہیں کیا تھا۔ ان پرچوں میں وہ فیل ہو گیا۔

ساتھی: آج کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ! جانتے بھی ہیں یہ انٹرمیڈیٹ ہے کیا بلا؟

ہم : مولوی فاضل کا کوئی کورس ہوگا۔ وہی کہتے تھے کہ انگریجیٹ میں فیل ہوگیا ہوں۔

یہ سن کر ہمارا ساتھی ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگیا اور کہنے لگا کہ کالج میں داخل ہوئے آپ کو اتنے دن ہوگئے۔ اب تک انگریجیٹ کے معنے بھی نہیں جانتے، ارے صاحب انگریجیٹ مجموعہ کے معنے میں استعمال ہوتا ہے۔ مولوی فاضل میں کم سے کم مجموعی طور پر پاس ہونے کے لئے تین سو نمبر لینے ضروری ہیں اب جس کے تمام پرچوں کے مجموعی نمبر تین سو سے کم ہوں۔ وہ پاس نہیں ہوسکتا۔ اُس کے متعلق کہا جائے گا کہ انگریجیٹ میں فیل ہے۔

ہم : تو انگریجیٹ کا یہ مطلب ہے!!

ساتھی : وہ کیا ہوسکتا ہے۔ اُس نے آپ کو انگریزی سے نابلد پاکر یہ چلپہ دیا ہے۔ اور آپ اُس کے جھانسے میں آگئے۔

ہمیں ولایت حسین کی یہ خود فریبی معلوم کرکے بڑا تعجب ہوا۔ لیکن کچھ دنوں اُن کے ساتھ بیٹھنے اُٹھنے کے بعد یہ تعجب رفع ہوگیا۔ ایک دن پتے کی کہی کہ انہوں نے اپنی خودکشی کا ارادہ بھی چھوڑ دیا۔ کہنے لگے :۔

مولوی صاحب تو عمر ہی نہ۔ اب میں مرنے کو تیار نہیں۔ پھر خودکشی کیسی۔ اور وہ پرچہ یاد الاعلکامہ تو خودکشی کی نمائش کے لئے پر پاکیا تھا۔ آپ لوگ حواس بجا رکھتے تو اس پرچہ یا میں مشغول کی جانے کو نہیں پاتے۔ ہر سال امتحان کا نتیجہ شائع ہونے والے دن خودکشی کی نمائش کا افتتاح کرنے کی ایک پرچہ یا سے کیا کرتا ہوں۔ اور عموماً ایک مولوی کے وعظ۔ نصیحت پر یہ نمائش ختم ہوجاتی ہے۔

○ اُردُو گرامر فارسی گرامروں کا چربہ ہے اور فارسی کی گرامر میں عربی صرف ونحو کو سامنے رکھ کر لکھی گئی تھیں۔ اس غلط نقالی کے سبب اُردو اور فارسی گرامر نے اُردو کی رفتار کا کبھی ساتھ نہیں دیا۔ خصوصاً اُردو گرامر تو جب مرتب ہوئی تھی اسی وقت بھی اُردو اس سے بہت آگے نکل آئی تھی۔ اور آج کی اُردو گرامر اور اُردو زبان میں تو پشاور اور پانڈیچری کی مسافت حائل ہے۔ موجودہ ترقی یافتہ اُردو زبان کے لیے نئے سرے سے ایک ترقی پذیر اور لوچدار قواعد پر مشتمل گرامر لکھے جانے کی ضرورت ہے۔

(علامہ تاجور)

چٹخارے

دہلی کی سیر

(۱)

سیاسی بیداری کے باعث کانگریس ملک کی مجلسوں میں سب سے زیادہ طاقت ور اور ہنگامہ آرا مجلس بن گئی ہے۔ کانگریس کے سالانہ
س کا اعلان نفخ صور کا حکم رکھتا ہے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ہندوستان بھر کی مردہ اور نیم مردہ انجمنوں میں زندگی کروٹیں لینے لگتی ہے۔
ریس کے اجلاس سے قبل اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ ملک میں کتنی سبھائیں نام ہیں، کس قدر انجمنوں نے جنم لیا ہے، ان کے مقاصد کیا ہیں
احاطہ کیا ہے تو کسی طرح معلوم نہ کر سکیں ... کے جلسے کا اعلان ہوا اور آل انڈیا انجمنوں کے شہر خموشاں سے بے بیان اور
ان انجمنوں نے کفن پھاڑ کر ... یکار شروع کر دی۔ اب آپ کو معلوم ہو گا کہ ہر ہندوستانی انجمن سازی کے مالیخولیا میں مبتلا ہے۔ سینکڑوں
ایسی اور انجمنیں ملک میں ایسی ہیں کہ ان کی انتظامیہ کمیٹیوں میں انسانوں کی بجائے سیکرٹری صاحب کے حواس خمسہ ہی ممبری کا فرض ادا
کرتے ہیں اور بس۔ اور پھر اسی کے ساتھ اس حقیقت کا بھی سراغ ملے گا کہ ہندوستان میں کوئی انجمن آل انڈیت کے حقوق سے محروم نہیں ہے۔ جس
میں کانگریس کا اجلاس ہوتا ہے، وہ شہر کچھ دنوں کے لئے تو میدان حشر و نشر کی پوزیشن ضرور حاصل کر لیتا ہے۔

ستمبر ۱۹۲۳ء میں کانگریس کا اسپیشل اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ یہ اجلاس سوراجسٹوں کے نو چینجروں پر غلبہ حاصل کرنے کی خوشی میں وقت سے تین
ہفتہ پہلے ہوا تھا۔ اس کے تین ماہ بعد سالانہ اجلاس ہونے والا تھا۔ پھر بھی ملک کی کئی درجن سبھائیں ... زندگی کا ثبوت دینے وہاں پہنچ گئی تھیں۔ خود دہلی
کی آل محلہ مجلسوں نے آل انڈیت کا چولا بدل کر اس ہنگامے کے فروغ میں حصہ لیا۔

انہی آل محلہ مجلسوں میں بزم سخن نام کی ایک ادبی انجمن تھی جس کے ممبر ہر پندرہ روز کے بعد کسی مصرعۂ طرح پر طبع آزمائی کر کے مشاعرہ کی
بیت میں مشق و ناسخ کے دور کی یاد تازہ کر لیا کرتے تھے۔ کانگریس کی تیاریوں اور آل انڈیا سبھاؤں کے ہنگاموں کو دیکھ ان کی رگ حمیت بھی حرکت
آئی۔ انہوں نے بھی کانگریس کے اسپیشل اجلاس کے اعلان کے ساتھ ہی حسب بزم سخن کے خاص اجلاس کا ڈھنڈورہ پیٹنا شروع کر دیا۔ ہر
جس کے گنہگار کے نام بزم سخن کے دفتر سے وارنٹ جاری ہو گئے۔

ہم بھی چونکہ جرم شاعری کے مرتکب ہیں۔ ہمارے نام بھی یہ وارنٹ پہنچے۔ اس کے ساتھ ہمارے مکرم پنڈت راج نرائن ارمان دہلوی کی
ست کا سمن بھی تھا کہ بزم سخن کے اس اجلاس کی تیاریاں کانگریس کے اجلاس سے زیادہ شاندار ہیں۔ ہندوستان بھر کے اساتذہ اس میں شریک
ہو گئے۔ آپ کی شرکت اس میں ازبس ضروری ہے۔ طعام و قیام کا انتظام بزم سخن کی جانب سے ہو گا۔ بزم کے منتظم اعلیٰ فلاں فلاں نواب صاحب ہیں۔
دہلی دیکھنے کا شوق۔ مشاعرہ کی غلغلہ اندازداد کی امید" طعام و قیام مفت" کی ترغیب۔ اساتذہ میں شمار ہونے کا فخر۔ بس کچھ نہ پوچھیے۔

"بیچارے ہیں اک طرف تھے اور تن تنہا مرا دل تھا"

آخر کار تمام دور بینیوں اور عاقبت اندیشیوں کی جانب سے آنکھیں بند کر پنڈت میلا رام وفا کو رفیق سفر بنا یہ عازم دہلی دارد ہو گئے

اسٹیشن پر بزم سخن کے رضاکاروں کو تلاش کرنے میں جسم کارواں رواں چشم شوق بنا ہوا تھا۔ جیسے ہی گاڑی سٹیشن پر پہنچی، رضاکاروں کی منظم قطاروں نے بندے ماترم اور اللہ اکبر کا غلغلہ بلند کیا۔ انجمن کی بھک بھک اللہ تو چاہیئے تھی" کے تلخ شور نے یہ سمجھنے کی بھی فرصت نہ دی کہ رضاکار کانگرس کے ہیں یا بزم سخن کے۔ ہم گاڑی سے تجسّس کے انداز میں اترے۔ قلیوں کے حملہ آور ہجوم کو یہ کہہ کر ڈانٹ بتائی کہ ہٹو قلی کی ضرورت نہیں۔ رضاکار اسباب اتاریں گے۔

ادھر رضاکار جذبۂ استقبال میں ایسے دیوانے ہو رہے تھے کہ انہوں نے اسباب قلیوں سے چھینتے وقت اتنا بھی نہ پوچھا کہ آپ کانگرس کے ڈیلیگیٹ ہیں یا جمعیۃ العلما کے

خوش فہمی نے انہیں سمجھنے کی مہلت۔ دی نہ حق نے ہمیں سمجھانے کی۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ اس گاڑی سے ہمارے ساتھ ہی کانگرس کے لئے پنجاب کے ڈیلیگیٹ آ رہے تھے۔ ادھر پنجاب کے حلاقی علما جمعیۃ العلما کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے اس گاڑی میں سوار ہوئے تھے۔

گاڑی سے ہم اترے پنڈت ... رام دفا کو کانگرسی رضاکاروں نے کھدر پوش جو دیکھا۔ کانگرس کا ڈیلیگیٹ تصور کر کے آ چکے لیا۔ ادھر راقم الحروف کی مولویانہ شکل و صورت اور مرد معقول کی پوزیشن دیکھ کر جمعیۃ العلما کے رضاکار لپکے اور اللہ اکبر کے دلنواز و عزور افزا نعروں کے ہجوم میں اپنے نرغے میں لیا پلیٹ فارم سے رضاکار ہمیں اسباب سمیت لے کر پل پر چڑھے پل سے اتر کر ٹکٹ بابو سے ایک بلیک بونی اور اسٹیشن سے نکل آئے۔

اب وہ نازک وقت آیا جس کی نہ ہمیں توقع نہ ہم اور وہ اس کے لئے تیار۔ مجھے خدا یہ وقت دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ اس واقعہ کا دھندلا سا نقشہ آپ بھی ملاحظہ فرما لیجئے۔

رضاکار: کیوں جناب آپ مولانا عبد اللہ دیر قصوری ہیں؟

میں۔ نہیں جناب۔

رضاکار: اچھا تو آپ جمعیۃ العلمائے ہند کے ڈیلیگیٹ ہیں نا؟

میں: نہیں جناب: میرا علما میں شمار نہیں نہ میں کسی جمعیۃ کا ڈیلیگیٹ ہوں۔

رضاکار۔ پھر آپ نے پلیٹ فارم ہی پر کیوں نہ فرما دیا تھا؟

میں: یہی شکایت مجھے آپ سے ہے۔

اس سوال و جواب کے بعد طرفین پر ندامت و خجالت کے اثرات اس حد تک طاری ہو چکے تھے کہ ایک دوسرے نے ایک دوسرے کو الوداعی رسوم ادا کرنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔

(۴)

آپ اصرار کریں تو پنڈت میلا رام وفا کی داستان مصیبت بھی سنا دی جائے۔ آپ اصرار ہی کرتے ہیں تو خیر "از مرفوق الادب" کے مقولے پر عمل درآمد کر کے ہم بھی اس سانحہ ... کو مختصراً گوش گذار کئے دیتے ہیں۔ کانگرسی رضاکاروں کو جب جوش عقیدت نے کچھ فرصت دی تو انہوں نے پنڈت صاحب سے پوچھا:

رضاکار: کیوں مہاشے جی آپ لاہور کانگرس کمیٹی کے ڈیلیگیٹوں کے ساتھ ٹھہریں گے؟

پنڈت صاحب: نہیں صاحب میں تو اخبار ایشیا کے دفتر ٹھہروں گا۔

رہنماکار: وہاں تو انبالے والے ڈیلی گیٹ ٹھہریں گے۔ آپ لالہ دونی چند انبالہ نواسی تو نہیں ہیں؟

پنڈت صاحب: نہیں میرا نام دونی چند نہیں ہے میں تو سیالکوٹ کا باشندہ ہوں۔ لاہور سے آرہا ہوں۔

رہنماکار: تو ڈاکٹر ستیہ پال کے ساتھیوں میں سے ہیں؟

پنڈت صاحب: نہیں میں کسی کانگریس کمیٹی کا ڈیلی گیٹ نہیں ہوں۔

رہنماکار: (آنکھیں پھاڑ کر حیرت زدہ لہجے میں) اچھا تو آپ کانگریس کے ڈیلی گیٹ ہی نہیں ہیں؟

پنڈت صاحب: (نیم خندہ سنجیدگی سے) نہیں۔

رہنماکار: آپ بھی عجیب چلتی ہوئی رقم ہیں۔ ہم سے اسباب کیوں اٹھوایا۔ ہم کوئی قلی ہیں آپ کے؟

پنڈت صاحب: میں کب کہتا ہوں آپ میرے قلی ہیں۔ آپ ہی نے قلیوں سے میرا اسباب چھین لیا

دوسرا رہنماکار: (دوسرے رہنماکار سے) (ہنستے ہوئے) ارے میاں تو تمہیں رہنماکار ہے۔ مگر بھی عقل آتی ہے ہم تو کانگریس کے والنٹیئر ہیں۔

پنڈت صاحب: بابا سمجھنے کی عقل کو تم نے بچا رکھا ہے۔ آپ دنیا میں یہ بتائیں کہ بزم سخن کے رہنماکار ہو۔

رہنماکار: بزم سخن کیا بلا ہوتی ہے؟

پنڈت صاحب: بزم سخن کے نام سے مشاعرے ہیں ہم ہیں پاس کئے ہوئے ہیں۔

تیسرا رہنماکار: استہزائیہ طریقے سے اچھا وہ اردو فارسی زبان والا مشاعرہ؟ آپ اس کے لیے؟ میں تو گویا آپ شاعر ہیں؟ اوروں کی سی تمیز ہے بات کرنے میں تو لفظوں کا تہیہ ہو جاتا ہے شاعر غالب پھرتے ہوں گے۔

دوسرا: ہاں بلکہ سائنس چلے جائیے۔ شاعر سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں

میں اپنی حیثیت سے چٹکارا پا کر ان صاحب کے ساتھ جو مباحثہ ہو رہا تھا اس میں شامل ہوا اور ہم دونوں بچ نکل کر باہر آئے۔

دروازے پہ تانگے پر بیٹھنا تھا کہ ہوٹل والے ایجنٹوں نے ہمارے ساتھ کرنے کے لئے زبردستی شروع کردی۔

ایک ایجنٹ: جناب کارونیشن ہوٹل تشریف لے چلئے گا۔

دوسرا: محبوب ہوٹل چلیئے گا جناب! پنکھا، بجلی، الگ باتھ۔ کھانے کا اعلیٰ انتظام۔

تیسرا: صاحب وہاں کہاں جائیے گا۔ یہ رہا سامنے پرنس ہوٹل گھر سے زیادہ آرام نوکر، پلنگ، آئینہ، میز کرسی، پاخانہ اور دوا۔

چوتھا: صاحب جناب سنٹرو ہوٹل جیسا آرام کہیں نہیں ملے گا۔ الگ پاخانہ اور وشنو کھانا۔

پنڈت صاحب: صاحب میں تو وشنو کھانا کھاؤں گا۔ میرے ساتھ یہ مسلمان دوست بھی ہیں۔

چھٹا: تو شریف ہوٹل چلئے۔ دونوں کا انتظام ہو جائے گا۔

میں: بھائی جان! ہم تو اخبار ایشیا کے دفتر میں ٹھہریں گے۔

پہلا ایجنٹ: اجی پھر تو آپ کو کارونیشن ہوٹل چلنا چاہیئے۔ اسی میں ہے ایشیا کا دفتر۔ اعلیٰ کمرا اور گدا۔ پاخانہ۔ بجلی، پنکھا، غسل خانہ سب

کچھ بافراط ملے گا۔ سارے کانگرسی وہیں ٹھہرے ہیں۔"

خیر اس رسہ کشی میں کارونیشن ہوٹل کا ایجنٹ فرانی لے گیا اور ہم دونوں مال منقولہ کی حیثیت میں اس کے حوالے ہوگئے۔ اُس نے راستے بھر دوسرے ہوٹلوں کی تفصیلی برائیوں کی سامعہ خراش فہرست ایک منٹ ضائع کئے بغیر سنانی شروع کردی۔ ہم یہ سب ظلم برداشت کرتے ہوئے فتح پوری پہنچے۔ کارونیشن کی شاندار عمارت میں ایجنٹ ہمیں لے گیا۔

اس تمام تگ و دو میں بدقسمتی سے اس خوش فہمی میں مبتلا رہا کہ ہم کارونیشن ہوٹل میں عام کرایہ دار مسافروں کی طرح قیام کریں گے ایشیا کے دفتر سے پنڈت راج نراین ارمان کو جو ہماری طرف لپکتے ہوئے دیکھا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔

"آیئے وفا صاحب" "ہا ہمارے مولنا بھی تشریف لے آئے۔ بھئی یہ بات کی ہے کام کی۔ واللہ اب مشاعرے کا لطف آئے گا" پنڈت ارمان صاحب کے مسلسل استقبالیہ نعرے سن کر ایجنٹ کی آنکھ کھلی۔ بہت سٹ پٹایا۔ آخر پینترے بدل کر بولا:

ایجنٹ: کیوں صاحب۔ آپ پنڈت صاحب کے پاس آئے ہیں؟

وفا صاحب: جی ہاں۔

ایجنٹ: تو میرا وقت کیوں خراب کیا۔ مجھے دوسرے مسافر بھی نہ لینے دیئے۔ آپ وہیں بتا دیتے۔

میں: ہم نے تو وہیں بتا دیا تھا کہ ایشیا کے دفتر میں ٹھہریں گے۔

ایجنٹ: میں تو یہ سمجھا کہ آپ دفتر کا کوئی کمرہ کرایہ پر لے کر ٹھہریں گے۔

میں: تو آپ اپنی سمجھ کی سزا بھی ہمیں دینا چاہتے ہیں؟

وفا صاحب: بھئی گھبراؤ مت ہم کھانا ہوٹل ہی میں کھائیں گے۔

ایجنٹ: صاحب جیسے رہائش آپ مفت کریں گے پنڈت جی کے پاس رہ کر آپ کھانا بھی بے دام ہی اڑائیں گے:

(۳)

بزم سخن دہلی کی جانب سے ہمیں تاکیدی دعوت نامے آچکے تھے۔ جن میں قیام و طعام کی ذمہ داری مجلس استقبالیہ نے اپنے ذمے لینے کا اظہار کیا تھا۔ ساتھ ہی طوطیٔ ہند پنڈت راج نراین ارمان دہلوی کھٹ شاستری اور خدا جانے کیا کیا نے اصرار تار کا تار باندھ دیا تھا جس میں ناراضی کی دھمکی بھی دی تھی۔ ہم دونوں ساتھی دہلی اور دہلویات کے متعلق کوئی تجربہ نہ رکھتے ہوئے، آنکھ بند کر کے ناک کی سیدھ چل کھڑے ہوئے استقبال کے متعلق تمام امیدیں ہفت اقلیم کی بشارتوں کی صورت میں جلوہ گر ہو رہی تھیں۔ خیال تھا کہ اسٹیشن استقبالیہ کمیٹی کے ممبروں سے معمور ہوگا۔ پھولوں کے ہاروں سے گردن اور سینہ گنج شائگاں بنا دیا جائے گا۔ ہماری گاڑی کو گھوڑوں کی بجائے رضا کار کھینچیں گے۔ وغیرہ وغیرہ مگر ع

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

استقبالیہ کمیٹی کی نوعیت اور رستم ظریفی سے ہم آپ کو واقف کر چکے ہیں۔ اب قیام و طعام کا عبرتناک منظر پیش کرتے ہیں۔

ایشیا کے دفتر میں پہنچے تو دو میزیں جن پر اڈیٹر اور جائنٹ اڈیٹر قابض تھے۔ ایک سالم اور ایک پاشکستہ کرسی۔ ایک آرام کرسی جس میں کھٹملوں کی جمہوریت کو سیلف گورنمنٹ ملی ہوئی تھی۔ ان تبرکات کا نام دفتر ایشیا تھا۔

میں چونکہ سفر کی تکان سے مضمحل ہو رہا تھا بے تواضع ہی آرام کرسی پر دراز ہوگیا۔ پنڈت میلارام وفا طبعی انکسار اور تہذیب دہلی کے رعب سے متاثر پاشکستہ کرسی پر بیٹھنا چاہتے تھے۔ وہ کرسی کم بخت کچھ زیادہ مہمان نواز واقع ہوئی تھی۔ مہمان کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو جاتی

تھی۔ گویا اُن کھٹولے کی طرز پر بنائی گئی تھی۔ دیکھنے میں چاروں ہاتھ پاؤں ورکنگ آرڈر میں نظر آتے تھے۔ مگر حقیقت میں وجع مفاصل میں بری طرح مبتلا تھی۔ اُس کے اگلے دو پاؤں باقی اعضا سے منحرف ہو چکے تھے۔ پنڈت صاحب نے انکسار کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُسی کرسی کو انتخاب کیا۔ بیٹھنے کی دیر تھی کہ کرسی کی رگ حمیت جوش میں آئی جھٹ گھٹنے ٹیک دیئے۔ پنڈت صاحب اس وقت تکان کا اظہار انگڑائی کی صورت میں کر رہے تھے کہ اِدھر کرسی نے دست برداری کا اعلان کر دیا۔ ایک محرومی پوزیشن میں زمین پر آ رہے۔ یہ منظر افسوسناک سہی مگر دلچسپ ضرور تھا۔ پنڈت صاحب کا زمین اور جسم اقلیدس کی تمام شکلیں پیش کر رہا تھا۔ کرسی کی شکستہ پائی اور ان کی افتادگی نے منفرجہ اور حادہ زاویوں سے اس سین کو جیومیٹری کورس بنا دیا تھا۔

ارمان صاحب نے نیم خندہ ہمدردی کا اظہار کیا۔ مگر مجھ سے قہقہے کو نعرۂ ہمدردی میں چھپانا نہیں آتا۔ میں کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ اخبار ایشیا کے دو قابل کاتب جو اس وقت تک مقامی تہذیب کے خیال سے اپنی ہنسی کو آنکھ کے پپوٹوں اور رخساروں کی پہنائی میں دبائے ہوئے تھے میری بے اختیاری نے ان سے بھی یہ امانت اگلوا لی۔ اور اب تو سارا دفتر قہقہہ زار بن گیا۔ سب کے سب اتنے ہنسے کہ آخر کار ہنسی

" در پس ہر خندہ آخر گریہ ایست "

کے قانون کے مطابق تحلیل ہو کر آنکھوں سے پانی کی طرح بہنے لگی۔ دیر تک اس افتادگی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ اس بے قرار ساعت کے بعد سکون ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ کرسی کھٹملوں کی ایک نو آبادی ہے اور اگر میں کچھ دیر اسی پر دراز رہا تو ان کے کامیاب حملے میرے وزن میں کئی پونڈ کا اضافہ کر دیں گے۔

میں نے کھٹملوں کا چیلنج نامنظور کرتے ہوئے رسمیات کو برطرف رکھا اپنا بستر چٹائی پر بچھا لیا۔ ارمان صاحب بہتیرا کہیں ہیں ارے یہ کیا کرتے ہیں آپ کہتے رہ گئے۔ مگر میں نے ایک نہ سنی اور یہ کہہ کر بستر خاک پر دراز ہو گیا کہ مٹی کی نژاد ہوں خاک سے زیادہ اُنس رکھتا ہوں۔ انہوں نے بھی اس تواضع سمرقندی کو زیادہ طول دینا مناسب نہ سمجھا کیونکہ بزم سخن کی مجلس استقبالیہ نے شعرا کی فلک پردازی کے دعووں کے ساتھ ان کی خاک نشینی کو دیکھتے ہوئے چارپائیوں وغیرہ کی ضرورت نہ سمجھی تھی۔

ہوٹل کے ایک ملازم کو دیکھ کر پنڈت ارمان نے آقایانہ انداز میں فرمایا "جاؤ مولینا کے لئے گرم پانی غسل خانے میں رکھو" میں سمجھا کہ آغاز اسی مگر انجام اچھا ہوگا۔ گرم پانی سے غسل کیا اور کپڑے بدل کر مستقبل پر اعتماد کر کے بیٹھ گیا۔ پنڈت میلا رام جی اس خوش نصیبی میں میرے شریک حال ہے۔ اب جناب چاشت کے انتظار نے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ سفر میں مجھے بھوک زیادہ لگتی ہے۔ قوت ہاضمہ کبھی طالب علمی میں بھی اتنے عروج پر نہ ہوئی تھی جتنی آج دفتر ایشیا کو دیکھ کر آپے سے باہر ہوئی جاتی تھی۔ مسلسل انتظار کرتے کرتے دل بتاشے کی طرح بیٹھنے لگا۔ آخر صبر نہ کر سکے۔ کچھ بہانہ کر کے اٹھا اور بازار سے پوریاں خریدیں۔ فتح پوری کی مسجد میں جا کر ان پوریوں سے اُس صبر آزما انتظار کا پورا پورا انتقام لیا۔ وہاں سے پھر دفتر ایشیا میں آ گیا۔ اب کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ ارمان صاحب اس سے بے خبر تھے کہ میرے ارادی تغافل کا بدلہ پوریوں سے لے چکا ہے۔ ہوٹل کے ملازم کو آواز دی کہ ذرا مولینا کو کھانا کھلا دو۔ یہ بزم سخن کے مہمان ہیں۔ بزم سخن کے مہمانوں کے لئے اسی ہوٹل سے انتظام کیا گیا تھا۔ میں اگرچہ پوریاں اچھی طرح کھا چکا تھا لیکن بزم سخن کی مہمانی کے ذکر نے معدہ کو پوریوں والا واقعہ ہی بھلا دیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں نے رات سے کچھ نہیں کھایا۔ بہتیرا معدے کے حافظے پر زور دیا مگر توبہ توبہ۔ آنکھیں زبان دانت منہ دل سب کے سب معدے کے ہم زبان ہو کر مجھے جھٹلانے لگے کہ پوریوں والے خواب کو واقعہ تصور کرنے میں آپ کو مغالطہ ہوا ہے۔ میں نے بھی مصلحتاً اپنے حافظے کا ساتھ چھوڑ دیا اور دل کو یہ کہہ کر سمجھا لیا کہ گرہ سے دام نہیں جاتے کھا نا مفت ملے تو جا بیں گے ہوٹل کے "بوائے" سے مثال کر کھائیں گے۔ بغیر مزید تامل اٹھ کھڑا ہوا ملازم نے ایک اچھے کمرے میں سنگ مرمر کی میز کے سامنے ایک کرسی پر جا بٹھایا اور کہنے لگا کیا کیا کھایئے گا؟ اس کا یہ فقرہ میں نے اس پوزیشن میں سنا گویا ہاتف غیب جنت کی بشارت دے رہا ہے یا میرے

نام کوئی لاٹری نکل آئی ہے تو؟ جتنے کھانوں کے نام یاد تھے اسے فرفر سنا دیئے۔ وہ یہ سمجھا بمبئی کا کوئی منچلا سیٹھ جائیداد بیچ کر آ گیا ہے۔ اس کی بھی باچھیں کھل گئیں۔ گیا دوڑا ہوا اور قسم قسم کے کھانوں کی پلیٹیں لانی شروع کر دیں۔ میں نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ مسافرت میں پرخوری مناسب نہیں مبادا پیٹ کی شکایت نصیب دشمناں ہو جائے پانچ سات پلیٹوں کے بعد اسے روک دیا اور اب "بسم اللہ مجریہا و مرسا ہا" پڑھ کر دست شوق کو گستاخیوں اور معدہ کو دامن دراز کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا۔ کسی پلیٹ میں کچھ بھی چھوڑنا مذہبی وعید کے مطابق گناہ تھا۔ اس لئے مکہ مدینہ بیت المقدس جیسے اشرف متبرک مقامات میں جاروب کشی شروع کر دی۔ کھانے اور ہاتھ کی معرکہ آرائی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی کیونکہ چند منٹ کے بعد معدہ کو بزبان حال یہ کہتے سنا کہ ع

"پھیر دی ہے نگہ یار نے جھاڑو دل میں"

(۴۳)

بزمِ سخن دہلی کی مہمان نوازی

کھانا کھا کر وہاں سے اٹھا تو بیرا نے مجھ پر استفسارانہ نگاہ ڈالی۔ میں لذیذ کھانوں کے کیف و خمار سے لطف اندوز ہو رہا تھا میں نے بیرے کے خفی سوال کو نظر انداز کر دیا اور وہاں سے چل کھڑا ہوا۔ پھر تو اسے شبہ ہوا کہ یہ مسافر جعلی کا کوئی "بہروپیا" تو نہیں ہے جو اس چالاکی سے کھانا کھا کر اس بے فکری سے بے دام دیئے چلتا بنا۔ پھر اس خیال سے کہ مبادا کوئی نواب زادہ یا آپ ٹو ڈیٹ جنٹلمین ہوں، اور باقاعدہ بل پیش کرنے کے منتظر ہوں وہ جھپاکے سے ہوٹل کے منشی سے بل لینے چلا گیا۔ میں نے اس کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھایا اور لمبی لمبی ڈگیں اٹھاتا ہوا ایشیا کے دفتر میں پہنچ گیا۔ پنڈت رنج نرائن ارمان نے میرے چہرے پر خون صالح کی جھلک دیکھ کر بھانپ لیا کہ یہ ہماری بے اتفاقیوں کا ہوٹل سے انتقام لے کر آیا ہے۔ جبھی یوں ہشاش بشاش معلوم ہوتا ہے۔ بولے:

ارمان صاحب: کہئے نوٹنا پیٹ پوجا سے فارغ ہو آئے؟

میں: یہ معرکہ بھی سر کرنا ہی تھا نا آخر۔

ارمان صاحب: کھانا حسب منشا مل گیا؟

میں: آپ کی عنایت سے حسب منشا سے بھی کچھ اچھا ہی تھا۔

ارمان صاحب: پھر آپ اطمینان سے آرام کرسی پر دراز ہو جائیے۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔

ابھی فقرہ پورا بھی کرنے نہ پائے تھے کہ ہوٹل کا بیرہ بل لے کر آ دھمکا۔

بیرہ: (میرے ہاتھ میں بل دیتے ہوئے) بابو جی یہ بل ہے کھانے کا!

میں: (بل ہاتھ میں لے کر) بہت اچھا۔ ایک روپیہ نو آنے بنتے ہیں، یہ لیجئے۔

ارمان صاحب: بل کیسا؟

میں: ہوٹل کا بل۔

ارمان صاحب: مگر آپ تو ہمارے مہمان ہیں۔

میں: بل ادا کر کے بھی مہمان ہی رہوں گا۔ میزبان نہ بن جاؤں گا۔

ارمان صاحب: مناسب تو یہی تھا کہ آپ یہ بل ادا نہ کرتے۔

میں: اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ میں ہی ادا کر دوں۔

ارمان صاحب: ویسے تو یہ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا مگر آپ جو بڑے ہیں ہم جانتے ہیں ادا کئے بغیر نہ رہیں گے۔ اچھا آپ کی مرضی ہم آپکو ناخوش کرنا نہیں چاہتے۔

میں: آپ کا شکریہ۔

خیر بل میں نے ادا کر دیا اور ایک روپیہ نوکر کے ساتھ ہی بیرہ بڑی خوش خوری کا خمار ہو۔ لے گیا کھانے کے بعد استراحت ہضم کے لیے ہی ہے لیکن [illegible] یاد تھے۔ نئے امتحانات کو اشکرہ پر تبدیل کر دیا۔ بزم سخن وادن کی پیرا معانی حرکات۔ مصنوعی تواضع و انکسار [illegible] بھی [illegible] جوانوں میں حرارت۔ [illegible] خیریت پر گذری [illegible] وقت وی بی [illegible] کا پیپر اڑا نے کے لئے تانی روپیہ ساتھ [illegible] وہ اور ان [illegible] تو ایسا معقول [illegible] کر دیا تھا کہ بیا صاحب فرق کرانے کے لئے [illegible] نیا ہم تلاش کرنے پڑتے۔

[illegible] صاحب [illegible] کی [illegible] تم [illegible]

[illegible] اور عشق صاحب [illegible] کی دوست ایسے بھی ہیں۔ جن سے ملاقات ہوتی کی عمر اتنی ہو [illegible] انسانی بچے [illegible] ملوم کر کے تعجب ہوا کہ بیمار [illegible] کو زندہ الاباب اپنے آپ کو نقد و پارسا اخلاق [illegible] ساتھ لغنی گہیر ہو کر ہے۔ گویا ان کی پوری زندگی ہم دونوں کے [illegible] مگر ان [illegible] مصنوعی زندگی کا [illegible] مقروں سے ہو سکتا ہے جو چند ملاقات ان لوگوں کی زبان سے نکلے [illegible] صاحب آغا حورا [illegible] صاحب آنکھیں [illegible] آپ کے انتظار میں۔ ہاں اب مشاعرہ جمے گا۔ کہئے کب تشریف لائے؟

میں: صبح حاضر ہوئے ہیں۔

وہ صاحب: کہاں قیام ہے؟ ایشیا کے دفتر میں؟ بہت اچھی جگہ آپ کو مل گئی ہے۔ چاندنی چوک کے تمام نظارے دیکھ سکیں گے۔

دوسرے صاحب: آغا وفا صاحب اور پیر رکیب رشید و رشید مولینا بھی۔ ہاں ہاں سمجھ گئے [illegible] ہوں گے۔ اچھا تو بڑے بڑے لوگوں ساتھ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ [illegible]۔ کانگرس نے ہوٹل کیمپوں کے ساتھ قیام پذیر ہیں۔ پھر تم غریبوں کے گھونسلوں کو کہاں پسند کریں گے۔

میں: نہیں صاحب ہم تو کانگرس والوں میں نہیں آتے نہ کانگرس ڈیلی گیٹس کی شکلیں دیکھیں۔ کاروبیشن ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

وہ صاحب (ہوٹل کا چھپتا ہوا فقرہ سن کر) اچھا تو کاروبیشن ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہاں بھئی ماشا اللہ سیٹھ لوگ ہیں۔ اس ہوٹل میں [illegible] ٹھہر سکتا ہے۔ اچھا اور فرمایئے مزاج کیسے ہیں۔ لاہور کی ادبی فضا کیسی ہے؟ بھئی یہاں راستے میں باتیں کرنا ذرا [illegible] کے خلاف سمجھا جاتا ہے وقت بتایئے۔ ہوٹل میں کس وقت مل سکتے ہیں؟

میں: شام کی چائے پر تشریف لایئے۔

وہ صاحب: میرے ساتھ پروفیسر حیدری۔ رونق صاحب۔ ساحر صاحب اور دو تین احباب ہوں گے۔ یہ سب حضرات آپ سے ملنے کے بے حد مشتاق ہیں۔

میں: ہماری بڑی خوش قسمتی ہے۔ ضرور ان کو بھی ہمراہ چائے پر لایئے۔

وہ صاحب: بہت خوب۔ شکریہ۔ اچھا آداب عرض کرتا ہوں۔ ہاں مجھے وقت پر سوجھ گیا۔ میرا خیال ہے آپ کی تشریف آوری سے فایدہ اٹھانا چاہیئے۔ دہلی کے اہل قلم کو کیوں نہ آپ کی آمد کی اطلاع دے دی جائے۔ میں سب کو لے کر ہوٹل میں پہنچ جاؤں گا۔ اچھا ہے دو چار گھنٹے صحبت

ء۱۔ اردو کے مشہور شاعر اور مولانا کے محب خاص پنڈت میلا رام وفاؔ

رہے گی۔ پھر یہ موقعے روز روز کہاں ہاتھ آتے ہیں۔ نواب تاباں۔ نواب رخشاں۔ نواب درخشاں یہ سب ہوں گے۔

میں نے جو یہ ہم قافیہ نوابوں کے نام سنے تو یادش بخیر بحث کا تصور آ گیا۔ ساتھ ہی اس بے فکرے میونخوڑ کی تباہ کن جبری دعوت کی تجویز دل پر غور کرنے لگا۔ دلی کا یہ من چلا دوست میری پیشانی کے بلوں کو تاڑ گیا کہ اس جلسے بازی کی تجویز میں میری چالیں بھی ہاتھ سے جاتی معلوم ہوتی ہے جھٹ پینترا بدل کر بولا :

وہ صاحب : اچھا یوں کیجیئے۔ آج تو میں اپنے چند دوستوں کو لے کر پانچ بجے آجاؤں گا۔ جلسے کی تجویز کل پرسوں پر رکھیئے :

میں : جو آپ مناسب سمجھیں مجھے منظور ہے :

(۵)

دہلی والے شعراء سے ملاقات

ایشیا کے دفتر میں شعرا کا تانتا لگا ہوا تھا۔ ایک جاتا تو دو آتے تھے۔ دفتر کی نمایشی اشیاء میں وفا صاحب اور مولینا سب سے نمایاں تھے جو ہر ایک کو دکھائے جاتے تھے۔ لوگ ایسے غور و استعجاب کی نظروں سے معائنہ کرتے تھے۔ گویا ہم افریقہ کے جنگلوں سے پکڑ کر لائے گئے ہیں۔

(۱) اچھا۔ وہ یہ صاحب ہیں۔ خوب نام تو سنا کرتے تھے۔ دیکھ بھی لیا۔

(۲) آہا وفا صاحب یہ ہیں۔ یہ تو بڑے سادہ منش معلوم ہوتے ہیں۔

(۳) اخاہ مولینا یہ ہیں۔ ارے آپ تو جوان نظر پڑتے ہیں۔ ہم تو لمبی سپید ڈاڑھی والے بزرگ آپ کو سمجھتے تھے۔"

اس قسم کے تعارفی ریمارکس ہم پر ہو رہے تھے۔ اور ہم مردہ بدست زندہ۔ خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتے تھے :

جبری ٹی پارٹی

پانچ بجے سے پہلے وہ بزرگ اپنے نصف درجن دوستوں کے ساتھ آ ورآمد ہوئے۔ آدھا گھنٹہ تعارف کی بے کیف رسم میں ضائع ہوا تعارفی نمونے ملاحظہ ہوں :

(۱) یہ صاحب میرے دوست ہیں پروفیسر خیر اللہ بڑے بھاری شاعر ہیں۔ بڑے پُر گو ہیں۔ سنگلاخ زمینوں میں دو دو سو شعر کہہ جاتے ہیں اور پھر لطف یہ کہ تقریباً فی البدیہہ کہتے ہیں۔

(۲) یہ جناب نواب رخشاں ہیں۔ قصیدے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ سودا اور ذوق کے بعد ان کی ٹکر کا قصیدہ گو اور کوئی نہیں ہے۔ بڑے شریف۔ نمازی۔ پرہیزگار اور ضلع جگت بولنے کے استاد مانے جاتے ہیں۔ شطرنج میں بڑے بڑے شاطروں کو مات دے چکے ہیں۔ ان کے خاندان میں "پھوپی گدگدی" اور "بی بنتی" کے بڑے بڑے ماہر موجود ہیں۔ ظفر بادشاہ کے ولی عہد کی دوسری بیوی انہیں کے بزرگوں میں سے تھیں۔

(۳) یہ میرے دوست شیخ مدار بخش موسیقی کے یگانہ استاد۔ آپ نے بھی ان کا نام سنا ہوگا۔ گراموفون کے ریکارڈوں میں ان کے گانے بھرے ہوئے ہیں۔ ستار بڑا اچھا بجاتے ہیں۔ جل ترنگ بجانے میں تو مشہور ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کے مرید ہیں۔ شعر فہمی کی استعداد بھی بقدر ضرورت موجود ہے۔

(۴) یہ ہیں ہندو دوست لالہ سیتلا پرشاد صدیقی ہیں سیشن جج کی عدالت میں قتل خواں ہیں۔ بڑے نامی گرامی آدمی ہیں۔ لالہ چھجو رام ٹھیکیدار کے چچا بھائی ہیں۔ شاہی زمانے میں ان کے بزرگ ڈیوڑھی کے پہرہ دار ہوا کرتے تھے۔ آپ سے ملنے کے بڑے آرزومند تھے۔ آپ کے منہ سے آپ کا

کلام سننا چاہتے ہیں۔ خود بھی شاعرہ ہیں۔

(۵) یہ دہلی کی مشہور و معروف طوائف لڈن جان نازؔ ہیں۔ بڑی اچھی غزلیں کہتی ہیں۔ ان کے کلام میں شوخی اور معاملہ بندی بہت ہوتی ہے۔

اور صاحب سچ یہ ہے کہ یہ ہیں بھی حقیقت میں بڑی نیک اور شریف۔ ان کے ہاں پیرِ دستگیر کی گیارھویں شریف بڑی دھوم دھام سے ہوتی ہے عاشورۂ محرم میں شان دار مجلسیں کراتی ہیں دور دور سے سوز خواں اور مرثیہ خواں بلائے جاتے ہیں۔ خود ان کی سوز خوانی کا انداز دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ بڑے بڑے خاندانی امرا ان کا آنا جانا ہے۔ آپ سے ملنے کی بے حد مشتاق تھیں۔ آپ کے منہ سے آپ کی وہ غزل سننا چاہتی ہیں۔ وہ انہیں بہت ہی پسند ہے جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

"اُن کے سینے پہ نہیں تعویذ یہ بے فائدہ — چشم بد دور اُن کے جوبن پہ اُبھار آنے کو ہے"

اول تو ان خوفناک ناخواندہ مہمانوں کی صورت ہی سے میری روح تحلیل ہوئی جا رہی تھی کہ الٰہی عمر بھر پارسائی کے طفیل اس وادیٔ پُرخار سے بچا رہا۔ مولینا کے لقب نے جہاں اور بہت سی دنیوی سعادت سے محروم رکھا وہاں ان مذکورہ سے بھی آشنا نہیں ہونے دیا۔ اب کس گناہ کی پاداش میں یہ احوال نصیب ہوا ہے۔ خدا نخواستہ لاہور یا دیوبند کا کوئی واقف اگر اُدھر آ نکلتا تو میرا تو خاتمہ ہی تھا۔ بس ہارٹ فیل ہو جاتا۔ میں اس غیر متوقع مہمان کے خیر مقدم کے لئے تیار نہ تھا۔ اس کی موجودگی نے میرے حواس ہی معطل کر دیئے۔ مجھے عالم سراسیمگی میں ایسا معلوم ہوا کہ دیوبند کے مولویوں کی ایک جماعت مجھے گھیرے کھڑی ہے۔ حد نظر تک طالبعلموں کی داڑھیاں ہی داڑھیاں، مرچھپاں کی طرح ہلتی نظر آ رہی تھیں۔ اس ذہنی تصور نے مجھے پریشان کر دیا ان کا نظر باز ناز تاڑ گیا کہ اس پر اس وقت مومنیت طاری ہو رہی ہے۔ بولا :

مولینا آپ انہیں عام طوائفوں میں نہ سمجھیں۔ مولینا فضل احمد جیسے بزرگ، نظامی خواجہ جیسے صوفی بھی نازؔ صاحب کی قوالیوں پر سر دھنتے ہیں۔ یہ موسیقی میں گوہر جان اور پٹنہ کی زہرہ جان سے بھی بازی لے گئی ہیں۔ موسیقی ایک فن ہے۔ اسلام علوم و فنون کی قدر کرتا رہا ہے پھر آپ چونکتے کیوں ہیں۔ اور پھر یہ بے چاری تو مذہب کی بڑی پابند ہیں۔ کسی نیک بخت عالم دین کی تلاش میں ہیں۔ کوئی ان کے ڈھب کا ملا تو نکاح بھی کر لیں گی اور حج کا تو کئی سال سے ارادہ کر رہی ہیں۔

لڈن جان نازؔ: مولینا میں تو آپ کی بڑی عقیدت مند ہوں۔ آپ کا کلام اکثر پڑھا کرتی ہوں۔ سب قیس۔ لیکن کسی کے گھر پر آج تک نہیں گئی آپ کی زیارت کے لئے آپ کے بغیر بلائے حاضر ہو گئی۔ تو آپ مجھ سے ملنا تقدس کے خلاف سمجھتے ہیں۔ کبھی ہمارے بڑے صاحب کے عرس میں تشریف لائیں تو آپ دیکھیں گے کہ کتنے بڑے بڑے دور دور کے سجادہ نشین میری عزت کرتے ہیں اور مولینا فضل احمد سے زیادہ تو معاذ.. فرمایئے آپ کو پارسا مان نہیں سکتی۔ ان کا تو یہ حال ہے۔ اگر میں کسی جمعرات کو نہ جاؤں تو آدمی پر آدمی بھیج کر بلواتے ہیں۔ ایک دن تو خود ہی میرے غریب خانہ پر تشریف لے آئے تھے۔ آخر وہ بھی عالم دین ہی ہیں اور آپ سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔

(۶)

میں نے اس بے پناہ تقریر کو سننے کی بجائے سارا وقت اپنے حواس خمسہ بجا کرنے پر صرف کر دیا اور سنبھل کر بولا :

نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے۔ میں کوئی مولوی وولوی نہیں ہوں۔ ان لوگوں کا حسن ظن ہے یا حسن مذاق کہ مجھے مولینا کے غیر موزوں لقب سے مخاطب کرتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ شعر جو میری طرف منسوب کر کے مجھے سنایا گیا ہے۔ اس نے مجھے بہت تکلیف دی کہ

"چشم بد دور ان کے جوبن پر ابھار آنے کو ہے"

استغفر اللہ۔ ایسا نجس اور غیر شریفانہ جذبات سے لبریز شعر میں کہہ سکتا ہوں۔ مجھے اس قسم کے گندہ اشعار سے بچپن سے نفرت رہی ہے۔

لندن جان نازؔ: اچھا تو پھر یہ شعر کس کا ہے ؎

نیلے عارض ہیں نزاکت سے یہ کس بیدردی سے
لیا بوسہ تصور میں تری تصویر کا

میں: مجھے کیا معلوم کس کا شعر ہے۔

نازؔ: آپ کا نہیں ہے؟

میں: خدا نہ کرے کہ میں ایسا شعر کہوں۔ میں اس قسم کے اشعار کو میں اردو شاعری کے لئے بلک سمجھتا ہوں۔

نازؔ: میں نے آپ کا شعر [illegible] سے مجالس کی مجلس پھڑک گئی ہے۔ اس روز [illegible] کے ترنم میں پوچھ

لئے آپ [illegible] غزل پڑھی [illegible] ؎

[illegible] کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

جب اس شعر پہ آئی [illegible]

"[illegible] لیا بوسہ تصور میں تری تصویر کا"

تو سارا مجمع لوٹ پوٹ ہو گیا۔ مرزا [illegible] کوچے میں ہے [illegible] تو اس شعر پہ حال آ گیا۔ بچپن [illegible]

ہوتے [illegible] پڑھوا لیا گیا ہوگا یہ شعر [illegible] سے مشہور ہو گئے ہیں۔

میں: آپ مجھ سے مذاق [illegible] کر رہے ہیں۔ بقول شخصے مدعی سست گواہ چست۔ مطلع غالب کا اور شعر خدا جانے کس کا۔ یہ مجھ پر اس قدر

[illegible] کیوں مہربان ہوئی کہ ایسے اشعار میرے سر منڈھ دیئے گئے۔

[illegible] غالب کا یہ واقعہ تو بہت ہی مشہور ہے مولینا کے نام منسوب کرتے ہوئے آپ نے بڑی جرأت سے کام لیا اور پھر [illegible]

[illegible] کہ غالب سوتے [illegible] کہ غالب کا مطلع دوسرے کی غزل میں کیوں لگا دیا۔ مولینا کو شاعری کی اچھی

[illegible] ہے اور وصل [illegible] سے بھی انہیں نفرت ہے۔ اسی قدر اس قسم کے اشعار ان کی طرف منسوب کر دیئے جاتے ہیں

نازؔ: اچھا جناب [illegible] ہوں۔ اگر یہ اشعار واقعی آپ کے نہیں ہیں تو میں پرسوں [illegible] کے ہاں [illegible] والا ہے۔

اس میں اعلان کر دوں گی کہ یہ غزل [illegible] نہیں ہے۔ اب تو آپ خوش ہیں؟

میں: خدا کے لیے ایسا نہ کیجیے۔ پہلے ہی آپ نے کافی طرح میری شاعری کو رسوا کر دیا ہے۔ اب اعلان کر کے پبلک کو مزید توجہ نہ دلائیے۔

نازؔ: اچھا نہ سہی۔ اعلان [illegible] نہیں کروں گی تا آپ کسی طرح خوش ہو جائیں۔

[illegible] صاحب: [illegible] صاحب چھوڑیئے ان جھگڑوں کو کچھ اور ذکر کیجئے۔ کہیئے لاہور کا کیا حال ہے۔ میونسپلٹی تو آپ کی بڑی مالدار ہے۔ چیئرمین صاحب سے تو آپ کے تعلقات اچھے ہوں۔ میرے بھائی صاحب وہاں ٹھیکیداری کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ مجھے لاہور بلانا چاہتے ہیں۔ تو انہیں مل ملا کر کوئی اچھا معقول سا ٹھیکہ دلوا دیجیئے۔

میں: مجھے تو چیئرمین صاحب سے نیاز حاصل نہیں ہے۔ نہ یہ جانتا ہوں کہ لاہور کی میونسپلٹی مالدار ہے یا کنگال۔

[illegible] صاحب: [illegible] صاحب لاہور کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ مالک! جو چاہیں ہو سکتا ہے۔ گورنر سے بھی کچھ کام پڑے تو وہ بھی ان کے کہنے کو

نہیں ٹال سکتا۔ خیر یہ تو سب کچھ ہو جائے گا۔ ہاں وہ جلسے کے متعلق آپ نے کچھ نہ فرمایا۔ بھئی میرا تو یہ خیال ہے عام جلسہ کرنا تو ٹھیک نہیں۔ بس زیادہ سے زیادہ بیس آدمی جو ادبی ذوق رکھتے ہیں انہی کو دعوت دی جائے اور کسی کے گھر پر جلسہ کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ یہاں کے اہل قلم ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ چشمک رکھتے ہیں۔ ہم [illegible] کسی ایک کے گھر پر سب جمع نہیں ہو سکیں گے۔ اور سب کے سب ہمارے بلانے آ بھی گئے تو بھی نہیں۔ آپ سب سے الگ تھلگ ہیں [illegible] دعوت نامہ خطبہ بانٹ دیے [illegible] میں یوں کیجئے پرسوں شام کو اسی وقت اسی جگہ بلوا لیجئے۔ اچھا تو پھر چار گھنٹے آپ [illegible] سب اہل ظلم [illegible] بیٹھا [illegible] جناب۔ ہم دلی والوں میں رشک و رقابت کے جذبات ہمیشہ سے رہے ہیں۔ غالب [illegible] [illegible] ایک [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہم خیال [illegible] اچھا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ان [illegible] انہی [illegible] لازمی ہونا چاہیے۔

[illegible] صاحب [illegible] تقریریں [illegible] اور [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

"[illegible] [illegible]"

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] امید [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] صاحب تجویز تو بہت اچھی ہے [illegible] چاہتا ہے کہ اہل دہلی کی صحبت [illegible] ہوں مگر بدقسمتی سے ہم [illegible] سے فارغ ہو کر رام پور جانا چاہتے ہیں۔ وہاں سے پھر [illegible] ہو کر دہلی قیام کریں گے۔ اس وقت [illegible] جلسہ کرنا [illegible] ہوگا۔ رام پور [illegible] پہنچنا نہایت ضروری ہے۔ پرسوں تو ہم کسی صورت بھی یہاں نہیں ٹھہر سکیں گے

[illegible] صاحب بھی تو ہیں۔ ابھی آپ کی تجویز سن کر چلے [illegible] تھا [illegible] [illegible] باقی انشاء اللہ [illegible] اچھا [illegible] کریں گے۔ [illegible] دلی کی [illegible] نوبہیں [illegible] ہے [illegible] صاحب [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] نیر [illegible] ہے۔ بس [illegible] جانا تو تین دن کے بعد وہاں سے واپس ہوں گے۔ [illegible] [illegible] سب کو یہاں سے آنا آپ کے سپرد ہوگا!

محترم [illegible] یا دل نخواستہ اپنی تجویز واپس لی مگر اس دھمکی کے ساتھ [illegible] جناب! اگر آپ [illegible] ہوئے چلے گئے تو عمر بھر شکایت رہے گی۔ مجھے [illegible] سے [illegible] نہ پڑا ہے گا"

ہماری جانب سے [illegible] کا اطمینان کر کے یہ صاحب اپنی پارٹی کو لے کر [illegible] اور رسمی شکریہ ادا کر [illegible] جناب [illegible] کے سپرد کر گئے۔

شعراء کا ایک گروپ

گرمی کا موسم۔ پھر گرمی بھی دلی کی۔ چلچلاتی دھوپ پڑ رہی تھی۔ ہم ایشیا سے [illegible] پنچھے کی [illegible] رہے تھے۔ اچانک اطلاع ملی کہ ملاقاتیوں کا ایک وفد ہمارا معائنہ کرنا چاہتا ہے۔ اس وقت ملاقاتی کپڑے پہننا بہت کھلا مگر کیا کرتے

"مردہ بدست زندہ"

وقاسے یاس نوروبی کھدر کا ایک جوڑا تھا جو لاہور سے پہن کر چلے تھے۔ اسے ملاقاتی سمجھ لیجئے یا پرائیویٹ۔ بس دے کے بس وہی تھا۔ مجھے تکلفات نے مصنوعی زندگی اختیار کرنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ خیر میں نے آناً فاناً کپڑے بدلے اور اس ناخواندہ قضائے مبرم کا منتظر ہو گیا۔ دفتری سیڑھیوں پر پریڈ کرنے کی سی آواز آئی۔ معلوم ہوا وفد کیا پوری ایک پلٹن چلی آ رہی ہے۔

اب ارمان صاحب کو تعارف کی مصیبت سے پھر دوچار ہونا پڑا۔ ہمارے متعلق تو وہ صرف اتنا ہی فرما دیتے تھے کہ یہ مولانا ہیں اور وہ وقار صاحب مگر وفد کے ہر ممبر کے متعلق تعارف ہوتے وقت انہیں ایک نثریہ قصیدہ پڑھنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ یہ وفد پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی کی سرکردگی میں اصحاب ذیل پر مشتمل تھا۔

(۱) نواب تاج الملوک: دہلی کے مشہور شاعر۔ خاندانی آدمی، گورے چٹے، چوڑے چکلے، اپنی جوانی کی غلط کاریوں کے کارٹون بنے ہوئے، سپید داڑھی، مونچھیں راجپوتی انداز کی، چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں دنبالہ دار سرمہ، ہونٹوں پر مسی کی دھڑی جمی ہوئی اس بڑھاپے میں جوڑے کی شوقینی کا یہ حال کہ چیھ گرہ چوڑی لیس کی گول ٹوپی، ریشمی گرانڈیل کا انگرکھا، پنڈلیوں سے چمٹا ہوا چست پاجامہ جس کا اودا ریشمی آزار بند قدموں کی بلائیں لے رہا تھا۔

(۲) لالہ پیارے لال، رونق دہلوی۔ پستہ قد، شاعرانہ چہرہ مہرہ، آزادانہ وضع قطع۔ ایک تخلص اور دیوان غزلیات کے بلا شرکت غیرے وارث مانئے یا نہ مانئے وہ شعر ضرور سنائیں گے اور آپ کو داد دینی پڑے گی۔

(۳) لالہ چنڈی پرشاد شیدا دہلوی۔ صورت شکل میں لاہوری شیدا کے ہم قسمت۔ قد سوا نیزہ۔ پتلے دبلے اتنے کہ خدا نخواستہ کبھی مر گئے تو ڈبل عرض کے آدھ گز کپڑے میں منہ لپیٹا ہو سکے گا۔ ان مصیبتوں کے ساتھ شعر بھی کہتے ہیں۔ آدمی بہت شریف ہیں۔

(۴) حکیم الطاف احمد آزاد سہارنپوری۔ ایک مشہور و معروف شاعر ہیں۔ میانہ قد، مگر لاغر اندامی کے سبب دراز قد نظر آتے ہیں۔ صورت و شکل سے ان کے اشعار کو ملائیے تو معلوم ہوگا کہ یا یہ اشعار ان کے نہیں ہیں اور اشعار اگر انہیں کے ہیں تو آزاد سہارنپوری کوئی اور بزرگ ہوں گے۔ میں نے ایسے اچھے شگفتہ نگار شاعر کو اتنا منکسر المزاج نہیں دیکھا۔

(۵) لالہ سورج نراین مہر بی۔ اے سابق انسپکٹر مدارس پنجاب۔ پنجاب کا تعلیمی اور ادبی حلقہ ان سے خوب واقف ہے۔ ان کا مجموعۂ کلام ہر اسکول کی لائبریری میں ملے گا۔ اردو کے مشہور شاعر، سنسکرت کے فاضل اور دیانت کے مجنون ہیں۔ گوشہ نشین اور علم دوست انسان ہیں۔

(۶) پروفیسر حیدری اردوئے معلےٰ کے ایڈیٹر۔ جوان بخت و جواں سال۔ ظاہری وجاہت اتنی ہے کہ اگر آزاد سہارنپوری کے کلام کو اپنا نے بیٹھ جائیں تو کوئی ان کے دعوے کی تردید نہیں کر سکے گا۔

(۷) کیفی دہلوی۔ یہ کیفی دوسرے ہیں ہمارے محترم پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی سے مختلف ہیں۔ نام ان کا ذہن سے اتر گیا۔ سیدھے سادے سے مرد معقول ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں۔

(۸) مولانا گرامی۔ مولانا گرامی جنہیں مرحوم لکھتے ہوئے کافی صدمہ ہوتا ہے ان کی زیارت بھی اسی وفد کے ایک ممبر کی حیثیت سے ہوئی اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سادگی اور کرختگی کا نمونہ بنے ہوئے تھے۔ جٹا شاہی لباس۔ عمامہ سر پہ جس کے ایڈٹ کرنے میں کافی بے نیازی برتی گئی تھی، ایک قلندری سوٹا ہاتھ میں۔ بولنے اور زیادہ بولنے کے مریض۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ نپٹ بہرے، اپنی ہی کہے جاتے تھے، دوسرے کی نہیں سنتے تھے۔ ایسا بیکراں و بے عدیل سحر نگار خدا جانے اس وفد کے ہتھے کیسے چڑھ گیا تھا!

(۹) پنڈت وستہ پرشاد فدا بی اے ایڈیٹر روشنی۔ لاہور سے ہی مشاعرہ میں تشریف لے گئے تھے۔ گول مول بدن، شکیل اور رمو نعل چہرہ۔ ہوش سنبھال کر سب سے پہلے شاعری ہی شروع کی ہے۔ کسی اخبار کے خاص نمبر میں اگر خدانخواستہ ان کی نظم نظر نہ آئے۔ تو ان کے دوستوں کو بیمار پرسی کے لئے جانا ضرور ہی ہوتا ہے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ مرزا سلطان احمد اور پنڈت وستہ پرشاد نے یوں مقاسمہ کر لیا ہے کہ نثر کے علاقے

مرزا صاحب کے حصے میں آگئے اور نظر سے مرے پنڈت جی نے آباد کر لیئے۔ مرزا سلطان احمد تو اپنی جاگیر سے ریٹائر ہوگئے اور پھر کوئی بھی نثری دنیا میں ان کا حریف ہمہ گیری نہ بنا مگر پنڈت جی کی جائیداد پر ابھی مجھلی شہری نے بھی نظریں ڈال رکھی ہیں۔ اگرچہ ہمیں یقین ہے کہ ابھی مجھلی شہری اور نقد لدھیانوی پنڈت جی کی ہمہ گیری کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گے۔

ہاں تو پنڈت دتہ پرشاد جی کا اردو اور انگریزی خط قابل رشک حد تک خوبصورت ہے۔ بڑی قابلیتوں کے انسان ہیں۔ نثر کے مضامین نہایت مفید اور دلچسپ لکھتے ہیں مگر کسی رسالے کو اشاعت کے لیئے عنایت کرتے ہوئے شرط یہ لگا لیتے ہیں کہ پہلے میری نظم شایع ہونی چاہیئے پھر یہ مضمون چھاپئے گا کیونکہ "میں ایک نثار ہونے سے پہلے ایک شاعر ہوں" میرے دیرینہ عنایت فرما ہیں اور مجھ سے ان کا برتاؤ ایک قابل قدر مخلص دوست کا سا ہے۔ اس لیئے میں تو انہیں نثار ہونے سے قبل کیا معنی وقت پر نثار ہونے سے بھی پیشتر شاعر مان لیا کرتا ہوں۔

(۹) پنڈت امرناتھ ساحر۔ دراز قد، دراز تر ریش، ایم اے ہیڈ ماسٹر، مرد معقول، اتنا پاری شکل و صورت، شریف طبع، مرنجان مرنج، شاعری کے ہیضے میں بُری طرح مبتلا۔ تقریباً پندرہ سال سے بلا ناغہ پندرہ روزہ مشاعرہ اس پابندی کے ساتھ منعقد کرتے ہیں کہ سورج اپنا مقررہ پروگرام بدل سکتا ہے مگر ان کا مشاعرہ اپنے وقت سے نہیں ٹل سکتا۔ حقیقت میں دہلی میں اردو شاعری انہی کے دم قدم سے اپنی زندگی کے آخری سانس پورے کر رہی ہے ورنہ مسلمان شعراء تو ہتھیار ڈال چکے ہیں۔

(۱۰) پنڈت راج نراین ارمان دہلوی۔ بڑی بڑی قیصری مونچھیں، ایسا معلوم ہوتا ہے دونوں رخساروں پر دو کالی گلہریاں بھر رہی ہیں، داڑھی صفاچٹ، گھٹا ہوا سر آئینے کی طرح چمکدار۔ آنکھیں گول مگر بے نمیت۔ رنگ آبنوس سے کچھ نکھرتا ہوا۔ سیاہ ایرانی ٹوپی، چوڑی دار چست پاجامہ۔ چوڑی آستینوں کا کرتہ، اوپر سے شکاری کوٹ۔ ہاتھ میں چھتری کی موٹھ کی طرح کا بھدا سا بینت۔ دنیا آپ کی قدر کرے یا نہ کرے۔ آپ خود اپنے قدر شناس واقع ہوئے ہیں بقول حسرت موہانی ع

"ہیں اپنی داد خود دے لوں کریں بھی کیا قیامت ہوں"

آپ نے کسی یونیورسٹی کے اسناد کی کبھی پروا نہیں کی۔ خود اپنی قابلیتوں اور استعداد فنون کا اندازہ کر کے ذیل کے طغرے اپنے لیئے تجویز کر لئے ہیں۔

"کھشٹ شاستری" ڈاکٹر، وئید، جوتشی، ایڈیٹر، شاعر، جانشین داغ، دہلوی۔

ایک دن کسی خاص موڈ میں اپنے اندر استحقاق خطاب کے جذبے کے ساتھ عطائے خطاب کی استعداد جو پائی بیٹھے بٹھائے ایک نہ دو اکٹھے تین خطاب اپنے واسطے گھڑ لیئے۔ طوطی ہند، مورخ، افضل الشعراء۔

اب آپ کا سائن بورڈ ان ڈگریوں اور خطابوں کی وجہ سے طبیہ کالج دہلی یا ایس پی ایس کے ہال لاہور سے عمارتی چندہ دہندگان کا تختہ سیاہ معلوم ہوتا ہے۔ ماشاء اللہ اس کلے جبڑے کے ساتھ بہت کرج دار آواز پائی ہے۔ اس لئے بحیثیت مناظر اور اپدیشک بہت کامیاب ہیں۔ اسٹیج پر نظم سناتے ہوئے لندھور کی آن بان کے مالک ہو جاتے ہیں۔ غرضیکہ آدمی بہت دلچسپ ہیں۔ داغ کے رنگ میں کہہ لیتے ہیں تو استاد شاگرد کا امتیاز اٹھا دیتے ہیں۔

(۱۱) پنڈت میلا رام وفا ایڈیٹر سوراجیہ لاہور

ان کا حلیہ تو حکیم صاحب کی گولیوں کی طرح پیٹنٹ ہے۔ رنگ سرخ آنکھیں بے نور جیسے مرنے کے بعد ہو جایا کرتی ہیں۔ عادتاً تو داڑھی منڈواتے ہیں مگر لاابالی پن کہیئے یا کفایت شعاری داڑھی بیچاری خشخاشی سی ہی رہتی ہے مونچھوں کو بال خورہ لگ گیا ہے۔ جس نے سرزمین بروت کو جگہ جگہ سے بنجر کر دیا ہے۔ اس پر مصیبت یہ کہ کسی معاملے میں غور و فکر کی حالت میں مونچھوں کے بالوں پر دانتوں کی قینچی مصروف عمل ہو جاتی ہے۔ کاسۂ سر عجیب قماش کا پایا ہے نہ گول ہے نہ چوکور۔ بیضوی بھی اسے نہیں کہہ سکتے جنوباً شمالاً تو لمبوترا ہے شرقاً غرباً اصطرلاب کی شکل کا ہے۔ سطح بالا سرپوش کے بغیر کھلی سی

ہے۔ سر کے سامنے دو کان ایسے ہیں جیسے سارنگی کے پردے۔ سر کا پچھلا حصہ کچھ ضرورت سے زیادہ بڑھا ہوا اور چھجے کی طرح جھکا ہوا ہے۔ خدا جانے صناعِ حقیقی نے اس اضافی سر میں اپنی صنعت کا کون سا بھید رکھا ہے۔ ڈاکٹر عبدالقوی کہتے ہیں کہ "سن سٹروک" سے بچانے کے لئے کھوپڑی کے آس پاس دھوپ چھتری لگا دی گئی ہے وہ کہتے ہیں کہ اسپتال میں کئی مریض ان کے ہمسر ہمارے زیرِ مشق رہے ہیں خیر ایسا ہی ہوگا۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے، ہم تو یہ سمجھے ہوئے تھے کہ دنیا کی حیرتوں میں اضافہ کرنے کی غرض سے پنڈت صاحب دو سر سے پیدا ہوئے تھے دائی نے یہ سمجھ کر کہ بچے کے دو سر کسی نے دیکھ پائے تو خوشی رنج میں بدل جائے گی اور پھر مجھے انعام کے نام کا کچھ پراپت نہ ہوگا۔ نال کے ساتھ پچھلا سر بھی اڑا دیا۔ یہ قطع و برید ہوئی جلدی میں۔ آپ جانیں جلدی کا کام! ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہوا یہ کہ کٹتے ہوئے سر کی پیشانی کٹنے سے رہ گئی۔ ان کی قسمت تھی جو بچے ہوئے سر کے سامنے کٹتے ہوئے سر کی پیشانی پر بال آگئے ورنہ سر باقی کا گنج سر فانی کی پیشانی سے ہم آغوش ہو جاتا اور یہ فارغ البالی ان کے حسنِ صورت کو چار چاند لگا کر انہیں یورپ سے چلنے پر مجبور کر دیتی۔ افسوس ہے۔ ان کے تفقس عنصری کی تکمیل میں مجھے ان کے لباس کو روشناس کرانے کا موقع ہی نہیں ملا۔

میرا خیال ہے اور میرا ہی خیال کیا اور صاحب کی بھی یہی رائے ہے کہ ان کے کپڑوں میں جتنی قسم کی بیماریوں کے جراثیم پناہ گزین رہتے ہیں، اتنے لاہور کے اسپتال کی لیبارٹری میں بھی نہیں ملیں گے۔ ان کے کپڑے کتنے ہی میلے ہو جائیں۔ ان میں جوئیں کبھی نہیں ملیں گی کیونکہ بیماریوں کے جراثیم کی وجہ سے جوئیں کو نشوونما کا موقع نہیں ملتا کہ کھٹملوں والی چارپائی پر انہیں سلا دیجئے صبح ہوتے ہوتے چارپائی ہر قسم کے خطرات سے پاک ہو جائے گی سمجھدار کھٹمل تو ہر سونگھتے ہی چارپائی سے بھاگ جاتے ہیں۔ باقیوں کا وہیں ڈھیر ہو جاتا ہے ترکِ موالات کی تحریک جب زوروں پر تھی تو کھدر کا بن آئی تھی ان کے نازک بدن ململ اور نیریہ بھی تھی تھی انہیں بھی بیاروناچار رکھ کر پوشش اختیار کرنی پڑی تھی لیکن میں نے دوست دشمن کے منہ سے خلافِ رہنما کا روں کی دھمکیاں نہیں۔ مگر کھدر پہننا گوارا کیا۔ اس کی وجہ کوئی یہ نہ تھی کہ خدانخواستہ تحریکِ ترکِ موالات کا مخالف تھا یا کھدر سے مجھے کوئی ضد تھی نہیں یہ بات ہرگز نہ تھی واقعہ یہ ہوا کہ میں نے پنڈت جی کو رفقا کے ہمراہ کھدر دیکھ پایا تھا۔ وہ منظر اس درجہ تھے آور تھا کہ ہمیشہ کے لئے مجھے کھدر سے دست بردار ہونا پڑا۔ وفائی ہجا مرزیبی کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی بیش قیمت کپڑا انہیں پہنا دیا جائے تو پولیس پیچھے ہو جاتی ہے اور کوتوالی میں مسروقہ چیزوں کی فہرست کا مطالعہ تو روز غرض سے ہونے لگتا ہے۔ ہم نیاز مندوں کو خدا نخواستہ ان کے متعلق پولیس کے شبہات تو پیدا نہیں ہوتے۔ البتہ یہ تجسس ضرور ہوتا ہے کہ چیز آخر وہ کون سخی داتا ہے جس نے یہ ایثار کیا ہے؟

باتوں باتوں میں پنڈت امرناتھ ساحر نے فرمایا کہ ایسے منتخب روزگار اہلِ قلم ایک جگہ اتفاق ہی سے جمع ہو گئے ہیں۔
وہ اتنا ہی کہنا چاہتے تھے کہ میرا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں میرے سامنے ڈنر کی تجویز تو نہیں پیش ہو رہی ہے۔ ان کی بات کاٹ کر بولا:
میں: مگر جناب ہم تو پا بہ رکاب ہیں۔ رام پور کل ضرور پہنچنا ہے۔ اگر البتہ یہاں اطمینان سے ایک ہفتہ گزاریں گے۔ اس وقت ہر تجویز قابلِ عمل ہوگی۔

ساحر صاحب: تمد فوٹوگرافر موجود ہے۔ کہیں آنا جانا بھی نہیں پڑے گا۔ ہوٹل کے صحن ہی میں گروپ لے لیا جائے گا۔
اب میری جان میں جان آئی۔ گروپ کی تجویز معقول تھی۔ معقول تجویز سے کسی نامعقول ہی کو انکار ہوتا ہوگا۔ میں نے جھٹ تقریر کا پہلو بدل دیا میں: مگر سب کی تجویز بہت مبارک ہے۔ رام پور سے واپسی پر تجویز زیادہ مناسب ہوتی۔ لیکن آپ بزرگ ہیں۔ آپ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کی مجھ اپنے میں جرأت نہیں پاتا۔ بسم اللہ سرِ تسلیم خم ہے۔
اس قیل و قال کے بعد ہوٹل کے صحن میں کرسیاں بچھائی گئیں اور ہم لوگ شگفتہ تصویریں کھنچنے کے لئے نوک پلک درست کرنے لگے۔ گرمی نے سب کو بوکھلا رکھا تھا۔ میں تو گرمی میں سلطان سکھ ہو جاتا ہوں۔ میرے مثانے اور معدے میں سمجھوتہ ہو چکا ہے کہ گرمی گرمی معدہ مثانے کے لئے دفتر داری بنا رہے اور گرمی کے بعد معدہ اور مثانہ دونوں غذا کے لئے مال گودام بن جایا کریں گرمی میں گلاس سے پانی پینا چھوڑ دیتا ہوں کیونکہ گلاس کو

لینے سے مجھے استسقا ہونے کا خطرہ ہوتے لگتا ہے۔ پانی گھڑی گھڑی پیتا ہوں۔ اور ہر مرتبہ سبو تماؤ تا منہ سے لگا لیتا ہوں اور جب تک غٹ غٹ
آواز نہ کیبوں میں نہیں بدل جاتی تو تا منہ سے جدا نہیں ہوتا۔ مسامات اگر درست پچے وا نہ کریں تو یقیناً پانی اندر اور دم باہر کا نقشہ کھینچ جایا کرے۔ چنانچہ
ڈیپوٹیشن کے ممبروں کو برخاب نوش جان کراتے ہوئے میں نے مترف۔ شربت اس بے طرح ڈگڈگا کے پیا تھا کہ بیٹ کا تناؤ سارے جسم پر چھا رہا تھا
مسامات کے پرانے معدے کے سیلاب کی نکاسی میں گرم عمل تھے۔ کپڑے پسینے میں شرابور۔ جلا یہ کوئی تصویر اتروانے کا وقت تھا!

خیر بندگی بیچارگی۔ کپڑے بدلے۔ منہ ہاتھ دھویا۔ پانچ منٹ تک آئینے سے بشدت مشت ہوتی رہی اور آخر دل کو یہ سمجھا کر ہم وہ نہیں ہیں جو آئینے
میں نظر آتے ہیں۔ اٹھے اور کمرے سے صحن میں باہر آمد ہوئے۔ گروپ میں اپنے منصب کے مطابق نشست حاصل کرنے کا معرکہ درپیش ہوا تو نواب تاج الملوک
بہت گستاخ پایا۔ اپنی ایڈیٹری کے زمانے میں نواب صاحب سے کچھ ہم بیج ہو گئی تھی۔ وہ ہمیں برخورداروں کی پوزیشن دینا چاہتے تھے اور ہم نئی روشنی کے
نوروارد کی طرح ان بزرگوں کو بھی

"ر تقویم پارینہ نایہ بکار"

مصداق سمجھتے تھے۔ اس چشمک کا اثر اس گروپ کے موقع پر نمایاں ہو رہا تھا وہ بزرگ تو چاہتے تھے کہ راقم الحروف تو گروپ کے استادہ لوگوں میں
شامل ہو اور وہ بدولت کرسی نشینوں کی صدارت کریں۔ بندہ یا دلِ ناخواستہ ان کی صدارت برداشت ہو سکتا تھا۔ مگر استادگان صف اطفال میں شمولیت کے
لئے ہرگز آمادہ نہیں تھا۔ خیر میں نے تواضع انکسار کو بالائے طاق رکھ کر ایک کرسی پر قبضہ کر لیا اور ساتھ ہی دوسری کرسی پر وفا کو بٹھا لیا۔ باقی لوگ کچھ
کرسیوں پر بیٹھ گئے اور جو بہ جرأت نہ کر سکے وہ کھڑے ہو گئے۔ اس وقت نواب صاحب کرسی نشینوں کے صدر تھے۔ خدا بھلا کرے فوٹو گرافر کا کہ اس نے
کرسی نشین کو جو میمنہ پہ قابض تھا گروپ کو وزن دار بنانے کے لئے کھڑا کر دیا۔ بعلی رغم نواب صاحب بندہ وہ اس پوزیشن میں آگیا۔ جس کی آرزو
نواب صاحب زیر بو رہے تھے۔ نواب صاحب نے جو بساط اپنی دیکھی ضبط نہ کر سکے پھوٹ پڑے فرماتے کیا ہیں، کہ اس غریب گرامی کی سفید ڈاڑھی اور پیرانہ سالی
ہمیں احترام کرنا چاہیے اس کے ہوتے ہم میں سے کسی کو صدر نہ بننا چاہیے۔ میں جانتا تھا کہ یہ لکتہ نواب صاحب کو اب سوجھا ہے۔ اپنی دفعہ اس پر غور ہونے کا موقع
ہی نہیں ملا۔ ادھر یہ بھی جانتا تھا کہ گرامی مرحوم بہت بہرے ہیں۔ اگر نواب صاحب کے بیان کردہ نکتے پر غور کرنے سے میں انکار کر دوں تو گرامی کا ثقل سماعت
ان کی نظروں میں سرکشی کا جرم نہ بننے دے گا۔ اس پر مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ گرامی سادہ مزاج ہیں اور پھر اس کی حیثیت یمین و یسار سے بالاتر
بھی ہے۔ جو نے بہانہ سازی کے یہ تمام منطقی دلیلیں مصور کر کے میرے سامنے لا رکھیں۔ مجھے ان کو تسلیم کرنے سے کون روک سکتا تھا۔ میں نے
نواب صاحب کی بے محل بحث کو دخل در معقولات کی عزت دے کر سنی ان سنی ایک کر دی۔ ممکن ہے معاملہ طول پکڑتا مگر فوٹو گرافر نے اپنی جلد بازی
سے مجھے پھر ممنون بننے کا موقعہ دیا اور "ریڈی" کے ایک فقرے کے ساتھ ہی ہمیں اپنی پوزیشنوں پہ فٹ کر دیا۔ نواب صاحب کو میری ڈھٹائی
اور شہری تہذیب نے جب ہر طرف سے مایوس کر دیا تو وہ یہ خیال کر کے رہ گئے کہ

"صدر ہر جا نشیند صدر است"

اس کرسی پر اس تحکمانہ انداز سے بیٹھے جیسے کوئی حکمران فرمانبردار رعیت کے سامنے مجرموں کو فیصلہ سنانے بیٹھتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اس شان
سے تصویر کھینچے گی تو دیکھنے والے میری رعب انگیز صورت و شکل کے ساتھ کرسی نشینی کے اس اطراق کو دیکھیں گے تو گروپ پریذیڈنٹ کی بجائے میری
اور میری مظلومیت کا اندازہ کر سکیں گے۔ تصویر کا پروف دیکھا تو نواب صاحب کو بھی یقین ہو گیا کہ

"تدبیر سے قسمت کی برائی نہیں جاتی"

پروف جس نے دیکھا۔ بے اختیار ہنس پڑا۔ یوں تو گرمی کی بوکھلاہٹ نے سبھی کی پوزیشنیں خراب کر دی تھیں۔ مثلاً مہر صاحب کا ازار بند
خط مستقیم کی شکل میں ان کی تصویر کے ساتھ کھینچ گیا تھا۔ وفا کی آنکھیں بند اور مونچھوں پر ہاتھ تھا۔ میری شیروانی سینے پر سمٹ کر سینے کا جھول بن کر

رہ گئی تھی۔ ارمان صاحب نے اپنا قلندری ڈنڈا کرسی اور ٹانگوں کے درمیان کچھ اس انداز سے رکھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ کرسی پانچ ٹانگوں کی ہے یا صاحبِ تصویر ٹائپیکل کے نمونے ہیں۔ رونق صاحب استادگان کے صدر بنے ہوئے اس شان سے کھڑے تھے کہ شبہ ہوتا تھا کہ یہ کسی کے چپت مار کر تو نہیں بھاگیں گے؟

پنڈت وشنو پرشاد کے ساتھ حکیم الطاف احمد آزاد کو دیکھ کر دھوکا ہوتا تھا کہ یہ گروپ نہیں بلکہ "ڈونگرے کے بال امرت" کا اشتہار ہے جس میں بال امرت پینے سے پہلے مریض کو مدقوق دکھا کر دوا پینے کے بعد تندرست دکھایا گیا ہے۔ لالہ چندی پرشاد شیدا ایک کنارے کھڑے اپنے فضا شگاف قد کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ حکیم الطاف احمد آزاد دوسرے کنارے کھڑے ایسے دکھائی پڑتے تھے جیسے پورے گروپ کی طرف اشارہ کرکے یہ بتا رہے ہیں کہ،

"اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا"

پنڈت امرناتھ صاحب ساحر اپنی دراز ریش سے سرسید کی نمائندگی کر رہے تھے۔ مولانا گرامی اس گروپ میں مسولینی کی شان کے مالک نظر آتے تھے۔ غرض ہر شخص کسی نہ کسی شان کا اظہار کر رہا تھا مگر یادش بخیر ہمارے نواب صاحب تو بس گروپ کی جان بن رہے تھے جس مقصد سے انہوں نے تخت زادہ نشست اختیار کی تھی اگرچہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے مگر گرد بد سے انہیں کئی پوزیشنوں میں تقسیم کرکے سب کے لئے قابلِ توجہ بنا دیا تھا۔

کرسی کی پشت پر سر رکھا تھا۔ اس وجہ سے منہ اس انداز سے کھل کر رہ گیا تھا جیسے داڑھ اکھڑوانے کے لئے مریض کو بٹھا دیتے ہیں۔ سینے اور پیٹ کی آسمان رسی سے حیثیت، مجموعی اکھاڑے میں بچھڑے ہوئے پہلوان کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اس حیثیت کے ساتھ پاؤں پسارنے کی ہیئت سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کا اپریشن ہونے والا ہے اور اگر ان تشبیہات کو :

"قلم در کفِ دشمن است"

پر آپ محمول فرمائیں تو اس آخری تشبیہ کی صداقت سے تو خود نواب صاحب قبلہ کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کی تصویر ایک ایسے شخص کی تصویر ہو گئی تھی۔ جسے ہاتھ پاؤں باندھ کر زبردستی کرسی پر ڈال دیا گیا ہو۔ وہ اکڑ فوں دکھا رہا ہو اور وہ بے درد مصور اس کی شان استغنا کی پروا نہ کرتے ہوئے اسے تصویر کے شکنجے میں کس ڈالے۔ یہ بیان بھی اگر شاعرانہ مبالغے میں شامل ہے تو تصویر دیکھ کر آپ بھی بول اٹھیں گے کہ:

"کھینچنے والے کی ادا کھنچ گئی تصویر کے ساتھ"

آنریبل ہیں اور نہ سر ہیں آپ
نے خداوندِ سیم و زر ہیں آپ
یہ شرف کم ہے کیا کہ نامِ خدا
"ادبی دنیا" کے تاجور ہیں آپ

سلام الدین خواجہ ۱۹۲۹ء

انارکلی کی سیر

کسی شاعر نے پنجاب کو "انتخاب ہفت کشور" کا لقب دیا تھا۔ ہمارے خیال میں اس کی توقلمونیوں کو دیکھتے ہوئے پنجاب کے لئے یہ لقب کچھ بے جا نہیں ہے۔ پنجاب تو ایک طرف رہا۔ چشم بددور تنہا ہمارا لاہور ہی اس وقت دنیا کی دلچسپیوں کا البم بن رہا ہے۔

لاہور اور لاہور میں انارکلی بازار اگر آپ نے نہیں دیکھا تو سچ جانیئے دنیا میں رہ کر کچھ نہیں دیکھا۔ اکتوبر سے لے کر مارچ تک یہ جنت ارضی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ "حلوہ خوردن را روئے باید" سچ ہے لیکن انارکلی کی شام کے نظارے کے لئے بھی "موئے" چاہئیں۔ آنکھ بنوائی پڑتی ہے۔ آنکھ بنوائیے یا نہ بنوائیے مگر انارکلی دیکھنے کے لئے لاہور ایک دفعہ ضرور آیئے۔

اگر اس کی زیارت سے پہلے خدانخواستہ "اوپر والے" مہربان ہو جائیں تو ان سے گڑگڑا کر ایک ہفتے کی مہلت طلب کیجیے۔ انکار کریں تو اصرار کیجیے۔ گھسیٹنے لگیں تو زمین پکڑ لیجیے۔ بڑھ کے ٹلیں تو بنا ئیے بن جائیں گھو ن جائیں گے اور اگر کسی تدبیر سے قابو میں نہ آئیں۔ تو پھر قانون سے آزاد ہو جائیے۔ اور ہر بڑے میاں کا پیام شوق وارنٹ کی صورت میں بدل جائے۔ تو اتنا کیجیے کہ دنیا کو خالی کرنے سے پہلے اپنے وصیت نامے میں اپنے جانشینوں کو ہدایت کر جائیے کہ وہ آپ کی تیرھویں سے پہلے انارکلی کی یاترا ضرور کر آئے۔ ورنہ یاد رکھیئے اگلا چولا یہ مانس کا پائیے گا اور پھر کبھی آدمی کا چولا بدلنے کو بھی ترس جائیے گا۔

انارکلی ـــــ آہ انارکلی ـــــ عجائبات کا مرکز ـــــ عجائبات کا مخزن ـــــ انارکلی یہ ہیچ ہے آج جہانگیر کی انارکلی سے بھی زیادہ دلچسپ و دلکش ہے۔ تاج محل کو دیکھ کر لیڈی کرزن نے کہا تھا کہ "اگر مرنے کے بعد مجھے ایسا مزار نصیب ہو تو میں ابھی مرنے کے لئے تیار ہوں" لیکن کاش لیڈی کرزن تیر انارکلی کا نظارہ کرتیں تو اپنی تمنا کو اگر مگر سے تباہ نہ کرتیں۔ بس ایک ہی نظر تجھ پر ڈالتیں۔ اور کیسری کی دوکان کے آگے ہی آلتی پالتی مار کر انجہانی بن جاتیں ـــــ انارکلی کی شام کے سامنے "شام اودھ" اور "شب مالوہ" کا تو نام ہی نہ لیجیے۔ بلکہ اس دعوے پر شام پر "صبح بنارس" کو نثار کر دیجئے کہیے تو پھر کیا ارادہ ہے؟ بس کہہ ڈالیے۔ ہمارا مشورہ تو یہ ہے کہ بجٹ کی جانب سے آنکھ بند کر کے پلیگ سے پہلے لاہور پہنچ جائیے۔ لیکن اتنا ضرور کیجیے کہ روانگی سے پہلے اپنے کپڑوں اور اسباب کو "ڈس انفکٹ" کرا لیجیے۔

مبادا آپ کے ساتھ ہی پلیگ بھی وارد ہو سکے۔ لئے آپ کے ڈبے میں کوئی سیٹ ریزرو کرالے۔ خدانخواستہ کہیں ایسا ہوا تو بس کان کھول کر سن رکھیئے کہ لاہور کے سٹیشن پر میونسپلٹی کی جانب سے چار کہار اور ایک میلتھ آفیسر استقبالیہ کمیٹی کی شکل میں آپ سے ملاقات کریں گے اور آپ کے وجود باوجود کو ٹکسال باہر سمجھ کر ہوٹل کی بجائے بیرون ٹکسالی دروازہ وبائی مریضوں کے چھپرال میں ڈولی سے اتار دیں گے۔ دیکھئے پھر نہ کہیے گا کہ لاہور والے مہمان نواز نہیں ہوتے

ہاں تو امام ضامن بازو پر باندھ کر چل پڑیئے گیارھویں والے پیر کا واسطہ بس چل ہی پڑیئے! آپ کی سیدھے لاہور چلے آئیے۔ اسٹیشن سے چار پیسے دے کر بیر کاٹ میں بیٹھ لیجیے۔ انارکلی میں صادر ہو کر سوچیے! اگر آپ قوم "مغلوں" سے تعلق رکھتے ہیں تو دہلی مسلم ہوٹل میں نازل ہو جائیے اور اگر آپ اس کے ہم نوالہ و ہم پیالہ ہیں جس کی شان میں مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے فرمایا ہے ؎

لو جنگل سے چر کر آئی　　　گھاس کا دودھ بنا کر لائی

یعنی آپ کو مطبخ کی بجائے چراگاہ کی ضرورت ہے تو امپیریل ہندو ہوٹل کے گول مول پروپرائٹر کے سایۂ عاطفت میں پناہ گزین ہو جائیے۔

دیکھئے! "جھٹ پٹا سا ہو چلا ہے شام کا"

مگر اس کے جواب میں پہلی کتاب سے دوسرا مصرعہ پڑھ دیجئے کہ

"صاحبو! یہ وقت ہے آرام کا"

کیونکہ انارکلی میں شام کا وقت آرام کا وقت نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ تکلیف (دہائی) کا وقت ہوتا ہے۔ تو لیجئے پھر اب آپ جھٹ پٹ آفتاب لب بام پوزیشن میں آجائیے۔ دل تھام کر نظر اٹھائیے۔ اور انارکلی کے بوقلموں مناظر میں گم ہو جائیے ہوش و حواس قائم رہیں تو مسٹر ٹائیڈ مین کا جغرافیۂ عالم سامنے رکھ لیجئے اور بازاریوں کی رفتار گفتار، وضع قطع، چال ڈھال سے پہچان کر اپنے جغرافیے کے حدود میں انہیں تقسیم کرتے رہئے۔ لیجئے سنبھل بیٹھئے۔

نوشتۂ کھل کر لطف نظارہ

(۱)

دیکھئے وہ سامنے سے ننگے سر ننگے پیر ایک دھوتی پوش گذر رہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے کتنا پاکیزہ حلیہ پایا ہے گویا صناع کہن سال نے اپنے ہاتھ سے جی لگا کر بنایا ہے۔ چہرے کا آبنوسی رنگ بالوں کی روغنی سیاہی کو شرما رہا ہے۔ یہی نہیں معلوم ہوتا کہ اس چہرے پر سر کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ البتہ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بالوں کی سپیدی شمع ظلمات کا کام ضرور دے رہی ہے۔ آخر یہ ہیں کون بزرگ؟

کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ کانپور کے مچھلی بازار میں ان کی زیارت ہوئی تھی۔ ایک بڑا سا قد آدم "رو ہو" کندھے پر ڈالے چلے جا رہے تھے یہاں بھی اکثر مدراسی "سے کلو" انہیں خریدتے دیکھا جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونس پیغمبر سے کوئی روحانی تعلق رکھتے ہیں۔ کیا عجب ہے اُن کے اُمتی ہوں۔ ع

"یونس اندر دہان ماہی شد"

کی روایت کہیں انہوں نے بھی سن پائی ہے اضطراب یا عقیدت میں حافظے کو ابھی جہالت اندوی کہ روایت مذکورہ میں الفاظ کی ترتیب قائم نہ رکھ سکے۔ چنانچہ الٹا سمجھ بیٹھے ہیں ع

"ماہی اندر دہان یونس شد"

مصر کے محکمۂ آثار قدیمہ کا کوئی ماہر حجریات ہاتھ لگے تو ان کے چہرے مہرے کا معائنہ کرائیں۔ لیکن یہ کیا؟ اسے پیچھے وہ جگالی والا کان پر کھڑے "رس گلے" نکل رہے ہیں۔ تالو اور زبان تو شریک حال معلوم ہوتے ہیں مگر فرو بردن کی اس مہم میں دانت "تامل و رتن" کے مٹے ہوئے ہیں۔ اچھا اب ان کا زیادہ تعاقب نہ کیجئے ادھر دیکھئے!

(۲)

نظر اٹھائیے! دیکھئے، وہ سامنے سے ایک باطل پوش وہ خدا وہ نکلا اخبار فروشوں کی بھیڑ میں سے ذرا سج دھج ملاحظہ کیجئے۔ پاؤں میں تلے ملائی جوتی۔ دریائی کی دھوتی باندھے، سر پر زریں سیلا لپیٹے گلے میں بڑے بڑے ملائی موتیوں کا کنٹھا ڈالے، انارکلی کی ہر چیز کو حیران کن نگاہوں سے تکتا، منہ اٹھائے بے دھڑک چلا آتا ہے۔ لمبے لمبے پٹھوں (لم پٹوں) سے مکھن کی عفونت اس طرح پھوٹ رہی ہے جیسے "گدھوں" کا جلوس گذر رہا ہو۔ اور لیجئے! دھوتی میں بے قاعدگی محسوس کر کے سر بازار ہی اُسے ایڈجسٹ کرنا شروع کر دیا۔ دونوں کناروں کی سلوٹیں چنی جا رہی ہیں۔ ساتھ ہی ہونٹوں دانتوں کو جھٹکا جا رہا ہے۔

ہیں ہیں! یہ کیا وحشت ہے۔ اس گاودی سے کوئی کہنے والا نہیں۔ کہ مادر زاد ہونے کا شوق ہے تو حمام میں جائیے بازار کو اپریشن روم کیوں سمجھ رکھا ہے!

لیجئے! آنکھیں کھول لیجئے اور شکر کیجئے! ع

"رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت"

دھوتی کے نظم و نسق سے فارغ ہو چکے اور آپ ہی آپ اس نورش سلیقگی سے پھر فلک شگاف سروں میں الاپنا شروع کر دیا کہ

"غازی مصطفٰی کمال پاشا دے تیر یاں دور بلائیاں"

ماشاء اللہ کیا غزالہ ہے وار آنہ زیانی ہے۔

[illegible] ہیں گانے میں — [illegible] کچھ خبر نہیں — [illegible] وہ ہو گئی بائیسکل والے سے ٹکر — اتر اور بہت بری طرح زمیں بوس ہوئے [illegible] تھے دونوں کو دو [illegible] قبول میں تقسیم کر دیا ہے۔ لو [illegible] تھا [illegible] ہو [illegible] اور پھر گانا شروع کر دیا۔ اب یہ کدھر جا رہے ہیں؟ ایں یہ کیا؟

حضرت [illegible] بے پناہ تقریر سننے کھڑے ہو گئے۔ وہاں کیوں جا رہے [illegible] زبان سے "افریقہ کی جڑی بوٹیوں کا سودا کریں گے؟ اچھا ردا فروش کو [illegible] کا جائزہ لیتے دیکھئے۔ اور ان [illegible] نام [illegible] لو [illegible] ہی چلے ہاتھ میں گولیوں کی شیشی ہے کچھ سوچ کر ہنس رہے [illegible] شیشی کو دیکھتے ہیں کبھی اپنے بل بوتے کو۔ [illegible] ہے اچھا انہیں خدا کے سپرد کیجئے اور آخری نظر ان پر ڈال لیجئے [illegible] دیکھنا نصیب [illegible] گولیوں کا انجام [illegible] اس [illegible] آپ [illegible] کا مشورہ دے۔ کیسا عبرت ناک منظر ہے۔ بائے [illegible] وہ گولیاں۔ [illegible] تھا [illegible] وارثوں کو دلی والے حکیم صاحب سے خون بہا تو دلا دیتے۔

(۲)

[illegible] چاراسٹریٹ [illegible] نکلے چوڑے چکلے قندھاری جوان۔

"جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو"

[illegible] اس حسن میں گھٹے ہوئے [illegible] سونے پہ سہاگہ [illegible] تراکر [illegible] جاتا ہے

[illegible] سطح فضا پہ خطوط مستقیم کھینچ رکھے ہیں ؟ چونیا گھر کی پہاڑی [illegible] آنے لگے۔

[illegible]

[illegible] ہوئے ہیں ایک ایک [illegible] ان کی میلی کچیلی فلک [illegible] آرہا ہے۔

[illegible] ان کے بڑی بیچے کے [illegible] گریبانی کے سبب [illegible] تبدیل ہو گیا ہے از ملک تا سماک گندہ بیریوں سے [illegible] دنیا میں اس رفتار سے ہزاروں انقلابات آئے۔ مگر:

"جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے"

[illegible] کی میراث [illegible] آئی ہے۔ [illegible] دیکھ کر آپ کو متلی آتی ہے تو تھوک دیجئے۔

ارے یہ کیا کرتے ہیں؟ خدا کے لئے ہنسئے مت [illegible] انہوں نے آپ کو اپنے اوپر ہنستے دیکھ لیا تو قبلہ یاد رکھئے وصیت نامہ لکھنے کی بھی فرصت نہ پائیے گا۔ آپ کے [illegible] کو خلعت شہادت سے ضرور سرفراز کر دیں گے۔

[illegible] ان میں سے وہ صاحب کرنے میں پیشاب کرنے کیوں بیٹھ گئے؟ مرد آدمی کو دفعہ ۳۴ کا بھی ڈر نہیں۔ پھر

"حیا بھی تو کوئی شے ہے کسی کا ڈر نہ سہی"

اقبال دیکھئے، پہرے کا سپاہی کھڑا دیکھ رہا ہے مگر اتنی ہمت نہیں کہ انہیں اس وحشت سے روکے۔ غریب تانگے والوں ہی کو ڈانٹنا آتا ہے!

لو وہ خیر سے آپ ہی گئے۔ آہا شلوار میں رسی پروئی ہے۔ لمبے لمبے پائنچوں میں روشن دانوں کی بہتات ڈاکٹری اصول کے مطابق صحیح ہو تو ہو تہذیب تو ہر چند تازہ ہوا کی آمد و رفت کو پسند نہیں کرتی۔ ہیں! اب یہ کیا کرنے لگے ـــــ مٹی کے ڈھیلے سے استنجا! ارے توبہ! سر بازار؟ مانا یہ نمازی ہیں۔ جم جم نماز پڑھیں۔ مگر یہ استنجے کی پوزیشن!

"دل بہ یار دست بہ کار"

سر بازار میں تو زیب نہیں دیتی۔

اچھا اب ان کا زیادہ انسپکشن نہ کیجئے۔ بس خیریت اسی میں ہے کہ پس پا ہو جایئے۔ مبادا یہ "چونی روپیہ سود" والے بیوپاری ہوں۔ اور آپ قرض لینے کے سابقہ تجربوں کے گھمنڈ میں ان سے کوئی بیوپار کر بیٹھیں۔ دیکھئے یہ عقلمندی کبھی نہ کیجئے۔ دال اور سالم دنبے کا فرق مدنظر رکھئے اور کان کھول کر سن لیجئے کہ ان سے لین دین کرنے والے کو قبر بھی پناہ نہیں دے سکتی۔ ان کا روپیہ ہضم کرنے سے "سوتر مندری" والے سنیاسی کی "دوائے سیاہ" بھی انکاری ہے۔

لو وہ کرنال شاپ میں جا گھسے۔ خدا کرے شاپ والوں کا ان سے منہ چھپانا ہو جائے۔ نہیں تو پانی پت کی چوتھی لڑائی توپ و تفنگ کی جگہ ڈاسن کے بوٹوں سے ہوئی ہو۔

(۴)

اے لیجئے ایک اور نمونہ ملاحظہ کیجئے۔

آپ کلکتہ میل سے ابھی چلے آرہے ہیں۔ آج اسٹیشن پر ٹی ٹی سے ہشت مشت آپ ہی کی ہو رہی تھی۔ غضب خدا کا۔

من بھر اسباب کے ساتھ دو شکستہ چارپائیوں کے پنجر۔ سرائی تبرکات میں دیرینہ سال لحاف تو شک۔ مٹی کے ایک برتن کی بوری۔ ایک رسی میں لکھنؤ کی چلموں کا ہار۔ بٹیروں کے پنجروں کا ایک سیٹ۔ تھرڈ کلاس کا ایک ٹکٹ لے کر گھر سے چل کھڑے ہوئے۔ ٹی ٹی نے سہارنپور ہی میں ان کی گرانباری کو بھانپ لیا تھا۔ لاہور کے اسٹیشن پر سلام دعا ہو گئی۔ پہلے تو آپ نے ٹی ٹی کو آداب گفتگو پر توجہ دلائی۔ پھر لگے ریلوے ملازموں کے فرائض گنوانے۔ جب اس نے اینگلو انڈین لہجہ میں ٹرپل محصول کا مطالبہ کیا، تب آپ کو معلوم ہوا کہ ٹی ٹی اپنے فرائض سے بخوبی واقف ہے۔

اب سوچ میں پڑ گئے کہ چھ روپے تاوان دیا جائے یا ان تبرکات سے دست بردار ہو جائیں۔ ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ اس نے آپ کا اسٹیشن ماسٹر سے انٹرویو کرانے کی بشارت دی۔ پھر تو آنکھوں میں دنیا اندھیر ہونے لگی۔ مجبوری کا نام شکریہ۔ بیچارے کیا کرتے اس کار زار ہستی پر لعنت بھیجتے ہوئے ٹی ٹی سے خفیہ عہد نامہ کیا اور قلیوں کے سر پر اسباب رکھ کر اسٹیشن سے باہر آئے۔ اسباب تانگے پر رکھوا کر دو قلیوں کو چھ پیسے کی زیارت جو کرانے لگے تو انہوں نے بہت کچھ عقیدت مندی کا اظہار کیا کمبخت شہر میں آنے ہی نہیں دیتے تھے۔ ان کی دامن گیری جب گلو گیری میں تبدیل ہونے لگی تب تانگے والے نے بیچ میں پڑ کر طرفین کو تھوڑے تھوڑے ایثار پر راضی کر لیا۔ خدا خدا کر کے ان بد لگاموں سے جان چھوٹی اور شفیع کی سرائے میں نازل ہو گئے۔

چیتوڑے کے شوقین واقع ہوئے ہیں۔ اتنے معرکے سر کرنے کے بعد بھی تازہ دم نظر آتے ہیں۔ اسباب سرائے کی تاریک کوٹھڑیوں میں رکھ کر سر دیوں میں ململ کی اچکن زیب بدن فرمائی۔ اور انار کلی کو لکھنؤ کا چوک سمجھ کر بازاریوں میں آ ملے۔

رفتار ملاحظہ ہو۔ پاؤں کہیں ڈالتے ہیں پڑتا کہیں ہے۔ چھیلا بیگم (افیم) اس وقت ہوا س خمسہ کا جائزہ لے رہی ہیں۔ تنہا ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہے ہیں۔ کوٹھوں پر نظریں آوارہ گردی میں مصروف ہیں۔ مگر کھڑکیوں کے سائن بورڈوں کے سوا کوئی بام تجلی نظر نہیں آتا۔ "چھلے دی بستی بسی" پر نظر پڑی تو رنگوں

میں دوران خون تیز ہو گیا۔ سیکھے پودھراؤں کا ملان ہے۔ باچھیں کھل گئیں۔ عالم تصورات میں سے کچھ تبسم ہونٹوں پر پکا پنسے تو مسی آلودہ تبسی نمودار ہو گئی رخسار و فاراند تو سشت آنکھوں کے پپوٹوں سے جا الجھا افیم کی ترنگ۔ زردو ں پر تھی۔ جاگتے دوکان میں وہاں ایک طرف تو مسٹر دھمی رام کو بزنس کے گھر رستے پر "رحم تقسیم پایا۔ دوسری جانب نگاہ پڑی نوٹوں کے ڈھیر پر۔ ماشاء اللہ کا۔ اسٹیشن کا خطرہ نظروں کے سامنے پھر گیا۔ مسٹر بھلے کی پذیرائی کے جواب کی بھی شدت نہ رہی۔ جلد بھاگ کے سے دکان سے باہر ہو گئے۔

اب پنجاب کی خشونت مزاجی پر نہرے کیسے جارہے ہیں۔ آپ ہی آپ خفا ہو رہے ہیں۔ کچھ سوچتے ہیں اور نیچے کو گردن ڈال کر منٹ منٹ بعد لا حول ولا قوۃ" فرما دیتے ہیں۔ دیکھئے اب پنواڑی سے بیگمی پانوں کی فرمائش ہو رہی ہے وہ بیچ لائچی بھی کیا جائے۔ اس نے ایک بڑے سے پان میں کتھا چونا تھوپا، چھالیہ کے چورے کے ساتھ سونف، اور ملٹھی کا خیساندہ ڈال کر دے دیا اب منہ میں گلوری ہے اور ماتھے پر تیوری بڑبڑاتے جاتے ہیں اور پان چباتے جاتے ہیں۔ دیکھئے قریب آگئے اچھی طرح زیارت کر لیجئے!

تیلیا رنگ۔ ٹکال پچکے ہوئے، ماروی ناک۔ آنکھیں جوانی کی صحت کاریاں کی یاد میں گوشہ نشین ہو گئی ہیں۔ ماتھے پر شکنیں رخساروں کی سلوٹوں سے "دست پنجہ" کر رہی ہیں۔ سارے جسم کی صحت۔ ہونٹوں میں کھنچ کر آگئی ہے دونوں ہونٹ مل کر ایک سوٹ کیس کا ہینڈل بناتے ہیں۔ بے ترتیب۔ دانت یرقان میں مبتلا ہیں۔ معلوم ہوتا ہے منہ میں زرد تو ڑیاں بھر رکھی ہیں ناک کے تیر آباد گوشوں میں جو دب جم گئی ہے اس کی سیاہ بیلیں ہونٹوں کی ملاپتی تک پہنچ چکی ہیں بحیثیت مجموعی قدرت نے جی لگا کر یہ پتلا تیار کیا ہے

ذات شیطان کو خواب میں دیکھا　　　ساری صورت جناب کی سی تھی

(۵)

وہ دیکھئے ایک ڈار ریشمی میلوں کی چلی آ رہی ہے۔ ترقی اعتبار سے یہ لوگ قلمی اصل ہیں ان کا شعر زنانہ لباس ۔ وضع قطع مشرق و مغرب کے سنگم کی یادگار ہے۔ یہ مولوی نما جنٹلمین یا جنٹلمین نما مولوی ہیں۔ ان کا کعبہ آمال پنجاب یونیورسٹی کی ادبی فیکلٹی ہے عبارت ہے اس گنگا جمنی ٹولی میں سے

کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا　　　بھان متی نے کنبہ جوڑا

کوئی حیدر آبادی تمسال کا ڈھلا ہوا ہے کوئی یو پی کے زمین و آسمان کا لاڈلا۔ کوئی راجپوتانہ کی قلیات کا ستم رسیدہ کوئی انگلش اونلی (English only) کا مریض کے چھیر میں آیا ہوا ہے۔ غرضیکہ ہر ایک اپنے طالع نا سازگار کا چہرہ بزبان حال فریادی نظر آتا ہے۔ دیکھئے قریب آگئے۔ ان نورانی صورتوں کی اچھی طرح زیارت کر لیجئے۔ ہر ایک کا حلیہ غور سے دیکھئے۔

وہ صاحب جو ذرا زیادہ جنٹلمین نظر آتے ہیں ملتی فاضل ہیں بطالب گریجویٹ بننے کی ہوس "انگلش اونلی" کے "شارٹ کٹ" سے بجھانا چاہتے ہیں، اس سال چوتھی بار بی۔ اے میں بیٹھیں گے۔ استقلال کہیے یا ڈھیٹ پنا۔ یونیورسٹی سے جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ اس "انگلش اونلی" کے شارٹ کٹ کو طے کرنے میں اتنے سال لگائیں گے جتنا وقت فسٹ مڈل سے بی۔ اے تک پہنچنے میں صرف ہوتا ہے ڈاڑھی کو میٹرک کے سرٹیفکیٹ کے بدلے رہن رکھ آئے تھے۔ اب تک واگذار نہیں ہوئی بالوں اور چہرے کی روغنیت سے دھوکا نہ کھائیے۔ کڑوا تیل ویسلین کا کام بھی دے سکتا ہے۔ آپ ان کے کوٹ پتلون پر ترچھی نظریں کیوں ڈال رہے ہیں؟ جب لاہور کے اوکشن روم بڑے بڑوں کو اپٹوڈیٹ بنائے ہوئے ہیں۔ اس غریب نے مسٹر نامی کے سوٹ پر بولی بول دی تو کیا غضب آگیا۔ انڈین اوکشن مارٹ کے مالک مسٹر سلامت شاہ اتنے کباڑیوں سے واقف نہیں تھے کوٹھی بنگلے والوں کے مالیات کے ماہر ہیں۔ کوٹھیوں کا ڈیچر اوکشن مارٹ میں رہن ہیرے کو دم ادا کئے بغیر کوٹھیوں میں داخلے کا مجاز نہیں ہے۔ قبلہ جنگ کے بعد سے سیکنڈ ہینڈ کی فسٹ ہینڈ سے زیادہ پوچھ ہوتی ہے۔ بس اب آپ اس غریب جنٹلمین کی پتلون کا پیچھا چھوڑیں اور ان دوسرے حیوان ناطقوں کا جائزہ لیں۔ دیکھئے وہ پتلون والے کے ساتھ جو

بزرگ ہیں ان کی دیکھ بھال کریں۔

کیا نورانی شکل پائی ہے !! اسے دیکھنے کو جی چاہتا ہے ان کو نمونیا کا خطرہ کبھی نہیں ہو سکتا کیونکہ دراز دامن داڑھی کا مفلر سویٹر سے زیادہ سینے کی حفاظت کرتا ہے۔ آدھی داڑھی بالکل سپید ہو گئی ہے۔ نصف ثانی بدستور سیاہ رو سیاہ مو ہے۔ شعر ہم اس لیل و نہار کو گویا گلے ملاتی ہے۔ اس خوبصورتی پر یہ سرو قامتی معلوم ہوتا ہے نجدی فوج کا علم ہے۔ جس پر چونچیا داڑھی کا پرچم لہرا رہا ہے۔ گھٹے ہوئے سر پر بے پھندے کی ترکی ٹوپی چہرے کی نورانیت کو چار چاند لگا رہی ہے۔ لمبے لمبے پلپلے سے کان دیکھ کر توشبہ ہوتا ہے کہ انسان کا مورث اعلیٰ بندر نہیں خرگوش ہے۔ ناک کا اٹھان اور پھیلاؤ منصفیوں کا سا ہے آغا خانی شیروانی ڈاٹ رکھی ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو! شیروانی کا ہر بٹن نئے سائز اور نئی کوالٹی کا ہے۔ کسی بٹن کی دو کاج کے نوچی تو نہیں ہیں؟ شیروانی کے ساتھ شلوار اور فوجی بوٹ ذوق انتخاب کی داد دیجئے۔ پیتل کی کمانی دار عینک کچھ ضعف بصر کی وجہ سے نہیں لگا رکھی ہے۔ کیونکہ جب کسی چیز کو غور سے دیکھتے ہیں تو عینک اتار لیتے ہیں۔ بلکہ اس عینک سے فیشن کی تکمیل مقصود ہے۔ سینے پر گھڑی کی زنجیر دیکھ کر آپ سمجھے ہوں گے۔ جیب میں گھڑی بھی ہوگی؟ نہیں یہ زنجیر بجائے گھڑی جیب کی خلوت میں کنجیوں کے گچھے سے رشتہ قائم کئے ہوئے ہے۔ آپ نے اس سال اردو پروفیشنسی کا امتحان دیا تھا، بدقسمتی سے پانچ پرچے کچھ کمزور ہوئے اور چھٹے دن امتحان کے سینٹر میں دس منٹ دیر سے پہنچے۔ سپرنٹنڈنٹ نے دروازہ سے باہر ہی استقبال کرتے ہوئے عرض کیا کہ یہ سینٹر آپ کے شایان شان نہیں ہے خدا نے چاہا تو اگلے سال ہم لوگ آپ کے ریسپشن کا معقول انتظام کر سکیں گے۔ سردست تو آپ امتحان کی زحمت سے دست بردار ہو جائیے۔ آپ نے خوشامد سے اسے الجھانا چاہا مگر معلوم ہوا کہ یہ انگریزی داں بڑے ہٹی ہوتے ہیں۔ آپ نے بھی سمجھا کہ چلو قدرت نے ہماری لیاقت کی پردہ پوشی کا یہ چانس دیا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ چھٹا پرچہ لکھ کر ہم کون سا ریکارڈ بیٹ کر لیں گے۔ وہاں سے بیک بینی و دو گوش چلے ہی آئے اب اپنے ساتھیوں کو اس مصنوعی صدمے میں شریک کر رکھا ہے۔ ان پانچ پرچوں کے متعلق آپ کی زبانی سننے میں آیا ہے کہ ان کے جوابات نثر کی بجائے نظم میں دیئے ہیں اور اگر چھٹا پرچہ لکھنے کا موقعہ مل جاتا تو اپنے امتحان میں ہر دیال کی پوزیشن حاصل کرتے۔ خیر خدا نے ہر دیال کی عزت رکھ لی کہ آپ کو سینٹر وقت پر نہ پہنچنے دیا اقبال کے بانگ درا کے جواب میں آپ نے "دانگ برا" لکھی ہے اس وقت اسی پر گلفشانی ہو رہی ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ سینٹر کے سپرنٹنڈنٹ کو اقبال نے اکسایا ہے۔ ورنہ اسے کیا حق تھا کہ ایک امیدوار کو جس نے باضابطہ فیس یونیورسٹی کو دی امتحان سے روک دے۔ ہو

(۴)

یہ کوئٹے کا جاڑا پڑ رہا ہے اور آپ ٹھنڈا سوٹ زیب بدن فرمائے ہوئے ہیں۔ اوکسن مارٹ میں سلیپنگ سوٹ پر بولی بول دی تھی۔ شاہ سلامت اللہ کو رحم آ گیا اور انہی کے نام بولی ختم کر دی۔ تہمد دار پتلون میں ستلی ڈال رکھی ہے۔ ستلی ہی بوٹ کے تسموں کی ڈیوٹی بھی ادا کر رہی ہے ستلی کو پالش سے بوٹ کے ہمرنگ کر دیا ہے پاؤں کا رنگ قدرتی طور پر پالش کا ہم نوا ہے۔ دور سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹانگ کی کالی جرابیں پہن رکھی ہیں۔ فیشن کے پیچھے میں اس قدر مبتلا ہیں کہ بقول لسان العصر مرحوم ع

بھینس کو گون پہنا دیجئے عاشق ہو جائیں

شاہی مسجد کے ساتھ والے بورڈنگ میں آپ کے ہمخیال و ہمحال بہت سے پائے جاتے ہیں۔ روزانہ شام کو چارپائیاں کھڑی کر کے وہاں ٹینس کھیلی جاتی ہے۔ کباڑیئے کے ہاں سے ٹینس ریکٹ خرید کر اس کی جالی نکلوا دی اور مضبوطی کے خیال سے لوہے کی پتریاں جڑوا لی ہیں آپ کا خیال ہے کہ دو سال تک کے منشی کا امتحان دے ڈالیں اور رفتہ رفتہ ایم۔ او۔ ایل تک پہنچ کر یونیورسٹی کا ولایتی وظیفہ حاصل کریں۔ عمر کا سوال آپ اس طرح حل فرماتے ہیں کہ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی نے تو انگریزی بڑھاپے میں پڑھی تھی۔ میری ابھی عمر ہی کیا ہے۔ بیالیس سال بھی کوئی عمر ہوتی ہے پردہ سسٹم کو آپ ہندوستان کے لئے لعنت سمجھتے ہیں۔ ہندوستانی عورتوں کو بدتمیز، بدسلیقہ اور اپ ٹو ڈیٹ سے ناآشنا بتاتے ہیں۔ آپ نے اسی لئے یہ جھنجھٹ نہیں پالا۔ کچھ یونہی سا خیال

ہے کہ جب پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے جائیں تو وہاں سے کوئی اپٹوڈیٹ لیڈی ساتھ لائیں گے۔

اس صاحب کو نو فر کے ہم پلہ ہی قدرت نے حلیہ بھی عنایت کیا ہے۔ چہرے کا رنگ ہے۔ رخ تو نقاہی اور ادھر اُدھری مہاسوں نے قیمہ بنانے میں بڑی وسعودی کا اظہار کیا ہے۔ ناک پہلے ہی سارس کی منقار کی حریف تھی اُس پر یہ مہاسوں کی فوج کا کمانڈر رہتا یک ناک کی پھنگی پہ کھڑا اپنی ساری فوج پہ نظر ڈال رہا ہے۔ اب اس بیٹے مہاسے کا سر اور لب زیریں کی سطح بالا باہم سرگوشیاں کرنے لگے ہیں۔ ان کی یہ سرگوشیاں دیکھ کر دونوں رخساروں نے بھی ہم آغوشی کی ٹھان لی ہے۔ گویا اب منہ کے اندر تالو، زبان، دانت اور حلق اور رخساروں نے ایک سماجا بنا رکھی ہے۔ آنکھوں نے جو میدان خالی پایا تھا اپنے مستقر سے باہر آگئیں۔ بے تو اسی گھر پڑی پڑی تو ہو گئیں۔ آپ اپنی خوبصورتی بیان کرتے ہوئے آنکھوں کو سب سے زیادہ کریڈٹ دیا کرتے ہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ سر آغا خاں کی آنکھوں کے بعد بڑی آنکھیں دنیا کی ہر [illegible] شماری میں سب سے بڑی ہیں۔

چہرے کی سیاہی کا کلنک یوں کہہ کر مٹایا کرتے ہیں، کہ ہمارا آبا و اجداد کا خاندان نمکین حسن میں علاقہ بھر میں مشہور رہا ہے۔ آپ کو یورپ کی کوئی چیز اگر ناپسند ہے تو وہاں کی صباحت۔ اکثر کہا کرتے ہیں کہ یورپین لیڈیاں اپنے بے ابٹ بے سفید سے پن پر نازاں ہوتی ہوں گی، ہمیں تو اُبلے ہوئے انڈے نظر آتی ہیں۔ بے نمک۔ رنگ بھی کوئی رنگ ہوتا ہے۔ [illegible] حسن کشمیر ہے؟ آپ کو ہنسی آتی ہے۔ بقول آپ کے نمکین حسن پائیدار ہوتا ہے۔ شیخ سعدی کو صرف اس مصرعے پہ پکڑتے ہیں۔

"سعدیا روز ازل حسن بہ نمکیں دادند"

بد ذوق شاعر کہا کرتے ہیں۔ غرضیکہ زندگی اگر اطمینان کا نام ہے تو یہ بیالیس سال کے نوجوان اپنی صورت، سیرت اور حالت سے ہر طرح مطمئن ہیں۔

آپ خیر سے شاعری کا بھی دم بھرتے ہیں۔ الحق بھی پوندوی کا رنگ آپ کو اکبر کی شگفتگی اور ظرافت سے زیادہ پسند آتا ہے۔ آپ جگر کی شاعری کو سہل الممتنع قرار دیتے ہیں۔ جگر صاحب کے متعلق زمانے کی قدر ناشناسی کا شکوہ عموماً آپ کی گفتگو کا موضوع بنا رہتا ہے۔

آپ کی رائے میں ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگ جگر کو دنیائے شاعری کا واحد شریک قرار دیں گے۔ آپ کا کلام پڑھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ فن کی بندشوں سے آزاد اور قواعد فن سے بے مہار ہونا چاہتے ہیں۔

(۵)

تماشائی: یہ کون ہے؟ اکیلا آپ ہی آپ باتیں کرتا چلا آتا ہے۔

راوی: جو آپ سے آپ باتیں کرتا چلا آتا ہو اُس کے متعلق بھی پوچھنے کی ضرورت ہے؟ ہوتا کون کسی انجمن کا سیکرٹری ہوگا یا کسی بزم کا شاعر۔

تماشائی: یہ کیوں کر معلوم ہوا؟

راوی: کیوں کہ یہ خود کلامی کا مرض شاعروں یا سیکرٹریوں ہی کو ہوا کرتا ہے۔

تماشائی: یہ کیوں؟

راوی: اس لئے کہ سیکرٹری شپ ملتے ہی انتظامیہ کمیٹی کا جلسہ دفتر کی بجائے زیادہ تر سیکرٹری صاحب کے دماغ میں منعقد ہوا کرتا ہے۔ رہے شاعر صاحب، ان کے مینٹل ہال میں کبھی تل دھرنے کو جگہ نہیں ملا کرتی۔ ہر وقت تالیوں اور قہقہوں کی گونج۔ واہ وا اور پھر ارشاد ہو کی صدائیں، مکرر اور ونس مور کے بلند بانگ مطالبوں سے شاعر کا دماغ بجے

"انساں بجائے خویش ہے اک محشرِ خیال"

کا نقشہ بنا رہتا ہے۔

تماشائی : آپ کی قیافہ شناسی پہ آفرین۔ مگر یہ تو فرمایئے کہ یہ بزرگوار شاعر ہیں یا سیکرٹری۔ ان دونوں سے کون کی پوزیشن کے مالک ہیں؟

راوی : سیکرٹری شپ اور شاعری میں تذکیر و تانیث کی طرح تو کوئی نسبت تضاد تو ہے نہیں کہ شخص واحد میں جمع نہ ہو سکیں۔ ممکن ہے جناب موصوف دونوں عزتوں کے سرمایہ دار ہوں۔

تماشائی : یہ کیسے ممکن ہے؟

راوی : اس طرح کہ پہلے آپ کے دماغ پر شاعری کا فالج گرا ہو اور پھر اس بیماری کی نمائش کے لئے آپ نے کوئی ادبی انجمن گھڑلی ہو۔ آپ ان کے پیچھے ہولیں باتوں سے خود پتہ لگ جائے گا کہ یہ شاعر ہیں یا سیکرٹری یا دونوں۔

تماشائی : ہیں!! یہ جھک جھک کر سلام کسے کرنے لگے ان پاس تو کوئی ہے بھی نہیں۔ ذرا سنئے تو زیر لب کچھ فرماتے بھی جاتے ہیں:

"جناب میں کس لائق ہوں۔ استاد مرحوم کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔ جو کچھ بک لیتا ہوں عزت افزائی عنایت۔ مولانا شعر عرض کرتا ہوں۔ زبان ملاحظہ ہو محاورے کو قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے سے:

دل مجروح کو تم دیکھنے آئے ہو بہتر چھپالو چہرہ دیکھو چاندنی پھٹتی ہے گلا پہ"

تماشائی : ارے یہ کیا۔ یہ کیا بکنے لگا اب۔

"پھر فرمایئے! مکرر ارشاد ہو۔ قلم توڑ دیا ہے۔ زمین چھین لی ہے۔ آپ ہی کا حق تھا۔
پڑھے جایئے اسی شعر کو ماشاءاللہ آپ تو جادو پھونک رہے ہیں۔ اے سبحان اللہ۔
تالیاں، مسلسل تالیاں۔ ونس مور۔ ونس مور کا متواتر شور۔
بھئی اچھا شعر کہا ہے۔ چشم بددور۔ ہونہار ہو۔۔۔
آداب بجا لاتا ہوں۔ میں اپنے دیوان کے دیباچے میں حضور والا کے یہ زرین کلمات فخریہ لکھ جاؤں گا"

راوی : اب تو بتانے کی ضرورت نہ رہی ہوگی۔

تماشائی : آپ خوب پہچانے تھے۔ واقعی شاعری کے مالیخولیا میں بری طرح مبتلا ہیں۔ مگر یہ بے ربط فقرے کیوں بول رہے ہیں؟

راوی : آپ ابھی تک نہیں سمجھے۔ جناب قبلہ کے دماغ کے ہال کمرے میں اس وقت مشاعرہ جم رہا ہے۔ آپ اسٹیج پہ اپنے ہفوات سنانے میں منہمک ہیں۔ جیسی داد چاہتے ہیں ویسا ہی مجمع تصور کر لیا ہے۔ جلسے میں سارے داد دینے ہی جمع ہیں۔ جب آپ شعر پڑھتے ہیں تو اپنی نمائندگی کا فرض ادا کرتے ہیں اور پھر داد دینے والوں کی قائم مقامی بھی آپ ہی کو کرنی پڑتی ہے۔

تماشائی : مگر یہ آخری داد کس قسم کی ہے؟
"بھئی خوب کہا ہے۔ چشم بددور۔ ہونہار ہو" یہ تو کچھ داد وداد نہیں ہے۔ معمولی بلکہ اس سے بھی کم درجے کے الفاظ ہیں۔

راوی : او ہو آپ نہیں سمجھے۔ یہ داد سب سے بڑھیا تھی اسی لئے تو اخیر میں نقل کی گئی ہے۔ آنجناب اس خیالی مجمع میں میر تقی میر مرحوم کو بھی ان کی قبر سے اٹھا لائے ہیں۔ یہ الفاظ انہیں کی زبان سے ادا کئے جا رہے ہیں۔ جبھی تو اس داد پہ آپ سب سے زیادہ ریشہ خطمی ہو گئے تھے۔ اور اپنے کلیات کے دیباچے میں فخریہ درج کرنے کی وصیت کر رہے تھے۔

تماشائی : ہاں اب میں سمجھا۔

راوی : دیکھو، دیکھو پھر دورہ ہوا!

تماشائی بیں ہیں۔ یہ ہاتھ پھیلا کر زور زور سے اپنی رانوں پہ مار کر گھوم کیوں جاتے ہیں اور یہ کیا، چھاڑی والے سے ان کی آہنت مُشت بول ہونے لگی ؟

اوہی دونوں بے قصور ہیں۔

گدڑیوں والا یہ جھی گانے میں دنیا بھر سے بے خبر تھا "آنے دے یار آنے دے یا" یہ مٹھائی دے کے آنے دے یار" کمبخت نے بھی سر دیکھا کہ سامنے "پھڑ پھڑ کا" ہو رہا ہے۔ بزبزی کے ہاتھ دکھائے جا رہے ہیں۔ ان بیچاروں نے اپنے خیالی مشاعروں میں داد زور لگا کر شعر پڑھا تھا شعر تھا اور داد دینے والوں کی دل نقل کرتے ہوئے حسرت موہانی کے اس مصرع کا بھی خیال نہ کیا کہ

"میں اپنی داد خود دے لوں کہیں ہم کیا قیامت ہوں" ۔

یہ اپنی ہی نمائندگی کرتے ہوئے بیٹھے بیٹھے "کہہ کر زور سے رانوں پر ہاتھ مارنا چاہتے تھے۔ یہ ارادہ "آنے دی یار" والے حریف سے ٹکر ہوگئی۔ اب اگر کسی کی چاند ی گڑ بڑی تو اس میں ان بیچاروں کا کیا قصور ہے۔ سب کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہیں۔ چھاڑی والا بدتمیز قانون شکنی تک آمادہ معلوم ہوتا ہے۔ صورت سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا داد دینے کا بھی عزم رکھتا ہے

یہ بیچارے مشاعرے کے دھانی پان ہیں

"مگر بتلی صراحی دار گردن "

اس بے تکے ان کھڑی بستی والوں کی سہارن کہاں دیکھے ہیں۔ ایک ہی چپت میں مدارتوں پر گئے

کم بخت نے بھاجا یا مشاعرہ درہم برہم کر دیا۔ اب کی دفعہ مشاعرہ پر ٹکٹ لگوائیں گے۔ پھر بھی ان "شاعرے ماجھوں" کی روک تھام ہو سکے گی؟

— — — ٭٭ — — —

"اور ہاں میرے شاگردوں کو ناچیز نہ کہیے، وہ بڑی چیز ہیں اُن میں جس نے اس نا ہنجار فن میں ترقی کی، پہلے مجھے اور میری استادی کو ماننا ضروری سمجھا۔ آپ ان کے متعلق اپنا خطاب واپس لیجئے، خیریت اسی میں ہے قبلہ! آپ مجھے اور کچھ نہیں تو اپنا ہمسر تو خیال کرتے ہوں گے۔ خدانخواستہ دیوانے کتے نے تو نہیں کاٹا کہ آپ جو شاگرد بنا کر آپ کی معاصرانہ ہمدردی کو شاگردانہ درندگی میں بدل دوں۔ پچھلے پندرہ سال میں یہ سودا بہت کر چکا ہوں۔ اور تو اور کچھ دنوں سے "شاہکار" بھی مجھے شاگردانہ ایذائیں دے رہا ہے۔ حالانکہ میں نے کبھی اس پر استادانہ نظر نہیں ڈالی۔"

(علامہ تاجور)

★

زبانِ اہلِ زبان

اردو لکھنے بولنے کے لئے اب کسی خاص شہر میں پیدا ہونے، رہنے سہنے مرنے جینے کی ضرورت نہیں رہی۔ پانڈیچیری میں رہ کر بھی اگر کوئی اُردو والا بننا چاہے تو بن سکتا ہے یاغستان کے دغاراوڑوں میں بھی اُردو کے بعض اچھے شاعر پائے جاتے ہیں۔ حالانکہ اردو کے خود ساختہ قبلوں کا طواف کرنے کا انہیں کبھی کوئی موقعہ نہیں ملا۔ غیر صوبے والے بیچارے سیاسی طور پر جیسے دہلی۔ لکھنؤ کے اُردوت کیش بنے رہے۔ اسی طرح ادبی حیثیت سے بھی وہ اسی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے ہیں۔ مگر خداوندانِ اردو نے ان کی عبادت شعاریوں کو حقارت ہی کی ٹھوکروں سے ہمیشہ روندا ہے۔ اب کہ دنیا اس قدر آگے بڑھ آئی ہے پستیاں رفعتوں میں تبدیل ہو گئیں نشیب فراز بن گئے۔ مگر اُردو کے ان دیوالیہ ساہوکاروں کی ذہنیت قاروں کے خزانے کی طرح زمین تقفل کی گہرائیوں میں دھنسی ہی چلی جاتی ہے ان کی شریعت میں ہر جرم معاف کیا جا سکتا ہے۔ ہر گناہ کا کفارہ ہے۔ لیکن "باہر کا آدمی ہونا" ابر البیا ثر ہے جس کے لئے نہ مغفرت ہے نہ کفارہ۔ یہ عجوبۂ روزگار نسل اپنے لئے "اہلِ زبان" کا خطاب تجویز کرتی ہے۔ باقی ہندوستان کو عجمی سمجھتی ہے۔ راقم الحروف کو اس نسل کے

اکابر سے نیازمندی کا شرف حاصل ہے۔ انتہائی زیادہ ارادت کا مظاہرہ کرنے کے باوجود اہل زبان کے اس دربار سے فقط یہ سند افتخار لینے میں کامیاب ہوا ہوں کہ :

"بھئی ماشاء اللہ ہونہار ہو۔ پنجابیوں میں اچھا کہہ لیتے ہو"

ان ازکار رفتہ فرعون دماغوں کی ادبی قہاری کا اندازہ ذیل کے دو واقعات سے ہو سکے گا :

(۱) مخزن کی ایڈیٹری کے زمانے میں غلط مستی و تحریک کے استعمال پر مولانا ابوالکلام آزاد اور مرزا عزیز لکھنوی میں ایک بحث چھڑی تھی۔ بحث یہ تھی کہ آیا غلط مستی، تحریک کے استعمال میں ذم کا پہلو نکلتا ہے یا نہیں۔ مولانا ابوالکلام کا دعویٰ تھا کہ یہ دونوں الفاظ برے معنوں میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ مرزا عزیز اسے تسلیم نہیں کرتے تھے۔ مولانا معشوق حسین اطہر ہاپوڑی کی شامت جو آئی بیٹھے بٹھائے ایک محاکمانہ مضمون دے مارا جس میں نہایت معقول بینہ و استدلال سے سوال کے دونوں پہلوؤں پر محاکمہ کیا گیا تھا۔ یہ مضمون انہوں نے مخزن میں اشاعت کے لئے بھیج دیا۔ اس مضمون کو درج کرتے ہوئے ایک نوٹ کی صورت میں ایڈیٹر کی "ہم" میرے قلم سے بھی ٹپک پڑی۔ مضمون اور نوٹ دونوں میں تحکم اور ایڈیٹر دونوں نے فریقین کی بعض ضرورت سے زیادہ گرم کر دی تھی۔ مگر چونکہ بد قسمتی سے ہم دونوں دلی کی شہر پناہ سے باہر اور گومتی کے اس پار سے تعلق رکھتے تھے، ہماری یہ جسارت ایک فرسودہ روزگار ادیب کو بہت "کھلی" یہ بزرگوار بقول اپنے ۴۴ سال نواب آبادی بیگم صاحبہ کے سایۂ عاطفت میں زبان سیکھنے کا "وثیقہ" حاصل کئے ہوئے تھے۔ واجد علی شاہ کے دربار میں بھی باریابی کا موقعہ پا چکے تھے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ رسالہ "صبح امید" میں، جو آنجہانی چکبست کی ادارت میں لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا، ادیب لکھنوی کے فرضی نام سے جھٹ ایک مضمون لکھ مارا :

"مولانا ابوالکلام دھلوی ہیں، حضرت عزیز لکھنوی۔ یہ دو اہل زبان ایک ادبی مسئلہ پر تبادلہ خیالات کر رہے تھے۔ اطہر صاحب ہاپوڑی اور تاجور صاحب نجیب آبادی کو اہل زبان کی گفتگو میں دخل در معقولات کا کیا حق حاصل تھا۔"

یعنی اس پر خفا نہیں کہ محاکمہ غلط ہے یا ایڈیٹر کے نوٹ میں کوئی نقص ہے۔ بلکہ ان بے زبانوں کا یہ جرم ناقابل معافی ہے کہ یہ اہل زبان کی گفتگو میں بولنے کا حق رکھتے ہوئے بھی کیوں زبان درازیاں کر رہے ہیں۔ مخزن جیسا موقر رسالہ جس نے ہزاروں بے زبانوں کے منہ میں زبان پیدا کر دی ہے اس کا خریدار ہونا بھی استناد کے لئے کافی ہو سکتا تھا۔ کجا یہ کہ اس کی عنان ادارت ہاتھ میں ہو۔ دماغ میں ضرورت سے زیادہ رعونیت سمائی ہوئی تھی۔ گرما کے ایک غیر منقوط قصیدہ ان اہل زبان کی شان میں تیار کیا۔ ابھی اسے چھپنا نصیب بھی نہ ہوا تھا کہ معلوم ہوا ادیب لکھنوی کے بھیس میں نواب آبادی بیگم کے تلمیذ رشید فلاں لکھنوی صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ یہ فلاں صاحب آسمان ادب کے تابناک ستارے کہے جاتے تھے۔ گذشتہ سال بیچارے آنجہانی ہو گئے ہیں۔ مجھے ان سے شرف نیاز حاصل تھا۔ اتفاق سے مجھے یوپی کا سفر درپیش آ گیا۔ یوپی کے ایک مشہور شہر میں ان سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اکثر اہل زبان اس مجلس میں موجود تھے۔ ان میں سے کسی کو میری خارجیت کھل رہی تھی۔ کسی کو میری غلط زبانی سے متلی آ رہی تھی۔ نواب آبادی بیگم کے متبنیٰ نہ رہ سکے۔ مجھ سے پوچھا کہ مولانا آپ نے "صبح امید" کا تازہ نمبر ملاحظہ کیا ؟

میں : ہاں جناب دیکھا ہے۔

وہ : آپ کے متعلق بھی تو ایک مضمون ادیب لکھنوی نے شائع کیا ہے۔

میں : (مضمون نگار سے دانستہ بے خبر ہو کر) ہاں مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ ہے ناکندۂ ناتراش حیدر مرزا پوری۔ اس نے یہ حماقت کی ہے۔

وہ : نہیں جناب آپ کو غلط اطلاع ملی ہے وہ مضمون تو لکھنؤ کے ایک مسلم الثبوت استاد کا لکھا ہوا ہے۔

میں : نہیں قبلہ مجھے خوب معلوم ہے۔ انہیں ذات شریف مرزا حیدر بہاری نے لکھا ہے۔ جو چار سطر میں آٹھ غلطیاں زبان کی کرتے ہیں اور اس پر دعویٰ یہ ہے کہ بہت بڑے مضمون نگار اور ادیب ہیں۔

وہ : (ذرا گرم ہو کر) آپ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ ایک سانس میں اتنے بڑے استادوں کو گالیاں دیئے چلے جاتے ہیں۔ آخر اس نے کیا غلط لکھا ہے اہل زبان کی گفتگو میں آپ لوگوں نے دخل اندازی کیوں کی؟

میں (تیوری چڑھا کر) کیا خوب تو آپ کے خیال میں ایبٹ آباد اور پشاور میں پشتو بولی جاتی ہے؟

وہ : پشتو نہیں تو اردو بھی نہیں بولی جاتی۔

میں : آپ اردو سے کیا مراد لیتے ہیں؟

وہ : اردو سے مراد وہ زبان ہے جو دہلی لکھنؤ کی بیگمات بولتی تھیں اور اب ان دونوں شہروں کے خاص خاص محلوں اور مخصوص خاندانوں میں خاص خاص لوگ بولتے ہیں۔ باہر کے لوگ ان بیگماتی محاورں سے بے خبر ہیں۔ اچھا آپ اگر اردو جانتے اور بول سکتے ہیں۔ تو بتایئے "قمر داغ" کسے کہتے ہیں!

میں : مجھے نہیں معلوم قمر داغ کس جانور کا نام ہے۔

وہ : ہا ... س (بس کو اشباع کر کے) جناب یہی نکتے ہیں۔ جن سے آپ حضرات بے بہرہ ہیں سنئے قمر داغ تو سے کو کہتے ہیں۔ یہ خاص بیگماتی لفظ ہے

میں : آپ تو فرمایئے! مہر داغ کسے کہتے ہیں؟

وہ : مہر داغ کوئی لفظ نہیں۔

میں : ہا ــــ س (بس کو ضرورت سے زیادہ کھینچ کر) اسی برتے پر زبان دان و اہل زبان بنے پھرتے ہیں۔ قبلہ دہلی بیگمات جو تو سے کو قمر داغ بولتی تھیں تیتجن کو مہر داغ کہا کرتی تھیں۔ یہ خاص قلعہ معلی کی زبان ہے۔

وہ (سراسیمہ ہو کر) غلط بالکل غلط آپ نے کس سے سنا ہے؟

میں (ہربٹ دھرمی کرتے ہوئے) صحیح بالکل صحیح مرزا داغ اور مولانا طباطبائی کی زبان سے یہ لفظ میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔

وہ : مرزا داغ اور طباطبائی کی زبان سند نہیں ہے۔ حیدر آباد میں رہنے سے ان کی زبان پر دکنی بولی چڑھ گئی تھی۔

میں : اردو ادب کی تعمیر میں آزاد۔ نذیر احمد۔ شرر۔ طباطبائی۔ داغ۔ سرشار۔ خود آپ اور اس قسم کے لوگوں نے حصہ لیا ہے اردو دنیا انہی کو جانتی ہے۔ کیا دلی۔ لکھنؤ والے انہیں مستند نہیں مانتے؟ آزاد پنجاب میں جا کر پنجابی بن گئے۔ داغ و طباطبائی دکنیوں میں جا ملے۔ شرر کوسی کے بھتے آپ کو جاور کا بتایا جاتا ہے۔ سرشار کی زبان سے "بوئے کچوری مے آید" جب یہ اتنے بڑے بڑے اہل زبان بھی مستند نہیں رہے تو قبلہ کیا نواب الٰہی اور آغا چھٹن اہل زبان ہیں۔ جو چوڑے پائنچوں اور ٹوں کے بیٹھنے والی "پھریا" پھڑکاتے لکھنؤ کے چوک میں پھرا کرتے ہیں۔

مجھے یوں سرحادی جوش میں پایا۔ تو ایک کربلائی قبلہ و کعبہ آگے بڑھے اور بیچ بچاؤ کرنے لگے۔ مگر ساتھ ٹیپ یہ سنا دی کہ مولانا قبلہ بُرا ماننے کی بات نہیں۔ زبان ایک بالکل دوسری چیز ہے۔ شغف و انہماک چاہتی ہے۔

میں : قبلہ میر صاحب یہ کب کہتا ہوں کہ زبان بالکل سہل چیز ہے شغف و انہماک نہیں چاہتی۔ مگر ان چند مقامی محاوروں کا نام تو اردو نہیں ہے اور نہ محلہ نخاس اردو کا مرکز ہے جہاں ہر لفظ مؤنث استعمال ہوتا ہے ہاتھی آئی۔ بازار رنگ رہی ہے۔ یہ لفظ اچھی ہے۔ وہ سانس اکھڑی ہوئی ہے۔

اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا اور میری ان ادیب لکھنوی سے صلح ہو گئی"

اپنی بیوی سے جنگ کی پہلی داستان

★

علامہ ظریف

جس جنگی ڈرامے کو گھر کے در و دیوار لگاتار پندرہ دن تک نصف خاموش اور نصف شائی قلم کی صورت میں دیکھتے رہے۔ کارکنان قضا و قدر کا حکم ہے کہ اسے مختصر کر کے پندرہ منٹ میں رسوائے آفاق کر دو۔

اب کہیں تو کیا اور سنائیں تو کیا سنائیں ؟ اگرچہ ہم وہ سب کچھ سنا سکتے ہیں جو سنانا چاہتے ہیں اور سنانے کی اجازت نہیں پاتے تو نا ممکن تھا کہ جس جس گھر میں ہماری یہ رام کہانی سنائی جا رہی ہے اس میں آج رنجگا نہ منایا جاتا۔ گھر کے میرا بھارضا کارانہ فراغت سے دو چار نہ ہونے، ضروری ہو جاتا کہ ریڈیو والے ہر گھر میں ایک جنگ نامہ پڑھا جاتا۔ گھر کے دیوی دیوتا حسب توفیق باہمی سرد جنگ اور گرم گفتاری زبان درازی دست درازی کی تعریفات میں مصروف ہو جاتے اور کم سے کم پندرہ دن تک تو گھر کے میاں کی تنخواہ کا کوئی دعویدار نہ پیدا ہوتا۔

گو ۲ ذاتی کی فوج مصلحت کے کماندار کی سپہ سالاری میں ہماری کا محاصرہ کئے ہوئے ہے۔ جو کہنا چاہتے ہیں نہیں کہہ سکتے کہ مجال دم زدن نہیں رکھتے اور جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ گفتنی ہی مگر شنیدنی نہیں۔ ہماری ذاتی مصلحت کی قطع و برید ہی کچھ کم نہ تھی لیکن رہی سہی کسر ریڈیو کے ٹیلر ماسٹر کی قینچی نے پوری کر دی۔ وہ بے چارہ بھی کیا کرتا کہ وقت کم ہے اور داستان طویل۔ گھڑی کی سوئی رینگنے کی بجائے ٹپک رہی ہے۔ ادھر سر پر ایک سرطہ کھڑا "آہستہ پڑھیئے" کے احکام سے سراسیمہ کئے ہوئے ہے۔ ادھر ہزار ہا گھروں کے میاں بیوی ریڈیو پر چھائے ہوئے اپنی آنکھ کے شہتیر کو نظر انداز کر کے ہماری آنکھ کے تنکے کو ہدف نگاہ بنائے ہوئے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس ڈرامے میں ہمارا پارٹ بیویات اور بیوی زدہ حضرات کے لئے ناخوشگوار ثابت ہوگا اور جماعت کی غائبانہ گالیاں جھڑتوں ہمارا نوشتۂ تقدیر بنی رہیں گی، ہر گھر کی بیوی ہمیں ظالم اور ہر پاکباز شوہر کمبخت گنوار بتلائے گا۔

ہماری خانہ جنگی کی داستان کو سننے کے لئے ہزاروں گنوار سنہ اور رہا ہے، بچہ اور مرکب اپنے اپنے ریڈیو کے سامنے گوش بر آواز ہمہ تن شوق بنے بیٹھے ہیں، یہ حادثہ انسانی دنیا میں کوئی پہلا حادثہ نہیں جو صرف ہمیں پر گذرا ہو۔ بلکہ آدم و حوا کے تمام بیٹے اور بیٹیاں ہر عہد اور ہر ملک میں آئے دن ان خانگی حادثات سے دو چار ہوتے رہتے ہیں۔ ہر گھر میں یہ تماشا ہوتا ہے، کہیں روزانہ، کہیں ماہانہ۔ اور ایسا گھر تو کوئی بھی نہ ہوگا، جہاں سال میں ایک آدھ بار یہ گھر یلو میدہ نہ لگتا ہو۔ مگر جس جوڑے سے پوچھیئے انکاری۔ کوئی میاں اور بیوی کتنے ہی سچے ہوں۔ خانہ جنگی کا ذکر چھیڑا جائے تو کانوں پر ہاتھ رکھیں گے گویا وہ انسان ہی نہیں دیوی دیوتا ہیں یا فرشتہ اور فرشتن۔ سب جانتے ہیں، سب پر گذر چکی ہے، گذر رہی ہے۔ ہر گھر کے در و دیوار ظاہر باطنی سے دیکھتے اور سنتے ہیں کہ گھر کے لیلیٰ مجنوں میں عشق ناز و نیاز کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی آپ سے تم اور تم سے تو کے جے کاروں کا مقابلہ بھی ہو جایا کرتا ہے مگر میاں بیوی کا کوئی جوڑا اپنے جنگ نامہ بجنت کا کبھی ہلکا سا اعتراف بھی کرنے کو آمادہ نہ ہوگا۔ یہ ہے سچ۔

"جھوٹا کل سنسار"

حقیقت حال تو یہ ہے کہ کوئی فاقہ مست فقیر ہو یا بادہ مست شہر یار کوئی ہو کسی ملک کا ہو "بوڑھے کے لڈو" کھانے کی عقلمندی کر چکا ہے، تو دیانت داری کے ساتھ یہ دعوٰے نہیں کر سکتا، کہ اس میں اور اس کی رفیق زندگی میں کبھی، مدھ رنگول نہیں ہوتی۔ کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے کوئی نہیں کرےگا۔ میاں بیوی کسی ہمزاد کے دو روپ تو نہیں ہوتے کہ ان میں چپقلش کا امکان ہی نہ ہو۔ اگر وہ دونوں انسان ہیں، انسان کی خو بو رکھتے ہیں تو انسان کی طرح

محبت بھی ہوں گے اور لڑائی بھی۔ لاکھ جی رکھیں گے اور بگاڑ بھی۔ صناعِ قدرت نے ہر انسان کی فطرت جُدا بنائی ہے، کوئی سے دو انسان بھی ایک فطرت کے مالک نہیں ہوتے۔ کچھ نہ کچھ مختلف ہوتے ہیں۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ دو انسان خواہ وہ لیلیٰ مجنوں ہی کیوں نہ ہوں۔ زندگی بھر ایک ساتھ رہیں اور اُن میں کبھی کسی بات پر اختلاف رائے تلخی اختیار نہ کرے۔ ازدواجی کے تعلقات کی بنیاد محبت پر ہوا کرتی ہے اور سب جانتے ہیں کہ محبت میں کبھی بھی بگاڑ بھی پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ پیار اور بگاڑ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جہاں پیار ہوگا۔ بگاڑ بھی۔ بگاڑ محبت ہی کی طرح فطرت کا ایک قانون ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ باہمی جنگ باہمی محبت کا ایک ثبوت ہے۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کہنے کو تیار ہیں کہ محبت کے جلوہ ہائے رنگا رنگ میں آپس میں روٹھنا اور لڑنا بھی ایک جلوۂ نیرنگ ہے۔ بقول شاعر ؎

بگاڑ سا اثر کہاں عشق میں ہوتا ہے آپس میں
لڑائی میں بھی اک پہلو نکلتا ہے محبت کا

اور سچ پوچھئے تو بگاڑ ہی کے ساتھ آپس کے پیار کا بھی کچھ مزہ ہے۔ ورنہ نرا پیار، اوّل سے لے کر آخر تک پیار ہی پیار روح کو بیزار اور زندگی کو [illegible] بنا دیتا ہے۔ روٹھنے والے جب من جاتے ہیں تو محبت میں ملکوتی رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ اِس آسمانِ تفرقہ پرداز کے نیچے آج تک میاں بیوی کا کوئی ایسا جوڑا پیدا نہیں ہوا جس کی ساری ازدواجی زندگی میں کبھی محبت کی حدت نے آتشیں جلوے نہ دکھائے ہوں اور اگر دنیا کے آباد یا غیر آباد جغرافیے کے کسی کونے کھدرے میں انسانی نسل کے کوئی ایسے فوق الفطرت میاں بیوی موجود ہیں۔ جن کی زندگی میں باہمی ناچاقی نے ایک لمحے کے لئے بھی کبھی جارحانہ رنگ اختیار نہیں کیا تو ایسے تیرہ بخت جوڑے کی موزوں قیام گاہ وہ جگہ نہیں جہاں یہ دنیا والوں کی نگاہ سے الگ زندگی گذار رہا ہے۔ انہیں چاہیئے اور وہ نہ چاہیں تو اس علاقے کی حکومت کا فرض ہے کہ اپنے چڑیا گھر میں اُن کی بود و باش کا انتظام کرے۔ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا!؟

ہاں تو میاں بیوی خواہ فقیر کی کٹیا میں رہتے ہوں یا شاہی محل میں، محبت کی دیوانگی میں مبتلا ہوں یا [illegible] کہ [illegible] کوئی ہوں، کہیں بھی کیسے ہی ہوں، یہ نہیں ہو سکتا کہ اُن کے تعلقات ناخوشی نے کبھی زندگی کا ثبوت نہ دیا ہو [illegible] کے مطابق ہر میاں بیوی کبھی کبھی ایک دوسرے سے لڑا کرتے ہیں۔

البتہ مہذب اور تربیت یافتہ جوڑے نوک جھونک کے رنگ میں دو چار سوال و جواب کے بعد پھر ایک دوسرے سے [illegible] کی گرمجوشی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اَن گھڑ قسم کے جوڑے لڑائی میں زبانوں کے ساتھ ساتھ ہاتھ پاؤں کو بھی شریکِ جنگ بنا لیا کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہر میاں بیوی میں ہاتھ پاؤں کے ساتھ تبادلۂ خیالات ہو یا زبانی زور آزمائی۔ جو کچھ بھی ہو کچھ نہ کچھ ہوتا ضرور ہے اور اِس سے انکار، وہ یا تو جھوٹا ہے یا کنوارا۔ جھوٹا ہے تو ناقابلِ اعتبار اور کنوارا ہے تو ناتجربہ کار۔ [illegible] دونوں کے خطا وار ہے کار۔

لہٰذا اصل جھگڑے کی بنیاد ہر میاں بیوی میں جنگ ضرور ہوتی ہے اور ایک جنگ ہی پر کیا منحصر ہے ہر انسانی جھگڑا جو دو جاندار وں میں واقع ہو سکتا ہے، ہر میاں بیوی میں پیدا ہوا کرتا ہے۔ ہوتا آیا ہے۔ ہوتا رہتا ہے اور جب تک دنیا قائم ہے اور شادی بیاہ ضروری ہے ہوتا رہے گا۔

آج اگر ہم اپنی بیوی سے جھگڑے کا افسانہ سناتے ہیں تو کسی میاں بیوی کو ہم پر ہنسنے کا حق نہیں کیونکہ غیر مہذب ہو معاشرت سے [illegible] ناآشنا میاں بیوی کے حق میں نامہ کیونکہ ؎

"این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند"

ہم اور آپ خانہ جنگی کے حمام میں سب ننگے ہیں۔

ہم بھی آپ کی طرح کے ایک انسان ہیں۔ انسان جذبات کا پتلا ہوتا ہے۔ انسانی جذبات میں محبت کی طرح عزتِ نفس بھی شامل ہے۔ بیوی

ہے والی ملے ہماری غیرتِ مردانہ کو چیلنج کیا تھا۔ وہ چیلنج منظور کر لیا گیا۔ لڑائی ہوئی اور خوب جم کر ہوئی۔ اب یہ حسنِ اتفاق کہیئے کہ اس جنگ میں ہمارے ہاتھ رہا انصاف کیجیئے کہ جب ہم محبت اُن سے کرتے ہیں تو غصہ اتارنے کہاں جائیں۔ پھر یہ امر مشکل اور مشکل سے زیادہ غیر منصفانہ ہے کہ محبت کا اظہار تو کریں بیگم صاحبہ سے اور غصہ اتارنے کے لئے کسی پڑوسی یا پڑوسن کو ڈھونڈتے پھریں۔ جس طرح ہماری ساری محبت اُن تنہا کا حق ہے اسی طرح ہمارے غصے سے بھی انہیں پورا حصہ دار بننا چاہئیے۔ یہ کیا کہ :

"میٹھا میٹھا ہپ ہپ اور کڑوا کڑوا تھو تھو"

یوں تو تیری بھی ہے ... زندگی کہلاتی ہے۔ سال کے ۳۶۵ دن اُسی کی خاطر صبح سے شام تک ایڑیاں رگڑتے ہیں۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخ ہماری ... تنخواہ اس ... حوالے کر دیتے ہیں ... جیسے ہم آپ کے ... ہیں

. . . .

... بھی ... تنخواہ ... کا کیا حشر ہوا ... جاتا ہے کہ اگر ہم دن بھر دفتر کی چکی پیس کر تھکے ماندے ... ہو جاتے ہیں ... کوشش کریں تو کہتی ہیں کہ ہماری شوہرانہ حکومت کا ضبط ... غیر مقدم ... ایک چھوٹی موٹی لڑائی لڑ لیا کرے۔ چنانچہ وہ بیچاری جیسا موقع دیکھتی ہے ... ہر کر لیتی ہے۔

مختصر یہ کہ ... میاں بیوی کی طرح ہم ... ہماری ... زندگی میں ... پیدا ہونے کے لئے کبھی کبھی جنگ ہو جایا کرتی ہے۔

... پیدا ہوا ... کہیں یہ بیانِ جنگ ... بیوی کے ایک اور اعلانِ جنگ کا سبب نہ بن جائے۔ اگر ... آتے ہیں ... کہتے ہیں کہ بیگم ہمارا انتظار کرتا شاید ہمیں گھر پہنچنے میں دیر ہو جاتی۔ اس وقت ... ہماری بیوی کی کوئی سہیلی اس وقت ... جنگ ... ہوں اللہ ... کی پہلی ... کہیں خدانخواستہ کسی گھر کی بیوی کو یہ توفیق ہو گئی تو ہمارے گھر میں ایک نیا ... گھر بگاڑنے کے سامان ضرور مہیا ہو جائیں گے۔ اگرچہ ہم ایک ... شوہر کی حیثیت میں ... سے ڈرتے ہیں ... آج کل بھی ... نہیں ہوتی۔ اس لئے ان محروم خواتین سے جو اس وقت ... ہماری ... افسانہ ... ہماری بیوی سے واقفیت رکھتی ہیں تو اُن سے بادب گزارش ہے کہ اس داستان کو اُن کے کانوں تک پہنچانے ... اور ... مذہب کی رو سے بھی گناہ ہے اور اخلاق بھی اس کی اجازت نہیں دیتا۔ یوں بھی کسی کے گھر میں فساد ڈلوا دینا کوئی ... اب تک تو وہ بے چاری ہمیں سچا بھی سمجھتی ہے اور اس مغالطے میں بھی مبتلا ہے کہ ہم اُس کے نیاز مند شوہر ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی بھلی مانس ... ہماری بیوی کے سامنے ہمیں اصلی صورت میں پیش کر دے۔ اگر کسی سہیلی نے ہماری استدعا کو نامنظور کر کے ہمارے خلاف بیوی ... تو ہمیں ہو گا کہ ایک لڑائی کے لئے ہمیں ... وقت ضائع کرنا پڑے گا۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ گھر سے باہر ہم چاہے ہر لڑائی میں ... مگر اُن سہیلی کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اُن کے تعمیر کردہ ہنگامے سے ہم نقصان نہیں اٹھائیں گے ... ساتھ ہم ہمیشہ کے لئے قطعی آرڈر لگا دیں گے کہ بیوی اپنی کسی سہیلی سے ملنے نہ پائیں۔

مختصر یہ کہ یہ داستان اگر کسی نئی جنگ کا سامان بنی تو ہماری بیوی اور آپ کی کوئی سہیلی ایک جگہ کبھی جمع نہ ہو سکیں گی۔

خدا کرے ہمارا یہ اندیشہ اندیشہ ہی ثابت ہو اور خدا نے چاہا ایسا ہی ہو گا۔ تعلیم یافتہ خواتین سے ایسی حرکت کی ہمیں توقع نہیں کرنی چاہیئے۔ پڑھنے والے میاؤں سے بھی درخواست ہے کہ اپنی اپنی "ملکۂ مہر نگار" کو سمجھا دیں کہ کسی میاں بیوی میں بیٹھے بٹھائے ہنگامہ برپا کرا دینا کوئی ہنر نہیں کہ :

"تو برائے وصل کردن آمدی   نے برائے فصل کردن آمدی"

باز آمدیم بر سر مطلب

بیوی سے پہلی جھڑپ بیان کرنے کا حکم ہے۔ سوچتے ہیں کہ بفضل ایزدی ہم فی الحال دو بیویوں کے شوہر نامدار ہیں۔ پھر کس بیوی سے پہلی جھڑپ کا حال بیان کریں؟ پہلی بیوی غریب تو ہم سے کالے کوسوں دور اللہ میاں سے لو لگائے بیٹھی ہے۔ ہمارا اُس کا ازدواجی رشتہ اب صرف اتنا رہ گیا ہے کہ پہلی تاریخ کو اُسے ہمارا مَنی آرڈر پہنچ جاتا ہے تو وہ سمجھتی ہے کہ یادش بخیر میرا "سرتاج" ابھی قفسِ عنصری سے آزاد نہیں ہوا۔ اور منی آرڈر کی رسید میں موصول ہوتی ہے تو ہم جان جاتے ہیں کہ

"ابھی دلی دور ہے"

وہ ادھر پہلی تاریخ کی خاطر ہماری عمر کی دعائیں مانگتی رہتی ہے۔ بالعکس ہم اُسی تاریخ کے تاوان جبری سے اُکتا کر اُس کی مغفرت کی دعاؤں میں سارا مہینہ گزار دیتے ہیں۔

مگر اُس نمازن کی دعا میں اثر ہے، مقبول ہو رہی ہے۔ ہم جیئے جا رہے ہیں۔ پہلی تاریخ بھی اپنے کو دہرائے چلی جاتی ہے۔ ہم بے نمازی کی دعائیں درِ اجابت تک رسائی سے محروم ہیں۔

خیر دیدہ باید شد

ہر چہ آید بر سرِ فرزندِ آدم بگورد

فیصلہ اب یہ ٹھیرا کہ پہلی بیوی کے اچھے بُرے ذکر کو چھیڑنا مناسب نہیں کیونکہ

"جس سے مطلب نہ ہو پھر اُس کو ستاتے بھی نہیں"

لہٰذا دوسری بیوی کی داستانِ جنگ کا بیان شروع کرتے ہیں ۔

داستانِ بلاکشاں نہ سنو   نہ سنو میری داستاں نہ سنو

مگر آپ نہیں مانیں گے، ضرور سنیں گے۔ اچھا تو اب سر کے کانوں کو بند کیجئے اور دل کے کان کھول کر یہ عبرت انگیز کہانی سنیے!

ہماری یہ بیوی فطرتاً بہت صلح پسند اور مرنجان مرنج واقع ہوئی ہیں۔ پہلی بیوی کی طرح "اٹھ بہر

"کرم کنتوا" اور "بہت تہہ کی دست ترے کی"

کے کھیل کھیلنے کی عادی نہیں۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ

"آدمی کا آدمی شیطان ہے"

بدقسمتی سے ہمارے خاندان میں ہمارے بھائی کی تیسری بیوی ایک مرکزی شہر سے تشریف لائی ہوئی ہیں۔ ہمارا خاندان مولوی ملاؤں کا خاندان کہلاتا ہے۔ خاندان کے ملاؤں نے اپنی اپنی ملانیوں کو دوزخ کی آگ سے اس قدر ڈرا رکھا ہے کہ کبیرہ چھوڑ کے انہیں صغیرہ گناہ کرنے کی بھی جرأت نہیں ہوتی۔ انہیں یقین دلایا ہے کہ عورتیں زیادہ تر میاؤں کی نافرمانی کی وجہ سے دوزخ کا ایندھن بنائی جائیں گی۔ سالہا سال کے وعظ و تخویف کا اثر یہ ہے کہ ہمارے خاندان کا ہر میاں اپنی بیوی کا خدائے مجازی بن رہا ہے۔ اُن میں کچھ ملّا نے ایسے بے تکے بھی ہیں کہ بات بات پر جوتی لات کے ہنگامے برپا رکھتے ہیں۔ غریب ملانیاں صبح کی نماز سے لے کر ٹوٹتی رات تک اپنے میاؤں کی خدمت میں لگی رہتی ہیں۔ اس پر بھی بے درد ملا بات بات بہانے انہیں آڑے ہاتھ لیتے رہتے ہیں۔ شادیانوں کی بجائے اُن گھروں میں آئے دن لٹھ بجائے جاتے ہیں۔ ہر ایک نے اپنی اپنی ملانی کو سمجھا دیا ہے کہ بدن کے جس حصے پر استاد اور خاوند کی قمچی پڑ جاتی ہے۔ اُس پہ دوزخ کی آگ حرام ہو جاتی ہے۔

ہماری نئی بھاوج اپنے میکے کی بڑھیوں سے بہت سے بیوپار ہتھکنڈے سیکھ آئی ہیں۔ انہوں نے جو دیکھا کہ سسرال میں ملانے ...

کا علاج ہے۔ تعدد ازدواج کی بیماری وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ بڑا ملّا دو دو سے لے کر چار چار بیویوں پر حکومت کر رہا ہے۔ ملّانیاں اپنے بے تاج بادشاہوں کی خدمت کرتے کرتے عاجز آگئی ہیں۔ دوزخ کی آنچ کے خوف سے سہمی ہوئی ہیں۔ ظلم سہہ رہی ہیں۔ مگر منہ سے اُف نہیں کرتیں۔ بعض گھروں میں دھول دھپّا اور لاٹھی چارج کی رسمیں بھی روزانہ ادا کی جا رہی ہیں۔

"ہائے مرگئی اور ہائے مرگئی" کے جیسے کارے گوشے گوشے سے بلند ہو رہے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر ان کے بھی اوسان خطا ہوگئے۔ ڈر یہ کہ کہیں ان کا ملّا بھی انہیں دوزخ کی آنچ سے بچانے کا کوئی پروگرام نہ بنا لے۔ یوں بھی دھان پان عورت ہیں۔ دو ٹھوکروں کی بھی گنجائش نہیں رکھتیں۔ انہوں نے سوچا کہ بیٹھ یا نہ بتانا ہے۔ باتوں کا توڑ تو کرسکتے ہیں لاتوں کا علاج نہیں بن سکتے۔ خدا نہ کرے کسی دن نعرۂ تکبیر مارنا پڑ گیا تو میرے لئے تو مصیبت ہوجائیں گے۔ عورت سمجھ دار واقع ہوئی ہیں۔ ابوردل جیٹھوں کو تو صبح کی چائے اور پراٹھوں سے رام کرنا شروع کیا اور شوہرِ نامدار کو زنانہ رنگ شہری کھانوں اور طرح طرح کی مٹھائیوں پہ لگا دیا۔ آپ جانتے ہیں ملّا لوگ تلوار سے ڈرتے ہیں نہ توپ سے۔ البتہ کھانے پر مار کھا جاتے ہیں۔ بھابی جان کا یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ سال بھر کے ملّاؤں میں ان کے نصیبے سے پڑھتے ہمارے نبیؐ تربرادری کو بارہ مسالے کی چاٹ پڑ گئی کہ اب انہوں نے ملّانیوں کی جانب توجہ کی۔

قرآن و حدیث سے چُن چُن کردہ احکام انہیں سناتے ہیں جن میں میاں بیوی کو برابر کا درجہ دیا گیا ہے۔ ادھر مردوں کے ظلم و ستم کے فرضی قصّے زنانہ پرچوں سے نقل نکال کر پڑھوائے۔ آج کل کے زنانہ رسالوں اور اخبارات میں مغرب زدہ خواتین کے مضامین کی ابتدا عموماً اس فقرے سے ہوتی ہے:

"اف یہ ظالم مرد، حقوقِ نسواں کو پامال کرنے والے مرد۔ بیویوں کو باندیاں بنانے والے یہ درندے مرد"

قرآن و حدیث کے احکام اور زنانہ پرچوں میں شوہروں کے جور و ستم کے افسانے سن سن کر خاندان کی مظلوم ملّانیوں میں احساسِ زندگی پیدا ہونے لگا۔ اور ازدواجی زندگی میں پہلی مرتبہ انہیں یہ معلوم ہوا کہ بیوی کے میاں پر بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ اس احساس نے ان میں حقوق طلبی کی جرأت اور دوزخ کی آنچ سے بے پروائی پیدا کردی۔

خاندان بھر کی ساری ملّانیوں نے نئی بھابی جان کی نگرانی میں اپنے ملّاؤں کے خلاف ایک خفیہ انجمن بنائی۔ بھابی جان اس کی صدر تجویز کی گئیں۔

سب جانتے ہیں کہ عورت کے سارے جسم میں اس کی زبان ایک ایسی قینچی ہے کہ اسے سان پر رکھنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی۔ نہ گھستی ہے نہ ٹوٹتی ہے۔ روک ٹوک نہ ہو تو ۲۴ گھنٹے چلتی رہتی ہے بلکہ جتنی چلتی ہے اتنی ہی اس کی تیزی اور روانی بڑھتی جاتی ہے اور اس خصوصیت میں عورت کے شہری اور دیہاتی ہونے کی کوئی شرط نہیں۔ یہ قینچی سب کے پاس ایک ہی کوالٹی اور ایک ہی مارکہ کی ہوتی ہے۔ ہماری ملّانیوں کو دوزخ کی "سیاہ آگ" کے خوف نے خاموش کر رکھا تھا۔ وہ یہ بھی نہ جانتی تھیں کہ بیوی کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ اس لئے بھی چپ تھیں۔ ان کی نئی لیڈر نے دوزخ سے انہیں نڈر بنا دیا اور یہ بات ان کے ذہن نشین کرادی کہ بیوی اور خاوند کے حقوق برابر ہیں اور ظالم شوہروں کی اطاعت گناہ ہے۔

اب کیا تھا۔ مواد پہلے ہی سے تیار تھا۔ ایک "ہو" سے خاندان بھر میں ہلڑ مچ گیا۔ ملّاؤں نے بھی پہلی بار محسوس کیا کہ بے زبان رعایا میں انارکی پھیل رہی ہے۔ بھلا اس بغاوت کو وہ کیوں کر برداشت کرسکتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر گھر میں آٹھ پہر دھما دھم شروع ہوگئی۔

"ہائے مرگئی اور ہائے مرگئی" کے جیسے کارے بھی تبدیل ہوگئے ان کی بجائے:

"نگوڑا! مجھے اپنی جوتی پہ طلاق ہے جو کسر چھوڑے۔ پھانسی پر چڑھوا دوں تو میرا نام زماماں نہیں، اب کے مار کے۔ یہ پنسیری سے تیرا سر نہ کچل دوں تو عزیز اللہ خاں کی بیٹی نہیں۔ ہاں ہاں مار سوچتا کیا ہے۔ اپنے سر میں پتھر مار کے تھانے میں نہ جا کھڑی ہوں تو شیر باز خاں کی نہیں کسی بھنگی کی بیٹی سمجھنا۔ ٹھیں کا ایک ایک بال نہ کردوں تو سہی۔

تیرا باپ بھی! جیل سے نکل آئے گا تو بھی روٹی نہیں پکاؤں گی۔ نرم گرم روٹیاں اب تجھے کھلاؤں گی۔ خاک کھالے، انگارے کھالے۔ بہت مار پہ پل گیا ہے چارہ۔ پندرہ سال سے ظلم سہتے سہتے یہ دن آگئے۔ اب سر سے پانی اونچا ہوگیا ہے۔ اب نہیں چھوڑوں گی۔ میری جوانی خاک میں ملادی

ہے اب بھی تجھے صبر نہیں آیا۔ میں بھی تجھے گور میں نہ پہنچا دوں تو میرا نام بھی فاطمہ نہیں۔"

ملّا نے جبریں ہتے کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ ہمارا ملک پاٹ جوتی کی نوک پر رکھا جا رہا ہے۔ لوکل سیلف گورنمنٹ کا کام کیوں ہو رہی ہے۔ گاندھی کا ستیہ گرہ انگریزوں کے خلاف چلا تھا۔ اس کی مشق گھر کے بادشاہوں کے خلاف کیوں ہونے لگی!

خاندان کے سرغنہ پریسیس نے اپنی اپنی بیگمات کی یہ حریفانہ دھاچوکڑی دیکھ کر باہم غور و فکر کے بعد یہ طے پایا کہ یہ ساری سازش جس محور کے گرد گھوم رہی ہے۔ وہ نئی بھابی جان ہیں۔ اس صحیح نتیجے پر پہنچنے کے بعد انہوں نے ایک وفد کی صورت میں یہ معاملہ بھائی جان کے سامنے پیش کیا اور انہیں بتایا کہ اس ساری شورش کا سر رشتہ آپ کی نئی نویلی دلہن کے ہاتھ میں ہے۔ جب سے ان کا سبز قدم گھر میں آیا ہے کنبے کے امن عامہ میں خلل پڑ گیا ہے یہ زنانہ ستیہ گرہ انہی کی رہنمائی میں جاری ہوا ہے۔ ورنہ خدا اور شوہر کے نام سے ڈرنے والی بیویاں حقوق کے نام تک سے آشنا نہ تھیں۔ اب تو ایکا ایکی یہ انقلاب برپا ہو گیا ہے۔

یہ بات ٹھیک بھی تھی۔ بھائی صاحب کی سمجھ میں آ گئی اور انہوں نے اپنی نئی بیوی پر دھونس جمانے کی کوشش کی۔ بھابی جان نے بھی آداب شوہری کو بالائے طاق رکھ کر "گربہ کشتن روز اول" کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے انہیں ترکی بہ ترکی جواب سنائے۔ وہ بے چارے اگرچہ خاندان کے عام مردوں کی طرح مار دھاڑ کے فلسفے کے قائل نہ تھے کیونکہ دوہری دوہری تہری تہری بیویاں رکھتے ہوئے بھی کبھی کسی بیوی سے حریفانہ مقابلے کا حادثہ انہیں کبھی پیش نہ آیا تھا۔

اس دفعہ نئی بیوی کے بگڑے ہوئے تیور اور برابر کی لاگ ڈانٹ دیکھ کر وہ بھی ششدر رہ گئے۔ اور تو کچھ نہ بن پڑا۔ بیوی سے گرم گفتاری شروع کر دی بیوی آئے تو جاتے کہاں ہو آپے سے باہر ہو گئیں۔ ایک ایک کی سو سو سنا کے بھی دم نہ لیا۔

یہ رنگ دیکھا دیکھ کر گھبرا سے گئے اور کچھ تو نہ سوجھا اتنا کیا کہ بیوی سے سلام کلام منقطع کر دیا۔

بیوی صاحبہ بھی آٹھوں گانٹھ کمیت تھیں، انہوں نے اپنی ایک بوڑھی نانی کا ایک انجر چلانے کی ٹھان لی۔ پہلے تو اٹوائی کھٹوائی لے کر چارپائی پر دراز ہو گئیں۔ کمرے کے کواڑ بند کر لیے۔ بھائی صاحب اس مغالطے میں رہے کہ بیوی نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔

ان کی جھوٹی ہڑتال سے اگرچہ دل میں بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ مگر خودداری و وقار کی خاطر بظاہر بے اعتنائی برت رہے تھے۔ بھابی جان نے جب یہ محسوس کیا کہ مقاطعہ جوئی بے اثر ثابت ہو رہی ہے تو دوسرے دن کمرے کے کواڑ کھولے اور بھائی صاحب کو بلا کر پیسے ہوئے کانچ کی ایک پڑیا دکھا کر کہنے لگیں:

"لو جی اب تم اور تمہارے یہ ٹھٹے بھائی بند گھر میں رہا کریں گے۔ میں سب کی آنکھ میں کھٹک رہی ہوں مجھے ایسی ذلیل زندگی پسند نہیں۔ یہ پڑیا مجھے تمہارے ظلموں سے نجات دے دے گی۔"

بھائی صاحب اس ضبط شکن منظر کو برداشت نہ کر سکے اور بھرائی ہوئی آواز میں انہیں خدا کا واسطہ دے کر بولے "چھوٹی بی! تم میرا ہی لہو پیو جو اسے پھانکو۔ آج سے میں تمہیں کبھی ایک لفظ بھی زبان سے کہوں تو گنہگار۔ اب کے معاف کر دو۔ خدا کے لئے غصہ تھوک ڈالو، خودکشی حرام ہوتی ہے۔"

بھابی جان نے دیکھا حریف میدان چھوڑ رہا ہے۔ نمائشی خودکشی کے اصرار میں جلوۂ عزم نمایاں کر دیا۔ مرد بے چارے نے مردانہ وقار سے دست بردار ہو کر جھٹ ہاتھ جوڑ دیئے۔ آخر بہت قسما قسمی اور شرائط طلبی کے بعد جینے پر رضامند ہوئیں۔ وہ دن اور آج کا دن البیلے دولہا نے پھر کبھی بیوی سے دوبدو ہونے کی جرأت نہیں کی۔

بھابی جان کا بیویانہ وقار بڑھتے بڑھتے اب حاکمانہ اقتدار میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اب بھائی صاحب ہر چیز کو بیوی ہی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ہر مسئلے کو بیوی کے دماغ سے سوچتے ہیں۔ بیوی کی زبان ان کے لئے "لسان الغیب" کا درجہ رکھتی ہے۔ بیوی دن کو رات بتائے تو وہ بھری دوپہر میں آسمان پر تارے گننے کو تیار۔ وہ رات کو دن ٹھہرائے تو یہ چاند کو سورج ثابت کرنے پر آمادہ۔ خاندان کے جس فرد سے بھابی جان خوش ہوں

بھائی صاحب اور اُن کا خدا بھی خوش۔ بس سے بیوی ناراض ہوں اُدھر کعبہ بھی ہو تو بھائی صاحب پیٹھ پھیر کر نماز پڑھتے ہیں۔ جن دنوں یہ ہنگامے برپا ہوئے سوء اتفاق سے ہماری بیوی سسرال آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے یہ سب تماشے اپنی آنکھ سے دیکھے۔ ان سارے معرکوں میں اُنہیں چڑیا والا نسخہ بہت پسند آیا۔ کیمیا کے نسخے کی طرح اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا۔

یہ اُن کی سادہ لوحی سمجھو یا ناتجربہ کاری کہ اُنہوں نے یہ سیکھا ہوا ٹوٹکا ہم پر آزمانے کی ٹھان لی۔

ہم خدا کے فضل سے سو فی صدی شوہر واقع ہوئے ہیں۔ ہمارے شوہرانہ مشرب میں نیاز مندی اور زن مریدی منصب سے بٹا کفر ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہم بیوی کو خدانخواستہ بیوی نہیں سمجھتے۔ نہیں ضرور سمجھتے ہیں۔ اور شوہرانہ حدود جہاں تک اجازت دیتے ہیں اُن سے محبت بھی کرتے ہیں۔ مگر جذبۂ محبت کو دل میں رکھتے ہیں۔ اس کا مظاہرہ کرنے کے خلاف ہیں۔ کیونکہ میاں بیوی میں زیادہ تر غلط فہمیاں مظاہرۂ محبت ہی سے پیدا ہوا کرتی ہیں۔ پھر یہ کہ ہم ایک مشرقی اور قدامت پسند خاوند کی طرح اپنے آرام و راحت پر بیوی کے راحت و آرام کو مقدم بھی سمجھتے ہیں۔ پہلی تاریخ کا سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے اپنی سوچی تنخواہ اُن کے حوالے کر دیتے ہیں اور پھر کبھی بھول کر بھی یہ چھچھورا سوال نہیں کرتے کہ بیوی تنخواہ کا حساب کیا ہے؟ خلاصہ یہ کہ نئی روشنی کی کوئی کلچرڈ بیوی بھی اپنے نیاز مند شوہر سے اتنے انبار در انبار حقوق حاصل نہ کر سکی ہوگی جو ہم تاریک خیال کٹر شوہر خاوند نے اپنے گھر کی ملکۂ پُر نگار کو بخش رکھے ہیں۔ اس پر بھی "حقوق حقوق" ہمارے حقوق، "مساوی حقوق" کے نعرے بلند ہوں، تو آپ ہی کہیے غصہ آئے نہ آئے؟ چنانچہ یہی ہوا کہ بیوی صاحبہ ہماری مزاج کے اتخابی آگئیں اور ایک دن دورانِ گفتگو میں ہم پر سوال جڑ دیا:

بیوی :- کیوں جی تم تو بہت بڑے مولوی، علامہ اور خدا جانے کیا کیا کہلاتے ہو۔ ذرا یہ تو بتاؤ میاں پر بیوی کے کیا حقوق ہیں؟

گھر کے تازہ ہنگامے ہم بھی دیکھ چکے تھے۔ اس سوال پر ہمارا ماتھا بھی ٹھنکا۔ ہمیں اپنے شوہرانہ اقتدار کے ایوان بلند میں زلزلہ سا محسوس ہوا۔ مگر ہم نے دل کی گھبراہٹ کو چہرے تک پہنچنے کی اجازت نہ دی اور مصنوعی متانت قائم رکھتے ہوئے بولے:

ہم :- کیسے حقوق؟ کس کے حقوق؟ کون بیوی؟ ہوش کی دوا بھی تو اچھی خاصی باتیں کر رہی تھیں۔ بیٹھے بٹھائے حقوق کی گردان کیوں شروع کر دی؟

بیوی :- خدا نہ کرے میں کوئی بے ہوشی میں باتیں کر رہی ہوں؟ تم عالمِ دین کہلاتے ہو؟ تم سے میں نے مذہب کا مسئلہ پوچھا تھا اس میں بُرائی کیا ہے؟

ہم :- ہم کوئی مفتی نہیں، مفتی کے بیٹے نہیں، کوئی ہمارے خاندان میں بھی مفتی نہیں گزرا۔ پھر ہم سے کیا سمجھ کے فتوے بازی شروع کر دی۔ بھلا ان بے کار سوالوں سے فائدہ؟ ان کا جواب معلوم کئے بغیر بھی خدا کے ہاں تمہاری نجات ہو جائے گی۔ بس پنجوقتہ نمازیں پڑھتی رہو، بچوں کی دیکھ بھال اور شوہر کی خدمت و اطاعت میں لگی رہو۔ خدا بھی خوش رہے گا اور اس کے بندوں میں بھی سرخرو رہو گی۔ دوزخ کی آنچ سے بھی بچ جاؤ گی۔ جنت کی بیوی کہلاؤ گی۔

بیوی :- نمازیں پڑھنے کو پڑھتی ہی ہوں اور خدا نے چاہا پڑھتی رہوں گی۔ تمہاری خدمت اور بچوں کی دیکھ بھال میں نہیں کرتی تو میرے بدلے کوئی اور آکر کر جاتا ہے۔ مگر تم سے جو مسئلہ پوچھا تھا اُس کے جواب سے پہلو خوب بچا گئے۔ مفتی کوئی آسمان سے تھوڑا ہی ٹپکا کرتے ہیں۔ عالمِ دین ہی مفتی بھی ہوتے ہیں۔ تم نے علمِ دین آخر اسی لئے پڑھا ہے تا کہ دین کے مسئلے مسائل خود بھی [illegible] اور جو نہیں جانتے اُنہیں بھی بتاؤ۔ پھر میرے سوال سے جان بوجھ کر کیوں پہلو تہی کر رہے ہو؟

ہم :- بیوی کے حقوق کے ساتھ اُس کے فرائض بھی تو پوچھنے تھے۔

بیوی :- بیوی کے فرائض مجھے سب معلوم ہیں۔ تم شوہر کے فرائض اور بیوی کے حقوق مذہب کی رو سے بتاؤ۔

ہم :- خاوند پر بیوی کے حقوق یہ ہیں کہ اپنی حیثیت اور بیوی کی خدمت کے مطابق اُس کے نان و نفقہ کا انتظام کرے۔ مناسب حد تک اُس سے محبت کرے اور شوہرانہ انداز سے اس کا احترام بھی کرتا رہے۔ شوہر کے فرائض یہ ہیں کہ بیوی کو صاف اور روشندانوں والے گھر کی چار دیواری

میں نظر بند رکھے جلسہ باز سہیلیوں سے اُسے ملنے نہ دے۔ نیاز مند شوہروں کی بدخو و غلط بیویوں کو گھر میں آنے نہ دے۔ زنانہ رسائل و اخبارات زنانہ لیڈرات اور فیشن زدہ لیڈیات کی زد سے اُسے ایمان کی طرح بچائے رکھے۔ گھر کا کام کاج زیادہ ہو تو ہاتھ بٹانے کے لئے حسب ضرورت و گنجائش آمدنی چارکی شرعی تعداد تک اضافہ بھی کر سکتا ہے۔

بیوی کا فرض یہ ہے کہ شوہر کو اپنی دنیا بنائے باقی ساری دنیا کو بھول جائے۔ اُس کی اطاعت، خدمت اور اُس کے بچوں کی پالنت کو اپنی نجات اور خدا کی خوشنودی کا وسیلہ بنائے۔

بیوی :- اس فرائض نامے کو کبھی ختم بھی کرو گے کہ نہیں؟ ہم نے تو سنا تھا کہ اسلام میں مرد اور عورت کے حقوق مساوی ہیں۔ تمہارے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بیوی اپنے خاوند کی بندہ ور ہوتی ہے۔

ہم :- جب عورت مرد ہی باہم برابر نہیں تو اُس کے حقوق کیونکر مساوی ہو سکتے۔ مرد انسان ہے۔ اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ ساری کائنات اور عورت خدا نے مرد کے لئے پیدا کی ہے اور مرد کو اپنی بندگی اور بزم دنیا میں اپنی نمائندگی کے لئے پیدا کیا ہے۔ پھر بھلا مرد اور عورت کے حقوق برابر کیوں کر ہو سکتے ہیں؟ نہیں ہو سکتے۔ بیوی شوہر کی بندہ ور ہوتی ہے یا نہیں؟ یہ سوال خود بخود حل ہو جائے گا جب تم یہ معلوم کرو گی کہ میاں اور خاوند کے الفاظ آقا کے لئے بولے جاتے ہیں۔ جب مرد آقا کہلائے گا تو آگے ذہن تم لڑا لو کہ بیوی اُس کی رشتہ میں کیا لگے گی؟

بیوی :- کیا واقعی تمہارا مذہب یہی ہے؟ مذاق تو نہیں کر رہے ہو!؟

ہم :- میرا کیا تمہارا بھی یہی مذہب ہے۔ مذہب کے معاملے میں مذاق کیسا؟

بیوی :- تو رج میرا یہ مذہب ہو، میں تو خدا کے فضل سے مسلمان ہوں۔ میرے مذہب میں تو عورت مرد میں بڑائی چھٹائی نہیں۔

ہم :- مسلمان تو بحمد اللہ ہم بھی ہیں اور ٹکسالی مسلمان ہیں، کیونکہ تمہارے قول کے مطابق عالم دین بھی ہیں۔ ہم نے تو قرآن شریف میں یہی پڑھا ہے،

"الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَی النِّسَاءِ" یعنی مرد عورتوں کے حاکم ہوتے ہیں۔

بیوی :- کس قرآن میں یہ لکھا ہے کہ بیوی شوہر کی محکوم ہے اور اُس کی بندہ ور ہے؟

ہم :- اُس قرآن میں جو حضرت رسول اللہ صلعم پر نازل ہوا تھا، جو مسجدوں، مکتبوں، دین محمد تاجر کتب کی دکانوں اور ہماری الماری میں رکھا ہے۔ جسے بچپن میں تم نے بتا ملانی سے قمچیاں کھا کر اور ہم نے میاں جی سے جوتیوں کے زور پر پڑھا ہے جس کی ہم کبھی کبھی اور پولیس کے گواہ آئے دن عدالت میں قسمیں کھایا کرتے ہیں۔

بیوی :- تو رج میں نے قمچیاں کھائی ہوں۔ مجھے تو ملانی بہشتن نے کبھی پھول کی چھڑی بھی نہیں لگائی۔ تم نے جوتیاں کھائی ہوں گی۔

ہم :- ملانی تمہاری بہشتن تھی یا نہیں، یہ تو تمہیں معلوم ہوگا، مگر سنتا ہے کہ اپنی شاگردوں کو روئی کی طرح دھنکا کرتی تھی۔ تم مکرنے کو مکر جاؤ ہمیں تو اقرار ہے کہ ہم نے قرآن، کفش خوری، گوشمالی اور گوش گیری کے زور پر پڑھا ہے۔ اللہ جنت نصیب کرے ہمارے میاں جی کو کان اس زور سے اینٹھا کرتے تھے کہ کانوں کا حال کان کے ہر پیچ کے ساتھ سمرچا گھوم جاتا تھا۔ ۲۵ برس اس حادثے پر بیت گئے مگر ہمارے کان اُس وقت کی دکھ اٹھائے ہوئے آج تک اپنے مرکز پر نہیں آسکے۔ میاں جی نے کانوں کو دو سال تک اینٹھا بھی اور کھینچا بھی۔ کمبخت بڑے سخت جان تھے جو اکھڑے نہیں۔ پھر مرحوم کی مشفق توجہ سے شرقاً غرباً اس قدر پھیل گئے ہیں کہ ہماری ناک اور کانوں میں کوئی تناسب باقی نہیں رہا۔ محلے کے ہمجولیوں نے ہمارے طباق کانوں ہی کی وجہ سے ہمارا نام "کن پھٹیڑو" رکھ دیا تھا۔ وطن کو خیرباد کہنے تک اسی معزز لقب سے ہم یاد کئے جاتے رہے۔ خیریت یہ ہوئی کہ پردیس میں کوئی بچپن کا واقف نہیں ملا۔ ورنہ یہ لقب تاریخی صورت اختیار کر جاتا۔

بیوی :- میں تو جب خوش ہوتی کہ تمہارے میاں جی تمہارے دونوں کان جڑ سے اکھاڑ پھینکتے۔

ہم :۔ وہ ضرور سا کھاڑ پھیلتے، مگر بیوی ڈرتے تھے۔ جانتے تھے کہ یہ بھی کبھی کسی بیوی کا میاں بنے گا۔ اس کے ناک کان اس کی بیوی کی امانت ہیں۔ میں امانت
میں خیانت کرنے والا کون ؟
میاں کے کان اگر کٹ جائیں گے تو مجھے لعنت ملامت کرے گی۔ کہ میاں جی خواہ مخواہ میرے بیویانہ فرائض میں مداخلت بے جا کر گئے۔
لو اب سنبھالو اپنی امانت کو۔ لاؤ کوئی تیز سا چاقو۔

بیوی :۔ کوئی بیوی کسی میاں کی ناک کان نہیں کاٹا کرتی۔ میاؤں کے کوتک ان کے ناک کان کٹوایا کرتے ہیں۔ تمہارے یہی رنگ ڈھنگ رہے تو کسی
دن کوئی ماں کا لال یہ فرض بھی ادا کر دے گا۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی ؟

ہم :۔ وہ ماں کے لال خدا کرے ہمارے سالار جنگ بہادر بن بیٹھیں اور کسی کو ہمارے ناک کان بھلا کیا تکلیف پہنچا رہے ہیں ؟ جو ان کے متعلق غیر آئینی
زحمت مول لے گا !

بیوی :۔ سالار جنگ کی جوتی کو کیا غرض پڑی ہے تمہارے ناک کان کاٹنے کی ؟ تمہارا کوئی بھائی بند کاٹے یا ایڈیٹر ہے۔ جو تمہاری کمائی کے حق دار ہیں وہی
ناک کان کے بھی خریدار بنیں گے۔
دیکھو جی میرے بھائی کا نام ہر بات میں مت لیا کرو۔ وہ بیچارہ کسی کے لینے میں نہیں دینے میں نہیں۔ اچھے میں نہیں برے میں نہیں۔ مگر دنیا ہے کہ
اسے ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔

ہم :۔ دنیا تو اسے دونوں آنکھوں سے چار سال تک چھاتی پہ مونگ دلتے دیکھتی رہی ہے اور اس نے اف تک نہیں کی۔
نیم آستین پہن کر دسترخوان پہ بیٹھیں کی پلیٹیں دنیا تو نہیں صاف کیا کرتی تھی ؟

بیوی :۔ پھر تم نے اس کے کھانے کو دیکھا ؟ تین تین مہینے تمہارا سارا لیاقت آسی کا مہمان رہا کرتا تھا یا کسی اور کا ؟
تمہارے گھر والوں کو تو کبھی اتنی بھی لوازی نصیب نہیں ہوئی۔ کہ ایک وقت ہی کے لئے ہاتھ پیلے کرا دیتے۔ ہاں بیٹھنے کھانے کو خوب ہیں۔ منہ اٹھا
اور لاہور کو چل کھڑے ہوئے۔ پھر اتنی توفیق کبھی نہیں ہوتی کہ لاؤ بچوں کے ہاتھ پر دو چار پیسے ہی رکھ دیں۔ یہ کیا جائیں گے۔ کہ تالے پیچھے کیا ہوتے
ہیں ؟ بس ننگ دھڑنگ آ کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔
"مکھن لاؤ، پیسٹری منگواؤ، بریانی پکاؤ، بورانی منگواؤ، یہ کھلاؤ، وہ کھلاؤ"
جب آئیں گے منہ کی بسانند نکال جائیں گے۔ ادھر وہ تمہارے خاندان کی قلماقنیاں آٹھ دن خلا کے بیچ کھڑی نظر آتی ہیں۔ قرار دل بیچارہ منہ اٹھا اور
چلو لاہور۔ پھر مکھیاں مارتی آتی ہیں اور موذی کا سامان سمجھ کر کھاتی رہی ہیں۔ رشتی بھی ہیں۔ چار دن میں سبب کا سارا رنگ نکال کر جلیبی پھرتی نظر آتی
ہیں۔ گھر جا کر ہر ایک کو یہ سناتی ہیں :۔
"دلہن بڑی اکل کھری ہے۔ سسرال کے کسی آدمی کو دیکھ نہیں سکتی۔ یہاں سے کسی کو آتے دیکھا اور صندوقوں، الماریوں میں قفل پڑنے شروع ہو گئے
ہاں بھائی بھاوج منہ چھپٹ کھاتے ہیں اور دندناتے ہیں خصم کی کیا مجال جو انہیں تم سے تو بھی کہہ سکے۔
خصم ہے نگوڑا۔ پیز جورو کا غلام۔ نہ دیسے کو کوئی جورو ملتی تو جانے کیا کرتا ؟ ادھر سے آیا بیگم کیا ہو رہا ہے۔ ادھر سے نکلا بیوی تمہاری طبیعت
کیسی ہے، تم نے سیب بھی کھائے۔ سنگتروں کا عرق بھی پیا، بٹیریوں کی یخنی پینی ہو تو ؟ دواء المسک یاد کر کے کھا لیا کرو۔
مٹی شمی کر کے کباب ہو جاتے ہیں۔ کچھ جورو نہ جورو کی دُم ڈنکھی سی نگوڑی ہے"
یہ ہے تمہاری قلماقنیوں کا وتیرہ۔ میں بری ہوں، اکل کھری ہوں، سب کچھ ہوں، پھر آتی کیوں ہیں یہ بلا ہیں؟ میں ان کے گھر وسے پر خاک ڈالنے
کون سے دن جاتی ہوں کہ یہ یہاں بن بلائی مہمان بن کر آٹھویں دن کھڑی نظر آتی ہیں ؟ اب کے کوئی شتارہ میرے گھر میں قدم رکھ کے دیکھے،

کہیں نہ کاٹ دوں تو میرا نام خورشید بیگم نہیں۔ بڑ ڈومنی رکھ دینا۔
میرا بھائی تمہاری زبان پہ خوب چڑھا ہوا ہے۔ ہائے ہائے تمہارا جگرا! شاباش ہے تمہیں! وہ بے چارہ تو بہنوئی کو دیکھ دیکھ کر پھولے نہیں سماتا، فرش راہ بچا جاتا ہے، اور بہنوئی صاحب کا حال یہ ہے کہ ہر پیکے پھریں گے تباہی پہ اسی کو یاد کریں گے۔

ہم :۔ ہاں بیوی تم سچی، تمہارا گروہ سچا، جھوٹا کل سنسار، ہم برے، ہمارا کنبہ برا، کنبے کے مردے تک کھوٹے بلبلنٹے، اور عورتیں قلماقنیں اردا بیگنیں۔ جو کچھ ہو وہ تھوڑا ہے۔ ایک غلطی کر بیٹھے ہیں پہاڑ جیسی غلطی۔ اس کی سزا جو دو گی، جب تک دو گی بھگتیں گے۔ تمہاری قید بے میعاد میں گرفتار ہیں۔ زندان عنصری سے آزادی کبھی ہے گی تو تمہاری قید و بند سے بھی رہائی پائیں گے۔

بیوی :۔ میری قید سے اس وقت بھی رہائی نہیں پا سکتے۔ مطمئن رہو۔ دنیا کے آگے قیامت ہے۔ میں وہاں بھی تمہیں موجود ملوں گی۔ ذوق شاعر تمہارے لئے یہ شعر کہہ گیا ہے ۔

"اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے ۔۔ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے"

ہم :۔ کدھر جاتے؟ جہنم میں جائیں گے۔ تمہارے قدموں کی برکت جہنم سے ادھر تھوڑا ہی رہنے کو چھوڑے گی تمہارا قصور ہی ایسا کیا ہے ہم نے۔

بیوی :۔ بھلا میں تمہاری کون؟ تین میں نہ تیرہ میں۔ تمہارے قرآن کی رو سے تمہاری بندی ہوں۔ بھلا بندہ در آقا کا کیا بنا بگاڑ سکتی ہے۔ جہنم یا بہشت جہاں بھی پہنچائیں گی۔ تمہاری پیاری بھاوجیں، تم پہ حق جتانے والی بہنیں، تمہاری کمائی کے حقدار رشتہ دار، تمہارے گھر کو گھر وا بنانے والے بھانجے بھتیجے۔ میں بے چاری کون؟ خاندان کی شریک نہ غم کی۔ بندی ہوں بندی دن رات اپنی ہڈیاں پیلتی ہوں، تمہارے بچوں کی ماماگیری کرتی ہوں، بچوں کے آگے کا بچا کھچا جو مل جاتا ہے، زہر مار کر لیتی ہوں۔ ہفتوں بیمار پڑی رہتی ہوں۔ تو کوئی جھوٹ کو بھی نہیں پوچھتا کہ تیرا کیا حال ہے؟ زندگی بدحال ہے؟ دو دو دن منہ میں کھیل اڑ کر نہیں جاتی۔ ہاتھ ٹوٹ جائیں جو کوئی دو چمچے دلیا پکا کے منہ میں ڈالنے کی زحمت اٹھائے۔ زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں، دنیا کے کندھے کا بوجھ بنی ہوئی ہوں۔ جس دن آنکھیں بند ہوئیں کفن میلا ہونے سے پہلے تمہاری یہ آدم خور بلائیں کوئی ہستنی لا کر بٹھا دیں گی۔
نئے نویلے دولہا کبھی بھولے سے بھی یاد نہ کریں گے کہ اٹھارہ سال کی بندی جس نے دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات جانا، آٹھ پہر میرے بچوں، میرے عزیز، اور رشتہ داروں کی خدمت کرتی رہی۔ لاؤ دو بول فاتحہ کے پڑھ کے اس کی روح کو ثواب پہنچا دیں۔

ہم :۔ بیوی بس اب یہ مرثیہ ختم کرو۔ رونے کو جی چاہ رہا ہے ــــــ اس کا ایک آدھ بند اور پڑھ دیا تو حسین حسین کرنے لگیں گے، آنکھیں گھٹا کی طرح تلی بری ہیں، کہیں ان سے بوندا باندی شروع ہو گئی تو جھڑی لگتے دیر نہ لگے گی۔ اب تو ارد تازہ بھی الاپنے لگو۔ ٹھمری ٹپے سنتے سنتے کان پک گئے۔

بیوی :۔ تو آج میں ٹھمری ٹپے سناؤں کوئی اور پر والی سمجھ لیا ہے مجھے؟ ٹھمری ٹپے سننو رنگیلی بھاوجوں سے، البیلی آپاؤں سے۔ خبردار اب جو میرے سامنے ٹھمری ٹپے کا نام لیا۔ لو جی! اور سنو! ہم سے اب ٹھمری ٹپوں کی فرمائش ہوتی ہے، کل کو کہیں گے ناچو، گاؤ! بھاؤ بتا کر دکھاؤ! ٹھمری ٹپے سننے کا ایسا شوق تھا تو کسی ڈومنی ڈومری سے رشتہ جوڑا ہوتا۔ شریف گھرانوں کی خاک کیوں چھانتے پھرے؟

ہم :۔ بس یہی تو غلطی ہوئی، اسی کو تو سر پکڑ کے روتے ہیں۔ کسی غیر شریف گھرانے کی آتی تو نالائق بیوی بن کے تو رہتی، خاوند کی آنکھ سے نا مدار بننے کی جرأت تو نہ کرتی۔

بیوی :۔ ارے یہ کہو! قسمت اچھی تھی کہ مجھ نصیبوں جلی کو اندھے اماں باوا نے تمہاری چکنی چپڑی باتوں کے جال میں ڈال دیا تھا۔ لڑکا عالم دین ہے خدا رسول کو پہچانتا ہے "یہ عالم دین ہیں۔ صورت دیکھنا! عالم دین کی۔ روزے سے واسطہ نہ نماز سے۔ قرآن کو مانے نہ حدیث کو۔ عورت بندہ

ہوتی ہے، جی ہاں "بندور ہوتی ہے"۔ ان سے کوئی یہ پوچھنے والا نہیں کہ عورتوں نے نبیوں کو جنا، اماموں کو گودوں میں کھلایا، ولیوں کو دودھ پلایا، تو کیا میرے منہ میں خاک وہ خدانخواستہ کرے۔ ان کی بندوریں تھیں ؟

ہم :۔ تو یہ تو ہماری بندوریں کیوں ہونے لگی تھیں، ہم تو انہیں ساری دنیا کے سامنے قابلِ احترام سمجھتے ہیں۔ البتہ یہ پھر بھی کہیں گے کہ اپنے خاوندوں کی خادمائیں ضرور تھیں۔ جیسے ہم تمہارے لئے خدا کے خلیفہ ہیں۔ اسی طرح اُن نیک صفات شوہر اُن کے آقا تھے ۔ ۔ ۔

بیوی :۔ آپ ہمارے لئے خدا کے خلیفہ ہیں ہا! ۔ سبحان اللہ، کیا کہنے خلیفہ جی کے۔ پڑوس کے چھدو نائی کو بھی تو لوگ خلیفہ ہی کہہ کر پکارتے ہیں۔ بس تمہاری خلافت بھی کچھ اسی ناپ کی ہوگی۔

ہم :۔ ہاں بیگم! سچ کہتی ہو۔ شوہر اپنی بیوی کے لئے چھدو نائی طرز کا بھی خلیفہ ہوتا ہے۔ کیونکہ بیوی کا عورت پن اُس کی ناک چوٹی سے زیادہ وابستگی رکھتا ہے جب کوئی بیوی اپنے بیویانہ حدود سے آگے بڑھ کر شوہر جیسے کی جرأت کرنے لگتی ہے تو مرد کو یہ حق بھی حاصل ہو جاتا ہے کہ کورے استرے کے ذریعے اس جیسی شوہر کی ناک چوٹی سے تباہ دخیالات کر لیا کرے۔

بیوی :۔ اگر کوئی اچھا قسم کا شوہر اپنے حدود توڑنے لگے۔ تو اُس کی داڑھی مونچھ کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہیئے؟ اُس وقت بیوی کو چھدو خلیفہ کی قائمقامی کرنے کی اجازت ہوگی کہ نہیں ؟

ہم :۔ بیگم صاحب! مرد کے کوئی حدود نہیں ہوتے۔ وہ بیکراں ہوتا ہے اس کی داڑھی مونچھیں قانوناً جواز رکھتی ہیں بالاتر ہیں۔ وہ مرد ہے۔ ظل اللہ ہے۔ ساری کائنات کا آقا ہے۔ وہ مالک اور حکمران ہستی جس کا ایک ایک بال بڑا سا پھول عورت بھی ہے اُس کی ملکیت ہے ۔

بیوی :۔ تو میں تمہاری مملوکہ ہوں، جیسا تمہارے گھر کا فرنیچر یہی حیثیت میری ٹھہری نا !

ہم :۔ بیگم گھر کے فرنیچر میں تو بعض چیزیں بیوی سے زیادہ ضروری ہوتی ہیں۔

بیوی :۔ مثلاً ؟

ہم :۔ مثلاً مطالعے کی کتابیں۔ ٹائم پیس، فونٹین پین، لیٹر پیڈ وغیرہ۔

بیوی :۔ پھر اگر بیوی کو فرنیچر ہی سمجھتے ہو تو آئے گئے مہمان کو ڈرائنگ روم کی دوسری چیزیں دکھاتے ہوئے ہم کو کہہ دیا کرو کہ یہ فرنیچر گھر میں پڑا ہے اسے بھی دیکھ لیجئے !

ہم :۔ ہاں اگر کوئی ایسا مہمان آ جائے جس سے ہم تمہارا پردہ ضروری نہ سمجھیں تو آسے ڈرائنگ روم کی سیر کراتے ہوئے اسی قسم کی گفتگو کریں گے :

جناب، یہ قالین جو ہال کمرے میں بچھا ہے ڈیڑھ سو روپے کا ہے۔ یہ نایاب آکشن روم سے سستا مل گیا۔ اس کی اصل قیمت ڈھائی سو ہے۔ یہ فریم والی تصویر "راوی دریا" کا شاہکار ہے۔ اس تصویر پر امریکہ کی نمائش میں مصور کو اوّل درجے کا انعام مل چکا ہے۔ یہ چائے کا سیٹ تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ فرانس کا شہنشاہ لوئی چہاردہم اسے استعمال کیا کرتا تھا۔ اور یہ ہماری بیوی ہیں۔ بریانی، تورانی پلاؤ، چلاؤ خوب پکانا جانتی ہیں، زیادہ بوڑھی نہ ہوتیں تو خوب چیز تھیں۔

بیوی :۔ تمہارے دیدے کی زیارت کرنی ہے۔ اچھا پھر یوں ہی سہی۔ میری بھی کوئی سہیلی بشرطیکہ عمر رسیدہ ہوتی، کبھی مہمان بن کر آئی تو میں بھی اسے سیر کراتے ہوئے اُس سے اسی طرح کی باتیں کروں گی :۔

بہن یہ میری مرغی ہے، لگاتار انڈے دیتی ہے، کڑک نہیں ہوتی۔ یہ کتیا بڑی اچھی نسل کی ہے خوب سدھ گئی ہے۔ یہ طوطا بڑا ذہین ہے۔ ہر بات کی نقل اتارتا ہے۔ یہ گرگابی کرنال شاپ سے ۱۲ روپے میں آرڈر دے کر بنوائی تھی۔ بازار میں اتنے داموں کو نہیں ملتی۔ میرا یہ کشمیری نوکر بڑا ایماندار اور خدمت گزار ہے چھ روپے اور کھانے پر نوکر رکھ چھوڑا ہے۔ روٹی تو خیر جیسی تیسی پکا لیتا ہے مگر سالن پکانا ابھی نہیں آتا۔ سیکھتے سیکھتے سیکھ

جائے گا اور یہ جو چار پائی پر ڈھیر ہوئے پڑے ہیں۔ میرے شوہر نامدار ہیں مشہور شاعر اور اس سے زیادہ مشہور ادیب ہیں۔ اپنے سوا ساری دنیا کو پاگل خیال کرتے ہیں۔ بہت اچھے صاحب اور بہت بڑے شوہر ہیں۔ ان کی تحریر سے کسی دماغی بیماری کا پتہ نہیں چل سکتا۔ ہوش میں ہوتے ہیں تو دانائی کی باتیں بھی کیا کرتے ہیں۔ دن بھر اونگھتے ہیں، رات کو جاگتے ہیں تو جتنی رات آتی ہے اتنے ہی پڑ گانا شروع کر دیتے ہیں۔ میری بکری جتنے پتے کھاتی ہے اتنے ہی یہ پان چباتے ہیں۔ ان کے پان کی پیک سے پان دان گرفتار رہتا ہے اور یہ رنگینی سیال زیادہ گھر کے در و دیوار اور پوشاک کے لئے مدیہ مقصت نظر بن جاتی ہے۔ کسی سے سرگوشی کی ضرورت پیش آتی ہے تو مخاطب کا گوش شنوا بات سننے سے پہلے پان کے لازار عزاتی سے لالہ زار ہو جاتا ہے۔

جہاں یہ صورت ہے ہری قسمت بڑے اصرار کے ساتھ آس پاس کے ہر جاندار کو جاگنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ راہ کے مُرّاثوں کی حواس باختہ موسیقی سے کہاروں کے محلے جھمگا اٹھتے ہیں۔ ان دل گداز نغموں کو سُن کر ظریفوں کے شب زندہ دار قدر شناس بہ یک آواز دو شوہر مرحبا بلند کرتے ہیں کہ آنکھوں سے نیند دلوں سے قرار اور دماغوں سے عقل گریز پائی اختیار کر جاتی ہے۔ جیتے رہیں بڑی خوبیوں کے انسان ہیں۔

" ماشاء اللہ استادنیوں کیسی کہی "

ہم: بی نور بی۔ آپ کبھی بھی خوب ہی کہا کرتی ہیں؟ درست، بجا، مناسب، مگر یہ بھی تو کہو کہ جس خوش نصیب عورت نے ان غیر معمولی صفات کے انسان کو شوہری کے لئے انتخاب کیا وہ بھی زیارت ہی کے قابل ہوگی۔ اس سے زیادہ موزوں شوہر اُسے پرا پیتا نہ ہوگا ہوگا، تبھی تو ایسے مجبور ساز گار کو ڈھونڈ کر کے قبول کیا ہوگا۔ وہی کہاوت کہ جیسی روح ویسے فرشتے۔

قرآن پاک بھی تو یہی فرماتا ہے کہ

"اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ" کیوں غلط کہہ رہا ہوں بیوی: ہماری تمہاری تو وہی مثل ہے۔

"اللہ ملائی جوڑی ایک اندھا ایک کوڑھی"

بیوی: خدا سے منہ پھیرے دو۔ تمہیں ہو گے اندھے بھی اور کوڑھی بھی۔ میری آنکھوں نے اپنی کسی ملاقاتی کی آنکھیں ملا لو تمہاری بہنیں کہا کرتی ہیں کہ چشم بد دور ہماری چھوٹی بھاوج کی آنکھیں جہانگیر کی نور جہاں سے ملتی جلتی ہیں۔ کیوں کہا کرتی ہیں یا نہیں؟

ہم: کہا کرتی ہوں گی ہم سے تو ایک دفعہ یہ پوچھتی تھیں کہ کیوں بھیا! تمہاری دلہن کی آنکھوں میں موتیا بند اُتر آیا تھا؟ ہائے ہائے تم نے پہلے ہی سے خیر خبر نہ لی۔ دیکھا کی اچھی بھلی آنکھیں "موئے نے بیچا کر ناگوری بیل کی سی کر لیں۔ چاؤ چونچلے تو اتنے بگھارتے رہتے ہو یہ نہ دیکھا گیا کہ آنکھیں خراب ہوتی جا رہی ہیں۔ پھر آنکھیں بنوائی تھیں تو غریب کو آتشیں شیشوں کی عینک تو لے دی ہوتی۔ یوں تو وہ پھر خراب ہو جائیں گی۔ اور خدا نہ کرے پھر بگڑ گئیں تو موئے نے جاڑ یا کالے پانی کسی کے بنائے کچھ نہ بن سکے گا۔

(۲)

بیوی: ڈرنا ہے تمہاری بہن سے، چڑوائی زبان پر زبان نہیں۔ کیوں نہ ہو آخر تمہاری ہی تو بہن ہے۔ اس دن وہاں ثروت کے ہاں بڑی مجلس میں میری آنکھوں کو نور جہاں کی آنکھوں سے تشبیہ دی جا رہی تھی۔ ستارا بیگم ان کی ساس نذیرا بھی زندہ ہیں اُن سے پوچھ لو کہ کچھ کہہ رہی تھیں یا نہیں؟ بھیا سے یہ شادی کرو اس بندی کی آنکھوں میں موتیا بند اُتر آیا ہے۔

اردو اور فارسی کہا گیا ہے۔ آنکھوں کی بُرائی پلکوں سے کرتی ہے۔

ہم: تمہیں نہیں ہوئی۔ انہوں نے نور جہاں کا نام لیا تھا تم سمجھیں بس نور جہاں جہانگیر بادشاہ کی ملکہ ہی کا نام تھا اور کسی عورت کا نام نور جہاں

ہو ہی نہیں سکتا۔ بیوی عیسیٰ نائی کی بیٹی دیکھی نہیں تم نے، وہی پھٹے پھٹے دیدوں والی۔ جس کے دو دانت ہونٹوں پر پڑے رہتے ہیں۔ اُس کا نام بھی نور جہاں ہے۔ نورو نورو کہنے لگے ہیں۔ اُس کی آنکھیں بھی خراب ہیں۔ یوں دیکھنے میں بڑی بڑی معلوم ہوتی ہیں۔ مگر شب کوری میں مبتلا ہیں۔ شب کوری جانتی ہو نا؟ جسے ہماری بولی میں رتوندا کہتے ہیں سب بے چاری کو چار گھڑی دن سے کچھ نہیں سوجھتا۔ یوں آنکھیں کھولے ضرور رہتی ہے۔ ذرا سورج نیچے کو ڈھلا اور اُس کی بینائی نے جواب دیا۔

بس یہی ہوا کہ تمہیں نام کا دھوکا ہو گیا۔ انہوں نے عیسیٰ نائی کی بیٹی کا نام لیا تم ملکہ نور جہاں سمجھ بیٹھیں۔ اس میں تمہاری خوش فہمی ہے۔ اُن بے چاری کا کیا قصور ہے؟

بیوی:۔ خدا نہ کرے میری آنکھیں نورو نائن کی سی ہوں۔ تمہاری بہن تو اس کی آنکھیں پسند ہیں اللہ چاہے ایسی ہی ان کی آنکھیں ہو جائیں گی۔

بڑی بے چاری میری بھی بچی آنکھوں میں موتیا بند اتارتی ہیں۔ اللہ! میری آنکھیں نورو نائن کی سی ہیں؟ اپنی ٹھوڑی کو نہیں دیکھتیں؟ ڈرائے ہوئے چہرے پر پھٹے پھٹے دیدے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے براؤن کوٹ کے دو کاج۔ ایک وہ چھوٹی دھونکنی پھرتی ہے۔ جیسا مراتی بھیگا ہوا آپا۔ سوجی ہوئی ٹھوڑی کے اندر مٹی دھنسی آنکھوں کا کہیں نام کو دکھائی نہیں دیتا مرات گھڑیا ڈھکیل جیسے کوا ہے کا چھوکرا ادھر سے آئے گی اماں چوپ تھالیں۔ اماں چاہے پی لوں۔ آٹھ پہر منہ بھی چلتا ہے اور پیٹ بھی۔۔ اپنی لمبوترے منہ والی بھابی ہی کو دیکھئے کہا ہوتا ہے کہ ٹھوڑی کی آنکھیں ہیں۔ اللہ تو بہ میری آنکھوں سے آٹھ پہر سے دور ڈگر ڈگر کرتی ہیں۔ جیسے کسی کی جان کندنی ہو رہی ہو۔ پھٹی پھٹی بے نوری آنکھوں ہی کے کارن تو بچپن سے اُس کا "بیدوں پھٹی" نام پڑ گیا ہے۔ اللہ! میری آنکھیں اس دیدوں پھٹی سے بھی گئی گزری ہو گئیں۔

خدا کی شان!! بری صورت میں عیب نکالے جاتے ہیں۔ پیارے بھیا کے سراپا پر جو ٹکر کرنوں نور برس رہا ہے۔ ایسے کبھی نہ دیکھا۔ بھیا بھیا، یا بھنے بھیا کے۔ بھیا آئے تھے "بھیسی بچوں کی بیجا" کتنے خوبصورت بھیا ہیں بھتو کے۔ وہی کہاوت۔

"اونٹ رے اونٹ تری کون سی کل سیدھی ہے"

خوبصورت بھیا کے کان دیکھو جیسے سارنگی کے پردے۔ ہونٹوں کا دل معلوم ہوتا ہے۔ ناند کے دو کنارے۔ تو ڑ کے منہ کے دہانے پر جڑ دیئے ہیں۔ قد پایا ہے بھیا نے جس کا لمبان چوڑان برابر برابر ہے۔ گردن کندھوں میں ڈوبی ہوئی اور پیٹ آدمی پر سے اللہ! پیٹ ہے یا کسی پیر کے مزار کا گنبد؟ پھر چٹیا کا رنگ کالا نہ گورا۔ بھوسلا ہے بلا سے کالے ہی ہوتے۔ کالے رنگ میں بھی کچھ نہ کچھ بھاپن تو ہوتا ہے۔ دانتوں کا دیوالہ ڈاکٹر جلال دین کی عنایت سے نکل چکا ہے۔ دانتوں میں "ماس خورہ" لگ گیا تھا۔ یا گھاس خورہ۔ جو آفت بھی تھی دانتوں کی بتیسی تو نظر آتی تھی۔ روٹی تو یہیں سے کھایا کرتے تھے۔ ماس خورہ کم ہوا تو ڈاکٹر اسے جلال دین اور بی جلال دین ایک نہ دو اکٹھے دو دانت خورے لگ گئے۔ مٹھی بھر بے جیتے جاگتے دانت زنبور کے حوالے کر دیئے۔ اور ابھی کیا ہے؟ ان اے۔ بی ڈاکٹر اور سی ڈی ڈاکٹر کا دم سلامت ہے تو گن گن کر رہے سہے دانت بھی اکھیڑ لیں گے پھر میاں پرملوں کا فالودہ پیئیں گے۔ لائق رہ جائیں گے۔ لو بھلا غضب خدا کا یہ عمر تمہارے پوپلے ہونے کی تھی؟ بہن عمر میں سات برس بڑی سارے دانت منہ میں بھرے پھرتی ہے بڑے بھائی دس برس بڑے ان کے کسی دانت نے جنبش نہیں کھائی۔ تم کون ایسے بڑھے بڑھے بوڑھے تھے کہ بچوں کی طرح پوپلے ہو گئے۔ بات کرتے ہو تو سمجھ میں نہیں آتی۔ منہ میں پان ہو تو بات سننے والے کا چہرہ پیک سے رنگین ہو جاتا ہے۔ بڑے بے چارے بھی وہیں سے چلے تھے۔ "ڈاکٹر جلال دین ایسا اور ڈاکٹر جلال دین ویسا۔ تمہارے دانتوں کا درد ہو درد سب کھو دے گا"۔ سچ ہے درد ورد آپ ہی کھویا جائے گا جب سب دانت زنبور کے حوالے ہو جائیں گے۔ میاں اپنا جیسا پوپلا مجھے بھی بنانا چاہتے تھے۔ وہ تو بے چاری سرفراز بیگم کا خدا بھلا کرے اُس نے مجھے روک دیا۔ کہہ کیا کر رہی ہو بھابی؟ کیوں دیوانی ہو اٹھی ہے بھائی صاحب کی طرح پوپلا بننے کو جی چاہ رہا ہے؟ وہ نہ روکتیں تو میں دیوانی تو جانے پر تیار ہی ہو گئی تھی۔ ان کا کیا جاتا ڈاکٹر اسے جلال دین منہ میں سے سارے دانت اکھاڑ لیتا۔ خدا ہی ستے

بچا یا ہے۔ ورنہ تم نے تو مجھے بولی بنانے میں کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔

ہم :۔ قصوروار تو تمہارے ہم تھے۔ ڈاکٹر اسے جلال دین غریب کے کیوں سر ہو گئیں۔ دانتوں کی بیماریوں کا ایسا باکمال ماہر سارے صوبے میں بھی نہیں۔ انگریز تک اسی سے دانتوں کا علاج کراتے ہیں۔ اس دن یہاں کے دانتوں کے سرکاری ہسپتال کا یورپین ڈاکٹر مسٹر گلبرٹ ڈھائی ہزار روپے تنخواہ اسی کام کی پاتا ہے۔ اپنی کسی رشتہ دار میم کے دانت دکھانے ڈاکٹر اے جلال دین کے پاس آیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر جلال دین اپنے فن کا ماہر نہ ہوتا تو ایسے ایسے ڈاکٹر کیوں اس کے پاس علاج کرانے آتے؟

بیوی :۔ ہو گا، ہمیں اس سے کیا؟ تمہیں اُس ... سے عقیدت ہے تو رہے۔ یہ دانت بھی نکلوا آؤ۔ اپنی بڑی آپا کے دانت نکلوا دو۔ پہلے دانتوں سے منہ بھرت بھرتی ہے۔ میرے دانتوں کے پیچھے کیوں پڑ گئے؟

ہم :۔ کیا کہیں۔ دانتوں آنکھوں کے ڈاکٹر تو سیکڑوں ہو گئے کوئی زبان کی بیماریوں کا ڈاکٹر نہیں ملتا۔

بیوی :۔ زبان کے ڈاکٹر کی کیوں ضرورت پڑ گئی؟ زبان کی کتریں تو میں بھی تراش سکتی ہوں۔

ہم :۔ ہماری ایک محترمہ کی زبان کے پیچ کچھ ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ بڑھتے بڑھتے ہاتھ بھر کی لمبی ہو گئی ہے۔ آٹھ پہر مشین کی طرح چلتی رہتی ہے۔ کوئی زبان کا مستری مل جائے تو ان کی زبان کی ذرا بریکیں کسوا دوں۔

بیوی :۔ تمہاری زبان کس نے کیل رکھی ہے؟ پہلے اپنی زبان کی خبر لو۔ اس کی کتریں ترشواؤ اور بریکیں بھی کسواؤ! مٹی ہم ہو گئے تراتر چلتی ہی رہتی ہے اور کہنی ان کہنی جو منہ میں آئے کہنے سے باز نہیں رہتی۔

اور وہ محترمہ کون ہے؟ میں؟ میری زبان کی بریکیں کسواؤ گے؟ تم! کیا کہنے تمہارے ہیں

"شبت کریں آرزو خدائی کی"

اپنی بڑی آپا کی زبان پر زخم اور آنکھوں میں تیل کی سلائی پھروائی ہوئی مٹی ناگن کی سی زبان اور بندیا کی سی آنکھیں آٹھ پہر چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں۔ پیاری بھابی کی جیبیا کی کتریں ترشواؤ! جب چلتی ہے تو کسی صورت رکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ کسی دوسرے کو بات کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیتی اور تم نے کون سے دن گنے لگے کا لگا لکھایا تھا؟ اپنی ... زبان کی کانٹ چھانٹ بھی تو کراؤ۔ سوتے میں بھی چلتی ہے اور جاگتے میں بھی۔ کیا مجال جو دم بھر کو چین لینے دے۔ پڑوسن پڑوسن ہی پوچھ رہی تھی کہ علامہ صاحب رات رات بھر کس سے لڑتے رہتے ہیں۔ یہ سوتے نہیں کسی وقت؟ اب کیا جواب دیتی میں اسے کہ وہ تو شام سے پڑ کر سوتے ہیں تو نو بجے دن کی خبر لاتے ہیں۔ مگر فارقی زبان چوکیدار کی طرح پہرہ دیتی ہے۔ اس کے نخرے کی نیند اڑ گئی ہے۔ تمہاری لم دراز جیبیا نے تو پڑوسیوں کی نیند حرام کر رکھی ہے۔ اس کی بریکیں بھی کسواؤ! اور چوں میں بھی۔

میری زبان کا ایسا رونا پڑ گیا اس کے لئے مستری اور سلوتری ڈھونڈے جانے لگے۔ اللہ کی شان! خدا جو خیال ہو اس مردوے کو کہ آخر بیوی بھی آدمی ہے۔ آدمی کا بچہ ہے۔ اس کا دل بھی رکھنا چاہیئے! عورت مٹی کا مادہ ہی کیا؟

ہم :۔ ہیں!! کیا عورت بھی آدمی ہوتی ہے؟ یہ آج ہی سنا ہے!

بیوی :۔ تو کیا عورت آدمی نہیں ہوتی؟

ہم :۔ ایں!! کیا عورت بھی آدمی ہوتی ہے؟ کل کو کہنے لگو گی کہ عورت بھی اشرف المخلوقات کہلاتی ہے اور تم سے کیا تعجب ہے کبھی اس کا بھی دعویٰ کر بیٹھو کہ عورت خدا کی خلافت اور خلق خدا پر حکومت کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ دیکھو بیوی! خدا کا خلیفہ ہے انسان اور انسان سے مراد ہے آدمی، اور آدمی مذکر ہوتا ہے۔ عورت بیچاری تو عورت ہوتی ہے۔ کائنات کی ہر چیز کی طرح عورت بھی مرد کی اطاعت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ دیکھو کائنات کا سورج آدمی کو روشنی بخشتا ہے۔ چاند اس کی کھیتیاں پکاتا ہے۔ ہوا اور پانی اُسے زندہ رکھتے ہیں۔ تارے

اُس کے لئے جگمگاتے ہیں۔ پرندے اُسے رسیلے گیت سناتے ہیں، پھول اُس کی خاطر کھلتے ہیں۔ اور فضا کو مہکاتے ہیں۔ کلیاں اُسے دیکھ کر مسکراتی ہیں۔ سبزہ اُس کی نگاہوں کے لئے لہلہاتا ہے۔ گھنگھور گھٹائیں اُس کے دل کو بھاتی ہیں۔ اسی طرح عورت اس کا دل بہلاتی ہے۔ اُس کے بچے پالتی ہے۔ اس کے باورچی خانے کا انتظام کرتی ہے مختصر یہ کہ جہانِ کائنات اور عالمِ موجودات کو خلیفۃ اللہ یعنی آدمی یعنی مرد کے لئے خدا نے پیدا کیا ہے۔ مرد نہ ہوتا تو کائنات عالمِ وجود میں آتی، نہ عورت نہ بیوی، نہ تم۔

بیوی : اور عورت نہ ہوتی تو مرد کس طرح پیدا ہوتا۔ حالی انڈے سے ؟

ہم : مرد چونکہ خلافتِ الٰہیہ اور کائنات پر حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اس لئے اُس کا پیدا ہونا تو ضروری تھا۔ عورت نہ ہوتی تو چاند سورج مرد کو جنتے۔ ستارے اُسے جنتے۔ جنت کی حوروں کو آسمان بھیجتیں۔ کھلانے اور دودھ پلانے کا شرف حاصل ہوتا۔ عورت کا تو یہ بڑا فخر ہے کہ اُسے مرد کی ماں اور اُس کی بیوی بننے کی سرفرازی حاصل ہوئی۔

بیوی : تم نے کسی بڑے آدمی کا قول نہیں سنا کہ جو ہاتھ پنگوڑا ہلاتا ہے۔ وہ حکومت کی باگ تھامنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔

ہم : یہ قول کسی بڑے آدمی کا نہیں۔ کسی خود فراموش بڑی عورت کا معلوم ہوتا ہے۔ یا پھر کسی لیڈی پین یا کسی مغرب زدہ انگلینڈ ریٹرنڈ ہندوستانی کا ہوگا۔ مغربی ملکوں کی زمین برفانی ہے۔ وہاں عورتوں نے مردوں کے حقوق کو دبا لیا ہے۔ یوں بھی وہ برفانی ملک نیاز مند شوہروں اور زن مرید میاؤں کی سرزمین ہو گئے ہیں۔ وہاں کے شوہروں میں پانچ فی صدی سے زیادہ شوہریت نہیں ہوتی۔ ہم ٹھہرے سرزمینِ مشرق کے باشندے سو فی صدی مرد اور سو ہی فی صدی شوہر۔ ہمارے ہاں تو جو ہاتھ پنگوڑا ہلاتا ہے ہمیشہ سے ہمیشہ تک پنگوڑا ہی ہلاتا رہے گا۔ سلطنت کی باگ تو درکنار اُسے گھوڑے کی لگام پکڑنے کی بھی اجازت نہ دی جائے گی۔

بیوی : دیکھو ! دنیا میں عورتوں کی تعداد مردوں سے بہت زیادہ ہے۔ اب نسوانی بیداری پیدا ہو رہی ہے۔ عورتوں کو ووٹ کا حق مل چکا ہے۔ وہ زمانہ قریب ہے جب مرد پنگوڑا ہلایا کریں گے۔ بچوں کی پرورش اور باورچی خانے کی ماما گیری اُن کا فرض ہوگا اور عورت دنیا اور مرد پر حکومت کرے گی۔ یہ زمانہ دور نہیں۔ تمہاری ہماری زندگی ہی میں آجائے گا۔ جب تک یہ مبارک دور آئے۔ عورتوں کو چاہیئے کہ مردوں کا بائیکاٹ کر دیں۔

ہم : دنیا میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کئی گنا زیادہ ہے۔ یہ سچ ہے۔ مگر یہ کوئی اتفاقی امر نہیں۔ قدرت جان بوجھ کر عورتوں کی تعداد بڑھاتی ہے۔ اس کا حسنِ خلاقی قابلِ داد ہے۔ اس میں لطیف اشارہ یہ ہے کہ عورت مرد کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ ہر مرد اگر چاہے تو ایک سے لے کر چار تک شادیاں کر سکتا ہے۔ رہا ووٹ کا حق۔ یہ مغرب کے نیاز مند شوہروں کی بیہودگی اور بزدلی ہے۔ ہم تو شروع ہی سے اس کے خلاف ہیں۔ خدا نہ کرے۔ اگر عورتوں کا عہدِ حکومت آگیا تو ہم تو بیوی کچھ کھا کے سو رہیں گے۔ ہم سے تو تم پنگوڑا ہلانے کی امید نہ رکھو۔ باقی رہا مردوں کے بائیکاٹ کا سوال۔ ہم بھی اس کی بزور تائید کرتے ہیں۔ وہ بڑا مبارک زمانہ ہوگا۔ جب عورتیں مردوں کا پیچھا چھوڑ دیں گی۔ مرد اپنی نیند سوئیں گے۔ اپنی بھوک کھائیں گے جو کچھ کمائیں گے اپنے اوپر اٹھائیں گے۔ کوئی تنخواہ کا دعویدار نہ رہے گا۔ سسرال کے جانداروں کی پالگت سے بچ جائیں گے۔ زیورات، زرق برق زنانہ پوشاک، تیل پھلیل، گوٹا ٹھپا، مسی، سرمہ، غازہ اور پوڈر کے جھنجھٹ سے چھٹکارا پائیں گے۔ تم اس بائیکاٹ کی تحریک کی لیڈر بن جاؤ۔ مضامین لکھ لکھ کر ہم دیں گے۔ اپنے نام سے شائع کراؤ اور سب سے پہلے اس نیک تحریک کا آغاز ہمارے بائیکاٹ سے کرو۔ خدا تحریک میں برکت دے گا۔ ہم خوش ہمارا خدا خوش۔

بیوی : سسرال والا کون تمہارے ہاں موٹا ہونے آ رہا ہے ؟ ایک لے دے کے میرا بھائی ہے۔ وہی تمہاری آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ مگر وہ تو جب تک میں جیتی ہوں ضرور آئے گا۔ ہزار بار آئے گا۔ جم جم آئے گا۔ تمہارے گھر والے زہر کھا کر مر جائیں۔ اُسے آنے سے کون روک

سکتا ہے ؟۔ مت لیا کرو سسرال کا نام میرے سامنے۔ بڑے بچارے منہ پہ ہر وقت سسرال کا نام رکھ چھوڑا ہے۔ اس اُجڑی سسرال میں اب کون رہ گیا ہے ؟ میری تین نوجوان بہنوں کو ٹوک ٹوک کر تو کھا چکے۔ اماں تمہارے سبز قدم آنے سے پہلے ہی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ ایک بڑھاپا باپ رہ گیا۔ ہے وہ بھی کئے دن اور کئے رات کا۔ باپ کی نشانی ایک بھائی ہے اُس کو میرے پاس آنے سے روکنے والا کون ہے روک کے تو دیکھیے۔

ہم :- ہمیں تو معلوم ہے تمہارا بھائی ضرور آئے گا۔ ہزار بار آئے گا۔ بلکہ آئے گا تو جانے کا نام نہ لے گا۔ آسے بھلا کون روک سکتا ہے۔ شکر ہے تمہاری بہنیں ہمارے گھر آ کر نہ مریں۔ ورنہ تم ہمیں پولیس کے حوالے کر دیتیں۔ اب تم مرنے لگو تو خدا کے لئے میکے چلی جانا۔ نہیں سسرال والے تمہارا خون ہمارے ذمّے تھوپ دیں گے۔

بیوی :- مجھ سے کیوں بیزار ہو گئے ہو۔ میں زیادہ جینے والی نہیں۔ میری کسی بہن کو جوانی راس نہیں ہوئی۔ جوان ہوتی گئیں مرتی گئیں۔ میں بھی کوئی دن کی مہمان ہوں۔ میرے خاندان میں عورتیں کالے چونڈے سے کر سدھار جاتی ہیں۔

ہم :- آہ ! بیوی ہم ایسے خوش نصیب کہاں ہیں ؟ تم اگر کسی اور گھر جاتیں تو جوان مرگی کے متعلق تمہاری خاندانی روایات ضرور قائم رہتیں۔ اب تو تم ہمارے گھر آ گئی ہو۔ بے خطر رہو۔ تمہارا یہ کالا چونڈا کاسے بھورا، بھورے سے چٹّا اور چٹّے سے خدا جانے کیا کیا رنگ بدلے گا۔ موت تم سے مایوس ہو چکی ہے بس ہمیں کو مرنا پڑے گا، تب کام چلے گا۔ تم جُگ جُگ جیتے جاؤ۔ ہم اپنا کچھ انتظام کریں گے۔

بیوی :- میں تو تمہیں مار کے مروں گی۔ کیا منہ بھر بھر کے مجھے کوس رہے ہیں ؟ کوئی سنے تو کیا کہے ؟

ہم :- تم بے فکر رہو۔ ہمیں مار کے بھی تم جیتی رہو گی۔ تم مرنے والی اسامی نہیں ہو۔

بیوی :- خدا کلو بوا کو غارت کرے۔ مردار نے گھر کے گھر لے لئے تھے۔ مال زادی اپنی چکنی چپڑی باتوں سے دادی بی کے پیٹ میں اُتر گئی۔ "اے بیگم لڑکے کی دسوں انگلیاں دس چراغ ہیں۔ میری آنکھوں میں خاک چہرے پر ایسا نور برستا ہے کہ درود پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ ایسا داماد چراغ لے کر ڈھونڈو گی تو نہ پاؤ گی۔ بیوی کے پاؤں دھو دھو کے پیا کرے گا"۔ بس تا۔ دادی بی کو ایسا شیشے میں اُتارا کہ اُس کا کلمہ بھرنے لگیں اور میری جیتی جان کو اندھیرے کنوئیں میں دھکیل دیا۔ مجھے کہیں ملے تو مار مار کے ہتنی کا بھُس بھر دوں۔

ہم :- ہاں بیوی کہیں ہاتھ لگ جائے تو غیبانی کے پانچ چار ہماری طرف سے بھی لگانا۔ ہمارے گھر والوں کو بھی اُس نے ایسی ہی بے سر و پا باتوں سے اُلّو بنایا تھا۔ اماں مرحومہ کو صبح شام تمہارے متعلق بے معنی قصیدے سنایا کرتی تھی۔

"بیگم صاحبہ! لڑکی کی بابت کیا بتاؤں، بس دیکھنے کی چیز ہے۔ رشکِ نظر، چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے۔ بات کرتی ہے تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ ناگوری بیل کی سی بڑی بڑی کٹورا سی آنکھیں، اونچی ستواں ناک، کشادہ پیشانی، سڈول جسم، سنہری رنگ پر لمبے لمبے کالے بال، دھوپ چھاؤں کو شرماتے ہیں۔ سمجھ دار ایسی کہ بڑے بڑوں کو عقل بتائے۔ مبارک قدم اتنی کہ اُس کے دم قدم کے ساتھ لکشمی دیوی چھم چھم کرتی آئے گی۔" ہماری اماں بے چاری اُس چھپل پیری کے ہتھکنڈوں میں آ گئیں۔ بے پوچھے گچھے جھٹ پیام جڑ دیا۔ اُدھر سُنا ہے، تمہارا پیا کہیں سے نہیں رہا تھا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ تمہارے میکے والوں نے فوراً منظور کر لیا۔ اور اس طرح ہماری ماں کی سادگی اور تمہاری دادی کی پُرکاری سے ہماری تمہاری شادی کا حادثہ ظہور میں آیا۔ ورنہ کہاں تم کہاں ہم ؟ کہاں گنگو تیلن کہاں راجہ بھوج !

بیوی :- گنگو تیلن تمہاری کوئی آئی لگائی ہو گی۔ مجھے اُس سے پھر کبھی تشبیہ دی تو اپنا سر پیٹ لوں گی۔ لقوہ مارے اس زبان کو۔ ہٹّی کیسی قینچی کی طرح چلے جا رہی ہے۔ اچھا اب بھی کیا بگڑا ہے۔ سوا لاکھ روپے کا انتظام کر دو۔ آج چلی جاؤں گی۔ خدا رکھے میرے ماں باپ کے یہاں میرے لئے کسی چیز کی کمی نہیں۔

ہم :- سوا لاکھ دس نہ بیس۔ اکٹھے سوا لاکھ۔ چل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو۔

بیوی :- کیسا میرے مہر نہیں دو گے۔ کہہ دو نہیں بندھے تھے۔ سوا لاکھ کے مہر ؟ میاں یہ آئی بلا تو سوا لاکھ لئے بغیر نہیں ٹلے گی۔ اِسی طرح کلیجہ

چاٹتی رہے گی

ہم :۔ کلیمہ مرحوم ہے کہاں جو چاٹے گی۔ اُسے تو چاٹ اچار کے یہ ختم بھی کر چکی۔ باقی مہر وہر، وہ تم معاف کر چکی ہو۔ اب اگر تم مکر بھی جاؤ، تو ہمارے پاس تو سوا لاکھ پیسے بھی نہیں۔

بیوی :۔ میں نے ہرگز معاف نہیں کئے۔ کیوں معاف کروں۔ یتیم ہو۔ فقیر ہو، اپاہج ہو، کون ہو؟ مہر تمہیں دینے پڑیں گے میاں! انہیں تو یاد رکھنا خان جاہ بیگم کی بھتیجی ہوں۔ وہ الہ آباد تک مقدمہ لڑیں تھیں اور جائیداد چھوڑی تھی نیلام پر۔

ہم :۔ ہمارے پاس کیا دھرا ہے جسے نیلام پر چڑھوا دو گی۔ دو چار جوڑی کپڑے۔ تھوڑا سا سامان۔ کرنال شاپ کا سستا سا جوتا۔ دو ہزار کا قرضہ اور ایک کرایہ کا مکان ہے۔ یہ تمام مقدمے کئے بغیر ہی ہم سے لے سکتی ہو۔ رہا لال پھاٹک۔ اس کا بھی ہمیں خوف نہیں۔ مقروض قیدی کو کوئی مشقت نہیں دی جاتی۔ وہاں فرصت میں خوب غزلیں لکھا کریں گے۔

بیوی :۔ دُنیا میں تم سے وصول ہوئے۔ تو قیامت میں تمہارا گریبان ہوگا اور میرا ہاتھ۔ کھینچے کھینچے پھروں گی۔

ہم :۔ ابھی قیامت جب آئے گی دیکھا جائے گا۔

بیوی :۔ کیوں مرنا نہیں تمہیں؟

ہم :۔ نا۔ مرنا کون سا ایسا ضروری کام ہے۔ کہ کسی کا جی چاہے، رہا ہے، یہ کام ضرور کرے۔

بیوی :۔ تم یونہی زبان چلاؤ گے۔ میرا مہر نہیں دو گے؟

ہم :۔ کہاں سے دیں تمہارا مہر؟

بیوی :۔ اپنے گردے میں سے دو۔ اور کہاں سے دو؟

ہم :۔ ہمارے گردے میں کیا رکھا ہے۔ تم اپریشن کرا کر دیکھ لو۔ روپیہ تو روپیہ جو تمہاری قسمت کی پتھری نکل آئے۔ تو ہم جھوٹے۔

بیوی :۔ اپنی جان بیچ کر دو۔ کہیں سے دو۔

ہم :۔ ہماری جان کی تو موت بھی گاہک نہیں۔ تمہیں چاہیئے تو مہروں کے بدلے میں لے سکتی ہو۔

بیوی :۔ ظالموں کے حصے کی موت بھی تو مٹ گئی۔

ہم :۔ ہاں دیکھ لو۔ تم مرتی ہو، نہ تمہاری دادی۔

بیوی :۔ میں تمہیں مار کر مروں گی۔

ہم :۔ تم ہمیں مار کر بھی جیتی رہو گی۔ ظالموں کی رسی بڑی دراز ہوتی ہے۔

بیوی :۔ ہاں ہاں تمہیں مار کر بھی جیوں گی۔ برابر جیئے جاؤں گی۔ جم جم جیوں گی۔ میں کیوں مر جاؤں۔ میرے بدلے وہ مر جائیں جو میرے مرنے کے دن رات خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ میری جوتی بھی نہیں مرے گی۔ اسی طرح چھاتی پر مونگ دلتی رہوں گی۔ رہے میرے مہر وہ الٰہی مور مجھے ملیں گے جنہوں نے نگلے وصول لوں گی۔ خاطر جمع رکھو میرے مہر مُردے کا مال نہیں کہ جس کا جی چاہا دبا لیا۔

ہم :۔ مگر لو گی کس سے مہر؟

بیوی :۔ اُس سے لوں گی جس کے ہاتھ میں پنچوں نے میرا ہاتھ دیا تھا

ہم :۔ وہ کون نیک بخت تھا؟ ہم بھی تو سنیں اُس کا نام۔ ع

"کس گراں بار کو اٹھی تھی قیامت لے کر"

بیوی :۔ نیک بخت تھا یا بدبخت یہ تو وہ جانے۔ تم بھی سُن لوگے، وہ کون تھا۔ گھبراؤ مت۔ جب گھر پہ قرقی آئے گی۔ گھر بار نیلام پر چڑھے گا۔ نیلامی کا ڈھنڈورہ پٹے گا۔ گلی گلی نام پکارا جائے گا۔ اس وقت تمہیں سب سے پہلے معلوم ہو جائے گا کہ مہر کس نیک بخت سے وصولے جا رہے ہیں ؟ اور مہر دینے والے کا کیا نام ہے ؟ اس وقت یہ شاعری وعری سب بھول جاؤ گے۔ میں خدا نہ کرے کوئی آئی گئی نہیں۔ خاندان کی بیٹی ہوں خدا رہتی دنیا تک میرے خاندان کو رکھے۔ میرے خاندان کی کسی بیٹی کا مہر آج تک نہیں مارا گیا۔ بڑے بڑے تیس مار خاں نہیں دبا سکے تم تو بیچارے حیثیت ہی کیا رکھتے ہو۔ بقول شخصے نٹ دھڑنگ، مست قلندر، تمہاری کیا بھسری ہے، جو میرے مہر ہضم کروگے۔ عدالت آخر عدالت ہے۔ کوئی مشاعرے کی محفل نہیں، وہاں قانون چلتا ہے۔ شاعری نہیں چلا کرتی۔ وہاں جناب کی "مطلع عرض ہے"[1] کوئی نہیں سُنے گا۔ میرے مہر تم ہضم نہیں کر سکتے۔ تمہارے پیٹ سے بھی رکھوا لوں گی۔

ہم :۔ ہمارے پیر تو دس سال گذرے اللہ کو پیارے ہو چکے۔ آن کی قبر پر سمن کی تعمیل کراتی پھرنا۔ رہے ہم۔ تم جانتی ہو ہمارے پاس دو چار کپڑے، الول جلول کا سستا سا جوتا، نسوار کی ڈبیہ، ڈربی کی لاٹری کا ٹکٹ۔ قرض خواہوں کی دو چار ڈگریاں اور کرایہ کا مکان ہے۔ یہ سب کچھ سامان تم بغیر مقدمے کے بھی لے سکتی ہو۔

بیوی :۔ تنخواہ مٹی کا نام نہ لیا۔ کہ سے بھول ہی گئے ؟

ہم :۔ جب تم جا رہی ہو تو نوکری کر کے کیا کریں گے۔ کمبخت پرائی تابعداری، یہ سب جھنجٹ تو تمہارے کارن کر رہے تھے۔ ادھر تمہارا تانگہ اسٹیشن سدھارے گا، ادھر ہمارا استعفٰی دفتر روانہ ہو جائے گا۔

بیوی :۔ اور یہ کتر پلے کیا زہر مار کریں گے ؟

ہم :۔ ہم تو ان پلوٹونوں کے خریدار بنتے نہیں۔ اس کباڑ کو بھی ساتھ لیتی جانا۔ ان کی آٹھ پہر کی ہاہاکار سے ہم پہلے ہی سے اُکتائے ہوئے ہیں۔

بیوی :۔ کیوں میں جہیز میں انہیں ساتھ لائی تھی ؟

ہم :۔ ہم بھی چڑھاوے کے ساتھ انہیں نہیں لے گئے تھے۔

بیوی :۔ بس اپنی علّت کو سنبھالو۔ میں میکے سے تنہا آئی تھی، تنہا ہی جاؤں گی۔ اللہ رکھے میرے باپ کے ہاں میرے لئے سب کچھ ہے۔

ہم :۔ یہ علّت ہے یا بیماری، جو کچھ بھی ہے، آخر تمہارے قدموں ہی کا صدقہ ہے۔ ہم تو جب کنوارے تھے، چھڑے چھٹانک تھے چھڑے چھٹانک ہی رہنا چاہتے ہیں۔ اللہ رکھے تمہارے باپ کے ہاں سب کچھ ہے، جہاں بیٹی کو پالیں گے، نواسی، نواسوں کو بھی کانہ دیکھ سکیں گے۔

بیوی :۔ واہ کیا کہنے، تری مری آخر میں کیوں سمیٹنے لگی تھی۔ اس گھر میں بیاہ ہوتے ہی کیسی منحوس گھڑی آئی تھی، ساری جوانی غارت کر دی۔ میرا گلاب کا سا رنگ ملتے توے سے بدل گیا۔

ہم :۔ ہمارے لئے بھی تمہارا آنا کچھ راس نہیں آیا۔ تمہارے تشریف لانے سے پہلے ہم بھی جوان رعنا تھے، جس طرف کو نکل جاتے تھے، وہ گلیاں بج جاتی تھیں، محفل کا سنگھار سمجھے جاتے تھے، جوانی پھٹی پڑتی تھی۔ کبھی لوگ ہماری تصویریں لیا کرتے تھے۔ رستہ چلتے ہمیں گھڑی بھر دیکھنے کو کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہی ہم ہیں، اب ہمیں کوئی دیکھے تاک پکڑے سے دم نکلتا ہے۔ آٹھویں دن ڈاکٹر یوسف انجکشن کی شیشی لئے دکھائی دیتے ہیں۔ ۲۹ تاریخ کی عید کا چاند سب سے پہلے ہم دیکھا کرتے تھے، اب عینک میں بھی ایک ایک حرف کے چار چار نظر آتے ہیں۔ دو قدم چلتے ہیں تو دم پھول جاتا ہے۔ اپنی اور تمہاری زندگی کا تیجہ بن کر رہ گئے ہیں۔ تمہارے قدموں کی برکت سے خود ہماری جوانی خاک میں مل گئی۔ ہم کس سے شکایت کریں۔

---

[1] بلی کے بچے۔

بیوی: میرے قدم میرے قدم تو ایسے ہیں کہ ہر پل سے دو سو روپے پا رہے ہو۔ جانی اپنی کرتوتوں سے خاک میں ملائی ہوگی۔ میں اس فق ذرق بق بق کو سننا نہیں چاہتی، ریل کا وقت آرہا ہے، میرے مہر والا رسید میرے ہاتھ سے۔

ہم: کہہ تو دیا کہ ہم تمہاری دعا سے دو ہزار کے قرضدار ہیں۔ اپنے ساتھ ہمیں بھی لے چلو۔ قرضداروں اور ڈگریوں سے تو پیچھا چھوٹے گا۔

بیوی: تمہارا کیا اچار ڈالوں گی لے جا کر؟

ہم: بدمزہ تو نہیں ہوگا۔

بیوی: میں کوئی خدا نہ کرے، آدم خور ہوں۔

ہم: ہمیں تم آدمی کب سے سمجھنے لگیں بیوی!

بیوی: چلو کیسی بیوی، کس کی بیوی، ہوگی کوئی چڑیل تمہاری بیوی، نشے، بیوی بیوی مت کہا کرو۔

ہم: کیوں تم سے ہمارا نکاح نہیں ہوا تھا۔ اور بیوی نہیں ہو تو مہر کاہے کے مانگتی ہو، ہم اب تک اسی دھوکے میں رہے کہ جس سے ہمارا نکاح ہوا تھا وہ عورت ہے۔ آج تمہاری زبانی سنتے ہیں کہ وہ چڑیل ہے۔

بیوی: مہر مہر تو تم سے ایسے رکھوالوں گی۔ جیسے آج کا دن نہیں پہنچواؤں گی لال پھاٹک میں، چکی پیستے پیستے ہاتھوں میں گھٹے پڑ جائیں گے، میاں ہو کس ہوا میں، بڑے علامہ ظریف بنے پھرتے ہو، سب علامگی ملائگی بھول جاؤ گے۔

ہم: یہ پنجاب ہے پنجاب بیگم! اتحادی پارٹی کی حکومت ہو رہی ہے۔ قرضہ نہ دے سکنا یہاں جرم نہیں، نہ مقروض کو لال پھاٹک دیکھنے اور چکی پیسنے کا خطرہ، ہم اپنی علامگی بھولیں یا نہ بھولیں۔ کسی طرح تم ہمیں بھول جاؤ۔

بیوی: میں تو مقدمہ دلی میں کروں گی، پنجاب سے مجھے کیا واسطہ، وہاں تو اتحادی حکومت نہیں۔

ہم: کسی پڑھے لکھے کے سامنے یہ مت کہہ بیٹھنا، تمہیں یہ بھی خبر نہیں کہ دلی پنجاب میں داخل ہے۔ وہاں کی عدالتیں پنجاب ہائی کورٹ کے ماتحت ہیں۔

بیوی: خدا نہ کرے دلی پنجاب میں داخل ہو۔ وہاں شاہ جارج پنجم کی حکومت ہے، دلی پرانی راجدھانی ہے۔ میں ان جھکموں میں نہیں آؤں گی۔

ہم: یک نہ شد دو شد، شاہ جارج پنجم کو فوت ہوئے مدت ہو گئی، ان کے بعد یکے بعد دیگرے دو بادشاہ گدی پر بیٹھ چکے ہیں، جارج پنجم کی حکومت تو شاید اب دوسری دنیا میں قائم ہوئی ہوگی۔ بس پھر وہیں مقدمہ دائر کر دینا، مگر اس کے لئے تمہیں یہ چولا بدلنا پڑے گا۔ کیونکہ ان کی حکومت کی سرحد قبر سے آگے شروع ہوتی ہے۔

بیوی: مرنے سے پہلے زندگی میں کنوئیں جھکاؤں گی۔ پھر مروں گی، اور حشر میں میرا ہاتھ ہوگا اور تمہارا گریبان، جب تک جہنم رسید نہ کرا دوں گی، دم نہ لوں گی۔

ہم: کنوئیں تو جتنے کہو ہم جھانکنے کو تیار ہیں۔ باقی حشر میں گریبان گیری کی دھمکی بھی بیکار ہے، ہم وہاں کوئی قمیص پہن کر تھوڑا ہی جائیں گے۔ نہ گریبان ہوگا، نہ تمہارے ہاتھ کو زحمت کرنی پڑے گی۔

بیوی: قیامت میں میرے مہر نہ دے سکو گے تو تمہاری ساری نیکیاں گن گن کر رکھوالوں گی۔

ہم: اطمینان رکھو، یہ مطالبہ بھی تمہارا بیکار ہی جائے گا۔ تمہاری دعا سے ہم نے اپنی یاد میں کوئی نیکی ہی نہیں کی، ہاں اگر ہمارے گناہ لے کر تمہارا مہر اتر جائے تو یہ جنس ہمارے پاس افراط سے ہے۔ گنتے گنتے تھک جاؤ گی اور پھر بھی گناہ ختم ہونے میں نہیں آئیں گے۔

بیوی: مجھے کیا چولھے میں ڈالنے ہیں تمہارے گناہ۔ تمہیں کہ اللہ دوزخ نصیب کرے، نیکی سے کورے نکلے تو اپنے سارے گناہ تمہارے منہ پر دے ماروں گی، میرے حصے کی بھی سزا بھگتنی پڑے گی۔ دوزخ سے کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا۔

ہم :۔ اور تم کہاں جاؤ گی ؟

بیوی :۔ کہاں جاتی۔ جنت میں جاؤں گی۔

ہم :۔ جنت میں ہمارے بغیر کیسے رہو گی۔ تمہارا دل اکیلے پن سے نہیں گھبرائے گا ؟

بیوی :۔ اکیلی کیوں رہنے لگی تھی۔ ہر جنتی کو خدمت کے لئے ستر حوریں ملیں گی۔ میں بھی حوروں کے جھرمٹ میں رہا کروں گی "ہمارے بغیر" کیا خوب ! جو دیے بڑے چہیتے کہ تمہارے بغیر جنت میں جی گھبرائے گا !

ہم :۔ بھلا حوریں تمہارے کس مصرف میں آئیں گی۔ اپنی جنس کے ساتھ چار دن بھی نہ کاٹ سکو گی۔ دیکھ لینا پھر ہمیں کو یاد کرو گی۔ ہم اچھے ہیں یا برے آخر تمہارے دکھ درد کے ساتھی ہیں۔ ہمارے بغیر تو جنت میں گھڑی بھر بھی تمہیں رہنا دوبھر ہو جائے گا۔

بیوی :۔ حوریں میری خدمت کریں گی۔ اپنی جنس کے ساتھ رہنے سہنے سے کوئی کیوں اکتانے لگا ہے۔

"کند ہم جنس با ہم جنس پرواز"

کیوں نہیں، تمہارے بغیر ضرور جنت میں رہنا دوبھر ہو جائے گا۔ تمہارے ساتھ رہ کر دنیا میں بڑا مزہ اٹھایا ہے جو جنت میں اٹھاؤں گی میری دنیا کو تو جہنم بنا دیا۔ تمہیں ساتھ رکھ کر کیا اپنی عقبیٰ بھی خراب کروں گی۔ تمہارا ساتھ تو جنت کو بھی جہنم بنا دے گا۔ نوج میں جنت میں تمہارے ساتھ رہوں۔

ہم :۔ اچھا پھر ہم تو دوزخ میں کسی شریف سی دوزخن سے دو بول پڑھا لیں گے تم کیا کرو گی۔ وہاں تو نیلی تہمد اور لمبی داڑھی والے مسجدوں کے اماموں سے واسطہ پڑے گا۔ اور سنتے ہیں کہ جنتی خواتین کا نکاح جنتی مردوں سے ہو جائے گا۔ یقیناً تم بھی ضرور کسی ملا کے حوالے کر دی جاؤ گی بلکہ ہمیں تو محلے کی مسجد کے امام سے خطرہ ہے، یہ کمبخت کہیں وہاں تم پر حق شفعہ نہ جتانے لگے۔

بیوی :۔ اس سے کسی اپنی قلماقنی کا نکاح پڑھوا دینا۔ تمہارے خاندان میں درجنوں ملانیاں بھری پڑی ہیں۔ مراتی ملا نے اپنی ذات برادری کو چھوڑ کر مجھ پر حق شفعہ کیوں جتانے لگے۔ میری طرف تو کسی نے آنکھ بھر کر بھی دیکھا تو آنکھیں نکلوا دوں گی

ہم :۔ عورت مرد دونوں سے مل کر زندگی کی تکمیل ہوا کرتی ہے۔ تم نے مرد کے بغیر نیم زندگی گزاری تو جنت سے تو تمہاری دنیا ہی بہتر رہی نہیں بیوی! بھلا کوئی بات ہے۔ جنت میں "کنوار کوٹھلہ" کو تمہارے لئے بننے سے رہا۔ یہی ہو گا کہ شادی کی لاٹری میں کوئی مردہ شوملا تمہارے نام بھی نکل آئے گا۔ آخر ملے جب دنیا میں دو دو تین تین ملانیوں کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ تو جنت میں تو تم جانو ملوں کو سوراج مل جائے گا۔ اپنے راج پاٹ میں یہ ایک وقت نورہ نہیں سکتے۔ وہاں منہ چھٹ کمانے کو ملے گا۔ رنگ برنگے مرغن کھانے کھا کھا کر ملانے کوئی رنگ لائے بغیر تھوڑا ہی رہیں گے ہر ملے کے ہاں جنت میں آٹھویں دن دیسے کی دیگ چڑھی نظر آئے گی

بیوی :۔ ہاں ہاں کہہ تو دیا۔ تمہاری برادری کی ملانیاں جنت میں ملوں کے گھر بسائیں گی، وہی کہاوت "جیسی روح ویسے فرشتے" خبردار جو تم نے میرا نام ملوں مراتیوں کے ساتھ پھر لیا۔ وہ وہ سناؤں گی کہ دھلی نہ چھٹیں گی۔ تمہارے نام کی غیرت بھی دنیا سے ناپید ہو گئی۔ کون سا ایسا مردوا ہو گا جو اپنی جورو کے نکاح غیر مردوں سے کراتا پھرے "یا بے غیرتی تیرا ہی آسرا ہے"

ہم :۔ جب دنیا ہی میں ہماری بیوی بننے سے انکاری ہو جب کہ ہمارے تمہارے نکاح کا قاضی حواس خمسہ کے ساتھ زندہ ہے۔ نکاح کے گواہ اور رایت کے براتی بچا پارسے فی صدی جی رہے ہیں۔ تو قیامت میں جہاں نفسی نفسی پڑی ہو گی۔ وہاں تم سے کیا امید ہو سکتی ہے کہ ہمیں اپنا شوہر تسلیم کرو گی۔ پھر جب ہم تمہارے شوہر تمہارے قول کے مطابق دنیا ہی میں نہیں ہیں۔ تو ہمارے لئے تم دنیا کی کروڑوں عورتوں کی طرح صرف ایک عورت موجود ہے ہمارا کوئی رشتہ نہیں۔ تو تمہیں بتاؤ کسی ملا مولوی سے تمہارے نکاح کا ذکر ہمارے لئے بے غیرتی کیسے بن گیا ؟

علاوہ مذہبی نقطۂ نظر سے بھی تم ہماری بیوی جبھی تک ہو جب تک ہمارا تمہارا ساتھ ہے۔ وہ بھی اسی صورت میں کہ دونوں کی زندگی میں کوئی حادثۂ خلع واقع نہ ہو۔ مختصر یہ کہ زیادہ سے زیادہ قبر کے حدود تک ہم تم میاں بیوی ہیں۔ اس کے بعد تم کون اور ہم کون۔ دوسری دنیا میں جنتی ہو گئے تو فریقین کی رضامندی پر پھر تجدید نکاح ہو سکتی ہے۔ ورنہ اپنی اپنی راہ اور اپنی اپنی منزل۔ ایک بات تو طے شدہ ہے کہ جنت ہو یا دوزخ۔ کنواروں اور رنڈووں کے لئے وہاں گنجائش نہیں۔ تمام مجرد ٹکٹ مرکب بنائے جائیں گے پھر جب ہم سے تم بیزار ہو اور دوسری دنیا میں اس تجربے کو دوہرانا پسند نہیں کرتیں تو ظاہر ہے کہ وہاں کسی جنتی کی قسمت ضرور پھوٹے گی اور ہمیں بھی دوزخ میں سہرا باندھنا ہی پڑے گا اور یہ بھی تم جانتی ہو کہ زیادہ نمازیں پڑھنے والے جنت میں جائیں گے۔ مسجدوں کے موذن، امام، میاں جی، مولوی ملانے یہی کلاس بس جنت کی مالک بنے گی۔ کوئی اونچے خاندان کا عیش پرست پٹھان یا مغل تو وہاں جانے سے رہا۔ ہماری مسجد کا اندھا امام آٹھ پہر وضو بے وضو نمازیں پڑھتا رہتا ہے۔ کوئی رات جب ذکر جہری کرنے لگتا ہے تو شہر بھر کے ڈربا نشینوں میں اذان کا کمپٹیشن شروع ہو جاتا ہے وہی وقت میٹھی نیند کا ہوتا ہے مگر بلند بانگ حریفوں کی ٹکٹکوں کون، کیا مجال جو کسی کو نیند کی اجازت دے۔ تو حافظ جیونا کی یہ بہشت پہری حور حق جنہیں دے اسے ستر حوروں کا آقا اور سیاہ ملانیوں کا میاں بنا کے چھوڑے گی۔ کیا عجب ہے کہ تمہاری جمعرات کی دودھ کی کھیر اسے یاد آ جائیں اور ہل جزاء الاحسان الا الاحسان" کے قرآنی حکم کی تعمیل کرتے ہوئے حق نمک اور حق شفعہ کا دعویٰ کر بیٹھے۔ اس میں بُرا ماننے کی کون سی بات ہے۔ جنت میں جا کر تو اس کے دونوں پٹ کھل جائیں گے۔ چیچک کے داغ نہیں۔ کہ نہ آبنوسی رنگ۔ چودھویں رات کے چاند کو شرمانے لگے گا۔ تمہیں انکار کرنے کی گنجائش کب رہے گی۔

ی: تمہارے کنبے کی بہت سی نمازی بڑھیاں بھی تو جنت میں جائیں گی۔ دنیا میں اپنے ملنٹوں کی آٹھ پہری مار دھاڑ سے وہ مجھ سے زیادہ اپنے شوہر کی صورت سے بیزار ہو گئی ہیں۔ اُن کے گھٹے تو تمہارے ساتھ جہنم رسید ہو جائیں گے۔ اُن کا رنڈاپا انہی نیلی تہمد اور لمبی داڑھی والوں کی مہربانی سے سہاگ میں تبدیل ہوگا۔ یقیناً جنت میں مسجد کے اماموں تکیے کے مجاوروں اور مکتب کے میاں جیوؤں کی تقدیر انہی سے پھوٹے گی۔ یہ لوگ اُن کا حق نمک بھی ادا کریں گے اور حق شفعہ بھی اُن پر جتائیں گے۔

مراتی ملانے میرے کیا لگتے ہیں، وہ جنت میں جا کر آفتاب بن کر چمکیں یا مہتاب کی صورت دمکیں۔ تمہارے وہ چاند ستارے تمہاری مرحومہ بڑھیوں کی اندھیری تنہائیوں کو روشن کریں گے۔ مجھ سے ملنٹوں کا کیا واسطہ؟

بس اب چھیا کو بند کرو یوں ہی میرے منہ سے کوئی اچھی بُری نکل جائے گی۔

: ملنٹوں سے اتنی نفرت تھی تو ہمارے خاندان میں زحمت جلوہ کیوں گوارا کرلی۔ کسی ڈھے منڈے زنانہ صورت بابو کا گھر بسایا ہوتا۔ ملا برادری ہوتی تو تمہیں قبولتا کون؟ دعا دو ہمیں اور ہماری برادری کو آج اَن پڑھ ہونے کے باوجود ایک علامہ کی بیوی بنی بیٹھی ہو۔ ورنہ دانتوں کی طرح چونڈا بھی سپید ہو جاتا اور کنوار کوٹھے سے نکلنا نصیب نہ ہوتا۔ تم جانو جوانی اندھی بھی ہوتی ہے اور دیوانی بھی۔ ماں باپ اونچی دیواریں گدھا دیتی ہے۔ ہم تم سے شادی کرنے کا ایثار نہ کرتے تو آج جانے کہاں کہاں تم حل کھانی بیر بیٹھتی پھرتی ہوتیں۔ وہ تو تمہاری قسمت سے خدا نے اپنی بے کس مخلوق کے لئے ہمارے دل میں جذبۂ رحم اس قدر کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے کہ بقول شاعر ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

کسی کے دکھ درد کو ہم دیکھ ہی نہیں سکتے۔ تمہاری بے بسی اور بے کسی کا حال ہمیں کل کیا ہے جیسے ہی معلوم ہوا ہم تڑپ اٹھے اور سب امیدواروں کی منتظر امیدوں کو خاک میں ملا کر تمہارے متعلق سفارش منظور کرلی۔

بیوی: بس کچھ نہیں کہتی۔ اس ہاتھ بھر کی لمبی دراز چھپا سے خدا ہی سمجھے، منی جھوٹ کے طوفان اٹھائے چلی جاتی ہے۔ ذرا نہیں جھجکتی، خدا کرے کالا ڈنہ نکلے۔ جھوٹ بول بول کے چہرے کا نور سب اُڑ چکا ہے، آئینے میں ذرا منہ دیکھو، کیسی پھٹکار سی برستی ہے۔

اِس تو تو میں میں نے بڑھتے بڑھتے تُرشی سے تلخی اختیار کی۔ آوازوں کی موسیقی گونج میں تبدیل ہونے لگی۔ زبانوں کو کمک پہنچانے کے لئے ہاتھوں میں قوتِ ارادی نے جوش مارا اور قریب تھا کہ انسانی تہذیب رجعت قہقری کر کے اپنے آغاز پر پہنچ جائے کہ حریفِ ہوشمند نے دست بدست تبادلۂ خیالات میں اپنے آپ کو کمزور پا کر اچانک پینترا بدلا اور آخری وار کر دیا۔ یعنی رونا شروع کر دیا۔ آپ اگر بیوی والے ہیں، تو جانتے ہوں گے کہ بیوی جب اپنی غیرِ منطقی جنگ میں عاجز ہونے لگتی ہے۔ تو میدان جیتنے کے لئے آخری بار ایک فیصلہ کن کاری ضرب لگاتی ہے۔ اُس کا بے پناہ ہتھیار اُس کا آنسو ہے۔ عورت کے آنسو سے تیز تر کوئی ہتھیار کبھی کسی میدانِ جنگ میں نہیں لایا گیا۔

ہمارے پاس اس وار کو روکنے کے لئے کوئی ڈھال نہ تھی۔ پہلے تو جی میں آیا کہ ہم بھی رونا شروع کر دیں۔ مگر غرورِ صنفی نے اجازت نہ دی۔ دفتر کی حاضری کی آڑ پکڑ کر پسپا ہو گئے

سارے دن دوستوں میں گھوم پھر کر شام کو گھر میں گھسے تو ہمارے کشمیری نوکر نے جو اردو کو صحیح بولنا کشمیری زبان کی ہتک سمجھتا ہے گھر میں قدم رکھتے ہی یہ دردناک خوشخبری سنائی:-

"میاں تو کہاں گئی تھی۔ ہم تجھے ساری دہاڑی ڈھونڈتا رہا۔ بیگم صاحب آج لوٹ روتا رہا، کانا بھی نہیں کایا"

اِس خبر نے ہمیں اپنے مرکز سے ہلا دیا۔ آیۃ الکرسی پڑھتے ہوئے بیگم کے پاس پہنچے، وہ بظاہر سو رہی تھیں، مگر درحقیقت انہوں نے سونے میں جان ڈال رکھی تھی۔ ہم نے کہا۔ بیگم بیگم، یہ کیا وقت ہے سونے کا، سوتے چلی جاؤ گی؟

ہماری آواز سے وہ کسمسا کر اُٹھیں۔

بیوی: کیا ہے۔ کیوں مجھے تنگ کیا جا رہا ہے؟

ہم: تم نے کھانا کھا لیا؟

بیوی: تم کون پوچھنے والے؟

ہم: ہم کون، تمہارے پیارے شوہر

بیوی: صورت گم کرو اپنی، مجھ سے کلام مت کرو۔ کیوں رے فضلو، دلی کو گاڑی کس وقت جاتی ہے؟

ہم: کیوں خیر تو ہے۔ کہاں کا ارادہ ہے؟

بیوی: جہاں سینگ سمائیں گے، وہاں جائیں گے۔

ہم: سینگ تو یہاں بھی سما سکتے ہیں۔ اور نہ سما سکیں تو تھوڑے تھوڑے ترشوا لو۔

بیوی: جاؤ یہاں سے اپنا منہ کالا کرو، مجھے مت چھیڑو!

ہم: ہمارا منہ تمہاری دعا سے پہلے ہی کالا ہے۔ گورے منہ والے پسند کریں تو اپنا منہ کالا یا نیلا کر سکتے ہیں۔

بیوی: تم مجھے جینے کو چھوڑو گے یا نہیں؟

ہم: ہم نے تمہیں باندھ کب رکھا ہے جو جینے یا مرنے کے لئے تمہیں چھوڑیں۔

بیوی: تمہاری یہی حرکتیں رہیں تو میرے لئے جینا دوبھر ہو جائے گا۔ یہ ہر وقت کی چھیڑ خانی مجھے گور کے کنارے لگا کے رہے گی۔

ہم: تم مرنے کے لئے پیدا ہی نہیں ہوئیں، تمہارے بدلے تمہاری تین جوان بہنیں مر چکیں، تمہیں بھی مرنا ہوتا تو جوان ہی مر جاتیں، اب کیا

مروگی، مرنے کا وقت تو گذر چکا ہے۔

بیوی: تم میرا مرنا چاہ رہے ہو؟

ہم: شاید اسی لئے تم مرنے کا نام نہیں لیتیں۔ ہماری ضد میں جینے کی زحمت اٹھا رہی ہو۔

بیوی: میں تو سمجھے ہوئے ہوں، خوب جان چکی ہوں، تم مجھے گور کے گڑھے تک پہنچا کے رہو گے۔ جب تمہارا کلیجہ ٹھنڈا ہوگا، اچھا پھر یوں ہی سہی، مر کے بھی دکھائے دیتی ہوں۔ تم نے میری زندگی اجیرن بنا رکھی ہے، اس پر بھی تمہیں صبر نہیں تو لو یہ کھٹکا بھی مٹائے دیتی ہوں ع

"تم پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا"

ہم: ارے تم تو شاعری کا ذوق بھی رکھتی ہو۔ واہ بیوی! اب بتایا ہے، جب مرنے کا ارادہ کر رہی ہو۔ دو ایک گھنٹے میں مرحومہ بن جاؤ گی۔ پہلے سے معلوم ہوتا تو دونوں مل کے شاعری کیا کرتے۔ ایک اور ایک گیارہ بنتے، ہیں دونوں کی مشترکہ شاعری کا بیب دنیا نے شاعری کو جگمگا سکتا تھا

بیوی: تم اب آخری وقت مجھ سے کسی کا خون کراؤ گے۔ خدا کے لئے مجھے چین سے مرنے دو۔ اپنی کہیں صورت گم کرو۔ اس زبان کو لقوہ مارے۔ میٹھے چلی ہی جاتی ہے۔

ہم: اچھا تو جاتے ہیں۔ اپنی صورت گم کئے لیتے ہیں۔

بیوی: نہیں، باہر نہ چلے جانا، مجھے آخری بات کرنی ہے۔

ہم: کہو تو یہیں بیٹھے رہیں۔

بیوی: خدا کے واسطے صورت گم کرو اپنی۔ میں آپ بلا لوں گی۔

ہم: کسی پہلو راضی نہیں، عجب ضیق میں جان ہے۔

یہ کہہ کر ہم باہر بیٹھک میں جا بیٹھے۔ جانے کو چلے تو گئے مگر ہمارے دل و دماغ پر جو گزر رہی تھی وہ ہمیں جانتے ہیں۔ بیوی کی قوت ارادی کا ہمیں بار ہا تجربہ ہو چکا تھا، وہ بات کی پکی، حوصلے کی بلند اور ضد کی پوری ہیں۔ ان کی عادات و صفات پر جتنا غور کرتے تھے، دماغ چکر کھانے لگتا تھا، دل کلاک کے پنڈولم کی طرح ہل رہا تھا۔ اپنے مرتے تعلق سے ہم دور جا پڑے تھے، بار بار سوچتے تھے، اب کیا ہوگا؟ بیوی سے ہمیں محبت بھی ہے۔ یہ محبت اس وقت طوفانی صورت اختیار کر رہی تھی۔ ادھر سسرال والوں کے قانونی پروسیڈنگ، تماشا پسند پبلک کی ہنگامہ آرائی، خدائی فوجدار پولیس کی جبری آستاں گیری، بلیک میلر اخبارات کی جلی سرخیاں، یہ خطرات بھیانک مستقبل کے بھیس بدل بدل ہمیں لرزا رہے تھے، گھر میں بدقسمتی سے کوئی بڑی بوڑھی بھی نہ تھی، جو دونوں کو بزرگانہ انداز میں ڈانٹ ڈپٹ کر صلح کرا دیتی۔

انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھے کہ اندر سے ملازم نے آکر کہا:

"میاں، بیگم صاحب بلاتا ہے۔ ذرا جلدی چلیے گی۔"

ملازم کا یہ فقرہ کانوں پر گھن کی طرح بجا اور ہم سورۂ اخلاص پڑھتے ہوئے گھر میں پہنچے، بیوی لباس فاخرہ پہنے، نوک پنجے سے لیس ہماری منتظر تھیں۔ جیسے کمرے میں گھسے، انہوں نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ یہ وہ کٹھن گھڑی تھی کہ ہمارے دل کی غیر معمولی حرکت میں آواز پیدا ہو رہی تھی، کواڑ بند کرنے سے ہمیں ایک شبہ اور ایک خطرہ اور پیدا ہو گیا۔ شبہ تو یہ گزرا کہ کہیں اپنے ساتھ ہمیں بھی تو لاش میں تبدیل کرنا نہیں چاہتیں۔ دل کے وسوسے یقین بن کر ڈرانے لگے، ہمیں خواہ مخواہ محسوس ہونے لگا، کہ ان کے پاس وہ لامبا خنجر نما چاقو ہے۔ جو پچھلے سال ہم وزیر آباد سے خرید کر لائے تھے۔ اب کوئی دم جاتا ہے کہ یہ اپنی جگہ سے جست کر کے وہ سموچا خنجر ہمارے سینے میں اتار دیں گی اور اسی سے اپنی مشکل بھی آسان کریں گی۔ اپنے آپ کو ملامت کرنے لگے کہ یہ نامراد خنجر خریدنے کی بیہودگی کیوں کی تھی۔ ہائے کیا اسی لئے اس خوبصورت موت پر دو روپے صرف کئے تھے کہ

سب سے پہلے خریدار پر ہی اس کا وار ہوگا ۔

خطرہ یہ پیدا ہوا کہ اگر بیوی نے رحم کھا کر ہماری جان بخشی کر بھی دی تو اس کی خودکشی کی تحقیقات کے سلسلے میں یہ بدبخت نوکر پولیس کے ہتھے چڑھ کر عدالت میں پولیس کی بولی بولنے لگے گا ۔ اور عینی شاہد کی پوزیشن میں اپنی غلط سلط اردو سے ہماری نظم ہستی کو نثر بنوا کے چھوڑے گا ۔ عاشق خیالی نے فوراً ہمارے دماغ میں سیشن جج کی عدالت تعمیر کر دی ، جس میں سیہ پوش وکیلوں کی دردناک چہل پہل ، تماشائیوں کی آرجار ، لال پگڑیوں کی بھرمار ، ملزم بیڑی ، ہتھکڑی سے آراستہ ، پریس کے رپورٹروں کا ہجوم ۔ سیشن جج کے چہرے پر موت کا سا جلال ، سرکاری وکیل کے خوفناک دلائل ۔ اپنے وکیل کی بے بسی نوکر کی عینی شہادت کہ :

" ہاں حضور بیگم صاحب سے میاں ہر دہاڑی لڑتی تھی ۔ اُسے بیوی کو ہر روز سوٹے کے نال مارتی تھی ۔ بیوی ہر ویلے روتا تھا ۔ میاں گالی بھی نکالتی تھی اور لڑائی کے دہاڑے میاں کہتی تھی ۔ میں تمہاری جان نکالوں گے ۔ ہم سے کئی ویلے میاں بولی ۔ ہم تجھے انعام دے گی تو بیوی کے کھانے میں زہر ملا دے گی ۔ ہم انکار کیا ۔ میاں خفا ہوگئی ۔ بولی تجھے نکالوں گی ۔ ہم کہا بھاویں ہم نوکری چھوٹ جائے ۔ ام بیوی کو زہر نہیں کھلائے گی ۔ ایک دہاڑے ہم دیکھا میاں بیوی کی دوا میں وہی پوڑی جیب سے نکال کے ڈال دیا جو نسا ہمیں کھلانے کو دینے لگی تھی ۔ بیوی دوا پیا اُس کا طبیعت خراب ہوگیا بولا ہمارے پیٹ میں آگ اے ۔ ہم میاں کے خوف سے چپ رہی ۔ بیوی بے ہوش ہوگیا اور مر گیا "

موت اپنے جبڑے کھولے ہوئے ہماری نگاہ تصور پہ چیر گی طاری کر رہی تھی ۔ سنٹرل جیل ۔ پھانسی کی کوٹھری طوق و سلاسل پھانسی کی ریشمی رسی ۔ مجسٹریٹ کی نگرانی میں پولیس کی للکار کہ " چلو پڑھو خدا کو یاد کرو " ریشمی جھولے میں جان کنی کے ہچکولے ۔ زمین و آسمان کے درمیان اپنی معلق لاش اِس ڈرامے کا یہ دردناک پس منظر اُس وقت پیش منظر بن رہا تھا ۔

دل پہ یہ کچھ بیت رہی تھی مگر خدا کی مہربانی ، جرأت مردانہ اپنی نمائش میں ثابت قدم اور چہرے کا رنگ بحال تھا ۔ زبان دماغ کا ساتھ دیئے جا رہی تھی ۔ دل دماغ کی سراسیمگی سے مطلق متاثر نہ تھا ۔ دل و دماغ کی اسی کشمکش کے دوران میں بیگم صاحبہ فرمانے لگیں ۔

بیوی :- جانتے ہو میں نے تمہیں اِس وقت کیوں بلایا ہے ؟

ہم :- ہاں جانتے کیوں نہیں ، پچھلے ہفتے تم " چھوٹے میاں " کی رسم عقیقہ کی تقریب کا تذکرہ کر رہی تھیں ، اُسی سلسلے میں انتظام سے متعلق کوئی مشورہ کرنا چاہتی ہوگی ۔ ہمیں تم سے زیادہ فکر ہے ۔ ۱۲ من دہرہ دون کی باسمتی کے چاولوں کا آرڈر دے دیا گیا ہے ۔ ایک من خالص گھی کی فراہمی نتھو خاں ضلعدار کے ذمے لگا دی ہے ۔ شیرمال کے لئے دودھ وقت کے وقت حاجی حلوائی کے ہاں سے منگا لیا جائے گا ۔

بکروں کی قیمت علیا بکر قصاب کو دے دی گئی ہے ۔ دعوتی خطوط چھپوانے کا کام منشی اعجاز احمد نے اپنے ذمے لے لیا ہے ۔ کریم بخش نائی ہمارا خاندانی نائی ہے ۔ چھدو نائی پڑوسی ہے تو کیا کریم بخش ہمارے باپ کی حجامت بناتا رہا ۔ بچپن میں ہمارا سر مونڈتا تھا ۔ اب دوسرے تیسرے دن خط بناتا ہے ۔ تمہیں تو یاد نہ ہوگا ۔ ہمارے سامنے کی بات ہے جب تم بچی ہی تھیں ۔ تمہارا سر بھی وہی مونڈا کرتا تھا ۔ ایک دفعہ تمہارے گنج کی پھڑیا میں غلطی سے اُسترا لگ گیا تھا ۔ تو تمہارے ابا نے اُسے بہت ڈانٹا تھا ۔ بلکہ غصے میں ایک چپت بھی رسید کر دیا تھا ۔ وہ تو کہتا ہے اور سچ کہتا ہوگا سچا " ذی ہے ۔ کہتا تھا کہ میں نے تو بیگم صاحبہ یعنی آپ کی ساس کا بھی بچپن میں سر مونڈا ہے ۔ سو بیوی ہم کریم بخش کی خدمات کو نظرانداز نہیں کر سکتے بڑا مسخرہ ہے ۔ بوڑھا ہوگیا مگر کمبخت نے مسخرہ پن نہیں چھوڑا ۔ کہتا تھا میاں چھوٹی بیگم کی طرح ان کی والدہ صاحبہ کے سر میں بھی گنج کے داغ تھے اور اللہ بخشے میری ساس سنایا کرتی تھی کہ حضور کی نانیا ساس " گنجی زہرہ " کے نام سے مشہور تھیں ۔ جب آپ کی سسرال میں کئی پیڑیوں سے گنج خاندانی نشان کی طرح چلا آتا ہے ۔

بیوی :- صبح کی چائے میں باورچی نے بھنگ کے پتے تو نہیں ڈال دیئے تھے ؟ خیریت تو ہے ۔ یہ دیوانہ پن دماغ پہ کیوں سوار ہے ؟ کس کا عقیقہ ہو جائے ؟

جاؤ تم اور چھوٹے میاں "گوتو" کیا ہوں۔ مجھے اس وقت عقیقے کی تڑپ ہو رہی ہے؟ اور اس مراقی کریم بیٹے کا دماغ تو فیس چل گیا؛ اتنی جوتیاں لگواؤں کی کہ بھیل سارا پلپلا ہو جائے گا۔ تم گنجے ہو گئے یا یہ سوا دو دمڑی کا کمین۔ مجھ سے اور میرے خاندان سے ستر پیڑھی دور، قبیح کرتی ہمارے ہاں گنجا ہوا ہو۔ ہاں تمہارے خاندان میں گنجے، کھترے، ٹوٹے لنگڑے، کانے، کلکی سب قسم کے نمونے دکھائی دیتے ہیں۔

عقیقہ میرے مرے پیچھے تم کرتے رہنا۔ مجھ نصیبوں جلی کو چھوٹے میاں کی یہ بہار دیکھنی نصیب نہ ہوگی۔ میں نے تمہیں اس وقت اس لئے بلایا ہے کہ میں جینے سے تنگ آ چکی ہوں۔ تمہارے آئے دن کے ظلم و ستم سہتے سہتے میرا کلیجہ چھلنی ہو گیا اب میں۔ سنا تم نے؟

ہم:۔ ہاں سنا۔۔۔ ہم نے۔ اب تم حج کو جانا چاہتی ہو؛ بڑا مبارک خیال ہے۔ ہمیں بھی ساتھ لے چلنا۔ حاجی حجن کی جوڑی خوب رہے گی۔ تمہاری زندگی باقی رہی تو خیریت سے دونوں واپس آ جائیں گے اور اگر خدا نے تمہارے آئے دن کی دعاؤں کو پذیرا کر لیا تو تمہیں "جنت البقیع" کے سپرد کر کے ہم اکیلے ہی واپس آئیں گے۔

بیوی:۔ میری بات نہیں سنو گے؟ شرارتیں کئے ہی جاؤ گے آخر میرے ستانے میں تمہیں کیا مزہ آتا ہے؟

ارے میں کہہ رہی ہوں کہ میرا ارادہ خودکشی کرنے کا ہے۔

ہم:۔ کیا کہا خودکشی؟

بیوی:۔ ہاں ہاں خودکشی۔ بہرے بھنڈ! خودکشی۔ اب بھی سنا کہ نہیں؟

ہم:۔ زندگی بھر میں سب سے زیادہ کام کی بات تمہارے منہ سے آج سنی ہے۔ ہمارے بھی کان کھل گئے۔ خودکشی یعنی اپنی جان پر کھیل جانا کتنا پاکیزہ خیال ہے!! خدا راس لائے۔ آمین۔

واقعی یہ دنیا رہنے کے قابل بھی نہیں۔ خدا رسیدہ لوگ اس نمائشی جلوے سے منہ پھیرتے ہی دیکھے گئے۔ مہاتما بدھ نے فانی دنیا کا عبرتناک انجام دیکھ کر اپنا راج پاٹ چھوڑ کر نروان حاصل کر لیا تھا۔ مہاتما بدھ کا نروان کا نظریہ بالکل درست ہے۔ انسان کی دائمی نجات نروان کے بغیر ناممکن ہے نروان کا سب سے سیدھا اور مختصر راستہ خودکشی ہے۔ بات بڑے ٹھکانے کی کہی ہے تم نے۔ ماشاءاللہ۔ تمہاری ذہانت کی قسم کھانی چاہیئے! مہاتما بدھ برسوں غور و فکر کے بعد جس روشن فیصلے پر پہنچے تم نے بیک نظر اس منزل کو دیکھ لیا۔ بڑی پہنچی ہوئی بزرگ ہو۔ سچ کہا ہے کسی نے

"سو سیانے ایک مت"

ماہرِ نظر لوگوں کے خیالات کی ہم رنگی کیسی حیرت خیز ہوتی ہے۔

بیوی:۔ میں تم سے اس وقت مہاتما بدھ کے نروان پر کوئی لیکچر نہیں سننا چاہتی۔ اس دخل در معقولات کو ختم کرو۔ ہر بات میں ٹانگ نہ اڑایا کرو! ہاں تو سن لیا تم نے؟ میں خودکشی کا ارادہ کر چکی ہوں۔

ہم:۔ ضرور کرو! ہماری مخلصانہ امداد ہر وقت حاضر ہے۔

بیوی:۔ ہاں بس اب خودکشی کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

ہم:۔ کوئی چارہ ہو بھی کیا سکتا ہے؟ ہم اس سلسلے میں تمہاری کیا امداد کر سکتے ہیں؟

بیوی:۔ مجھے آپ کی امداد و مدد کی ضرورت نہیں۔ آپ ہی کے کارن یہ خون کی ہولی کھیلنے پر مجبور ہوئی ہوں۔

ہم:۔ اجی ہم کس لائق ہیں۔ فانی دنیا کے بے عقل پجاری ہمارے متعلق یہ سب کچھ حسنِ ظن ہے ورنہ ہم کیا ہماری ہستی کیا!

بیوی:۔ یہ "تو تو"[1] بند نہیں ہوگی؟

---

[1] تو تو۔ زبان

ہم :۔ خودکشی کے ساتھ ہی بند ہو جائے گی تم نے اردو کے یہ محاورے تو سنے ہوں گے۔ فلاں آدمی کی "زبان بند ہو گئی" یعنی چل بسا۔ ہے خصوصاً عورت ذات کی زندگی کا مرکز تو اُس کی زبان ہی ہوتی ہے۔ کسی عورت کی موت پر یقین ہی اُس وقت کرنا چاہیئے۔ جب اُس کی زبان بند ہو جائے۔

بیوی : عورتوں کی زبان کا رونا خوب رو دیا جاتا ہے۔ مردوں کی زبان کو کس دن لقوے سے مارا تھا ؟ پوچھو گے نہیں تم ؟

ہم :۔ ہم لوگ کب رہنے دیتے ہو اور بول ہی کیا سکتے ہیں : ہمیں بولنے کی مجال ہی کب ملی ہے : ۱۸ سال کی ازدواجی زندگی میں ہمیں بولنا ہی کب نصیب ہوا : ہمارے حصے کا بولنا بھی مہروں کی طرح تمہارے حصے میں آ گیا تھا۔

بیوی : خیر یہ فیصلہ تو قیامت میں ہوگا۔ یہاں تم چاہے جتنی باتیں بنالو۔ بہرحال میں نے اب جان پر کھیلنے کی ٹھان لی ہے۔

ہم :۔ یہ کھیل ہے تو بڑا دلچسپ، ہمت شرط ہے۔ بقول شخصے "ہمت مرداں مدد خدا"

تم خودکشی ضرور کرو۔ تمہاری یہ نیکی ہمارے گناہوں کا بھی کفارہ بن جائے گی۔ ہاں خوب یاد آیا۔ پنجاب کے چند مخلص اور خاموش کارکنوں نے ملک کی بے تحاشا بڑھتی ہوئی آبادی اور موجودہ بے کاری وبدحالی کے پیش نظر انجمن خودکشان پنجاب کے نام سے ایک سبھا بنا رکھی ہے مہاتما گاندھی اس کے سرپرست ہیں اور خان غفار خاں صدر۔ ہمیں سب نے اصرار کر کے سیکرٹری بنا دیا ہے۔

اس انجمن کا مقصد یہ ہے کہ صوبے کی بے ضرورت آبادی کو لائف کنٹرول کے اصول کا پابند بنایا جائے۔ رضاکارانہ خودکشی کا پرچار ہو اور جو لوگ زندگی کی کشمکش سے اکتا گئے ہوں ان کو ممبر بنا کر خودکشی کے متعلق سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ سردست ذرائع خودکشی حسب ذیل تجویز کئے گئے ہیں :

ریل کی پٹڑی پر شب خوابی، راوی میں بھاری پتھر باندھ کر غوطہ خوری۔ شاہی مسجد کے مینار غربی سے مشق پرواز۔ ریوالور سے سرگوشی، اور اخیر نمبر ہے "پٹریا" کا۔

کپڑوں پر پٹرول چھڑک کر روشنی پھیلانے کے ہم خلاف ہیں۔ بس تم بھی اُس کی ممبر بن جاؤ۔ پانچ روپے ممبری کی فیس ہے "نیک صلاح کا پوچھنا کیا" آج ممبری کے فارم پر دستخط کر دو!

انجمن کی انتظامیہ کمیٹی کا آج شام کو جلسہ ہے۔ نئے ممبروں کے فارم اس میٹنگ میں پاس ہوں گے۔ تمہارا فارم بھی اس میں پیش کرا دیا جائے گا اور چونکہ تمہیں زندگی دوبھر ہو رہی ہے۔ ذرائع خودکشی میں جس صورت کو پسند کرو گی اس کے متعلق فوری سہولتیں بہم پہنچا دی جائیں گی۔ تمہارا مقصد پورا ہو جائے گا اور انجمن کے جلسے میں ہمارے لئے شکریے کی قرارداد پیش ہو جائے گی۔

ہمارے خیال میں ریل کی پٹڑی پر شب گزاری زیادہ مناسب رہے گی۔ بادامی باغ کے اسٹیشن سے ایک میل اُدھر رات کو سناٹا ہوتا ہے وہاں تمہیں پہنچا دیں گے۔ لائل پور کو جانے والی ۱۲ بجے شب کی آخری گاڑی تمہاری روح کو سیدھی جنت میں لئے چلی جائے گی۔

کل صبح کے اخبارات میں چار کالمی سرخیوں سے تمہاری سنسنی خیز خودکشی کی خبر اور ہمارے نام تمہارا آخری خط جس میں خودکشی کی وجہ تحریر ہوگی شائع ہو جائے گا۔ خط کی عبارت ہم خود بنا لیں گے۔ خط حسب ذیل ہوگا۔

پیارے علامہ!

میرا آخری سلام لو! میں بہت دنوں سے مہاتما بدھ کو خواب میں دیکھ رہی تھی۔ وہ مجھے ہر بار نصیحت فرماتے تھے کہ "غمخانۂ ہستی رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ جس طرح ہو اپنی مادی اور فانی زندگی ختم کر کے نروان حاصل کر لو" ! اُن کی الہامی نصیحت نے میری تاریک روح کو منور کر دیا اور میں رضاکارانہ خودکشی کے لئے بیقرار رہنے لگی۔ آج مجھے موقع مل گیا کہ مہاتما بدھ کی نصیحت پر عمل کروں۔

مجھے اعتراف ہے کہ آپ ایک شریف ترین اور وفادار شوہر کی حیثیت میں معیاری انسان ہیں۔ آپ کے ساتھ میری زندگی

بہشت کی سی زندگی بسر ہوتی۔ کاش یہ زندگی فانی نہ ہوتی۔ میں نروان اسی لئے حاصل کرنا چاہتی ہوں تاکہ دوسری دنیا میں آپ اور میں ایک بلند اور ابدی زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہوں۔ میری اچانک خودکشی کا جو صدمہ آپ کو ہوگا مجھے اس کا صحیح اندازہ ہے اور صرف یہی جاں گسل احساس مجھے اب تک نروان حاصل کرنے سے روکتا رہا۔ لیکن میں سوچتی ہوں کہ ایک نہ ایک دن یہ فانی اور ناقابل اعتنا زندگی موت کے قہار حربے سے پاش پاش ہو جائے گی اور اس طرح آپ میں اور مجھ میں جدائی بہرحال نوشتۂ تقدیر بن کر رہے گی۔ اس لئے اس حیات فانی کو حیات ابدی میں تبدیل کرنا محبت کا ایک مقدس فرض ہے۔ جسے ادا کرنا تکمیل محبت کے لئے ناگزیر ہے۔ آپ کی غمناک تنہائی کو خیال کرکے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر اس یقین کی روشنی میں آپ سے جدا ہو رہی ہوں کہ ہم اور آپ بہشت جاوداں میں حیات سرمدی کے مالک بنیں گے۔ سردست آپ غم غلط کرنے کے لئے ایک شادی ضرور کر لیں تاکہ نظام خاندان میں ابتری پیدا نہ ہو۔ اس خاتون کی خوش نصیبی تمام عالم نسواں کے لئے قابل رشک ہو سکتی ہے جو آئندہ آپ کے نکاح میں آئے گی۔ دیکھئے اگر آپ نے میرے سوگ میں شادی نہ کی یا اس سلسلے میں تاخیر کی تو میری روح نروان حاصل کر کے بھی بے قرار رہے گی۔ مجھے توقع ہے کہ آپ اپنی پرستار بیوی کی اس آخری وصیت کو فراموش نہ فرمائیں گے۔

مہر کا روپیہ وقتاً فوقتاً جو مجھے آپ سے وصول ہوتا رہا میں نے اپنے بھائی کے حوالے کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ میرے زیورات بھی انہی کی تحویل میں ہیں۔ میری رسم تجہیز و تکفین کے بعد آپ ان سے تمام روپیہ وصول کر لیں۔ یہ روپیہ بچوں کی تعلیم و تربیت پر صرف کریں اور اس میں سے ۲۵ ہزار روپیہ اپنی ہونے والی بیوی کو بطور مہر معجل ادا کر دیں۔ بیچارے رخصت۔ خدا آپ کا حافظ و ناصر ہے۔

راقمہ خورشید جہاں بیگم

اہلیہ علامہ ظریف

۲۰ جون ۱۹۳۸ء

اس خط کی اشاعت سے جہاں زندگی کے متعلق تمہاری بلند نظری پر دنیا تحسین و آفرین کے پھول برسائے گی۔ وہاں ہمیں کئی فائدے پہنچ جائیں گے۔

اول تو یہ کہ تمہاری بزم ماتم لال پگڑی والوں کی منحوس شمولیت سے پاک رہے گی۔ دوسرے یہ کہ تمہارا شوریدہ پشت بھائی اخبارات میں تمہارا خط پڑھ کر ہمیں قانونی دھمکیاں دینے کی بجائے سید صابر حد کے آزاد علاقے کو بھی فرانٹیر میل سے راہ فرار اختیار کرے گا۔ ہمیں اس خودکشی کی مہم میں تمہارے بھائی کی شوریدہ پشتی کا پہلو زیادہ فکرمند کر رہا ہے۔ یہ خط نہ شایع ہوا تو وہ لاہور پہنچ کر سید صابر کو توالی پہنچے گا۔ تم تو رضاکارانہ خودکشی کر رہی ہو وہ اپنی خفیف الحرکاتیوں سے ہمارے جبری نروان کا انتظام کرانے کی جدوجہد میں رات دن ایک کر دے گا۔ اس کی بیوی کی قانون دانی سے بھی تم واقف ہی ہو وہ عورت نہ ہوتی تو مسٹر جناح کی ٹکر کی وکیل بنتی تم جانتی ہو اپنے سگے بھائیوں کے وارنٹ کئی بار نکلوا چکی ہے۔ تمہاری خودکشی کی سن گن اس کے کانوں تک پہنچی تو اپنے سارے مقدمات ملتوی کرا کے اپنے بے قانون اور بے دماغ زن مرید کو لے کر جسے وہ پیار میں "منیا بندور" کہا کرتی ہے لاہور پہنچے گی اور وہ وہ قانونی طوفان ہمارے خلاف برپا کرے گی کہ سنٹرل جیل کے پھانسی گھر میں تمہارے چہلم سے پہلے ہی ہمیں جبری نروان کی سعادت دلا کے دم لے گی۔ تمہارا خط ہمیں اس قانونی پچھل پیری کے عدالتی ہنگاموں سے بھی بچائے گا۔

تیسرا بڑا فائدہ یہ پیش نظر ہے کہ تمہارے خط میں ہماری شوہرانہ وفاداری کا حال پڑھ کر چاروں طرف سے شادیوں کے پیامات بارش کی طرح برسنے لگیں گے۔ کہ ہمارے لئے انتخاب کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم تمہارے چہلم اور اپنے ولیمے کی رسمیں ایک ساتھ ہی انجام دینے کے قابل ہو جائیں گے۔

بیوی :۔ ان وعدوں کے ساتھ تمہاری تجہیز و تکفین کی رسم بھی شامل ہو جائے تو ایک کرشمہ [illegible] کی مثل صادق آجائے۔ میرا جی جلانے جاؤ گے، باز نہیں آؤ گے، کیا پاکیزہ خط تجویز کیا ہے ؛

کیا کہنے تمہارے۔ تم تو مجھے مہر وصول ہوتے رہے اور میں اپنے بھائی کے سپرد کرتی رہی اور زیورات بھی امی کی تحویل میں ہیں۔ اسے سبحان اللہ مہر ادا کرنے والوں کی صورت تو دیکھو دھڑا دھڑ نور برس رہا ہے اور زیورات ؛ زیورات اس اجڑے گھر میں مجھے کس دن پہننے نصیب ہوئے تھے۔ جوڑے پر مانگے تانگے کے چند زیور چڑھائے گئے تھے جو چوتھی کے دن اتروا لئے گئے تھے۔ تم وفادار شوہر تو میکے کا تمام زیور ایک ایک کر کے جیب تک پہنچا کر چین نہ آیا۔ میرے بھائی کا احسان مفت بہتا جا رہا ہے۔ اپنا کاروبار چھوڑ کر چار سال تک چند روپوں پر تمہاری خدمت کرتا رہا۔ اس کا یہ اجر نہ دو گے تو اور کیا دو گے۔ شاباش تمہیں! آخر عالم دین ہو نا ؛ اسلام اور مسلمانوں کی کشتی کے ناخدا۔ تمہیں جیسے علمائے دین نے اُمت کی کشتی ڈبوئی ہے۔ خدا کا ڈر نہ پولیس کی پکڑ دھکڑ کا خوف۔ اچھے عالم دین ہیں۔ تم سے تو یہودی ہزار درجے کہیں اچھے ہیں۔

انجمن خود کشتانِ پنجاب تمہیں مبارک۔ تم اسی کے طریقوں پر اپنی اور اپنے آباؤں کی رسم خود کشی ادا کرنا۔ مجھے اپنے طریقے پر مرجانے دو ! لو دیکھو ! یہ پسا ہوا کانچ ہے میں اسے پھانک کر خودکشی کرنا چاہتی ہوں"۔ یہ بادیکھ کر ہماری روح پرواز کرنے لگی۔ یہ انجھروہ ہماری بھاوج سے تازہ تازہ سیکھ کر آئی تھیں۔ ہماری بھاوج نے جب بھائی صاحب کو کانچ کی پڑیا دکھائی تھی، تو انہوں نے فوراً ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔ حالت ہماری بھی دگرگوں ہو گئی، اور قریب تھا کہ ہم بھی بھائی صاحب کی پیروی کرتے ہوئے اس میدان سے پسپا ہو جائیں، مگر خدا نے ہماری بڑی مدد کی۔ اور اس وقت ہمیں الہام سا ہوا کہ اس وقت ہار مان گئے تو یاد رکھنا بڑے گھٹے میں رہو گے۔ آٹھویں دن پڑیا کا تماشا ہوا کرے گا۔ تمام شوہرانہ اختیارات سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ اور اس ابتدائی انتہا تمہیں اس ٹھہرا دے کا ہم قسمت بنا دے گی، جو شرطِ شادی کی ادائیگی کے طور پر ہر صبح بیوی کے ہاتھ سے ناشتے کی بجائے سو جوتیاں کھایا کرتا تھا اس لئے عافیت چاہتے ہو تو گر بہ کشتن روز اوّل کے اصول پر کاربند رہ کر میدان میں ڈٹے رہو۔ یہ خیال آتے ہی ایک منٹ کی چوتھائی میں ہم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو ہم ہار نہیں مانیں گے۔ یہ دل میں ٹھان کر ہم نے کہا بیوی ذرا ٹھہرو ! اور دوڑ کر صراحی سے ایک گلاس پانی بھر لائے۔ بیوی کی طرف بڑھا کر کہا۔ لو بسم اللہ کر کے یہ سفوف مشغل کشا پھانک کر اوپر سے پانی کا یہ گلاس غٹ غٹا کر پی جاؤ۔ تاکہ گلے میں اچھو نہ لگے اور پڑیا اپنے جلوے دکھانے میں دیر نہ کرے۔ بیوی کے استادِ ازل یعنی ہماری بھابی جان نے یہ ہتھکنڈہ سکھاتے ہوئے غالباً یہ ہدایت کر دی تھی کہ اس کرتب کو دھمکی کی حدود سے آگے نہ بڑھنے دینا۔ یا پھر یہ بات ہے، کہ جان بڑی پیاری ہے اور جان پر کھیل جانا سب سے مشکل کھیل ہے۔ جو کچھ بھی ہو۔ ہوا یہ کہ خلاف توقع پڑیا انہوں نے ہمارے منہ پر ماری۔ گلاس دیوار پر پٹخا اور چیخ کر کہتی گیا ہیں، "تمہیں جو مر جاؤ" اس اعترافِ شکست نے ہمارے خون میں مسرت کی لہر دوڑا دی۔ قریب تھا کہ سرورِ فتحمندی میں ہم رقص کرنے لگیں۔ روح پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور نپولین کے فاتحانہ انداز میں بولے بس ترکی تمام شد ذرا سی پڑیا بھی نہ پھانکی گئی۔ ہم سمجھتے تھے کہ پکوڑا بنانے والا ہاتھ صرف پکوڑا ہی بنا سکتا ہے۔ نہ ہوئے ہم تمہاری جگہ۔ ایک کی جگہ چار پڑیاں پھانک کر دکھا دیتے۔ اب تم مانو گی کہ مرد خدا کا خلیفہ ہے۔ بیوی کا حاکم ہے۔ اشرف المخلوقات کہلانے کا حق دار ہے۔

بیوی: مرنے مرنے کے ساتھ راہ چلتے کے ساتھ مرنا بے وقوفی ہے۔ تمہارا کیا ہے۔ میں مر جاؤں گی تو کوئی اور مسٹنڈی لا بٹھاؤ گے، مفت میں اپنی جان گنوا بیٹھوں۔ کس نے کہا ہے۔ تمہارے نزدیک میری زندگی کی کوئی قیمت نہیں۔ میرے باپ بھائی سے تو پوچھو۔ اس وقت انہیں کے خیال نے میرا خیال پلٹایا ہے۔ بوڑھے باپ کو تین جوان بیٹیوں کی موت نے پہلے ہی ادھ موا کر دیا ہے۔ میری موت کا غم اُسے مار ہی ڈالتا۔ اِدھر ماں جایا بھائی سر پیٹ لیتا تمہارا کیا جاتا میرے ساتھ اُجڑا بلکہ بھی بٹ جاتا۔ تم مر جاؤ تو تمہارے میکے میں تم جیسے پٹنیوں بھرے پڑے ہیں۔ تمہاری کمی کسی کو محسوس بھی نہیں ہو گی۔ یہ کہہ کر وہ اٹھیں اور دوسرے کمرے میں جا کر انہوں نے کواڑ بند کر لیے۔ ہمیں شبہ ہے کہ انہیں بھوک نے بہت ستا رکھا تھا۔ اُس کمرے میں دودھ کی کھیر بھری دیگچی رکھی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سارا غصہ بے ترتیب کھیر پر اُتارا۔ یہ شبہ ظن سے اور ظن پھر یقین سے اس لئے ترقی کر گیا۔ کہ ہمارے شام کے کھانے پر

سب کچھ تھا مگر مرحوم کھیر نہ تھی ما انجام کار وہ دو تین دن روٹھی رہیں۔ ندامت شکست کا اثر تو مہینوں باقی رہا۔ گفتگو بھی کچھ مدت بند رہی۔ ہم سے کچھ کہنا ہوتا تو دیوار کو ناظر پیش بنا کر ہماری طرف سے منہ پھیر کر کہتیں۔ ہم بھی دیوار ہی کو بات کا جواب دے دیا کرتے۔ جب اس ان ڈائرکٹ بات چیت سے تنگ آگئیں۔ تو ڈائرکٹ گفتگو کا افتتاح کرتے ہوئے آخر ایک دن بولیں۔ بات کرنے کو جی تو نہیں چاہتا مگر کیا کروں بہشتی زیور میں رسول اللہ کی حدیث پڑھی ہے کہ کسی مسلمان بھائی کو دوسرے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ گفتگو بند کرنی جائز نہیں۔ خدا کا خوف اور رسول اللہ کا ڈر نہ ہوتا تو تم سے زندگی بھر نہ بولتی۔

ہم نے کہا تم نے ہم سے ناحق بات چیت شروع کی۔ رسول اللہ نے دو مسلمان بھائیوں کا لفظ استعمال کیا ہے۔ میاں بیوی بھائی بھائی تو نہیں ہوا کرتے تم اگر بول چال یونہی بند کئے رکھو تو ہمیں مطلق تکلیف نہ ہوگی اور نہ رسول اللہ ناراض ہوں گے۔ آئندہ پھر زبان چلانے ہی کا یہ نتیجہ ہے۔ تمہاری جیتی جان جاتی اور خیر ہمارا تو کیا بگڑتا۔ اور بگڑنے کی بات بھی یہی ہے۔ تمہارے چالیسویں تک گھر سونا پڑا رہتا بچوں کو تم اور ہمیں تمہاری نیکیاں یاد آ آ کر الگ تکلیف پہنچاتیں۔ خود کشی کی حرام موت تمہیں جہنم رسید کر کے تمہاری عاقبت بھی خراب کرتی۔ یہ مانا کہ کچھ دن تعزیت کے مہمانوں سے چہل پہل ضرور ہو جاتی پھر تمہاری قائمقام کے خیر مقدم کی تیاریوں میں ہمارا جی بہل جاتا۔ مگر تم تو سو فی صدی نقصان میں رہتیں۔ اس لئے مصلحت اسی میں ہے کہ ہم دونوں گونگے کا گڑ کھالیں بس دیوار ہی کے ذریعے گفتگو ہوا کرے۔ احتیاط اسی میں ہے۔

بیوی: میری موجودگی میں کوئی قائمقام گھر میں قدم رکھ کے دیکھے زبان کی بوٹیاں کاٹ کر رکھ دوں۔ کیسی مصلحت۔ کس کی بیوی۔ ہم ضرور بولیں گے۔ تمہیں بولنا پڑے گا۔

ہم: اچھا چلو تمہاری خاطر ہم یہ ایثار بھی گوارا کر لیں گے۔

صبح کی گفتگو جاری تھی کہ گھڑی کا الارم زور سے بجا۔ ہم ہڑبڑا کے لاحول پڑھتے ہوئے نیند سے چونکے ہو کر اٹھ بیٹھے۔ اتنے ہی بیگم کی محبت بھری آواز کانوں میں آئی۔ اجی آج کب تک سوتے چلے جاؤ گے؟ نوکر دیر سے چائے لئے کھڑا ہے۔ اٹھو بھی کلی کر کے ناشتہ کر لو۔ چائے ٹھنڈی ہوئی جا رہی ہے۔

مرزا غالب نے غالباً ہمارے لئے ہی کہا تھا کہ ؎

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا

غزل

"ضرورت اس امر کی ہے کہ غزل نگاری کا انداز بدلا جائے۔ اور اس کے ساتھ اس کے محدود موضوعات کو بھی وسعت دی جائے۔ انسانی مجد و شرف تمام پہلو غزل کی صورت میں باندازِ دگر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ شاعر سلیقہ مند ہو۔ بے سلیقگی کسی فن کو بھی سازگار نہیں۔ چہ جائیکہ شاعری جو از سر تا حسنِ سلیقہ کی طلب گار ہے۔"

(علامہ تاجور)

[illegible]

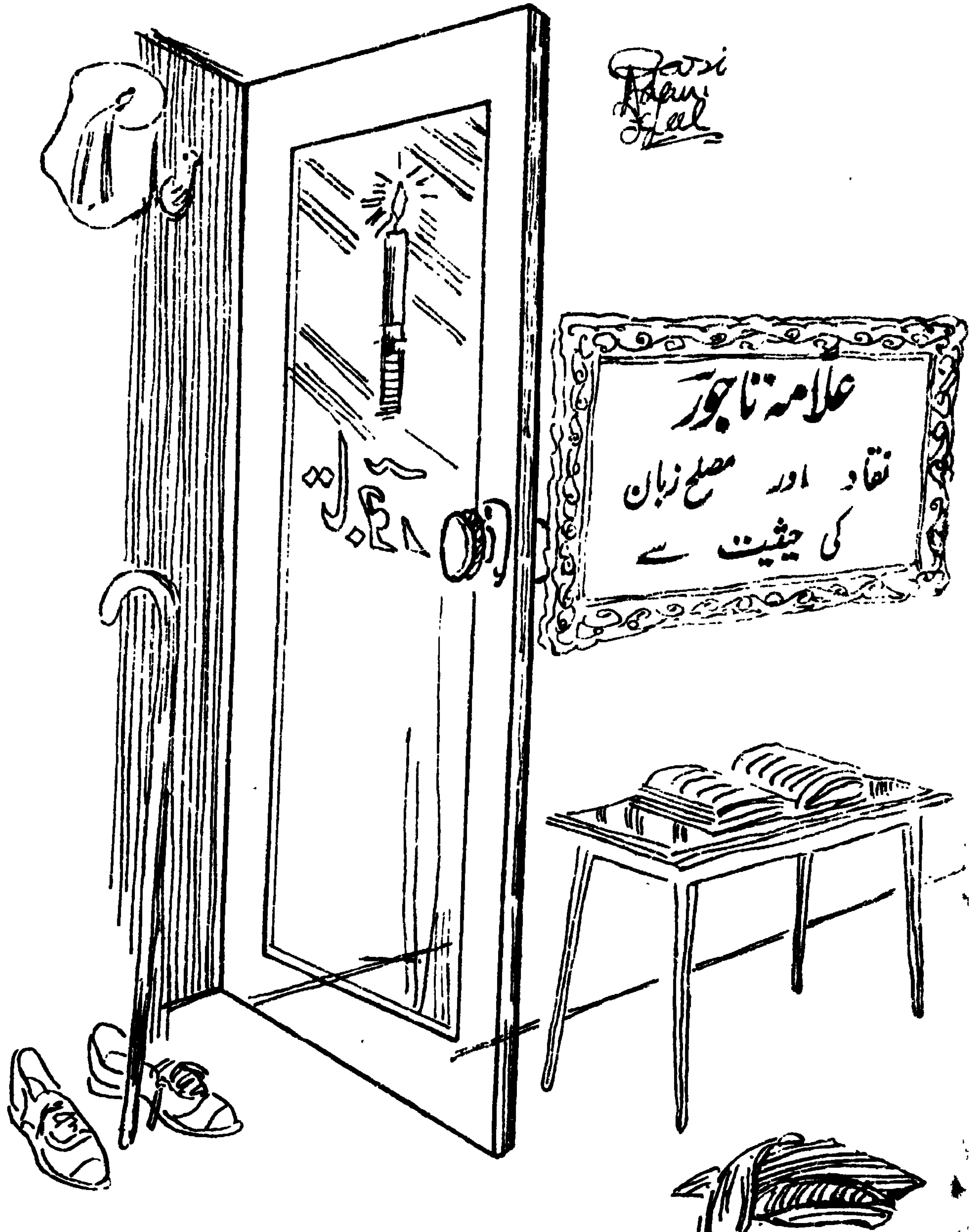
علامہ تاجور کا نمونۂ تحریر

بازار کی سیر

(۱)

~~جنوری اور نومبر شالامار باغ کے میلے میں~~

شالامار باغ کے جشن چراغاں کا میلہ قریب آ رہا ہے۔
یہ میلہ نہایت مشہور اور دلکش ہے اور لاہور والوں کا ایک قومی تہوار بن گیا ہے۔
اس میلے میں دیکھنے کے لیے ہر سال ہزاروں آدمی دور دور سے
آتے ہیں۔ ملازمت پیشہ دفتروں سے چھٹیاں لیتے ہیں۔
کاروباری لوگ اپنے کاروبار کی ترقی کے لیے میلے میں دکانیں
لگاتے ہیں۔ کئی دن شالامار باغ میں بڑی چہل پہل رہتی ہے۔
لاہور، گوجرانوالہ، امرتسر اور اس پاس کے رہنے والے اپنے دوستوں
کے ساتھ تین دن میلے میں گزارتے ہیں۔ گھر سے تنبو اور کھانے
پینے کا سامان ساتھ لے جاتے ہیں اور میلے میں جا کر زندگی


علامہ تاجور
نقاد اور مصلح زبان
کی حیثیت سے

تاجور ○ مصلحِ زبان

آج سے تقریباً تیس بتیس سال پہلے علامہ تاجور ماہنامہ ہمایوں لاہور کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تو آپ کی جدت پسندی نے تحقیق الفاظ اور اصلاحِ زبان کے سلسلے میں اصلاحِ زبان کے عنوان سے ایک نئے کالم کا اضافہ کیا۔ علامہ مرحوم کا شروع کیا ہوا یہ کالم اس قدر مقبول ہوا۔ کہ ہمایوں کے بعد ادبی دنیا۔ شاہکار اور پریم وغیرہ میں بھی جاری رہا۔

اس بیش قیمت علمی و ادبی خزانے کا کچھ حصہ اس نمبر کی زینت بنایا جا رہا ہے۔ ہمیں یقین ہے ان صفحات کا مطالعہ قارئین کرام کی علمی و ادبی معلومات میں اضافے کا سبب بنے گا نیز اس کے مطالعے سے یہ بات بھی واضح ہوگی۔ کہ الفاظ کے تلفظ اور علمی و ادبی معلومات کے لحاظ سے علامہ مرحوم کیسا بلند درجہ رکھتے تھے۔

اصلاحِ زبان علامہ مرحوم کا خاص موضوع تھا، اپنی نفاستِ طبع کے علاوہ اردو زبان کے ایک فدائی کی حیثیت سے وہ اس زبان کو ہر قسم کے عیوب سے پاک دیکھنا چاہتے تھے اور دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے برابر درجہ دلانے کی تمنا رکھتے تھے لیکن حالات کی ناسازگاری نے انہیں یہ کام جم کر نہ کرنے دیا پھر بھی جتنا کام کر پائے نہایت بیش قیمت ہے۔ کاش کوئی ایسا وسیلہ پیدا ہو۔ کہ یہ تمام چیزیں جو ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح پراگندہ ہیں کتاب کی صورت میں پیش کی جائیں!

بزمِ تحقیق

اِس عنوان کو بھی ہم مستقل کرنا چاہتے ہیں اِس کے ذیل میں اُردو زبان کے متعلق تحقیق طلب سوال اور اُن کے محققانہ جواب درج ہوا کرینگے
کسی خاص مسئلہ زبان پر مشاہیر اہلِ زبان کے خیالات یا باہمی اختلافات پھر اُن پر محاکمہ شایع ہوں گے۔ ذیل میں اردو زبان کے اہل الرائے کی توجہ
منعطف کرنے کی غرض سے چند سوالات درج کئے جاتے ہیں۔ اُمید ہے کہ ماہرین زبان اپنے گرانقدر خیالات سے مستفید فرمائیں گے!

(۱) اُردو زبان کو ہندوستان کی مشترکہ ملکی زبان قرار دینے کے لئے اس کو وسعت دینے کی ضرورت ہے تاکہ ہر قسم کے خیالات، مضامین، دقیق سے دقیق علمی نکات اس کے ذریعے سے بطورِ احسن بیان کئے جاسکیں، دوسری علمی زبانوں کے ترجمے اس شان سے اردو میں ہوں کہ اصل زبان کا زورِ کلام، فصاحت و بلاغت
طرزِ ادا ظاہر ہونے کے ساتھ ہی اردو بھی اپنی صفات سے اجنبی نہ ہوجائے۔

اس مقصدِ اہم کے حصول کے لئے ضرورت ہے کہ،

(۱) اُردو مصادر کو وسعت دی جائے۔

(ب) الفاظ کی صفاتِ مقررہ کی حدود وسیع کی جائیں۔

(ج) تشبیہات کو طویل الذیل بنایا جائے۔

(د) اُردو گرامر کی محدود چاردیواری کو منہدم کرکے حدِ نظر تک محیط قلعہ تعمیر کیا جائے۔

(ہ) دلّی اور لکھنؤ کی بیجا بندشوں سے اُردو کو آزاد کرکے لامرکزیت کے اصول رائج کئے جائیں۔

(و) اُردو نظم کو معینہ بحور و اوزان میں محدود رکھنے کی بجائے بلینک ورس اور اسی قسم کی نثر نما نظموں کو رواج دیا جائے۔

(۲) اُردو گرامر کی رُو سے غیر فارسی و غیر عربی لفظ کی اضافت فارسی و عربی لفظ کی طرف نہیں ہوسکتی اسی طرح اس کے برعکس اس مسئلے میں اس قدر غلو سے کام لیا جاتا ہے کہ وہ عربی و فارسی الفاظ جن کے ہندی استعمال میں ذراسا اختلافِ حرکت و لہجہ پیدا ہونے کی وجہ سے اُنہیں مُہنّد کا خطاب دیا جاتا ہے۔ اُن کی اضافت بھی جایز نہیں۔

مثلاً لفظ موسِم بکسرۂ سین عرب نژاد ہے۔

"صادف موسم الخیف معان الصیف"

اُردو میں "موسَم" بفتح سین استعمال ہونے کی وجہ سے یہ مُہنّد ہوگیا ہے اور اس کی اضافت بصورتِ مُہنّد جائز نہیں چنانچہ مرہمِ گل کا قافیہ اگر
موسمِ گل باندھا جائے تو غلط سمجھا جاتا ہے کیونکہ اضافت کی حالت میں موسِم مرہَم کا ہم قافیہ ہوگا نہ کہ مرہم کا

(ب) وہ اسم صفت جو کسی اسم و امر کی ترکیب سے بنایا جاتا ہے جیسے دل دار، دُور بین۔ اس کے متعلق بھی یہی حکم ناطق ہے کہ اس مرکب میں امر کے ساتھ جو اسم ہو عربی یا فارسی ہونا ضروری ہے، ضرورت ہے کہ ان سختیوں کو کسی اصول کے تحت کم کیا جائے۔ سوال کے دونوں پہلوؤں پر غور کی بہت گنجائش ہے
حصّہ (الف) میں سائل کے منشا کی تائید

"اب سڑک" "مرمود" "پنسی" "آب دان" "لیگ اقوام" "ایڈیٹر زمیندار" وغیرہ الفاظ کرتے ہیں۔
یہ الفاظ روزمرہ میں داخل ہو کر فصحا کی زبان قلم و دہن پر بھی قابض ہو چکے ہیں۔ سامعہ کو تکلم بنا کر ایسے بہت سے مرکب تراشے جا سکتے ہیں جنہیں کثرت استعمال کچھ دنوں میں فصیح بنا کر اُردو لغات میں معتدبہا اضافہ کرے گی۔

حصہ (ب) پر عمل درآمد کی سفارش الفاظ ذیل کا استعمال کر رہا ہے۔
سمجھ دار۔ پچھے دار۔ شوردار۔ کاٹھیاوان وغیرہ

(۳) منسی، تیور، پاپش، فوق الپھرک، ریسہ الفاظ بالا کو کثرت استعمال نے قبولیت کا جامہ پہنا دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ زبان سے بولنے والے ان سے دل کو بھی صاف کر لیں۔

(۴) لفظ صحیح بروزن فعیل ہندوستان کی علمی دنیا میں بھی اب صرف زبان قلم پر باقی رہ گیا ہے۔ بولنے والی زبان اس سے قطع تعلق کر چکی ہے۔ اُن متبحر مذہبی علما کو چھوڑ کر جو اپنے روزمرہ میں حروف حلقی کو حجازی لہجے میں ادا کرتے ہیں فصحائے اردو میں سے غالباً کوئی متنفس بھی "صحیح" کو فعیل کے وزن پر نہیں لاتا بلکہ صحی بوزن نفی استعمال ہوتا ہے تو کیا اردو کو مستقبل کی عام ملکی زبان بنانے کی غرض سے اس قسم کے الفاظ کی کتابت کو مروجہ تلفظ کے مطابق بنایا جا سکتا ہے؟

میں چاہتا ہوں کہ ان معروضات پر وسیع الخیالی کو پیش نظر رکھ کر اہل ادب غور فرمائیں۔
جوابات مختصر، مدلل، متین ہوں اور تحریر سے مکابرہ کی شان نہ پیدا ہوتی ہو۔
حضرات ذیل سے خاص طور پر توجہ فرمائی کی درخواست ہے۔
علامہ طباطبائی لکھنوی، مولانا شوق قدوائی لکھنوی، مولانا شاداں لکھنوی، حضرت ناصر نذیر فراق دہلوی۔ لالہ سری رام ایم اے مؤلف خمخانۂ جاوید۔ مولانا وحیدالدین سلیم (عثمانیہ یونیورسٹی)، مولانا عبدالحق بی اے (انجمن ترقی اردو) پنڈت برج نرائن چکبست مدیر صبح امید، حضرت بیخود دہلوی۔

ہر زبان کی شاعری میں شاعر کا ایک مخاطب ہوتا ہے جس کی خیالی صورت پیش نظر رکھ کر شاعر جذبات آرائی کی مشق کیا کرتا ہے۔ ہندی زبان کی شاعری میں شاعر عورت ہو یا مرد اپنے آپ کو عورت فرض کر کے اپنے محبوب مخاطب کو مرد تصور کرتا ہے۔
فارسی میں شاعر مرد ہو تو عورت کو مخاطب بناتا ہے اور عورت ہو تو مرد کو فارسی کے صیغوں میں تذکیر و تانیث کا چونکہ کوئی امتیاز نہیں اس لئے شاعر کا مخاطب مرد ہو یا عورت صیغہ ایک ہی مستعمل ہوگا۔ اردو کے صیغے فارسی کی طرح تذکیر و تانیث سے ساکت نہیں ہیں اس لئے اردو شاعری پر یہ اعتراض ہمیشہ ہوتا رہے گا کہ اس کے مخاطِب (شاعر) اور مخاطَب دونوں مرد ہوتے ہیں۔ فارسی کی خوش قسمتی دیکھئے کہ "مجالس العشاق" کی ناطق شہادت اور اس قسم کے جذبات ؎

"لشکر برفت و آں بت لشکر شکن برفت ہرگز مباد کس کہ دہد دل بہ لشکری"

کی موجودگی میں بھی فارسی شاعری محض اپنے صیغوں کی پردہ داری کے سبب چشم نمائی سے محفوظ ہے۔ لیکن اردو کے پاس یہ سہارا بھی نہ تھا اس لئے یہ ہدف ملامت بن گئی۔ اہل لکھنؤ نے جرأت اور رنگ کے مضامین نظم کر کے فطرت نگاری کی بنیاد رکھنی چاہی تھی مگر وہ اس جرم میں اردو دنیا کے آج تک معتوب ہیں۔ میری رائے ناقص میں ضرورت ہے کہ اردو شاعری کا طریقہ خطاب عربی کے مطابق بنا کر اُردو شاعری کو اس ناقابل رشک حالت سے نکالا جائے خصوصاً اسے اس کی ضرورت ہے۔ مستند سخن طراز پہل کریں تو کچھ دنوں کے بعد باقی شعرا اُن کے نقش قدم پر چلنے لگیں گے۔

۲

اردو شاعری کے رواج سے پہلے ملک میں بھاشا کے دوہڑے، چوبولے وغیرہ رائج تھے۔ ولی دکنی نے جہاں بھاشا میں فارسی تراکیب استعارے اور فارسی مضامین داخل کرکے اسے اردو بنایا وہاں اُس نے بلاضرورت اُردو نظم کے لئے فارسی اوزان و بحور بھی اختیار کر لیے۔ فارسی اوزان و بحور ایران کی شاعری کے لیے مناسب ہو سکتے ہیں۔ اُردو شاعری تو ان کی وجہ سے گرانبار پابندیوں میں دب گئی۔ نظرتی سادگی جو کسی زبان میں ہو سکتی ہے اُس سے اردو محروم ہے۔ میر تقی مرحوم نے اپنی غزلیات میں جہاں بھاشا کے اوزان میں سخن سرائی کی ہے نظرتی جذبات کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ بخوبی طراز حضرات جانتے ہیں کہ بعض وقت اردو نظم کی غیر طبعی پابندیوں کی وجہ سے بہتر سے بہتر شعر کاٹ دینا پڑتا ہے۔ اگر یہ غیر ملکی پابندیاں حائل نہ ہوتیں تو آج اُردو نظم میں ہر قسم کے مضامین کا بیکراں ذخیرہ موجود ہوتا تو کیا اساتذہ فن اس سوال پر اپنی توجہ مبذول فرمائیں گے؟ اُردو شاعری اگر بھاشا کے طبعی اوزان میں ڈھلنے لگی تو اس کی ترقی کے راستے سے رکاوٹوں کا ایک ہمالیہ ہٹ جائے گا۔ اس میں تو ایثار کی بھی ضرورت نہیں صرف رہنمائی کی ضرورت ہے۔

تجاویز

(۱) ایسے الفاظ جن کے اخیر میں ہائے مختفی ہو جیسے مدینہ۔ نگینہ۔ شیشہ۔ فتنہ وغیرہ کے ساتھ جب علامات اضافت نے۔ کا۔ کے۔ کی۔ حروف جارہ میں سے۔ پر یا علامت مفعول کو میں سے کوئی حرف، یا علامت آجائے تو اخیر کی ہائے مختفی کا لہجہ یائے مجہول سے بدل جاتا ہے: "مدینہ" سے مدینے میں مدینے کا۔ مدینے پہ۔ مدینے کو وغیرہ ان حروف و علامات کے ساتھ ان الفاظ کا املا دہلی و لکھنؤ میں دونوں طرح آتا ہے۔ ہائے مختفی کے ساتھ، مدینہ "مدینہ میں" لہجے میں تو کوئی اختلاف نہیں، ہر جگہ یائے مجہول کا لہجہ استعمال ہوتا ہے، البتہ املا دونوں طرح آتا ہے۔ پنجاب میں ایسے الفاظ کے ساتھ مذکورہ بالا حروف و علامات آئیں تو املا میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ پنجاب میں یہ املا دلی و لکھنؤ کی تقلید سے رائج ہوا ہے لیکن ایک خرابی اس سے اور پیدا ہو گئی، وہ یہ کہ ان الفاظ کا ان حروف و علامات کے ساتھ لہجہ بھی املا کے مطابق ہو گیا ہے۔ مثلاً مدینہ کا شہر لکھیں گے تو مدینہ کا شہر پڑھیں گے یہ لہجہ قطعی صحیح نہیں اور عام ہو رہا ہے اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر جگہ ان علامات کے ساتھ ان الفاظ کا املا یائے مجہول کے ساتھ قرار دیا جائے پنجاب میں جہاں مادری زبان اردو نہیں ہے اس قاعدے کی ترویج نہایت ضروری ہے۔

(۲) میری اپنی رائے۔ میرا اپنا خیال۔ میرا اپنا گمان۔ میرا کے ساتھ اپنا کا استعمال پنجاب سے شروع ہوا ہے۔ بیرون پنجاب کے اکثر فصحا اس پہ ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ وہ اس کی جگہ میری ذاتی رائے۔ میرا ذاتی خیال۔ میرا ذاتی گمان استعمال کرتے ہیں۔

ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ پنجاب اس میرا اپنا کو رائج کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اب اس کو غیر فصیح تصور نہ کرنا چاہیئے۔ دلی کے مشہور انشاء پرداز خواجہ حسن نظامی اور ملک کے بہت سے اہل قلم اس "میرا اپنا" کو بے ارادہ اور بے تکلف لکھنے لگے ہیں اس کے علاوہ ہم ہر جگہ میرا کے ساتھ ذاتی کا لفظ استعمال نہیں کر سکتے۔ لیکن اپنا کو ہر جگہ لا سکتے ہیں۔

(۳) کوسنا۔ بددعا کے معنی میں آتا ہے۔ اور یہی اس کا صحیح استعمال ہے لیکن پنجاب میں سب و شتم اور بُرا بھلا کہنے کی جگہ بولا جانے لگا ہے۔ یہ استعمال غیر صحیح اور غیر فصیح ہے۔ پنجاب کے اہل قلم کو اس غلط استعمال سے احتراز کرنا چاہیئے۔ کوسنا ہمیشہ بددعا کے معنی میں استعمال ہونا چاہیئے بُرا بھلا کہنے کی جگہ کوسنا نہیں بولنا چاہیئے۔

مذکورہ بالا تجاویز کو تسلیم کرنے میں غالباً کسی کو اختلاف نہ ہوگا لیکن دو تین نمبروں تک انتظار کرکے ادبی دنیا کی "مجلس علمیہ" کا فیصلہ شائع کیا جائے گا۔

ہندوستانی زبان کے لئے رسم الخط کے متعلق پنجاب یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ذیل کی تجویز ارسال فرماتے ہیں:

سوال وجواب

سوالات

(۱) محاورہ اور روزمرہ کا فرق سمجھائیے — راجہ محمد سرور متعلم درجہ دہم زمیندارہ ہائی اسکول گجرات۔

(۲) "مبتذل" صحیح ہے یا متبذل۔ ب پہلے ہے یا ت — محمد اختر متعلم درجہ نہم زمیندارہ ہائی اسکول گجرات۔

(۳) تقریظ۔ تنقید۔ تبصرہ میں فرق بتائیے — میر احمد محمود متعلم درجہ ہشتم زمیندارہ ہائی اسکول گجرات

(۴) حالی کی وہ نظم جس کے پہلے دو شعر یہ ہیں کس پر لکھی گئی ہے :-

اے بزم سفیرانِ دول کے سخن آرا — ہر خورد و کلاں تیری فصاحت پہ فدا ہے
یہ پچ ہے کہ جادو ہے بیاں میں ترے لیکن — کچھ سحر بیانی کا ترے ڈھنگ نیا ہے

— واجد علی شاہ متعلم درجہ نہم زمیندارہ ہائی اسکول گجرات

(۵) نظم، نثر کی اقسام معہ امثلہ بتائیے — چوہدری محمد حیات زمیندارہ ہائی اسکول گجرات

(۶) آپ نے شاہکار بابت ماہ اکتوبر میں لکھا ہے کہ "دھوپ کھانا" غلط محاورہ ہے۔ حالانکہ غالب نے اس محاورہ کو استعمال کیا ہے۔ شعر یہ ہے :-

آگ تاپے کہاں تلک انساں — دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار

کیا اس شعر کی موجودگی میں بھی آپ "دھوپ کھانا" کو جائز نہیں سمجھتے؟ — عبدالرحمٰن ناصر اعظم گڑھ

جوابات

(۱) روزمرہ وہ عام گفتگو جس میں خاص و عام دن رات تبادلۂ خیالات کرتے ہیں اور محاورہ خواص کی گفتگو کے الفاظ خاص کو کہتے ہیں۔

(۲) مبتذل میں ب پہلے ہے ت بعد کو۔ ابتذال اس کا مصدر ہے۔ برتی ہوئی چیز۔ بذل اس کا مادہ ہے۔ شاعری کی اصطلاح میں بھرتی کے شعر کو مبتذل کہتے ہیں۔ جس شاعر کے کلام میں ایسے اشعار ہوں جن کے مطالب اُن سے پیشتر شعراء نے اُن سے اچھے انداز میں نظم کر دیئے ہیں۔ اس کا کلام مبتذل کہلاتا ہے۔

اردو شعراء کے جن دیوانوں میں کسی مصرعے پر دو غزلہ سہ غزلہ اور چہار غزلہ کہا گیا ہے ان میں اکثر ابتذال اور قافیہ پیمائی کا عیب موجود ہے میر، داغ، امیر وغیرہ کے دواوین ابتذال وغیرہ سے بھرے پڑے ہیں۔

(۳) تقریظ کا لفظ عموماً مدحیہ اظہار رائے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ تنقید کسی کے کلام یا کمال پر غیر جانبدارانہ و ماہرانہ اظہار۔ تبصرہ بھی تنقید کا ہم معنی ہے

(۴) حالی کی یہ نظم کسی خاص شخص کے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ عام مدبرین سلطنت کی تقریروں کی بابت اظہار خیال ہے۔ دوران جنگ اور گول میز کانفرنس کے انعقاد سے پہلے سلطنت برطانیہ کے مدبرین اور وزراء نے ہندوستان کو کینیڈا جیسی آزادی دینے کا وعدہ کیا تھا۔ گول میز کانفرنس میں ان تقریروں

نے ایسے پیپر اکال لئے گئے جن کی رو سے مقررین کسی وعدے کے پابند ثابت نہ ہوئے۔ اور نوآبادیات کی تشریح کابینہ وزارت کے مدبرین نے ایسی کی جس سے ہندوستان کے پلے کچھ نہ پڑا۔

(۵) نظم کے اقسام باعتبار انواع اسلوب حسب ذیل ہیں:۔
مثنوی، غزل، رباعی، مخمس، مسدس، مسمط، مثمن، مستزاد، قطعہ، نظم معرّیٰ (بے قافیہ نظم) وغیرہا اور باعتبار مطالب: رزمیہ، بزمیہ، حمد، منقبت، نعت، شہر آشوب، واسوخت، مرثیہ، قصیدہ، بہاریہ، ہجویہ وغیرہ اور اقسام نثر: نثر مرجّز، عاری، مقفیٰ، مسجع وغیرہ۔

(۶) میں نے لکھا تھا کہ دھوپ لینا صحیح ہے۔ دھوپ سینکنا یا دھوپ کھانا صحیح نہیں۔ آپ نے مرزا غالب کا شعر دھوپ کھانے کے جواز میں نقل کیا ہے۔ مرزا غالب مجھ سے بہت زیادہ مستند ہیں۔ اس لئے میں دھوپ کھانے کے عدم جواز کے متعلق اپنی رائے واپس لیتا ہوں۔ اگرچہ مجھے اس شعر میں یہ شک پیدا ہوگیا ہے کہ مرزا نے حسب اقتضائے وقت محاورے میں تبدیلی پیدا کرلی ہے۔ یعنی غم کھانے اور ہوا پھانکنے کے بجائے دھوپ کھانا ضرورت شعری کی بنا پر لکھا ہے۔ بہرحال مرزا غالب کا کلام قابلِ استناد ہے۔

سوالات

(۱) ذیل کے شعر کا مطلب بیان فرما کر ممنون کیجئے:۔

خضر کیوں کر کے زیست کرتا ہے　　آب حیواں میں پانی مرتا ہے

—— سید ممتاز علی منشی فاضل اینگلو ورنیکولر مڈل اسکول چک ۵۱ جھنگ برانچ

(۲) مسلمان جو روپیہ سرکاری بنک میں جمع کراتے ہیں، اکثر جمع کرانے والے اس کا سود نہیں لیتے اور سرکار مسلمانوں کے سود کا لاکھوں روپیہ عیسائیت کی تبلیغ پر صرف کردیتی ہے۔ بنک کا سود جائز ہے یا ناجائز؟ اس کے متعلق جواب عنایت فرمائیے!—شیخ ابوالکرم بن کریم ڈیرہ غازیخاں

(۳) شہری کے مقابلے میں دیہی درست ہے یا دیہاتی؟ عام لوگ دیہاتی بولتے ہیں۔ صحیح اور فصیح کون سا ہے؟ —— حسن محمد احسن منٹگمری

(۴) وضاحت کے لفظ کو مولینا عشق امروہوی غلط بتاتے ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ اس کی بجائے صحیح لفظ "وضوح" ہے آپ کی کیا رائے ہے؟

(۵) حاشیہ نویس اکثر فٹ نوٹ لکھتے ہوئے "۱۲ منہ" اخیر میں لکھ دیتے ہیں اس سے کیا مراد ہوتی ہے؟—میرزا خادم منشی فاضل (ہوشیارپور)

جوابات

(۱) اس شعر کا مطلب تو بظاہر سطحی ہے۔ شاعر نے صنعت پیدا کرنے کی سعی میں شعر کو بے مزہ کردیا ہے۔ پانی مرتا ہے، زیست کرتا ہے۔ آب حیواں وغیرہ، ان الفاظ کے اجتماع سے صنعت تضاد پیدا ہوجاتی ہے۔ مطلب تو صرف اس قدر ہے کہ خضر علیہ السلام اتنی طویل مدت سے کیوں کر زندہ ہیں؟ پھر خود ہی بتاتا ہے کہ آب حیواں (آبِ حیات) میں پانی مرتا ہے یعنی خضر علیہ السلام کی طویل زندگی کا سبب آب حیات ہے۔

(۲) شاہکار مذہبی سوالوں کے لئے موزوں نہیں۔ نہ میں کوئی مفتی شرع۔ لیکن آپ کے استفسار کا جواب اپنی معلومات کے مطابق عرض کرتا ہوں میں نے طالب علمی میں اپنے استاد حضرت مولینا سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ دیوبند سے یہی سوال کیا تھا۔ انہوں نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ بنک کا سود درحقیقت ممنوعہ سود نہیں، چونکہ بنکوں میں زیادہ تر غیر مسلم روپیہ جمع کراتے ہیں اور غیر مسلموں سے سود لینا جائز ہے۔ "لاربوٰ بین مسلم و حربی" اس پر میں نے عرض کیا کہ اس بارے میں علماء فتویٰ دینے سے کیوں جھجکتے ہیں؟ تو استاد مرحوم نے فرمایا:۔

"ہاں عام فتویٰ دے دینا احتیاط کے خلاف ہے کیونکہ بنکوں سے سود لینے کی عادت بڑھتے بڑھتے مسلمانوں کو حریص بنادے گی اور پھر وہ

مسلم و غیر مسلم کا امتیاز مٹا کر مسلمانوں سے بھی سُود لینے لگیں گے۔"

حضرت اُستاد مولینا سید انور شاہ صاحبؒ اپنے عہد میں علوم دینیہ میں اس درجہ تبحر کے مالک تھے کہ عرب و عجم میں اُن کا کوئی ثانی نہیں تھا اور بقول اُستاد جلیل عبید اللہ سندھی مہاجر مکہ معظمہ "آج بسیط ارض پر مولینا انور شاہ صاحب کا جواب نہیں"

مذکورہ بالا گذارش کے بعد مسلمانوں کے لئے بینک کا سود لینا مباح ہو جاتا ہے اور سود کے روپے کو روک رکھنا شاید جائز بھی نہ ہوگا جبکہ یہ علم ہے کہ وہ روپیہ عیسائیت کی تبلیغ میں صرف کیا جاتا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ بینک کا سود لے کر اپنے اوپر صرف کرنے کی بجائے کسی خیراتی ادارے کو دے دیا جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۳) شہری کے مقابلے میں لفظ دیہاتی کثیر الاستعمال ہوگیا ہے۔ اس لئے یہ صحیح بھی ہے اور فصیح بھی۔ البتہ دیہاتی مسائل کے لئے دیہی کا لفظ دیہاتی کے مقابلے میں زیادہ فصیح ہے۔ دیہی مسائل دیہی اصطلاحات وغیرہ۔ لیکن کسی دیہاتی آدمی کو دیہی کہنا غیر فصیح ہوگا" ایک دیہی آرہا تھا" یہ فقرہ بہت اوپرا معلوم ہوتا ہے؛

(۴) وضاحت کا لفظ عربی میں صحیح نہ ہی اُردو میں تو قطعاً صحیح بھی ہے اور فصیح بھی۔ معیار صحت و فصاحت یہی ہے کہ یہ لفظ فصحا کی زبان دہن و قلم پر مشق ہو چکا ہے۔

مستند سے مستند فصحا بے تکلف لفظ وضاحت کو وضوح کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ مولینا عیش کا اسے غلط بتانا ان کی ذاتی رائے سمجھا جائے گا۔

(۵) "۱۲ منہ"۔ ۱۲ کے ہندسے سے یہ مراد ہوتی ہے کہ عبارت ختم ہو چکی ہے اور "منہ" کے لفظ کا مطلب یہ ہے کہ یہ فٹ نوٹ یا حاشیہ خود مصنف کتاب کا ہے۔ بعض اوقات عربی کی کسی علمی تصنیف پر حاشیہ کوئی دُوسرے عالم لکھتے ہیں وہاں "منہ" کا مطلب یہ ہوگا کہ ساری کتاب پر جو حاشیہ لکھ رہا ہے یہ فٹ نوٹ بھی اُسی کا ہے۔

سوالات

(۱) لسان العصر اکبر اور مولینا حالی کی ادبی حیثیات میں مشترکہ اور ممتاز خصوصیات کیا کیا ہیں؟

(۲) مولینا آزاد اور مرزا غالب دونوں نثر کے بادشاہ ہیں ان کی طرز نثر نگاری کی امتیازی صفات پر روشنی ڈال کر ممنون فرمایئے۔

—— پروفیسر ضیا ایم اے، ڈی اے وی کالج لاہور

(۳) مولینا حالی کی اردو غزل نگاری پر ایک مختصر سا نوٹ حوالہ شاہکار کر کے ممنون فرمایئے —— (لالہ) پیارے لال شاکر بی۔اے

(۴) پنجاب ایڈوائزری بورڈ نے جو اسکولوں کے لئے جدید کورسز کی نئی اسکیم شائع کی تھی اُس کا کیا حشر ہوا؟

—— قاضی فیض محی الدین مسلم زمیندارہ ہائی اسکول گجرات

جوابات

(۱) لسان العصر مولینا اکبر الہ آبادی اور خواجہ حالی کی مشترکہ خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

(ا) دونوں کی شاعری مصلحانہ ہے۔

(ب) دونوں کی شاعری یادگار انقلاب ہے

(ج) دونوں کی شاعری کے جدید و قدیم دور کئے جاسکتے ہیں۔

(د) دونوں مغربی تہذیب کے حامی اور منادی ہیں۔

ان کی ادبی حیثیات کی ممتاز صفات حسب ذیل ہیں۔

(۱) خواجہ حالی نثر نگار بھی ہیں اُن کی نثری تصانیف اردو ادب کی متاع گراں مایہ ہیں۔
لسان العصر اکبر کی کوئی نثری تصنیف نہیں۔ البتہ اُن کے بہت سے مکاتیب ہیں جو مختلف اشاعتی اداروں سے شائع ہوچکے ہیں لیکن کوئی مستقل تصنیف نہیں رکھتے۔

(ب) خواجہ حالی، ادب، شاعری، شعراء، سیاسی رہنماؤں، ملی رسمیات و حالات کے بہت بلند پایہ نقاد ہیں۔ ان کی قابل قدر تصانیف حیات سعدی، حیات جاوید، یادگار غالب، نثریں اور مدو جزر اسلام، دیوان حالی کی جدید نظمیں .... نظم میں حالی کی نقادانہ حیثیت کے تنوع کی آئینہ دار ہیں۔
مولانا اکبر کی جدید شاعری مغربی تہذیب کے ہمہ گیر تسلط، مشرقی تہذیب کی پامالی، جدید تعلیم کے مضر نتائج، بدمذہبی، بے دینی، بے پردگی، فیشن پرستی کے خلاف ایک موثر و مسلسل صدائے احتجاج ہے۔ صرف یہی نہیں اکبر نے موجودہ دور زندگی کے ہر پہلو پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ وہ سر سید کے ذاتی طور پر دوست تھے۔ لیکن ان کی تعلیمی و سیاسی پالیسی پر مختلف پیرایوں میں بار بار نکتہ چینی کرتے ہیں اور اس بارے میں دوستی کی مروّت کو قطعی حائل نہیں ہونے دیتے۔
بخلاف خواجہ حالی کے کہ وہ سر سید کے نہ صرف مداح بلکہ پیرو بھی ہیں بلکہ ان کی پالیسی کے مبلغ اور منادی بھی۔ ہزار صفحات کی حیات جاوید جو سر سید کی سوانح عمری، اُن کی تعلیمی، سیاسی، اصلاحی، ادبی، معاشرتی، خدمات کے تفصیلی بیان پر حاوی ہے۔ سر سید سے خواجہ حالی کی عقیدت کی شاہد ہے۔

(ج) اکبر تصوف کے دلدادہ ہیں۔ اُن کی صوفیانہ شاعری سے زیادہ ان کے خطوط ان کو ایک صوفی ادیب کی حیثیت میں پیش کرتے ہیں۔
خواجہ حالی جدید تعلیم یافتہ طبقے کے علمائے مذہب میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن کا مذہبی تقشف انہیں تصوف کے دائرے میں آنے سے روکتا رہا۔ سر سید کے ساتھیوں سے تصوف پذیری کی توقع بھی کیسے ہوسکتی ہے۔

(د) اکبر کی جدید شاعری کا زیادہ حصہ ظریفانہ ہے۔ بلکہ اکبر کی ظریفانہ شاعری ہی انہیں فسانۂ ہر بزم و انجمن بنائے ہوئے ہے۔
خواجہ حالی کی شاعری متانت و ثقاہت کے دائرہ سے قدم باہر نہیں نکالتی۔ وہ گفتگو میں ظریف ضرور تھے۔ شاعری میں مرد مقدس نظر آتے ہیں۔

(ھ) اکبر چونکہ ظریف شاعر ہیں اور ظرافت فنی پابندیوں کی پابند نہیں ہوا کرتی، اس لئے وہ اردو گرامر کے قاعدوں کی بالکل پروا نہیں کرتے بلکہ اکثر اوقات ان قاعدوں کو توڑ کر ہی کلام میں ظرافت پیدا کردیتے ہیں۔ مثلاً ؎

"کبریا بہ بخشایشے بر حال بندہ　　　کہ ہستم امیر کمیٹی و چندہ

خواجہ قولاً اردو شاعری کی روز افزوں پابندیوں کے خلاف ہیں لیکن عملاً ان کو توڑنا پسند نہیں کرتے۔ اکبر صرف شاعر ہیں اور حالی شاعر بھی ہیں اور مصنف بھی، مقرر بھی ہیں اور ادیب بھی، تعلیمی رہنما بھی ہیں اور عالم بھی۔

(۲) آزاد کی نثر تنقیدی تجزیہ و تحلیل کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اس نثر میں جو خوبیاں پائی جاتی ہیں بیان نہیں کی جاسکتیں۔ آزاد کی نثر کو دیکھ کر علمائے معانی و بیان کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ بلند کلام میں جو خوبیاں پائی جاتی ہیں، بیان نہیں کی جاسکتیں۔ "تو جدو لا توصف"
اس کے انداز نگارش میں قدامت کی جھلک موجود ہے۔ لیکن تلمیحات و تشبیہات اور دلکش استعارات سے کلام کو الہام بنا دیتا ہے۔
جس انداز میں اردو زبان کی ابتدائی درسی کتابیں تصنیف کی ہیں ایسی عام فہم رنگ میں فلسفہ زبان جیسے دقیق مسئلے پر اظہار خیالات

کرنے پر بھی قادر ہے۔ اسی سہل زبان اور انداز بیان میں تاریخی نکتہ آفرینیاں بیان کر جاتا ہے۔ پھر یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ایسی آسان زبان اور سہل انداز بیان میں لکھ کر ہم بھی آزاد جیسی نثر لکھنے کی جرأت کرسکتے ہیں۔ بالکل نہیں، اس کی نثر تو سہل الممتنع ہے آسان معلوم ہوتی ہے لیکن اس کا تتبع اور پیروی دشوار۔ حد درجہ دشوار ہے۔

مرزا غالب کی نثر نصف صدی کے بعد بھی نئی ہے اور شاید ہمیشہ نئی رہے گی۔

اس کے چھوٹے چھوٹے دلکش فقرے، اچھوتی تراکیب، نئے نئے انداز کی تراش خراش، اسلوب ادا، جدت بیان نے اس کی نثر کے فقروں کو جاندار بنا دیا ہے۔ ذوق بصیرت کے وہ فقرے کاغذ پر تڑپتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جہاں کہیں کسی خط کی عبارت کے کچھ فقرے مسجع و مقفی ہیں ان میں بھی رنگ قدامت و انداز بیان کی جدت نے مغلوب و مستور کر دیا ہے۔ یقیناً غالب کی نثر بھی اس کی شاعری کی طرح سہل الممتنع ہے۔

آزاد اور غالب کی ادبی حیثیتوں میں امتیاز یہ ہے کہ آزاد نثر کا شہنشاہ مطلق العنان ہے اور شاعری کے کوچے کا فقیر۔ مرزا غالب نظم، نثر دونوں قلمروں میں کوسِ "لمن الملک الیوم" بجا رہا ہے۔

(۳) خواجہ کی قدیم شاعری زیادہ تر غزلیات پر مشتمل ہے۔ حالی کی غزل نگاری کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

(۱) جذبات میں پاکیزگی اور متانت بلکہ ثقاہت ہے۔

(۲) خیالات میں غالب کی سی رفعت تو نہیں البتہ پستی سے ملوث نہیں۔ اپنے معاصرین میں داغ کی سی عامیانہ معاملہ بندی سے اجتناب کرتے ہیں۔ زبان داغ کی زبان کی طرح صیقل نہیں اور روزمرہ داغ کے روزمرہ کی برابری نہیں کرتا۔ ہاں واردات عشق کے اظہار میں داغ سے بہت بلند اور ممتاز ہیں۔ پختہ مشقی اور قادر الکلامی، آمد اور اثر حالی کی غزلیات میں بہت ہے مگر بعض اوقات غزل کو اخلاقی وعظ بنا کر اس میں بے لطفی پیدا کر دیتے ہیں۔ ابتذال سے حالی کا کلام یکسر معرّیٰ و منزّہ ہے۔

شعر کی تعمیر میں داخلی عنصر سے زیادہ مدد لیتے ہیں۔

حالی غزل میں ایک رفیع الرتبت ثقہ اور پاکباز عاشق کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کا کلام خیالات ہوا و ہوس سے خالی ہے۔ حالی کی غزلیات میں اوّل درجے کے اشعار جنہیں حالی کے نشتر کی حیثیت دی جا سکتی ہے، کم نہیں ہیں۔ معاصرین کے کلام سے نسبتاً بہت زیادہ ہیں۔

(۴) پنجاب ایڈوائزری بورڈ پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی سے کچھ مختلف چیز نہیں۔ بلکہ ع

"وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے"

اس نے کچھ کیا تھا نہ بظاہر حال اس سے کچھ کرنے کی امید۔ اردو کورس کی جدید سکیم موجودہ فضا میں ناممکن العمل تھی۔ اس لئے معرض التوا میں ہے۔ نئی اسکیم کی کامیابی کے لئے دو باتوں کی ضرورت ہے:

(۱) رازداری۔ اس کے بغیر نئی اسکیم ایک تماشے سے زیادہ کچھ نہیں رہ جاتی۔ لیکن رازداری اس فضا میں عنقا کا حکم رکھتی ہے۔ بعض پبلشنگ فرمیں اس محکمے کی جزئیات تک عالم الغیب ہیں۔ محکمے کا ہر راز ان فرموں کی تلاش میں رہتا ہے۔ پھر جب یہ صورت ہو تو اسکیم کیونکر کامیاب ہو سکتی ہے۔

سوالات

(۱) کیا یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ غیر مقفیٰ شاعری عنقریب مرّوج شاعری کی جگہ لے لے گی؟

(۲) ہندی نہایت سرعت کے ساتھ ملک میں پھیلتی جا رہی ہے۔ ہندی فلمیں، ہندی ریکارڈ عوام پر گہرا اثر ڈال رہے ہیں کیا کوئی

ایسا آسان ذریعہ ہے جس سے اُردو زبان کی حفاظت کی جائے اور ہندی کی بڑھتی ہوئی رَو کو روکا جائے؟

(۳) اکثر اُردو رسالوں اور اخباروں کا معیار بہت گرا ہوا ہے لیکن وہی ملک میں کثرت سے فروخت ہوتے ہیں جس سے پبلک کا مذاق بگڑتا چلا جا رہا ہے اگر ان اخبارات اور رسالہ جات کی طرف نامور شعرا اور مضمون نگار توجہ دیں تو تھوڑے ہی عرصہ میں ان کا معیار بلند کیا جا سکتا ہے آپ کی اس کے متعلق کیا رائے ہے؟ —— شیخ محمد طفیل از شملہ

(۴) میں منشی فاضل کا امتحان دینا چاہتا ہوں، فارسی ادب سے مجھے ابتدا سے دلچسپی ہے، ایف اے میں بھی فارسی لے رکھی تھی۔ مگر بی اے کورس سے خائف ہوں کیونکہ عربی میں نے بالکل نہیں پڑھی۔ امتحان میں چھ سات مہینے رہ گئے ہیں، کوئی ترکیب ایسی بتائیے کہ عربی کورس کے پرچے میں فیل ہونے سے بچ جاؤں۔ —— امرت لال منتظر مڈل اسکول ملتان

(۵) حضرت جگر کا پتہ مطلوب ہے۔ آپ کو معلوم ہو تو مطلع فرما کر ممنون کیجیے۔ —— غلام محمد نسیم ہوشیارپور

(۶) کلیات سودا میں سودا کے قصیدے کا ایک شعر ہے جس کا دوسرا مصرعہ سمجھ میں نہیں "ان گلوں پھٹ جونکے ہیں سدا مستقیم" اس میں پھٹ کے کیا معنی ہیں؟ —— رام لال ہیچر مڈل سکول ڈیرہ غازی خاں

جوابات

(۱) زندگی کا ہر پہلو آزادی کی نعمت سے شاد کام ہو رہا ہے تو اُردو نے ہی کیا قصور کیا ہے کہ اُسے ردیف اور قافیے کی زنجیروں میں گرفتار رکھا جائے۔ بے قافیہ نظموں سے شعرا کی دلچسپی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اچھی بے قافیہ نظمیں بلند پایہ اُردو رسائل میں شایع ہوتی رہتی ہیں۔ جدت پسند نوجوان شعرا کی توجہ ادھر مبذول ہوتی جاتی ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ بے قافیہ شاعری قبولیت عام حاصل کرے گی۔ انجمن ارباب علم پنجاب کے ذریعے میں نے بے قافیہ نظموں کو رواج دینے کی مسلسل کوشش کی تھی۔ اس کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اب بے قافیہ نظمیں اجنبی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتیں۔ ضرورت یہ ہے کہ پختہ مشق اور قادر الکلام اردو شعرا ادھر توجہ کریں کیونکہ بے قافیہ نظم میں ترنم اور نغمہ پیدا کرنا آسان نہیں۔ نظم میں زیادہ تر قافیہ ترنم کا کفیل ہوتا ہے۔ قافیہ اُڑا کر نظم میں ترنم پیدا کرنا بہت مشکل کام ہے پختہ مشق اور قادر البیان شعرا ایسی نظموں میں قافیے کی ترنم ریزی کا نعم البدل پیدا کر سکتے ہیں خام مشق نوجوانوں کے بس کی یہ بات نہیں بلکہ مجھے تو اندیشہ ہے کہ اگر خام مشق نوجوانوں نے بے قافیہ نظموں کی جانب زیادہ توجہ مبذول کر دی تو یہ صنف کبھی سرسبز ہی نہ ہو سکے گی۔

(۲) ہندی کی بڑھتی ہوئی رَو کو روکنا بہت خیالی ہے۔ ہندی اگر واقعی سُرعت کے ساتھ بڑھ رہی ہے تو بہت مبارک ہے وہ بھی آخر ہمارے دیس کی بولی ہے اور علمی سرمائے کی مالک اس کی ترقی سے ہر ہندوستانی کو خوش ہونا چاہیئے۔ ہندی کو اُردو کا حریف تصوّر کرنے کی بجائے اس کی بہن خیال کرنے کی ضرورت ہے۔ اُردو کی اشاعت زیادہ تر ہندو مصنفین، ہندو پبلشروں اور ہندو صحافت سے اشاعت پذیر ہو رہی ہے اور اُردو ادب ہندو شعرا وادبا کی تربیت و سرپرستی کا ابتدا سے مرہون منت رہا ہے اور اب بھی ہے۔ ہمیں ہندی فلموں اور ریکارڈوں کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ بلکہ مسلمان طلبا اور اہل ذوق کو ہندی سیکھنی اور اپنی بساط بھر ہندی کی اشاعت میں سعی کرنی چاہیئے

اُن لوگوں سے جو ہندی کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں صرف وہاں اختلاف ہوتا ہے جب وہ اُردو کو مٹانے کے خواب ہائے پریشاں دیکھنے لگتے ہیں۔ ہندو مسلمان اُردو ہندی دونوں کو اپنا کر دونوں کے نشر و اشاعت کی سعی کریں تو دونوں زبانوں کے لئے بہتر ہو ادبیات میں پالیٹکس کو داخل کر کے اُردو ہندی کی مخالفت وہ لوگ کرتے ہیں جنہیں خانہ جنگی میں لطف آتا ہے۔

(۳) ملکی غلامی کا اثر ہماری زندگی کے تمام پہلوؤں پر طاری ہے تو ہمارا لٹریچر اس سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہے۔ پست نگاری، بیہودہ نگاری عریاں نگاری جدید تعلیم یافتہ نوجوان پسند کرنا چھوڑ دیں تو پست معیار پرچوں پر مرگ عام طاری ہو جائے۔

ہمارے نوجوان تعلیم حاصل کر رہے ہیں مگر تربیت سے محروم ہیں۔ ان کی سوسائٹی تہذیب و متانت سے عموماً پاک ہوتی ہے۔ ادھر انگریزی تعلیم کی مصروفیت نے انہیں ملکی زبانوں کی صحیح تعلیم سے بے بہرہ کر رکھا ہے۔ فارسی، عربی زبانیں اُردو کے پیکر میں رُوح کا درجہ رکھتی ہیں ان زبانوں کے بغیر علمی و ادبی اُردو سے استفادہ دشوار ہے اور عربی و فارسی کی جگہ تعلیمات میں فرنچ، پولٹیکل سائنس اور جرمن لے رہی ہے مزید براں یہ ہے کہ ادبی اُردو عربی فارسی کے مغلق الفاظ سے بھرتی چلی جاتی ہے اِن مشکلات کی موجودگی میں نوجوان بلند معیار پرچوں سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے اور مجبور ہو کر پست معیار پرچوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان موقت الشیوع گوک شاستروں کو ترویج عام کا موقعہ مل جاتا ہے۔ اور اِسی مطالعے کا نتیجہ ہے کہ نوجوانوں میں آوارگی پیدا ہو رہی ہے اِس مصیبت کا علاج اِن مشکلات کے ازالے میں مضمر ہے مگر میں جانتا ہوں کہ یہ ازالہ اُردو کے مقدر میں نہیں ہے۔

(۴) آپ لگ کے محنت کریں تو منشی فاضل کا باقی نصاب چھ سات مہینے میں تیار کر سکیں گے اور عربی بی اے کورس سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں، منشی فاضل کے بچانوے فی صدی کامیاب اُمیدوار اسے رٹ رٹا کر پاس ہو جاتے ہیں آپ بھی کورس کی عبارت اور اُس کا اُردو ترجمہ طوطے کی طرح رٹ لیجئے "پڑھو جا رام جی کریں گے" اٹک بیٹھ گئی تو اس پرچے میں بھی پاس ہو جائیں گے۔ اصل یہ ہے کہ فارسی زبان آسان ہے چند ماہ میں بقدر کامیابی امتحان آسکتی ہے لیکن عربی کے لئے کچھ سال ضرور لگانے پڑتے ہیں۔ آپ کے پاس نہ اتنا وقت نہ شاید آپ کو اس کی ضرورت کہ عربی زبان کو پڑھنے کی طرح پڑھیں پھر خائف ہونے کی کوئی وجہ نہیں، سارا کورس رٹنے میں دماغ پر غیر معمولی بوجھ تو پڑے گا مگر اس کے بغیر چارہ کار بھی کیا ہے؟ میرے خیال میں تو منشی فاضل کے نصاب میں عربی بی اے کورس داخل کرنا بے سود بلکہ اُمیدواران کے لئے ہمت آزما بھی ہے خصوصاً ایسی صورت میں کہ منشی اور منشی عالم پاس کئے بغیر بھی ہر شخص منشی فاضل کے امتحان میں شریک ہو سکتا ہے۔ اِس نصاب میں اِسے شامل کرنے کا غالباً یہ مقصد تھا کہ فارسی ادب میں چونکہ عربی الفاظ و خیالات کا عنصر زیادہ ہے۔ اِس لئے عربی بی۔ اے کورس پڑھنے سے اُمیدواروں میں بلند فارسی کتابوں کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہو جائے گی لیکن یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا تھا کہ نیچے کے درجوں کے امتحانات پاس کرنے ضروری قرار دیئے جائیں اور اس طرح طلبا کو عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملتا پھر البتہ اُن کے لئے منشی فاضل میں عربی کورس . . . کا سمجھنا اور پڑھنا آسان ہو سکتا تھا جب ایسا نہیں ہے تو عربی کورس کا اس کے نصاب میں داخل کرنا اُمیدواران امتحان کے دماغوں کو رٹنے کی سزا دینے کے برابر ہے۔

(۵) حضرت جگر جہانیاں جہاں گشت ہیں۔ اُن کا کوئی مستقل پتہ نہیں بتا سکتا۔ آپ جامعہ ملیہ کے کتبخانہ کے مینیجر صاحب سے دریافت فرمائیے؛ شاید انہیں اُن کا پتہ معلوم ہو یا پھر اُن کے دوست شیخ اصغر حسین صاحب مختار مین پوری (یو۔ پی) سے اُن کا موجودہ پتہ مل سکے گا۔

(۶) "پھٹ" "چھوڑ" کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ یعنی اُن پھولوں کو چھوڑ کے۔ اُن کے علاوہ جو ہمیشہ دیکھنے میں آتے ہیں "پھٹ" کا لفظ اب متروک الاستعمال الفاظ میں شامل ہے۔

سوالات

(۱) مندرجہ ذیل سوالات کا جواب مطلوب ہے:۔

(۱) اکبر الہ آبادی کا اردو شعرا میں کیا درجہ ہے؟ کلام اکبر کے محاسن و معائب پر ایک اجمالی نظر ڈالیں۔ رباعیات و قطعات کے علاوہ اکبر کے کلام کا بیشتر حصہ ابتذال سے پُر ہے۔ کیا آپ کی نظر میں حضرت اکبر بھی "ذوقی" ہیں یا نہیں؟

(۲) مندرجہ ذیل الفاظ کی تذکیر و تانیث مشتبہ ہو رہی ہے۔ ان میں اکثر دونوں طرح مستعمل ہیں۔ آپ اپنی قیمتی رائے سے

آگاہ کریں۔ فکر۔ طرز۔ سانس۔ لغات۔ موڑ۔ تار۔

نیازمند، چرنجی لال گپتا آستش بی اے موگا پور ضلع فیروزپور

(۲) بہ سلسلہ سوال و جواب ماہ فروری ۲۷ء عرض ہے کہ:
اصل لفظ ندی بغیر تشدید دال ہے یہ لفظ بھاشا کا ہے۔ اس میں نون مفتوح اور دال مکسور ہے۔ گوسائیں تلسی داس فرماتے ہیں ؎

تلسی اس سنسار میں بھانت بھانت کے لوگ　　سب سے مل جل بیٹھئے ندی ناؤ سنجوگ

ہندی کے ایک اور مستند شاعر کا دوہا ہے ؎

ندی کنارے دھواں اُٹھت ہے میں جانوں کچھ ہوئے　　جا کارن جوگن بنی، وہی جلتا ہوئے

چڑی چونچ بھر لے گئی ندی نہ گھٹیو نیر　　(بھگت کبیر)

ندیاں بصورت جمع بھی بغیر تشدید بالکل درست ہے اور لکھنا چاہیئے مثلاً ؎

کہیں بگلوں سے اِک بارش سی ہے سیمیں ہولیوں کی　　کہیں سرسوں سے ندیاں بہہ رہی ہیں زرد پھولوں کی

بعض شعراء اسے مشدد لکھتے ہیں مگر اس کے جواز میں کوئی سند نہیں ملتی اسے ان کا تصرف یا بھول چوک سمجھ لیجیے۔ خیر یہ تصرف تو مذاق سلیم کو گراں نہیں گزرتا اگر کوئی ندی بہ تشدید دال لکھ دے تو غلط نہیں۔ مگر بعض جگہ یہ تصرف بہت برا معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً بھاشا کا لفظ گنگا ہے بہ سکون گاف تمام ہندوستان میں لکھا اور بولا جاتا ہے استاد ذوق نے اسے گنگا نظم کیا ہے (اس طرح میں) جو قابل تسلیم و تقلید نہیں ہے

——— خزاں (جہلم)

(۳) (ا) پہلے لوگوں کا خیال تھا آسمان چکر کاٹتا ہے۔ لیکن اب یہ نظریہ غلط ثابت ہو چکا ہے اس لئے "گردش گردوں" کہنا صحیح ہے یا نہیں اسی طرح کے کئی محاورات ہیں ان کا استعمال کہاں تک جائز ہے؟

(ب) آندھیاں چلنا درست ہے یا آندھیاں آنا ہے

اب زمیں ہلنے کو ہے اور آندھیاں آنے کو ہیں

(ج) "میں نے وہ الفاظ سادگی سے استعمال کئے، کسی کے دل کو دکھانا منظور نہ تھا" کیا یہاں سادگی کے معنی غلطی سے ہیں یا کچھ اور۔ اصل مطلب کیا ہے؟

شیخ محمد طفیل (امرتسر)

(۴) مجھے شاعر بننے کا شوق ہے، لیکن شعر نہیں کہہ سکتا۔ اس معاملے میں میری راہنمائی فرمائیں۔

——— حافظ رفیع الدین

(۵) اس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا شاعر کون ہے اور اس کے بعد کون ہوگا؟ ——— ایم شفیع

(۶) ہندوستان میں صحیح قوم پرست اخبار کون کون سے ہیں۔ ——— جیون لال

(۷) میں عامل کریم الدین سے ملنا چاہتا ہوں آپ کی کیا رائے ہے؟ ——— شاہ محمد

(۸) میں "مخزن" کا خریدار بننا چاہتا ہوں، براہ کرم اس کے دفتر کا پتہ تحریر کرکے ممنون فرمایئے۔ ——— جوہر اعظمی

(۹) مولانا سیماب کی شاعری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ ——— نذیر احمد شاد بی اے ملتان

جوابات

(۱) لسان العصر خان بہادر سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی ایک مشرقی ماحول میں پیدا ہوئے، مشرقی تہذیب میں انہوں نے تربیت

ہمارے نوجوان تعلیم حاصل کر رہے ہیں مگر تربیت سے محروم ہیں۔ ان کی سوسائٹی تہذیب و متانت سے عموماً پاک ہوتی ہے۔ ادھر انگریزی تعلیم کی مصروفیت نے انہیں ملکی زبانوں کی صحیح تعلیم سے بے بہرہ کر رکھا ہے۔ فارسی عربی زبانیں اُردو کے پیکر میں رُوح کا درجہ رکھتی ہیں ان زبانوں کے بغیر علمی و ادبی اُردو سے استفادہ دشوار ہے اور عربی و فارسی کی جگہ تعلیمات میں فرنچ، پولٹیکل سائنس اور جرمن لے رہی ہے مزید برآں یہ ہے کہ ادبی اُردو عربی فارسی کے مغلق الفاظ سے بھرتی چلی جاتی ہے اِن مشکلات کی موجودگی میں نوجوان بلند معیار پرچوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے اور مجبور ہو کر پست معیار پرچوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان موقت الشیوع کوک شاستروں کو ترویج عام کا موقعہ مل جاتا ہے۔ اور اسی مطالعے کا نتیجہ ہے کہ نوجوانوں میں آوارگی پیدا ہو رہی ہے اِس مصیبت کا علاج اِن مشکلات کے ازالے میں مضمر ہے مگر میں جانتا ہوں کہ یہ ازالہ اُردو کے مقدر میں نہیں ہے۔

(۴) آپ لگ کے محنت کریں تو منشی فاضل کا باقی نصاب چھ سات مہینے میں تیار کر سکیں گے اور عربی بی اے کورس سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں۔ منشی فاضل کے پچانوے فی صدی کامیاب اُمیدوار اسے رٹ رٹا کر پاس ہو جاتے ہیں آپ بھی کورس کی عبارت اور اُس کا اُردو ترجمہ طوطے کی طرح رٹ لیجیے "پڑھیے جا رام جیلی کریں گے" تک بیٹھ گئی تو اس پرچے میں بھی پاس ہو جائیں گے۔ اصل یہ ہے کہ فارسی زبان آسان ہے چند ماہ میں بقدر کامیابی امتحان آسکتی ہے لیکن عربی کے لئے کچھ سال ضرور لگانے پڑتے ہیں۔ آپ کے پاس نہ اتنا وقت نہ شاید آپ کو اس کی ضرورت کہ عربی زبان کو پڑھنے کی طرح پڑھیں پھر خائف ہونے کی کوئی وجہ نہیں، سارا کورس رٹنے میں دماغ پر غیر معمولی بوجھ تو پڑے گا مگر اس کے بغیر چارہ کار بھی کیا ہے؟ میرے خیال میں تو منشی فاضل کے نصاب میں عربی بی اے کورس داخل کرنا بے سود بلکہ اُمیدواران کے لئے ہمت آزما بھی ہے خصوصاً ایسی صورت میں کہ منشی اور منشی عالم پاس کئے بغیر بھی ہر شخص منشی فاضل کے امتحان میں شریک ہو سکتا ہے۔ اِس نصاب میں اِسے شامل کرنے کا غالباً یہ مقصد تھا کہ فارسی ادب میں چونکہ عربی الفاظ و خیالات کا عنصر زیادہ ہے۔ اِس لئے عربی بی۔ اے کورس پڑھنے سے اُمیدواروں میں بلند فارسی کتابوں کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہو جائے گی لیکن یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا تھا کہ نیچے کے درجوں کے امتحانات پاس کرنے ضروری قرار دیئے جائیں اور اس طرح طلبا کو عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملتا پھر البتہ اُن کے لئے منشی فاضل میں عربی کورس . . . . کا سمجھنا اور پڑھنا آسان ہو سکتا تھا جب ایسا نہیں ہے تو عربی کورس کا اس کے نصاب میں داخل کرنا اُمیدواران امتحان کے دماغوں کو رٹنے کی سزا دینے کے برابر ہے۔

(۵) حضرت جگر جہانیاں جہاں گشت ہیں۔ اُن کا کوئی مستقل پتہ نہیں بتا سکتا۔ آپ جامعہ ملیہ کے کتبخانہ کے مینجر صاحب سے دریافت کیجیے! شاید انہیں اُن کا پتہ معلوم ہو یا پھر اُن کے دوست شیخ اصغر حسین صاحب مختار مین پوری (یو۔ پی) سے اُن کا موجودہ پتہ مل سکے گا۔

(۶) "چھٹ" چھوڑ کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ یعنی اُن پھولوں کو چھوڑ کے۔ اُن کے علاوہ جو ہمیشہ دیکھنے میں آتے ہیں "چھٹ" کا لفظ اب متروک الاستعمال الفاظ میں شامل ہے۔

سوالات

(۱) مندرجہ ذیل سوالات کا جواب مطلوب ہے:۔

(۱) اکبر الہ آبادی کا اردو شعرا میں کیا درجہ ہے؟ کلام اکبر کے محاسن و معائب پر ایک اجمالی نظر ڈالیں۔ رباعیات و قطعات کے علاوہ اکبر کے کلام کا بیشتر حصہ ابتذال سے پُر ہے۔ کیا آپ کی نظر میں حضرت اکبر بھی "ذوقی" ہیں یا نہیں؟

(۲) مندرجہ ذیل الفاظ کی تذکیر و تانیث مشتبہ ہو رہی ہے۔ ان میں اکثر دونوں طرح مستعمل ہیں۔ آپ اپنی قیمتی رائے سے

آگاہ کریں۔ فکر۔ طرز۔ سائنس۔ لغات۔ موٹر۔ تار۔

نیازمند، چرنجی لال گپتا آنتش بی اے موگا پور ضلع فیروز پور

(۲) بہ سلسلہ سوال و جواب ماہ فروری ۳۷ء عرض ہے کہ:
اصل لفظ ندی بغیر تشدید دال ہے یہ لفظ بھاشا کا ہے۔ اس میں نون مفتوح اور دال مکسور ہے۔ گوسائیں تلسی داس فرماتے ہیں ؎
تلسی اس سنسار میں بھانت بھانت کے لوگ — سب سے مل جل بیٹھئے ندی ناؤ سنجوگ

ہندی کے ایک اور مستند شاعر کا دوہا ہے ؎
ندی کنارے دھواں اٹھت ہے میں جانوں کچھ ہوئے — جا کارن جوگن بنی، وہی نہ جلتا ہوئے
پہ جڑی چوپنچ بھرے گئی ندی نہ گھٹیو نیر — (بھگت کبیر)

ندیاں بصورت جمع بھی بغیر تشدید بالکل درست ہے اور لکھنا چاہیئے مثلاً ؎
کہیں بگلوں سے اک بارش سی ہے سیمیں پروبال کی — کہیں سرسوں سے ندیاں بہہ رہی ہیں زرد پھولوں کی

بعض شعراء اسے مشدد لکھتے ہیں مگر اس کے جواز میں کوئی سند نہیں ملتی ماسوائے ان کا تصرف یا مقبول چوک سمجھ لیجئے۔ خیر یہ تصرف تو مذاقِ سلیم کو گراں نہیں گزرتا اگر کوئی ندی بہ تشدید دال باندھے تو غلط نہیں۔ مگر بعض جگہ یہ تصرف بہت برا معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً بھاشا کا لفظ گنگا ہے بہ سکون کاف تمام ہندوستان میں لکھا اور بولا جاتا ہے استاد ذوق نے اسے گنگا نظم کیا ہے (سہرے میں) جو قابلِ تسلیم وتقلید نہیں ہے
——— خنداں (جہلم)

(۳) (ا) پہلے لوگوں کا خیال تھا آسمان چکر کاٹتا ہے لیکن اب یہ نظریہ غلط ثابت ہو چکا ہے اس لئے "گردش گردوں" کہنا صحیح ہے یا نہیں اسی طرح کے کئی محاورات ہیں ان کا استعمال کہاں تک جائز ہے؟
(ب) آندھیاں چلنا درست ہے یا آندھیاں آنا ؎
اب زمیں ہلنے کو ہے اور آندھیاں آنے کو ہیں
(ج) "میں نے وہ الفاظ سادگی سے استعمال کئے کسی کے دل کو دکھانا منظور نہ تھا"، کیا یہاں سادگی کے معنی غلطی سے ہیں، یا کچھ اور۔ اصل مطلب کیا ہے؟
شیخ محمد طفیل (امرتسر)

(۴) مجھے شاعر بننے کا شوق ہے، لیکن شعر نہیں کہہ سکتا۔ اس معاملے میں میری راہنمائی فرمائیں۔
——— حافظ رفیع الدین

(۵) اس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا شاعر کون ہے اور اس کے بعد کون ہوگا؟ ——— ایم شفیع

(۶) ہندوستان میں صحیح قوم پرست اخبار کون کون سے ہیں۔ ——— جیون لال

(۷) میں عامل کریم الدین سے ملنا چاہتا ہوں آپ کی کیا رائے ہے؟ ——— شاہ محمد

(۸) میں "مخزن" کا خریدار بننا چاہتا ہوں، براہ کرم اس کے دفتر کا پتہ تحریر کر کے ممنون فرمایئے۔ ——— جمیرا عظمی

(۹) مولانا سیماب کی شاعری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ ——— نذیر احمد شاد بی اے ملتان

جوابات

(۱) لسان العصر خان بہادر سید اکبر حسین الہ آبادی ایک مشرقی ماحول میں پیدا ہوئے، مشرقی تہذیب میں انہوں نے تربیت

پائی۔ مذہب کے زیر سایہ زندگی بسر کی۔
مشرق و مغرب کی تہذیبوں کا تصادم اور اس تصادم میں مشرقی تہذیب کی پس پائی۔ اس کے ساتھ مذہب سے عام بے اعتنائی
کے مناظر نے ان کے احساس کو مجروح کیا۔ ان کی شاعری درحقیقت مغرب زدگی اور مغربی تہذیب کی پرستاری کے خلاف ایک صدائے
احتجاج ہے جسے کبھی رو کر اور کبھی ہنس کر بلند کرتے ہیں۔
ان کے نزدیک خدا، مذہب، ضمیر، کیرکٹر اور مشرقیت کو مغربی تعلیم و تہذیب نے رخصت کر دیا ہے۔ انسانیت اس تہذیب کی
کورانہ تقلید سے دکھ اٹھا رہی ہے۔ اکبر کی ساری شاعری انہیں شکایات کا دفتر ہے۔
اکبر کی قدیم غزلیات میں ابتذال اور پرانی شاعری کی بعض بدنما ادائیں موجود ہیں۔ لیکن جدید کلام (نظمیں ہوں یا غزلیات)
بھرتی سے پاک ہے۔
البتہ چونکہ اکبر خدا اور مذہب سے بے اعتنائی، مغرب پرستی اور مشرقیت کی موت کے متعلق بار بار مختلف پیرایوں میں اظہار
خیال کرتا ہے۔ اس لئے تکرار خیالات کے سبب اکبر کا کلام مسلسل طور پر اکتائے بغیر نہیں پڑھا جاتا۔
البتہ اکبر ذوقؔ (ذوق کا پیرو) ہرگز نہیں۔ ذوقؔ کا کلام تو صنعتوں کا ایک انبار ہے۔ فرسودگی، پست نوائی، بے کیفی اس کی
شاعری کے بڑے بڑے نقائص ہیں اور اکبر کا کلام خصوصاً جدید کلام ان معائب سے قطعیۃً پاک ہے۔
(ب) فکر اور طرز مؤنث ہے۔ موٹر جدید لفظ ہے اور جدید مغربی الفاظ کی تذکیر و تانیث میں ملک کے اُن حصوں کی پیروی کرنی چاہیئے
جن میں یہ چیزیں اور ان کے نام پہلی مرتبہ آئے اور زیادہ آئے۔ پنجاب میں موٹر کا لفظ مؤنث ہے اور یہی صحیح ہے۔ البتہ تار کا لفظ
بھی یہاں مؤنث ہی بولا جاتا ہے اور غلط ہے کیونکہ تار سارے ہندوستان میں ایک ساتھ آیا اور دلی، لکھنؤ والوں نے اسے مذکر
بولنا شروع کیا۔ تار کو مذکر ہی بولنا چاہیئے۔ اس کی جمع تاریں غلط ہے۔
سانس لکھنؤ میں مؤنث بولا جاتا ہے ؎
"سانس دیکھی تنِ بسمل میں جو آتے جاتے — اور چرکا دیا جلاد نے جاتے جاتے
دہلی میں مذکر بولا جاتا ہے۔ اہل پنجاب تذکیر و تانیث میں عموماً دہلی کے پیرو ہیں۔
لغات مؤنث ہے۔
(۲) ندی بہ تخفیف دال بھاشا کا تلفظ ہے اردو کا نہیں۔ اردو میں بہ تشدید دال فصیح ہے۔ اگرچہ بہ تخفیف دال بھی غلط نہیں۔
گنگنا بہ سکون کاف صحیح ہے بہ فتحہ کاف فارسی غلط ہوگا۔
(۳) (الف) محاورات جس نظریہ یا خیال پر اول اول وضع کئے گئے ہیں انہیں کے مطابق اُن کا استعمال صحیح ہو سکتا ہے خواہ وہ نظریہ غلط ہی
ثابت ہو چکا ہو۔ اس لئے "گردش گردوں" بالکل صحیح ہے۔
(ب) آندھیاں چلنا۔ آنا اور اُٹھنا ہر طرح درست محاورہ ہے۔ ع
"اب زمیں ہلنے کو ہے اور آندھیاں آنے کو ہیں"
یہ بھی درست ہے۔
(ج) یہ فقرہ بھی درست ہے۔ سادگی سے یہاں مراد بے خبری اور انجان پن ہے۔
(۴) آپ کو شاعری کا بہت شوق ہے۔ خدا رحم کرے۔ شعر کہنا چاہتے ہیں اور کہہ نہیں سکتے۔ واقعی آپ کی قابلِ رحم حالت ہے۔ مجھے آپ سے

بڑی ہمدردی ہے۔ خدارا اس شوقِ ناروا کو اپنی بیماری نہ بنا لیجئے! شاعر نہ ہونا آدمیت کا کوئی نقص نہیں ہے۔ نہ تعزیراتِ ہند میں کوئی ایسی دفعہ ہے کہ:

"جو شاعر نہ ہو یا نہ بننا چاہے دو سال کی قیدِ سخت کا مجرم ہے۔"

اردو شاعری کا انجام گداگری یا پھر فاقہ کشی ہوتا ہے۔ آپ کو اس انجام کا کون سا پہلو پسند ہے۔ میری رائے تو یہی ہے کہ اپنے اوپر رحم کیجئے اور اس نیت سے باز آجائیے۔

نیز اردو شاعری تو شادی کی طرح "بور کے لڈو" ہیں جو کھائے پچھتائے اور جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے۔ اگر یہ سودا آپ کے سر سے بغیر نہ مانے تو شاعر بننے کے منحوس وقت آنے سے پہلے افیم کی ایک بڑی سی گولی کھا کر سو رہیئے!

(۵) اس وقت اردو کا سب سے بڑا شاعر اقبال ہے۔ اور اس کے بعد" کا جواب یہ ہے کہ "آپ اور میں"

(۶) صحیح معنی میں قوم پرست اردو اخبارات ہندوستان میں بہت کم ہیں۔ روزنامہ ہند کلکتہ، ریاست دہلی اور پارس لاہور۔ یہ ہر سہ اخبارات قوم پرست ہیں اور ان کی پالیسی تو اپر تا نہ ہے۔ اُسے نبا ہتے بھی ہیں۔

(۷) "آپ عامل کریم الدین سے ملنا چاہتے ہیں" اس میں میرے مشورے کی کیا ضرورت ہے! مل لیجئے! آپ ہی جیسے شردھالوؤں سے عامل کریم الدین کی دکان چل رہی ہے اپنے وجود کو بے کار نہ سمجھئے کہ خدا نے کوئی چیز بیکار پیدا نہیں کی۔

لیکن عامل کریم الدین سے شرفِ نیاز حاصل کرنے کا جو ہیضہ آپ کو ہوا ہے پہلے اس بیماری کا علاج کرائیے۔ بہتر تو یہ ہے کہ پہلے اپنے دماغ کا معائنہ ضرور کرا لیجئے، مبادا دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہو گیا ہو!

(۸) "آپ مخزن کے خریدار بننا چاہتے ہیں" شوق سے بن جائیے! البتہ لاہور میں سے اس کا دفتر مدت ہوئی منتقل ہو چکا ہے اُسے لاہور میں تلاش کرنے کی بجائے آپ کو ملکِ عدم تشریف لے جانے کی زحمت فرمانی پڑے گی۔

(۹) علامہ سیماب ملک کے چند در چند منتخب شعراء میں شمار ہوتے ہیں، ان کی شاعری بلند خیالات، پاکیزہ جذبات اور دل نشیں تغزل کی سرمایہ دار ہے۔ اُن کی غزلیات شاداب زمینوں، بولتے ہوئے قافیوں اور فلسفیانہ نکتہ آرائیوں سے غزل گو معاصرین میں درجۂ امتیاز رکھتی ہیں اُن کی بعض نظموں اور غزلیات کے متعدد اشعار پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں۔ اگرے کی بجائے لاکور کے باشندے ہوتے تو پیغمبر بے کتاب بنا دیئے جاتے۔ "کارِ امروز" اور "کلیم عجم" ان کے ساحرانہ کارنامے ہیں۔ افسوس ہے کہ ایسا باکمال سحر کار اس عالمِ ضعیفی میں زندگی کی کشاکش سے دوچار ہے ؂

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

یہ افسوس زیادہ دل گداز بن جاتا ہے جب بے مایہ اور فرومایہ تک بندوں کو عام کالعوام کی پذیرائی اور اس سبب سے زندگی کی کامرانیوں سے ہمکنار دیکھا جاتا ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ ذوقِ سخن فہمی سے اسی قدر دور ہے جتنا گروہ عوام اور تعلیم یافتہ جماعت چونکہ تہذیبِ حاضرہ کی نمایندہ اور علوم و فنون کی حامل ہے۔ اس لئے اس کی بے فہمی اردو شاعروں کے لئے شاعری سے بیزاری کا سبب بن رہی ہے۔

ایک سوال: آیندہ اپریل میں انٹرمیڈیٹ کے اردو پرچے کا امتحان ہوگا براہِ کرم مولینا حالی پر کوئی مختصر مگر حاوی مضمون ضرور شائع کریں تاکہ ہم طلبہ کو اردو امتحان دینے میں سہولت حاصل ہو جائے۔ بشیر احمد، خالصہ کالج امرتسر

جواب: آپ کی فرمائش کی تعمیل میں خواجہ حالی پر ایک مختصر سا مضمون اسی نمبر میں شائع کیا جا رہا ہے۔

سوالات

(۱) محترم علامہ تسلیم ! میں اپنے اردو کورس کے وہ تمام محاورات اور اشعار جو تشریح طلب ہیں یا جن کو ہم لوگ اچھی طرح سمجھ نہیں سکے لکھ کر ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ از راہ مہربانی ان کے جوابات "شاہکار" کے دو نمبروں میں شایع کر دیں

انور بیگ متعلم درجہ دہم زمیندارہ ہائی اسکول گجرات

کہانی	مصنف	محاورہ یا لفظ
خواجہ سگ پرست کی کہانی	میر امن	دانہ گھاس کرنا۔ بڑبڑا جانا۔ ٹھٹھکیانا۔ تاکنہ۔ پاجی پر تل بیٹھنا اور عقل گرگا بننا۔ پھڑ۔ پلیسوتی۔
شہرت عام بقائے دوام کا دربار	آزاد	تقویم کے پترے۔ سپاٹے میں
نیچرل شاعری	حالی	نقشہ اتارنا۔ نقل اتارنا۔ دل سے اتارنا۔ ہاتھ اتارنا۔ پہنچا اتارنا۔ ڈھنڈیا پٹنا۔ کلال کی دکان۔ ماتھا ٹھنکنا۔ اصیل تلوار۔ سروہی۔ چورنگ۔ بطور تفاؤل کے موصل الی المطلوب۔ قرار دیا جانا۔ بچکارنا
فسانۂ مبتلا	نذیر احمد	تتوار کروانا۔ دو ٹوک کی بات سنانا۔ بطریق ادغام۔ تکلفات باردہ۔ بھڑ بھڑیا۔ دوست۔
پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر	فرحت	مغصوبات۔ اخفاق حق۔ شملہ بمقدار علم۔ بکلوس۔ اندھا آنا۔ ٹراوں ٹوں۔ ٹیپ اٹھانا۔ بیگن کے نوکر۔
فسانۂ آزاد	سرشار	اڑھائی چاول گلانا۔ پینترے بدلنا۔ پانچوں گھی میں ہونا۔ ناظورۂ دلفریب۔ کلے ٹھلے کا گھبرو۔ یہاں اندھیر نگری چوپٹ راج ہے۔
ابن الوقت	نذیر احمد	میرا سارا خرچ میرے پندار میں اجلا ہے۔ چکھوتیاں
فسانۂ آزاد	سرشار	ٹیڑھی کھیر۔ سبستے کرنا۔ گدا دینا۔ لام کاف بکنا۔ کنسے تولنا۔ قرولیاں بھونکنا۔ ملو تیتو کرنا۔ وارے نیارے کرنا۔ پرچہ جڑنا۔ جیتی دھولے دھپے کی سند نہیں۔ تنگ آم۔ قمرے گاؤدی
راجہ بان سنگھ	آزاد	غٹ پٹ ہونا۔ فدائی ترازد ہونا۔ ٹوک دم بھاگنا۔ چاروں پٹیاں جھاڑنا۔ سا کھاکیا۔
کہانی	فرحت اللہ بیگ	ٹسوے بہانا۔ بات سے ہاتھ پر اترنا۔ توم ڈالنا۔ کنڈی کروانا۔ چونی بھی کہے مجھے گھی سے کھاؤ۔ نتھرے کا پانی۔ اونٹ رہا ہے بچی لغندری پاکھا۔
توبۃ النصوح	نذیر احمد	لوہے کا چھلا
محروم وراثت	راشد الخیری	دسوں انگلیاں دسوں چراغ۔ دھم ہو جانا۔ بیل منڈھے چڑھنا۔ ہیئت کذائی۔ ہلہلا جانا۔

توصیف کا نواب	راشد الخیری	کاج کی لاج، لوہے کو نرمانا۔ ٹاکم ٹوک اترنا۔ دانت کریدنے کو تنکا نہ ہونا کھیلتا ماتا۔
اصلاح سخن		ٹھرڈ اگٹ

(۲) جناب من بہار ادب حصہ چہارم برائے جماعت ہشتم میں چند ایسی مشکلات ہیں جن کا حل موجودہ لغاتوں سے نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جناب کو تکلیف دی جاتی ہے۔ مہربانی فرماکر حل کرکے مشکور کریں اور ساتھ ہی مشکل الفاظ پر اعراب بھی لگائیں، تاکہ تلفظ بھی معلوم ہو۔"

——— انند کمار بی۔ اے بی ٹی

صفحہ ۵۴ میاں آزاد اور لکھنو کے بانکے :

میاں آزاد ۔ ۔ ۔ ۔ جنٹ وار انگرکھے پہنے۔ لکے وارکتی ہوئی ٹوپیاں سر پر جمائے چست گھٹنے ڈانٹے اکڑ و پٹے ڈھاٹے باندھے ۔ ۔ ۔ دودو ۔ ولایتیاں ۔ ۔ ۔ باڑھیں چڑھی ہوئیں ۔ ۔ بنا رسر ہی شیر بچہ سب سے لیس ۔ ۔ ۔ ان کو تو کچھ کھڑے کی چڑھی تھی ۔ ۔ ۔ غریا مشخص ۔ ۔ ۔ کسیرو اچھالا اور پانچ چھ مرتبہ چھیل ڈالا ۔ ۔ ۔ تلوار کی باڑھ سے دس بارہ کی آنکھ میں سرمہ لگایا ۔ ۔ کھانڈا پھینکے پھینکتے گل کاٹ ڈالا ۔ ۔ ۔ ایک پیالے میں دس کوڑیاں رکھیں اور دو پر نشان بنا دیا۔ دونوں کو تلوار سے پیالے ہی میں کاٹا اور باقی کوڑیاں نلوہ بچ نکلیں۔ پہلوان اینڈتے ہوئے نکلے چٹ لنگوٹ باندھے ۔ ۔ ۔ ایک کسیرو والے کی چپت گاہ پر ۔ ۔ دیکھتا ہے تو ڈھو کا ڈھو آدمی ۔ ۔ ۔ پٹخا جاتے ۔

(۳) بندہ نواز! آج کل رسالوں میں بالعموم فہرست مضامین کی جگہ فہرس لکھا ہوتا ہے۔ کیا یہ لفظ فہرست کی ت حذف کرکے بنایا گیا ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے۔ تو لفظوں کے محذوف یا ایزاد کرنے کا حق محض مدیران رسائل کو ہی پہنچتا ہے، یا کسی اور کو بھی۔ اور اگر ایسا نہیں تو یہ کون سی زبان کا لفظ ہے اور فہرست کی بجائے ایسے لکھ دینے سے معانی میں تفاوت تو نہیں پڑتا؟

امیر حسن خاں، خورشید لاج لالیاں

(۴) اُمید ہے آپ مندرجہ ذیل سوالات کے جواب فروری کے پرچہ میں دے کر ممنون فرمائیں گے ،

(۱) کیا اردو میں لفظ مشکور کا استعمال بمعنی شکر گزار صحیح ہے؟

(۲) صحیح لفظ "تبادلۂ خیالات" ہے یا "مبادلۂ خیالات"؟

(۳) لب ساحل، کی ترکیب صحیح ہے یا غلط؟ ——— منظور اعجاز متعلم جماعت دہم گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم

جوابات :

(۱) ہڑبڑا جانا۔ گھبرا جانا۔ گھگھیانا، گڑگڑانا۔ گرگا۔ چالاک اور عیار، چیلا۔ دل سے اتارنا۔ کسی کی عزت دل سے نکال دینا۔ ہاتھ اتارنا، ہاتھ کو ایسا جھٹکا دینا جس کے صدمے سے کہنی کی ہڈی اپنی جگہ سے الگ ہو جائے۔ پہونچا اتارنا۔ جھٹکا دے کر ہاتھ کے گٹے کی ہڈی نکال دینا۔ نقشہ اتارنا۔ ڈھنڈیا پٹنا۔ جگہ جگہ ڈھونڈھنا، ماتھا ٹھنکنا۔ پہلے سے آنے والے خطرے کا احساس ہونا۔ بطور تفاؤل کے موصل الی المطلوب ہونا۔ نیک شگون کے طور پر مقصد تک رسائی حاصل کرنا۔ ہنکارنا۔ بھاری آواز سے پکارنا۔ بک بک کرنا۔ نشے میں شور مچانا۔ تکرار کرنا۔ بتائی کہنا بانٹنا۔ دو ٹوک بات کرنا۔ فیصلہ کن اور صاف صاف بات کرنا۔ بطریق اذعان۔ یقین کی روشنی میں۔ عمیق غور و تامل سے۔ تکلفات باردہ دل نہ چاہتا ہو اور زبان سے تکلفات کا اظہار کرنا۔ زبانی جمع خرچ کرنا۔ بھرا بھرایا۔ جو دل میں آئے زبان سے کہہ دینے والا، مغصوبات (غصب کی) چھینی ہوئی چیزیں۔ احقاق حق۔ حق کا ثابت کرنا۔ لٹرول ٹوں۔ متوڑا۔ معمولی الیلا۔ پانچوں گھی میں ہونا۔ کامیابی ہی کامیابی۔ فائدہ ہی فائدہ ناطورہ۔ حسینہ۔ گلے ٹھلے کا گھبرو۔ چوڑا چکلا جوان۔ یہاں اندھیر نگری چوپٹ راج ہے۔ ظلم و ستم اور بے انصافی ہوتی ہے۔ طاقت کا راج ہے

پندار۔ خیال سمجھ۔ خرچ اُجلا ہے۔ کمائی اور زیادہ خرچ ہے۔ ٹیڑھی کھیر۔ مشکل دشوار۔ گدا آدینا۔ پٹخ دینا۔ لام کاف بکنا۔ بدکلامی کرنا۔ تلوے چاٹنا۔ خوشامد
کرنا۔ واہے نیارے کرنا۔ خوب کمانا۔ خوب فائدہ اٹھانا۔ پرچہ چڑھانا۔ شکایت کرنا۔ مخبری کرنا۔ ڈھول ڈھمکے کی سند نہیں۔ مار پیٹ جائز نہیں۔ لڑائی
تازہ ہونا۔ لڑائی ٹھن جانا۔ نوک دُم بھاگنا۔ میدان سے تیز رفتاری کے ساتھ بھاگ جانا۔ شہوتے بہانا۔ رونا۔ بات سے ہاتھ پر اترنا۔ بات
کرتے کرتے ہاتھا پائی کرنے لگنا۔ چرخی بھی کچھ مچھے تھی۔ سے کھاؤ۔ کسی باکمال کو سر فراز دیکھ کر ایک عامی اور معمولی آدمی بھی اس کا رتبہ لینے
پر اصرار کرے تو ایسے موقعے پر بولتے ہیں۔ اونٹ رہا ہے۔ کھول رہا ہے۔ جوش کھا رہا ہے۔ ادھار کھانا۔ کسی کام پر تل جانا۔ دسوں انگلیاں دسوں چراغ،
نک سے سکھ۔ ہر حیثیت سے اچھا۔ کاج کی لاج۔ کام کا پاس۔ لوہے کو نرمانا۔ سخت دل کو منا لینا۔ دھم ہو جانا۔ بجھ جانا۔ رہ جانا۔ بیل منڈھے
چڑھنا۔ کامیاب ہونا۔ ہیئت اندازی۔ بدلباسی۔ بیج دھج۔ بلبلا جانا۔ کانپنا۔ خوف سے کپکپی طاری ہو جانا۔ ناک ٹوک اترنا۔ پورا اترنا۔ دانت کرید نے
کو تنکا نہ ہونا۔ قلاش ہونا۔ بے سروسامان ہونا۔ کھیلنا مالنا۔ اچھا بچھا۔ تندرست۔ خوش و خرم۔ کھٹراگ۔ فضول سامان۔ پاکھا۔ گھر کا پکھا۔ بغلی دیوار۔ ناگند
وہ پچھیرا جس پر ابھی سواری نہ ہوئی ہو یا وہ بیل جس پر بوجھ نہ لادا گیا ہو۔ بوزہ فروش۔ بوزہ چاول اور چینا کے آٹے کی شراب۔ انگریزی میں
بیئر۔ بوزہ فروش۔ کلال۔ شراب فروش۔ پھڑ۔ جوا کھیلنے کی جگہ۔ پنسوئی۔ چھوٹی کشتی۔ تقویم کے پترے۔ جنتری کے اوراق۔ سپاٹا۔ تیز رفتاری
دوڑ۔ اصیل تلوار۔ خالص فولاد کی تلوار۔ سروہی۔ تلوار۔ چورنگ کر دینا۔ تلوار کی ایک ضرب سے طول میں دو ٹکڑے کر کے ان دو ٹکڑوں کے
کرنے سے پہلے عرض میں دو ٹکڑے کر دینا۔ شملہ بمقدار علم۔ تکمیل علم پر دستار فضیلت باندھی جاتی تھی۔ ماخذ تو محاورے کا یہ ہے اسے
ایسے موقعے پر بولتے ہیں جب کوئی کسی بڑے کام کی مقدرت نہ رکھتا ہو اور اسے کرنے بیٹھ جائے۔ بگلوس۔ دربار شاہی میں کمر سے
چمڑے کا ایک فیتہ باندھ کر جاتے تھے۔ حیدرآباد میں آج تک استعمال ہوتا ہے۔ ٹیپ اٹھانا۔ ٹیپ مسدس میں تیسرا شعر اور مخمس میں چوتھا
اور پانچواں مصرعہ۔ ٹیپ اٹھانا۔ سوز خواں یا میلاد خواں اپنے ساتھ پڑھنے والوں کی ایک ٹولی لے جاتے ہیں۔ جب کوئی نظم پڑھتے ہیں تو کسی
مقررہ مصرعے پر ساری ٹولی مل کر ان کے ساتھ اس مصرعے کو گانے لگتی ہے۔ یہ ٹیپ اٹھانا کہلاتا ہے۔

بینگن کے نوکر۔ قصہ طلب کہاوت ہے۔ سنا ہے شہنشاہ اکبر نے ایک بار بینگن کی تعریف کی کہ سبزیوں میں سب سے اچھی
سبزی بینگن ہے۔ ابوالفضل نے اس کی تائید میں بینگن کی ستائش شروع کی کہ حضور بینگن واقعی عجیب سبزی ہے۔ اس کا رنگ کرشن کنھیا
کے رنگ سے ملتا ہے۔ اس کی جڑ زمردی تلوار معلوم ہوتی ہے۔ وغیرہ۔ کچھ دن کے بعد شہنشاہ نے بینگن کی برائی کرتے ہوئے فرمایا، بینگن بہت
نقصان پہنچاتی ہے۔ ابوالفضل نے اس کی بھی تائید کی۔ جہاں پناہ! واقعی بینگن بہت ضرر رساں سبزی ہے۔ جگر اور معدے کے لئے مضر ہے
بواسیر پیدا کرتی ہے خون میں کثافت پیدا کر کے جذام میں مبتلا کر دیتی ہے۔

جب یہ بینگن کی برائی کر کے باہر نکلے تو کسی بے تکلف درباری نے کہا، کہ اس روز آپ بینگن کی قصیدہ خوانی کر رہے تھے آج ہجو کی
انتہا کر دی۔ عجیب آدمی ہیں آپ بھی!

ابوالفضل نے کہا۔ میاں شہنشاہ کا نوکر ہوں۔ بینگن کا نوکر نہیں۔ بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملانا میری ڈیوٹی ہے۔ مجھے اس سے کیا
کہ بینگن مفید ہے یا مضر۔

اڑھائی چاول گلانا۔ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانا۔ جماعت سے الگ ہو کر کوئی کام کرنا۔ بے تُکے کرنا۔ تو تڑاک سے بیش آنا۔
بدزبانی کرنا۔ گنڈے تولنا۔ جانے کی آمادگی ظاہر کرنا۔ قرولیاں بھونکنا۔ خنجر بھونک دینا۔ گتھم گتھا۔ تین آدمیوں کا آپس میں لڑتے لڑتے گتھم جانا۔
نرے گاؤدی ہو۔ بالکل احمق، گدھے ہو۔ غٹ پٹ ہونا۔ لڑائی میں ایک دوسرے سے لپٹ جانا۔ چاروں پٹیاں جھاڑنا۔ گھوڑے کا دولتیاں
چلا کے اگلے پاؤں بھی مارنا۔ ساکھا۔ بھروسا۔ اعتبار۔ تو تم ڈالنا۔ پرانی روئی کو جو دبی ہوئی ہو چھوٹے چھوٹے حصے کر کے پھیلا لینا۔ کسی کو مار مار کے

کچھ موڑ نکال دینا۔ کندی کرنا۔ پہلے استری تو تھی نہیں۔ دھوبی دھلے ہوئے کپڑوں کو تختے پر تہ کر کے موگری سے کوٹ کوٹ کر اس کی سلوٹیں دور کیا کرتے تھے۔ اسی کو کندی کرنا کہتے ہیں۔ کسی کو پیٹ پیٹ کر ادھ موا کر دینا بھی۔ تقندری۔ فاحشہ اور آوارہ عورت۔

(۳) چپت دار انگرکھا۔ پرانی تہذیب کا لباس ہے۔ انگرکھے میں سینے سے نیچے گھیر میں چنٹیں ڈالنے کا فیشن تھا۔ بنکے دار ٹوپی۔ پہلے ٹوپیاں اس انداز کی بنواتے تھے کہ ماتھے پر تو پوری ہوتی تھیں اور ماتھے سے اوپر گولائی میں زیادہ کپڑا لگایا جاتا تھا۔ وہ گولائی کا جھول چھجا سا بن کر آگے کو جھکا رہتا تھا۔ چپت گھٹنا۔ چوڑیوں دار تنگ پاجامہ۔ اینڈے بینڈے۔ کسرت اور ورزش کے سبب بازوؤں کی مچھلیاں ابھری ہوئیں۔ دو دو دانا تبار تلواریں۔ باڑھیں چڑھی ہوئی۔ صیقل کی ہوئی۔ سان پہ رکھی ہوئیں۔ کٹار خنجر کی ایک قسم۔ شیر بچہ۔ طمنچہ۔ نیچے گھوڑے کی چڑھی تھی۔ پیچھے برتے میں رکھی ہوئی شراب زیادہ نشہ لاتی ہے۔ ——— مراد یہ ہے کہ وہ اپنی ہٹ میں کسی کی نہیں سنتے تھے۔ کسیرو۔ سنگھاڑے کی طرح کا ایک پھل جو تالابوں کے پانی میں پیدا ہوتا ہے۔ سیاہ۔ گول اور چھوٹا بالوں والا۔ اس میں سنگھاڑے کی گری سے ملتا جلتا ہے۔ تلوار کی دھار سے سرمہ لگانا۔ تلوار کا ہاتھ دکھاتے ہوئے اس کی دھار کو کسی کی آنکھ میں سرمے کی سلائی کی طرح گزار کر زخم لگائے بغیر کھینچ لینا۔ کھانڈا ابنر کی طرح ہتھیار۔ بانکی کوڑیاں تلوہ نہیں۔ تلوہ بروزن شکوہ بمعنی پیچ گیلیس۔ پیشت گاہ۔ سر کا پیچ کا حصہ جس پر ٹلکی لگایا کرتے ہیں۔ ڈھوکا ڈھوادی موٹا تازہ۔ لمبا تڑنگا۔ ہاتھی کی پیشانی۔ بیٹھا جانے۔ کچا جانے۔ چوکی۔ انگرکھے کی چولی پیچ کا حصہ جس پر کپڑے کی پٹی لگا دیا کرتے تھے۔

سوالات

(۱) اردوئے معلّی اور اردوئے معلّا میں کیا فرق ہے؟ ——— پیارے لال شاکر بی۔ اے۔ ایم بی ہائی اسکول (پچھا نکوٹ)

(۲) دلّی اور لکھنؤ کے ادبی اسکولوں کی خصوصیات بیان فرما کر ممنون کیجئے۔ ——— قاضی فیض محی الدین مسلم زبیندارہ ہائی اسکول گجرات

(۳) ایک کتاب میں یہ فقرہ میری نظر سے گزرا تھا۔ مگر مجھے اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کی تشریح فرمائی جائے:
"مشکل اول بدیہی الانتاج ہوتی ہے"
——— عبدالعزیز اظہر منشی فاضل، جالندھر شہر

(۴) آسمان کو فلک مینائی کیوں کہتے ہیں؟ لکھنؤ کے مشہور شاعر امیر کو بھی امیر مینائی لکھا جاتا ہے۔ مینائی کا کیا مطلب ہے؟
——— ہربنس لال گپتا بی۔ اے۔ چکوال

(۵) آپ نے پہلا شعر کب لکھا تھا، کس جذبے سے متاثر ہو کر لکھا تھا اور وہ شعر کیا تھا؟ تفصیل سے بیان فرما کر رہین کرم فرمائیے!
——— نیاز احمد راز کوٹلوی

(۶) آپ کے حالاتِ زندگی مطلوب ہیں اور تصویر بھی۔ حالاتِ زندگی میں خاندان، پیدائش، عمر، تعلیم، معاش، خدماتِ ادبی، موجودہ مشاغل پر روشنی ڈالیئے۔
——— عبدالعلیم فانی متھرا

(۷) میونسپل لائبریری میں آپ کا رسالہ شاہکار نظر سے گزرا۔ اس کا حسن ظاہری آنکھوں کو روشنی بخشتا ہے اور اس کے بلند اور مفید مضامین دل کو سرور پہنچاتے ہیں۔ میں خریدار بننا چاہتا ہوں۔ بذریعہ وی پی ایک پرچہ بطور نمونہ بھیج کر ممنون فرمائیے!
——— محمد صدیق طالب علم انٹرمیڈیٹ کالج لکھنؤ۔

جوابات

(۱ و ۲) اردوئے معلّی سے یوں تو اردو زبان ہی مراد ہے، لیکن دہلی کے قلعۂ معلّیٰ کی اردو چونکہ مستند سمجھی جاتی تھی اس لئے اہل دہلی نے دلّی کی اردو کو اردوئے معلّیٰ کا لقب دیا۔ وہ اردوئے معلّیٰ کے لفظ سے فصیح اور مستند زبان مراد لیتے ہیں۔ لکھنؤ والوں نے دلّی کی بربادی کے بعد چونکہ اردو زبان کی سرپرستی کی، اسے جلا دی۔ ناخوشگوار الفاظ سے اسے پاک کیا۔ اس کی لفظیات کے لئے قوانین و آئین بنائے۔ اس طرح

اپنے مطلب کی چیز بنا کر اسے اردوئے معلیٰ کا خطاب دیا۔
گویا لکھنؤ کی ترقی پذیر اور مستند اردو اردوئے معلیٰ کے نام سے موسوم ہے۔
دلی کا تمدن چونکہ ہمیشہ سادگی آمیز رہا ہے۔ دلی کی معاشرت، تکلفات و تصنعات سے منزہ چلی آئی ہے۔ اس کا اثر قدرتی طور پر
دلی کی زبان و ادب پر بھی پڑا ہے۔ اس لئے دلی کی شاعری میں خارجی عنصر بہت کم ہے۔ الفاظ و عبارات کی آرائش دلی کے اردو ادب سے
نمایاں نہیں ہوتی۔
بخلاف لکھنؤ کے، کہ لطافت، نفاست و نزاکت لکھنوی تہذیب کی امتیازی خصوصیات رہی ہیں۔
شاہی عہد کے لکھنؤ کی معاشرت تکلف و تصنع سے غیر قدرتی سی ہوگئی تھی۔ اس بنا پر اس وقت کی لکھنوی شاعری اور انشا پردازی
میں آرٹ کو زیادہ دخل رہا۔ صنائع و بدائع کا استعمال بڑھتے بڑھتے ضلع جگت تک ترقی کر گیا تھا۔ میرزا رجب علی سرور کی " فسانۂ عجائب"
اور پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی " گلزار نسیم" اس عہد کی صنعتی نثر و نظم کے نمونے کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔
اس کے مقابلے میں دہلی کی زندگی ہر رنگ میں حسن فطرت کی آئینہ دار رہی ہے۔ اسی لئے دلی کے ادب و شاعری میں فطری سادگی
نمایاں خصوصیت بنی رہی۔
میر حسن کی مثنوی سحر البیان اور میر امن کی " باغ و بہار" کا موازنہ گلزار نسیم اور فسانۂ عجائب سے کیا جائے تو دلی و لکھنؤ کے
ادبی اسکولوں کا امتیاز سمجھ میں آجاتا ہے۔
(۳) یہ منطقی زبان ہے۔ منطق میں ہر دعویٰ اشکال اربعہ میں سے کسی شکل کے ذریعہ ثابت کیا جاتا ہے: جو دعوےٰ شکل اول کے
قالب میں ڈھل جائے وہ یقینی الثبوت بن جاتا ہے مثلاً:
دعوےٰ یہ ہے کہ " دنیا حادث ہے"
اسے شکل اول کے معیار پر کسا جائے گا اس طرح کہ:

دنیا تغیر پذیر	ہر تغیر پذیر شے حادث ہوتی ہے
صغریٰ	کبریٰ

حد اوسط کو ساقط کرنے سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ:
" دنیا حادث ہے"
یہ نتیجہ بدیہی اور ناقابل انکار متصور ہوگا۔ اس بحث کا سلسلہ دراز ہے۔
(۴) مینا شراب کی صراحی کو کہتے ہیں۔ یہ عموماً نیلے رنگ کی ہوتی تھی۔ آسمان کا رنگ بھی نیلا نظر آتا ہے۔ اسی لئے آسمان کو چرخ نیلگوں
اور فلک مینائی کہا جاتا ہے۔ فلک مینائی کے معنی ہوئے صراحی جیسے نیلے رنگ کا آسمان۔ باقی لکھنؤ کے مشہور شاعر مفتی امیر احمد مینائی
مرحوم کے نام کے ساتھ " مینائی" کا ضمیمہ — ؟ وہ کچھ اس لئے نہ تھا کہ مرحوم کا رنگ نیلا تھا، بلکہ لکھنؤ میں شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ ایک
بہت بڑے پیر طریقت گزرے ہیں۔ مفتی امیر احمد صاحب کا خاندانی یا روحانی سلسلہ شاہ مینا سے ملتا ہے۔ اس لئے آپ کے خاندان کا
ہر فرد اپنے نام کے ساتھ " مینائی" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔
(۵) میں نے پہلا شعر اپنے ہمسر کے خلاف انتقام کے طور پر چار سال کی عمر میں کہا تھا۔ وہ شعر کیا تھا؟ یہ نہ بتاؤں گا۔ شعر کہنے میں اگر ارادے
کو بھی دخل ہے تو پھر تو سرے سے وہ شعر ہی نہ تھا۔ ارتجالاً زبان پر ایک منظوم فقرہ آگیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے لکھنؤ کے ایک سقے نے کنویں سے۔

سے پانی بھرتے ہوئے مینہ کی جھڑی دیکھ کر بے ارادہ یہ مصرعہ چست کیا تھا کہ ؎

"اگر یونہی پانی برستا رہے گا"

یہ سن کر اُس کے دوسرے ساتھی پر شاعری طاری ہو گئی اور اُس نے فوراً یہ کہہ کر مصرعے کو مطلع بنا دیا کہ

"تو کا ہے کو گھیوں کو ترستا رہے گا"

میرا اوّلیں شعر بھی کچھ اسی قسم کی تک بندی ہے جس میں ایک لفظ کا تلفظ بھی غلط ہے۔ میں اس غلطی کو رنگ دوام دینا پسند نہیں کرتا

(۴) آپ کو میرے حالاتِ زندگی مطلوب ہیں؛ کچھ انتظار کیجئے! جہاز عمر تیزی سے زود بہ ساحل ہے مستقبل قریب ہی میں ایک صبح کے لاہوری اخبارات آپ کو میرے حالاتِ زندگی سے باخبر کر دیں گے۔ اُس وقت تصویر میرے وارثوں سے طلب کر لیجئے گا۔

میرے موجودہ مشاغل یہ ہیں ہے

ماضی سے متاسف ہوں۔ حال سے پریشان اور مستقبل سے خائف۔ کبھی فرصت ملتی ہے تو اُردو زبان کی جان کو بد دعا دے لیا کرتا ہوں

(۵) آپ نے میونسپل لائبریری میں شاہکار کا پرچہ دیکھا۔ خوش ہوں کہ اُس کا مطالعہ آپ کے دل و دماغ کے لئے موجب فرحت و سرور ہوا۔ آپ اُس کے خریدار بننا چاہتے ہیں؛ چاہتے رہیئے اور خیال کو چھ روپے اگر آپ کے بجٹ میں زیادہ ہیں تو کسی غریب رشتہ دار کو بخش دیجئے اور لائبریری میں جا کر شوقِ مطالعہ کی تسکین کر لیا کیجئے۔ اور اگر خریدار بننے پر اصرار ہے تو شکریہ۔ چھ روپے دفتر شاہکار کے نام بھیج دیجئے۔

رہا نمونہ؛ وہ آپ نے لائبریری میں دیکھ لیا ہے۔ وہی اُسے قائم کر لینے کے لئے کافی ثابت ہو چکا ہے۔ مزید نمونہ کی طلب ہے تو چھ آنے کے ٹکٹ مینیجر شاہکار کے حوالے کیجئے؛ دوسرا نمونہ آپ کی خدمت میں بھیج دیا جائے گا۔

معاف فرمایئے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ آپ مفت بینی کے مرض میں مبتلا ہیں تو قبلہ مفت بینوں کے مظالم کا تو میں کارتون ہوں اب دل پہ مزید زخم کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ ؎

"تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم"

میں اپنی معاشی اور صحافتی زندگی میں مفت خوروں، مفت گیروں اور مفت بینوں کی ضرورت سے زیادہ خدمت انجام دے چکا ہوں۔

منتجر ہی۔ باقی معلوم ہوا کہ میرے دفتر کے مفت پیشہ گان کی فہرست میں آپ کا نامِ نامی پہلے ہی سے درج ہے۔ گویا مجھ سے اپنی مفت بینی کا ٹیکس آپ وصول کر چکے ہیں۔ اب کوئی نیا پرچہ نمونے میں کسی دوسرے معاصر سے طلب کیجئے۔ آپ کے دیرینہ ستم خوردگان تو شاید آپ کی مزید خدمت کے لائق نہیں رہے ہیں۔

سوالات

(۱) مرزا غالب کے مندرجہ ذیل شعر کی تشریح فرما کر ممنون کیجئے ؎

دماغ عطر پیراہن نہیں ہے   غمِ آوارگیہائے صبا کیا

(سائل کے نام کا خط دفتر سے گم ہو گیا ہے)

(۲) "آمد" و "آورد" کی تعریف اور مثال میں اشعار پیش کر کے دونوں کا فرق بیان کیجئے! — سید نصرت جبین اختر امروہہ ضلع مراد آباد

(۳) میں ایک ادبی رسالہ جاری کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی عمر اس دشت کی سیاحی میں بسر ہوئی ہے۔ براہِ کرم اپنے مفید مشوروں سے رہنمائی کیجئے میرے احباب نے پانچ سو خریدار بہم پہنچانے کا یقین دلایا ہے۔ کامیابی کی یقینی اُمید ہے۔

—— اختر نظامی ملتان

جوابات

(۱) "دماغ عطر پیراہن نہیں ہے — غم آوارگیہائے صبا کیا"

"عطر پیراہن" یہ ترکیب اختراعات غالب میں سے ہے۔ پیراہن ظرف ہے اور عطر مظروف۔ یعنی پیراہن جو عطر میں بسا ہوا ہو۔

"دماغ" سے یہاں برداشت اور سہار مراد ہے۔ ع

"مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا"

شاعر پر ناکامی عشق سے بددلی یا بے دلی کا جذبہ طاری ہے۔ وہ اس جذبے سے متاثر ہو کر کہتا ہے۔ کہ صبا اگر چمن کے پھولوں کی خوشبو سے گوشہ و برزن کو مہکاتی پھرتی ہے تو مجھے اس تضییع نکہت سے کوئی رنج نہیں، کیونکہ مجھے اب لباس کو معطر رکھنے کی بھی برداشت نہیں

(۲) شعر میں آمد کے یہ معنی ہیں کہ اس کے الفاظ میں خوشگواری۔ الفاظ کی ترتیب میں موزونیت۔ اس کے مصرعوں میں ہم آہنگی۔ اور برجستگی ہو۔ جسے سن کر دل میں جوشِ تحسین و مسرت پیدا ہو جائے۔ اور ایسا محسوس ہونے لگے۔ کہ شاعر کے دماغ سے یہ شعر کسی کاوش شکستہ تعمیر کے بغیر بیساختگی وجود پذیر ہو گیا ہے: ــ

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے — رن ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے
ہر قصرِ سلاطینِ زمن کانپ رہا ہے — رستم کا بدن زیرِ کفن کانپ رہا ہے
اب جان کے بچنے کا کوئی طور نہیں ہے — عباس ہے عباس کوئی اور نہیں ہے
(مرزا دبیر مرحوم)

آورد آمد کے برعکس ہے

شعر کی ساخت سے یہ محسوس ہوتا ہو کہ شاعر نے حسبِ معمول پہلے قافیہ تلاش کیا ہوگا۔ پھر دوسرا مصرعہ کہا ہوگا۔ اس کے بعد پہلا مصرعہ لگایا ہوگا۔ بڑی دماغی کاوش کرنے پر یہ شعر شکم دماغ سے روتا جھینکتا پیدا ہوا ہوگا۔ آورد کا عیب شاعر کو شاعری کے مرتبے سے اتار کر ناظم کی حیثیت دے دیتا ہے۔

وقتِ امداد ہے اے ابرِ کرم لطف بتاں — شاخِ نخلِ چمن طرز فغاں سوکھ گئی
مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا — طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا
شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا — تماشائے بہ یک کف بردن صد دل پسند آیا
بنو گے خسرو اے نسیم دل شیریں زباں ہو کر — جہانگیری کرے گی یہ ادا نور جہاں ہو کر
سر شکِ سر بہ صحرا دادہ نور العین دامن ہے — دل بے دست و پا افتادہ برخوردار بستر ہے

(۳) آپ ایک ادبی رسالہ جاری کرنا چاہتے ہیں۔ اور آپ کے دوستوں نے پانسو خریدار بہم پہنچانے کا وعدہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کو میرا مشورہ درکار ہے:

پہلے یہ تو بتائیے کہ آپ کو جنون شوق نے ادبی پرچہ نکالنے پر مجبور کیا ہے۔ یا معاش کی خاطر بزنس کے طور پر یہ خیال پیدا ہوا ہے؟ شاید میرا یہ دریافت کرنا تو موجودہ ایٹی کیٹ کے خلاف ہو۔ کہ آپ کے پاس اس تضییع اوقات کے لئے سرمایہ کتنا ہے۔ مگر مجبوری یہ ہے کہ اس کے بغیر صحیح مشورہ نہیں دیا جا سکتا۔

پھر یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ آپ کا ذاتی سرمایہ ہے یا کسی کثیر التعداد تنظیم کو اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں؟

اب سنئے میرا ناچیز مشورہ:

آپ اس سودائے خام کو سر سے نکال سکتے ہوں تو اپنے اوپر رحم کیجئے۔ اور گناہ بے لذت سے دستبردار ہو جائیے۔ ایسا نہیں کر سکتے تو سرمایہ بال بچوں کے حوالے کیجئے اور ہماری انجمن کے ممبر بن جائیے۔ ہم نے اس رسالہ بازی سے تنگ آکر جاں بازی کی ٹھان لی ہے اور "انجمن خود کشتگان پنجاب" کے نام سے ایک سبھا قائم کی ہے۔

اس انجمن کا مقصد ہماری بد حالیوں کے پیش نظر بہت مقدس ہے۔ اس انجمن کی ممبری کا کریڈیہ یہ ہے کہ زندگی سے بیزار لوگوں کے لئے موت کی سہولتیں مہیا کرے۔ ہر ممبر کو سزائے زندگی سے نجات دلانے کے لئے۔ پستول، سنکھیا، افیون، ریکپور، تیزاب جیسی فنا پذیر ادویات مفت فراہم کی جاتی ہیں۔ کوئی ممبر کھانے پینے میں چھوت چھات برتتا ہو تو شاہی مسجد کے مینار سے چھلانگ لگانے میں اس کی مدد کی جاتی ہے۔ میلا رام کے تالاب، ریل کی پٹڑی، ناری سے ٹکر وغیرہ کا بھی انتظام کر دیا جاتا ہے خودکشی کے یہ تمام دروانے انجمن کی نگرانی میں آٹھ پہر کھلے رہتے ہیں۔ رسالے کی تپ دق زندگی سے مایوس اور موت کے لئے سخت جان بنا کر رسالہ باز کو زندگی و موت کے برزخ میں بے یار و مددگار چھوڑ دیا کرتی ہے۔ اس مصیبت غیر فانی سے نجات اس وقت تک میسر نہیں آسکتی۔ جب تک ہماری انجمن کی رکنیت اختیار نہ کی جائے گی۔

" در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست"

جھٹ پٹ زندگی کا بیمہ کرائیے، بیمے کی رقم کے متعلق وصیت نامہ لکھوا لیجئے اور متعلقین سے کہا سنا معاف کرا کے لاہور کا ٹکٹ لے لیجئے۔ گورنمنٹ نے ہماری انجمن کو خلاف قانون قرار دے دیا ہے۔ اس لئے کسی تانگے والے سے انجمن کے دفتر کا پتہ نہ پوچھیے، میکلوڈ روڈ کے جس مکان پر "نجات ابدی" آویزاں دیکھیں، اتر پڑیں، باقی آپ سنے مشورے کے بعد سب امور طے ہو جائیں گے۔

یہ مشورہ تو اس صورت میں ہے۔ کہ آپ کے پاس ذاتی سرمایہ ہو۔ اور اگر کوئی مربیانہ دام تزویر میں گرفتار کیا ہے تو پھر انجمن کی ممبری کے لئے جلدی نہ کیجیے۔ چند ماہ تزک و احتشام سے رسالہ نکالئے۔ اس کے دو چار خاص نمبر شائع کر دیجیے۔ پھر غالباً آپ کے ساتھ سرمایہ لگانے والے دیوالیئے کو بھی انجمن کی خدمات حاصل کرنی پڑیں گی۔ جب وہ اس مقام تصوف پر پہنچ جائے۔ تو اسے ہمراہ لائیے انجمن آپ دونوں حضرات کی مشکلات حل کر کے رکھ دے گی۔

ہاں خوب یاد آیا۔ ایک صورت اور بھی ہے۔ کسی آوارۂ شباب تک بند کو ایڈیٹری پر رضامند کر کے "شبابیات" کے نام سے ماہانہ کوک شاستر جاری کر دیجیے۔ سابق مہاراجہ کشمیر کے معالج آنجہانی کوکا پنڈت کا اصلی کوک شاستر ہر "صنفی معلومات" کے ایڈیٹک کے پاس موجود ہے۔ اس کی برہنہ تصاویر پر برہنہ شبابی نظمیں کہنے والے لاہور کے گلی کوچوں میں بے شمار مل سکیں گے، دہلی کے بہت سے مذہبی اور اصلاحی پرچے نکالنے والے ریفارمروں سے اس پرچے کی ترتیب میں آپ کو مدد مل سکے گی۔

ادھر سینما والوں سے فلم سٹار ایکٹریسوں اور رقاصاؤں کی ہوش خیز تصاویر کے بلاک مفت نذر کے طور پر ملتے ہیں گے، آنکھوں پر ٹھیکری رکھ کر یہ پرچہ اگر آپ نے جاری کر دیا تو اس عیش فروشی کے طفیل دو تین سال میں اپنے نام کی ایک آدھ بلڈنگ بنا سکیں گے۔

جینا بڑا ضروری ہے ایمان کا کیا ہے
اس سودے میں ضمیر ہاتھ سے جاتا رہے تو یہ کہہ کر تسکین دے لیجئے گا
"ہو گیا گم ہو گیا جاتا رہا جاتا رہا"

مختصر یہ کہ ادبی رسالے کا انجام بہر حال خودکشی ہے۔ اس لئے اس کار خیر کو آغاز ہی میں کیوں نہ سرانجام دے لیا جائے

تجارتی مفاد کا سوال اس ساری داستان میں کہیں نہیں ملے گا۔ تجارتی کامیابی تو آج کل صرف کوک شاستروں کی اشاعت کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے پھر کیا ارادہ ہے عیش فروشی یا جاں فروشی؟ جن دوستوں نے پانچ سو خریدار کا وعدہ کیا ہے اُن کے نام خندہ زن دشمنوں کی فہرست میں لکھ لیجیے۔ ان مفت بینوں پر مطلق اعتماد نہ کیجیے۔

سوالات

(۱) اُردو گرامر کی رُو سے ایسے دو الفاظ سے فارسی کی ترکیب اضافی یا توصیفی نہیں بن سکتی۔ جو فارسی یا عربی کے نہ ہوں لیکن عام ادیب اور اہلِ فہم ممبرانِ کونسل۔ انسپکٹرانِ مدارس لکھتے اور بولتے ہیں۔ کیا یہ جمع اور ترکیبیں جائز ہو سکتی ہیں؟

——— رام دتا مل ضیا ایم اے پروفیسر فیض کالج لاہور

(۲) اکبر الہ آبادی کی خصوصیات شاعری پر ایک مختصر نوٹ تحریر فرما کر مستفید فرمایئے!

——— محمد رشید منشی فاضل ادبی ٹامرت سر

جوابات

(۱) اُردو گرامر فارسی کی گرامروں کا چربہ ہے اور فارسی کی گرامریں عربی صرف و نحو کو سامنے رکھ لکھی گئی ہیں۔ اسی غلط نقالی کے سبب اُردو اور فارسی گرامر نے فارسی اور اُردو کی رفتار کا کبھی ساتھ نہیں دیا۔ خصوصاً اُردو گرامر تو جب مرتب ہوئی تھی اُس وقت بھی اُردو زبان اُس سے بہت آگے نکل آئی تھی۔ اور آج کی اُردو گرامر اور اُردو زبان میں تو پشاور اور پانڈیچری کی مسافت حائل ہے۔ موجودہ ترقی یافتہ اُردو زبان کے لیے نئے سرے سے ایک ترقی پذیر یا در لوچ دار قواعد پر مشتمل گرامر لکھے جانے کی ضرورت ہے۔ ملکی اور غیر ملکی الفاظ، اصطلاحات، محاورات، تشبیہات و تلمیحات کا ایک سیلاب اُردو کی وسعتوں میں سما رہا ہے آج سے ایک صدی پیشتر کی لکھی ہوئی گرامر زبان کی برق رفتاری کا ساتھ کیسے دے سکتی ہے؟ انسپکٹرانِ مدارس اور ممبرانِ کونسل کی ترکیبیں عام و خاص میں رائج ہو چکی ہیں۔ اس لیے بالکل صحیح اور فصیح بھی ہیں۔

بس رواجِ عام کو سندِ صحت و فصاحت بنایا جا سکتا ہے آج سے چالیس سال پیشتر مولانا محمد حسین آزاد اپنے ایک خط میں جو لالہ دونی چند کے نام لکھا ہے "ججانِ چیف کورٹ" کی ترکیب استعمال کر چکے ہیں۔ آزاد کی زبان پر کون اعتراض کر سکتا ہے۔ اور جی نہ مانے اور خواہ مخواہ تکلیف نوازی پر زور دیا جائے تو انسپکٹرانِ مدارس کی بجائے افسرانِ مدارس یا مدارس کے افسرانِ معائنہ لکھیے اور کونسل کو علم قرار دے کر ممبرانِ کونسل کی بجائے اراکینِ کونسل یا نمائندگانِ کونسل بنا لیجیے۔ مگر یہ احتیاط وہم کے دائرے میں آ جائے گی اور اس قاعدے سے ججانِ چیفکورٹ کو منصفانِ عدالت عالیہ یا چیف کورٹ کو علم قرار دے کر منصفانِ چیف کورٹ بنانا پڑے گا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس سلسلے میں ہر محتاط اقدام مضحکہ خیز بنتا چلا جائے گا۔ انسپکٹران، ممبران اور ججان جیسی فارسی نما جمع بھی رواجِ عام کی وجہ سے جائز قرار دی جائیں گی۔

(۲) لسان العصر مولانا سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی مرحوم کو خدا اور مذہب سے شیفتگی، مشرقی تہذیب و اخلاق سے دل بستگی اور مغربی زندگی سے نفرت تھی۔

وہ مشرق و مغرب کی تہذیبوں کے تصادم میں مشرقی تہذیب کی شکست سے بہت متاثر تھے۔ مشرقی تہذیب و معاشرت ان کی نگاہوں کے سامنے دم توڑ رہی تھی ——— مشرقی خصوصیات (جن میں خدا پرستی، مذہب پرستی، کیریکٹر، وضع داری، بے غرض دوستی شامل تھی) ایک ایک کر کے مٹ رہی تھیں۔ جدید تعلیم یافتہ

نسل کی مغرب زدگی مغرب پرستی کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ ان دردناک مناظر کو دیکھ کر شاعر کے حساس دل پر چوٹ لگی اور اس نے اہل وطن کو اس راہ بے منزل کے خطرات سے متنبہ کیا۔

احساس باختہ نوجوانوں پر اپنے وعظ کو بے اثر دیکھ کر کبھی وہ پھبتیاں کستا ہے۔ کہیں اُن کا مذاق اُڑاتا ہے۔ کہیں دلسوز پیرایہ اختیار کرتا ہے اور کبھی مغرب زدگی کے طوفان بے پناہ کو بے قابو دیکھ کر اُس کے نغمے دردناک چیخ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ نئی روشنی کے نوجوانوں کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

انہوں نے دین کب سیکھا ہے رہ کر شیخ کے گھر میں — پلے کالج کے چکر میں مرے صاحب کے دفتر میں

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم — رنگ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

کبھی اُن کی بڑھتی ہوئی فیشن پرستی کا مذاق اُڑاتا ہے کہ ؏

"بھینس کو گون پہنا دیجئے عاشق ہو جائیں"

مذہب سے بے نیاز اہل وطن کو نصیحت کرتا ہے کہ ؎

شعر میں اکبر یہی مضمون تو ہر بار باندھ — اے مسلماں سبحہ لے اے برہمن زنار باندھ!

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا — بت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا

ملک کی ہنگامی تحریکات پر ضرور اظہار رائے کرتا ہے ؎

مدخولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا — اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں — اک مشت خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

علی برادران کی نظر بندی سے متاثر ہو جاتا ہے ؎

بہ یاد رنج یاران نظر بند — کیا ہم نے بھی اب ہنسنا کا در بند

خدا کا نام اس سوز و گداز سے لیتا ہے کہ الفاظ سے محبت پھوٹ پڑتی ہے ؎

غرور اتنا نہیں ہے تو مجھ کو بھی ناز ہے اکبر — سوا خدا کے سب اُن کا ہے اور خدا میرا

ہر اک کو موت کا اک دن پیام آئیگا — خدا کا نام لئے جاؤ کام آئے گا

ہندو مسلم چپقلشوں کو ناگزیر سمجھتے ہوئے باہمی اتحاد کی تلقین کرتا ہے ؎

کہتا ہوں میں ہندو و مسلماں سے یہی — اپنی اپنی روش پہ نیک رہو

لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ — موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

اکبر کی شاعری قدیم و جدید پر منقسم ہے۔ قدیم شاعری زیادہ تر غزلیات پر مشتمل ہے۔ ان غزلیات میں ابتذال کی کمی نہیں پرانی تشبیہات۔ فرسودہ خیالات اور آورد نما صنائع و بدائع سے بھی پاک نہیں۔ لیکن طبیعت کی جدت آفرینی اکثر شعر کے کہنہ جام سفال کو تخیل کی صہبائے جانفزا سے فانوس کی طرح منور کر دیتی ہے۔

جدید شاعری نے سید اکبر حسین کو "لسان العصر" بنایا۔ حالات کی روز افزوں ابتری، اہل وطن کی اخلاقی و روحانی تباہی، مشرقی تہذیب کی بربادی، ملک کی غلامانہ زندگی کے مصائب، نوجوانوں میں بے دینی اور مغرب زدگی کے رجحانات، ایشیا اور عالم اسلام کی پامالی کے مناظر دیکھتے دیکھتے اکبر کی طبیعت پر یاس و قنوط طاری تھا۔ یہی قنوطیت اس کے جدید اشعار میں جھلکتی ہے۔

سوالات

(۱) جس طرح لفظ ذمہ وار غلط طور پر اسم فاعل استعمال کیا جا رہا ہے۔ اور جس کی ادباء و ناقدین نے صوری و معنوی ترمیم کر کے ذمہ دار بنایا اسی طرح لفظ امیدوار بھی ہے۔ اگر تھوڑی سی تحقیق سے کام لیا جائے۔ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بھی ذمہ واری ترکیب کا ایک مضحکہ خیز نمونہ ہے۔ کیا امیدوار کی تصحیح بھی ہو سکتی ہے۔ اور کیا اسے امیدوار سے امیددار کہا جا سکتا ہے؟ ——— ذلفی (ادیب عالم) محمود کوٹ

(۲) (ا) آغا حشر صاحب کاشمیری دہلوی کی مصنفہ کتاب موج زمزم کا پتہ درکار ہے۔

(ب) حضرت محروم۔ وفا۔ چکبست۔ نظر۔ سرور۔ شاکر۔ برق کی تصنیفات کے نام درکار ہیں۔

——— الراقم بابو رام ایس وی مدرس لائبریرین مڈل سکول گھمان ضلع گورداسپور

(۳) (۱) حضرت شبلی اور حضرت اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار کترین کے خیال میں غلط ہیں۔ آپ کا ان کے متعلق کیا خیال ہے۔

(ا) دفعتہً پاؤں پہ بیگم کے گرا اور یہ کہا — تو اگر کشتہ شدی آہ چہ می کردم من

(ب) اک پاؤں عدم کو کیوں نہ جاتا اقبال — تھا اہلِ فنا کو اشتیاق پابوس

پہلے شعر میں "مے کردم" بجائے ماضی تمنائی استعمال کیا گیا ہے۔ اور دوسرے میں اشتیاقِ پابوس، بجائے اشتیاقِ پابوسی

(۲) مندرجہ ذیل مصرعے کا مطلب درکار ہے۔

عجیب میکدۂ بے خروش ہے یہ گھٹا

(۴) ذوق اور غالب کے قصائد کا موازنہ کیجئے۔ اور اپنے مطالب کو مثال سے واضح کیجئے!

(۲) عہدِ حاضر میں کس شاعر کے تتبع سے تغزل کی قدر ہونے لگی ہے؟ اس کے کلام کی خصوصیات ارشاد فرمایئے۔ اور اگر ممکن ہو تو مثال ضرور دیجئے!

(۳) حالی اور درد میں کیا فرق ہے؟ دونوں کا موازنہ کیجئے۔ دونوں کے کلام کی خصوصیات مثالوں سے واضح کیجئے۔

——— رتن (پنڈوری) منشی فاضل، ادیب فاضل ڈی بی ہائی سکول سری گوبند پور

(۵) رسالہ شاعر (آگرہ) اور میرٹھ کے رسالہ پیمانہ میں آج کل جھڑپ ہو رہی ہے۔ شاعر کے ایڈیٹر صاحب نے جدید پیمانہ کے متعلق لکھا تھا۔ کہ اس میں قدیم پیمانہ کی سی سرمستی نہیں ہے۔ اس پر دونوں پرچوں میں چل گئی۔ اب جدید رسالہ پیمانہ مولانا سیماب اور ان کے "قصر الادب" کے خلاف لکھ رہا ہے۔ اور رسالہ شاعر حضرت ساغر پر حملے کر رہا ہے۔ آپ کسے حق پر سمجھتے ہیں؟

——— عبد الحمید محلہ اندر کوٹ میرٹھ

(۶) مجھے شعر کہنے کا بہت شوق ہے۔ کئی سال سے شعر کہتا ہوں۔ مگر اب تک کوئی رہنما نہیں ملا۔ اب آپ کی جانب رجوع کرنے کا خیال ہے۔ امید ہے کہ آپ میری رہنمائی فرمائیں گے اور اپنے ناچیز شاگردوں میں داخل فرما کر ذرے کو آفتاب بنائیں گے۔

——— غلام حسین ناظم بستی غذان جالندھر

(۷) ایک مقامی جرنلسٹ نے ایک دفعہ اپنے کسی مخالف کے خلاف پوسٹر شائع کیا تھا۔ اور اس کا عنوان فرینکن سٹائن قائم

گیا تھا۔ اس وقت سے میں نے یہ لفظ اپنے متعدد دوستوں کی زبان سے سنا ہے۔ لیکن میں اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوں کیا آپ اس پر کچھ روشنی ڈالیں گے؟ ——— (محمد شریف لدھیانہ)

جوابات

(۱) ہم کئی بار بتا چکے ہیں۔ اور پھر دہراتے ہیں کہ زبان کے لئے گرامر بنائی گئی ہے۔ گرامر کے لئے زبان نہیں بنائی جاتی۔
گرامر کے تمام قاعدے استقرائی اور قیاسی ہیں کلیہ قاعدے شاذ و نادر ہی ہوا کرتے ہیں۔ اردو میں تمام مصادر کے اخیر میں چونکہ "نا" آتا ہے۔ کھانا، پینا، سونا، جاگنا، وغیرہ۔ اس لئے گرامر نے بھی یہ قاعدہ بنا لیا ہے کہ اردو میں مصدر کے اخیر میں لفظ "نا" لانا چاہیئے۔
مختصر یہ کہ گرامر ہر حال میں زبان کے تابع ہوگی۔ زبان پر اس کا تسلط نہیں ہو سکتا۔ ہر ملک میں زبان محتاط فصحا کی معتبر ہوا کرتی ہے۔ وہ فصحا جو زبان کے استعمال میں احتیاط برتتے ہیں۔ امیدوار کو حرف واؤ سے بولتے ہیں، دال سے کوئی نہیں بولے گا۔ اب گرامر لاکھ شور مچائے کہ قاعدے کی رو سے یہ لفظ غلط ہے۔ اُس کی کوئی نہیں سُنے گا۔
"لٹو وار" پگڑی (دیکھو دربار اکبری مصنفہ آزاد دہلوی) اہل زبان کے فصحا بولتے ہیں یہی صحیح ہے۔ گرامر کا یہ قاعدہ کہ فارسی الفاظ کے ساتھ ہندی الفاظ کا ربط صحیح نہیں، ناقابل عمل سمجھا جائے گا۔ مختصر یہ کہ صحیح لفظ ذمہ دار حرف دال کے ساتھ ہے ذمہ وار حرف واؤ سے غلط ہے غیر محتاط ادیبوں کی سند نہیں۔ امیدوار حرف واؤ کے ساتھ صحیح ہوگا۔ کہ فصحائے اردو اسے حرف واؤ کے ساتھ ہی صحیح سمجھتے اور بولتے ہیں یہاں گرامر زبان کی پیروی کرے گی۔ نہ کر سکے تو گرامر غلط اور لفظ مستعملہ صحیح۔
بس یہی ایک اصول ہر جگہ پیش نظر رکھیئے کہ فصحائے اردو جو لفظ یا محاورہ جس طرح بولتے اور لکھتے ہیں۔ خواہ گرامر اُسے غلط بتائے وہی لفظ صحیح ہوگا۔ گرامر ہمیشہ زبان کے زیر فرمان رہے گی۔ فصحا کی زبان پر اس کا کوئی اقتدار تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

(۲) آغا حشر مرحوم کاشمیری کی جنم بھومی بنارس ہے دہلی نہیں۔ انہیں دہلوی لکھنا صحیح نہ ہوگا۔ ان کی مشہور مطبوعہ نظم "موجِ زمزم" مرغوب ایجنسی چوک متی لاہور سے مل سکتی ہے۔

(۳) لالہ تلوک چند محروم بی۔ اے کا مجموعہ کلام "گنجینہ معانی" کے نام سے چھپا ہے۔ مصنف موصوف سے سی بی مڈل اسکول لال کرتی راولپنڈی کے پتے پر طلب کیجئے۔
پنڈت میلا رام وفا کا مجموعہ کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا۔
پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی کا کلام "صبح امید" کے نام سے بارہ سال پیشتر چھپا تھا۔ غالباً انڈین پریس بک ڈپو الہ آباد سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔
منشی نوبت رائے نظر لکھنوی کا کلام پچھلے سال شائع ہوا ہے، نظر سے نہیں گزرا۔ "نول کشور بک ڈپو لکھنؤ" سے مل سکے گا۔
منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی کا کلام "جام سرور" کے نام سے منشی دیا نرائن نگم نے چھپوایا تھا۔ زمانہ بک ڈپو کان پور لکھیئے۔
لالہ پیارے لال شاکر میرٹھی کا نام کبھی کبھی اخبارات میں دیکھتا ہوں۔ مجھے اُن کا صحیح پتہ معلوم نہیں۔ اور غالباً اُن کا کلام ابھی تشنۂ اشاعت ہے
بابو مہاراج بہادر برق دہلوی آنجہانی کے کلام کا ایک مجموعہ میرے خیال میں شائع ہو چکا ہے اور باقی کلام زیر ترتیب ہے ان کے مطبوعہ کلام کے متعلق ذیل کے پتے پر خط و کتابت کیجئے؛
بتاشوں والی گلی دہلی، مکان بابو مہاراج بہادر برق دہلوی۔

(۳) آپ کو معلوم ہے کہ ماضی تمنائی اور شرطی کے کل تین صیغے ہیں "کردے، کردندے، کردمے" اس کے باقی تین صیغوں کی جگہ وہی صیغے ماضی ناتمام کے استعمال ہوا کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا، کہ ماضی ناتمام حسب موقعہ ماضی تمنائی اور شرطی کے بجائے استعمال ہوتی ہے۔ بنابریں علامہ شبلی کا مصرعہ۔ "تو اگر کشتہ شدی آہ چہ می کردم من" صحیح ہے غلط نہیں۔

یہاں "می کردم" ماضی تمنائی نہیں بلکہ ماضی شرطی کی جگہ استعمال ہوا ہے۔

ڈاکٹر اقبال نے پابوسی کی جگہ پابوس صحیح استعمال کیا ہے۔ مرزا غالب کے اردو شعر میں فارسی ترکیب "قدم بوس" ملاحظہ طلب ہے۔ "کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کے لئے"

پابوس اور قدم بوس کا ایک ہی مفہوم ہے ؎

"عجب مے کدۂ بے خروش ہے یہ گھٹا"

"مے خروش" نہیں بلکہ بے خروش ہے۔ اصل شعر یہ ہے ؎

"گرج کا شور نہیں ہے خموش ہے یہ گھٹا عجب میکدۂ بے خروش ہے یہ گھٹا"

مطلب واضح ہے، کہ یہ گھٹا جو فضا پر چھائی ہوئی ہے۔ اس میں بادل کی گرج یا بجلی کی کڑک نہیں ہے۔ اور دیکھنے والوں کو بدمست بنا رہی ہے۔ یعنی بے گرج گھٹا ایسا میکدہ ہے۔ جو سرمستی بکھیر رہا ہے۔ مگر اس میں عام شراب خانوں کی طرح صدائے ہاؤ ہو نہیں۔

(۴) متاخرین شعراء میں مولانا حسرت موہانی امام المتغزلین کا رتبہ رکھتے ہیں۔ ان کی طرز نگارش تغزل کی تمام صفات لازمہ کی آئینہ دار ہے۔ اس وقت صنف غزل کے وہی راہنما ہیں۔ ان کی غزلیات مجاز و حقیقت عشق و ہوس جذبات اور واردات ترنم و تنغم مختصر یہ کہ صحیح اور مکمل تغزل کا نمونہ ہیں۔

سوال نمبر ۱ اور ۲ فرصت طلب ہیں، ان کے جوابات کے لئے نقاد حضرات کو صلائے عام دی جاتی ہے۔

(۵) میں کوئی قاضی نہیں کہ فریقین خصومت کے تضیہ کا فیصلہ کروں۔ البتہ مفتیٔ ادب کی حیثیت سے یہ کہہ سکتا ہوں، کہ ادبی رسائل اور ادباء میں تو تو میں میں ہونا افسوسناک بات ہے۔ ہم ادیب ہیں، ہمارا منصب ادب آموزی ہے۔ ہم خود خانہ جنگیوں میں مبتلا ہو جائیں گے، تو ہمارا رہا سہا وقار بھی مٹ جائے گا۔ مدیر شاعر کا یہ کہنا کہ جدید پیمانے میں قدیم پیمانے کی سرمستی نہیں۔ نامناسب ہے۔ کیونکہ قدیم پیمانے میں سرمستی نہ تھی خرمستی تھی۔ قدیم پیمانے کی مخصوص تحریریں "دوشیزہ کی ڈائری" وغیرہ رسالہ بینوں کے حافظے سے ابھی محو نہیں ہوئیں

قدیم پیمانے میں ایسے ہی عریاں اور فحش مضامین کو پڑھ کر ایک بہت بڑے ادیب اور افسر مجاز نے کہا تھا کہ،

"پیمانے کو بند کرانا میں ایک انسانی خدمت سمجھتا ہوں"!

نوجوانوں کی تصاویر پر لڑکیوں کے نام سے ہوس خیز نظمیں قدیم پیمانے ہی میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ اگر یہ سرمستی ہے تو پھر خرمستی کسے کہتے ہیں!

دوسری جانب جدید پیمانے کا صراحتہً "قصر الادب" اور تلمیحات میں مولانا سیماب پر حملے کرنا بھی ناروا ہے۔ کیوں کہ حضرت ساغر کا قصر شہرت "ساغر سیمابی" کی حیثیت میں تعمیر ہوا ہے۔ تنہا ساغر سے آج بھی بہت کم لوگ روشناس ہیں۔

ساغر صاحب جو کچھ بھی ہیں جیسے کچھ بھی ہیں، مولانا سیماب کے تربیت یافتہ ہیں، ان کے دوستوں کو استاد زادے کی آڑ لے کر استاد کو مطعون کرنا زیبا نہیں، ہم اپنے ہر دو معاصر سے درخواست کرتے ہیں کہ اپنے پرچوں کو ادبی جنگ کا میدان نہ بنائیں۔ اسی میں دونوں کی نیکی ہے۔

(۶) خدا آپ پر رحم فرمائے، بُرے مرض میں مبتلا ہوئے ہیں۔ یہ شوق ذوق کچھ نہیں دماغی بیماری ہے۔ اس سے نجات ڈھونڈیئے۔ ترقی کر گئی تو فہم کو ذہن سے آزاد کر دے گی۔ اور پھر آپ کی آزاد معاشرت میں سرکار مداخلت کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اس کا علاج مسلسل فاقہ ہے۔ جب بھوک سے دن کو تارے نظر آئیں گے۔ شعر و یہ سب بھول جائیں گے اور آپ کی صحت بحال ہو جائے گی۔ لہٰذا اس جنون کے رہنما کو ڈھونڈنے کی بجائے اس کے چارہ ساز کو تلاش کیجیے۔ اپنے بال بچوں کے متعلق گراں بار ذمہ داریوں پر غور و فکر فرمائیں گے تو اس کا طبیب چارہ جو آپ کو مل جائے گا۔

میری جانب یا مجھ جیسے کسی کی جانب رجوع کرنے کی زحمت نہ فرمائیے! اوّل تو بہ قول شخصے "او خویشتن گم است کرا رہبری کند" میں اس بیماری کا مریض ہوں، رہنما نہیں۔ دوسرے یہ کہ آپ کے حسنِ عقیدت کا احترام کرتے ہوئے اس حیثیت کو اوڑھ بھی لوں تو میرا ضمیر مجھے یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ آپ کو اس خارزار میں قدم رکھنے سے باز رکھوں۔ مختصر یہ کہ سب کچھ کیجیے شاعری کو ہاتھ نہ لگائیے! اور بہت سے فن ہیں۔ مطربی سیکھ لیجیے۔ ارگن نوازی کی جانب توجہ فرمائیے! اور کچھ نہیں تو "منفی معلومات" کی آڑ لے کر "اصل کوک شاستر" کی اشاعت شروع کر دیجیے! بے فکری سے روٹی تو ملے جائے گی۔

رہی شاعری یہ آپ سیکھ بھی لیں اور میں رہنمائی کی مصیبت بیٹھنے پر راضی بھی ہو جاؤں۔ تو بے معنی واہ واہ کے سوا کیا پائیے گا کچھ نہیں اور ہاں میرے شاگردوں کو ناچیز نہ کہیئے۔ وہ بڑی چیز ہیں۔ ان میں سے جس نے اس ناہنجار فن میں ترقی کی۔ سب سے پہلے مجھے اور میری استادی کو عاق کرنا ضروری سمجھا۔ آپ ان کے متعلق اپنا خطاب واپس لیجیے۔ خیریت اسی میں ہے۔ قبلہ اب مجھے اور کچھ نہیں تو اپنا معاصر تو خیال کرتے ہوں گے۔ خدانخواستہ دیوانے کتے نے تو نہیں کاٹا کہ آپ کو شاگرد بنا کر آپ کی معاصرانہ ہمدردی کو شاگردانہ درندگی سے بدل لوں۔ پچھلے پندرہ سال میں یہ سودا بہت کچھ کر چکا ہوں اور تو اور کچھ دنوں سے شاہکار بھی مجھے شاگردانہ ایذائیں دے رہا ہے۔ حالانکہ میں نے کبھی اس پر استادانہ نظر نہیں ڈالی۔

(۷) عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فرینکن سٹائن کسی مافوق الفطرت ہستی کا نام ہے اور اسے انہی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اگر کسی شخص میں تعمیر کی نسبت تخریب کا مادہ زیادہ ہو تو اسے بھی مزاحیہ انداز میں فرینکن سٹائن کہہ دیا جاتا ہے۔ چونکہ لوگوں کے نزدیک فرینکن سٹائن کی افتادِ طبع یہی تھی۔ لیکن یہ سب لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ دراصل یہ کسی جن کا نام نہیں، بلکہ انگلستان کے یگانۂ روزگار شاعر شیلے کی بیوی کے ایک افسانہ کا مرکزی کردار ہے۔

یہ کہانی اس وقت لکھی گئی تھی، جب شیلے اپنی بیوی اور لارڈ بائرن کے ہمراہ جینیوا کے نزدیک تفریحی ایام گزار رہا تھا۔ اتفاقاً موسم خراب ہو گیا اور انہیں کچھ مدت تک شام کا وقت گھر ہی میں گزارنا پڑا۔ اس دوران میں وہ وقت گزاری کے لیے بھوت پریت کی کہانیاں پڑھا کرتے تھے۔ ایک روز بائرن نے تجویز کیا کہ ہم سب ایک ایک کہانی تصنیف کریں اور ان سب کا پلاٹ مافوق العادت ہو۔ شیلے کی بیوی نے جو افسانہ لکھا۔ اس کا عنوان فرینکن سٹائن تھا۔ کہانی کا ماحصل یہ ہے:

فرینکن سٹائن جینیوا کا ایک جادوگر تھا۔ اسے ایک مرتبہ خیال ہوا کہ ایک مردِ کامل کو عالمِ وجود میں لائے۔ لہٰذا شبانہ روز محنت کے بعد اس نے ایک انسانی ڈھانچہ تیار کیا۔ جس کا ہر عضو معمولی انسان کی نسبت کئی گنا بڑا تھا۔ جادو کے عمل سے اس میں جان بھی ڈال دی۔ لیکن جان پڑنی تھی کہ وہ مخلوق عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگی۔ اور اس کی ڈراؤنی شکل نے خود فرینکن کو خوف زدہ کر دیا۔ اس نے بھاگ کر اپنے سونے کے کمرے میں پناہ لی۔ اور خوف کو دل سے بھلانے کے لیے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ تین چار گھنٹے نیم خوابی کے عالم میں بسر کیے۔ لیکن اچانک ہی وہ چیخ مار کر بیدار ہو گیا۔ کیونکہ وہ خوفناک شکل اس کے روبرو تھی۔ وہ کمرہ چھوڑ کر بھاگ گیا اور باقی رات اس نے مکان کے دوسرے حصے میں

بسر کی۔

صبح اُٹھ کر اس کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ وہ وحشتناک مخلوق غائب ہو چکی ہے۔ لیکن یہ مسرت عارضی تھی۔ اُسے بہت جلد اس امر کی اطلاع مل گئی کہ آزاد ہونے کے بعد اس مخلوق کی تباہ کاریاں تمام شہر کے لئے خوف و ہراس کا موجب بن رہی ہیں اور اس نے اس کے بھائی کو بھی قتل کر دیا ہے۔

ایک مرتبہ فرینکن سٹائن سیر کو جا رہا تھا کہ راستے میں اس کی اس خود ساختہ مخلوق سے مُٹھ بھیڑ ہو گئی۔ اس نے شکوہ کیا کہ تم نے مجھے تخلیق کر کے مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ میرا کوئی ساتھی نہیں اور ایک ساتھی کے بغیر زندگی گزارنا بہت دشوار امر ہے۔ اس نے دھمکی دی کہ اگر فرینکن سٹائن نے اس کا ایک ساتھی تخلیق نہ کیا تو وہ اپنی تباہ کاریوں میں اضافہ کر دے گا۔

فرینکن سٹائن نے اسی قسم کی ایک اور مخلوق کو عالم وجود میں لانے کی ٹھانی۔ لیکن ابھی نصف ڈھانچہ ہی تیار ہوا تھا کہ اسے اپنے شغل سے نفرت ہونے لگی۔ اور اس نے اسے پاش پاش کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مخلوق تنہا ہی رہ گئی۔ اس نے غصے میں آکر فرینکن سٹائن کو دھمکی دی کہ وہ عین شادی کے روز اس کی بیوی کو قتل کر دے گی۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ فرینکن سٹائن نے قسم کھائی کہ وہ اپنی مخلوق کو تباہ کر کے ہی دم لے گا۔ لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اُلٹا اس مخلوق نے اسی کو مار ڈالا۔ اور بعد میں خودکشی کر لی۔

اس کہانی کو پڑھ کر آپ پر بخوبی واضح ہو گیا ہوگا، کہ عوام کتنی شدید غلطی کرتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ فرینکن سٹائن اس مافوق العادت مخلوق کا نام تھا۔ حالانکہ دراصل یہ تھا۔ اس جادوگر کا نام ہے جو اسے عالم وجود میں لایا۔

سوالات

(۱) حضرت محترم زِادت معالیکم۔ اسلام علیکم، لفظ "پیاس" بمعنی تشنگی اور لفظ "پیاسا" بمعنی تشنہ کا عروضی وزن مخلوط الیاء یعنی بوزن فاع اور فعلن، درست اور فصیح ہے یا بہ اعلانِ یاء یعنی فعول اور فعولن صحیح ہے؟

(۲) کیا کسی مستند نے ان الفاظ (پیاس اور پیاسے) کو بہ اعلانِ یاء بوزنِ فعول و فعولن بھی نظم کیا ہے؟ اگر جمہور اساتذہ کے خلاف کسی نے ایسا کیا ہے تو اس کی تقلید ہمارے لئے مستحسن ہے یا غیر مستحسن؟

(۳) کم از کم دو اشعار اپنے فرمودات میں سے ایسے عنایت فرما دیجئے جن میں لفظ "پیاس یا پیاسا" موزوں ہوا ہو۔ یہ اشعار سابقہ فرمودات میں سے ہوں یا حالیہ اس کی کچھ شرط نہیں ہے۔ ——— نیازمند، صغیر احسنی جلال آبادی مدیر ماہنامہ دستگیر دہلی

(۴) حضرت علامہ! مجھے علامہ اقبال مرحوم کے اِس شعر کے سمجھنے میں اشکال پیش ہے۔ از راہِ التفات رہنمائی فرما کر ممنون فرمائیں
——— کاتب کا نام پڑھا نہیں گیا ——— اسٹیٹ ہائی اسکول بہاول نگر

"ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے ۔۔۔ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا" (اقبال)

"بے نوری" پہ رونا اور ہزاروں سال کے بعد بصد مشکل "دیدہ ور" کا پیدا ہونا یہ کیا ماجرا ہے؟

اسی معنوں میں علامہ کا فارسی شعر کہ ؎

"عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات ۔۔۔ تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید برون"

اس کی تشریح کر دیتا ہے۔ مگر نرگس کا "بے نوری" پہ رونا اور "دیدہ ور" کا پیدا ہونا؟

جوابات

(۱) جواباً گزارش ہے کہ (۱) میری ناقص رائے میں پیاس اور پیاسا میں یائے مخلوط ہے ملفوظ نہیں۔ اس لئے ان کا بحوری وزن

فاعِ اور فعلن ہے، فعول اور فعولن نہیں۔

(۲) میری نظر میں تو کسی مستند استاد کا کوئی ایسا شعر نہیں گزرا جس میں "پیاس" اور "پیاسا" کو علی الترتیب فعلن اور فعولن کے وزن پر نظم کیا ہو اور متقدمین میں سے کسی نے اگر ایسا کیا ہے تو اُس کا اتباع ہمارے لئے ضروری نہیں۔ اگر ضروری ہو جائے تو پھر میر و سودا کے عہد کے تمام الفاظ "متروکات" کے دائرے سے نکل کر مستعملات کے زمرے میں شامل ہو جائیں گے۔

(۳) یاد نہیں پڑتا کہ کسی شعر میں مَیں نے "پیاس" اور "پیاسا" کے الفاظ نظم کئے ہوں اور فرمائشی شعر کہنا میرے بس کی بات نہیں،

(۴) اس شعر میں کوئی اشکال مجھے تو معلوم نہیں ہوتا۔ ممکن ہے آپ زیادہ ڈوب کر سوال کر رہے ہوں۔

نرگس کا پھول آنکھ کی شکل کا ہوتا ہے۔ جیسے کوئی کنَ انکھیوں سے دیکھ رہا ہو۔ شعر کی زبان میں اسی لئے نرگس کو تماشائیِ چمن سے استعارہ کرتے ہیں۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ نرگس کی آنکھ پہلے بے نور تھی اور تماشائے چمن سے محروم، ہزاروں سال تک اپنی اس محرومی پر وہ روئی۔ تب کہیں جا کر اُس کی آنکھ میں روشنی پیدا ہوئی اور وہ دیدہ ور کہلائی۔

آنکھوں والے کو دیدہ ور نہیں کہہ سکتے۔ دیدہ ور وہی کہلاتا ہے جو پرکھنے کی نظر رکھتا ہو۔

نرگس دیدہ ور ہے۔ یعنی وہ چمن کے تغیرات و انقلابات کو گہری نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ضمناً اس سے شاعر یہ مفہوم پیدا کرتا ہے کہ چمنستان ہستی کے تصورات کو نگاہِ بصیرت سے دیکھنے والے مبصر روز روز پیدا نہیں ہوا کرتے۔ زمانہ ہزاروں کروٹیں بدلتا ہے تب کوئی محرم اسرارِ حیات دنیا میں پیدا ہوتا ہے۔

سوالات

(۱) حضرت علامہ!

تسلیم۔ حالیؔ اور آزادؔ کی نثر و نظم پر ایک نوٹ میں تبصرہ کرنے کی مہربانی فرمائیں۔ پریم کے حصۂ سوال و جواب کو ہر نمبر میں دیا کریں۔ اس سے ہم جیسے نیازمندانِ ادب کو بڑی مدد ملتی ہے۔ —— عبدالمومن نثارؔ بی۔اے۔ کراچی کلیفٹن

(۲) علامہ صاحب! تسلیم

مہربانی فرما کر یہ بتائیے کہ جوانی اور شباب میں کیا فرق ہے۔ مَیں نے کہیں شباب کو شاب لکھا دیکھا ہے۔ کیا شاب اور شباب ایک چیز ہے؟ —— عبدالکریم خواجہ بازار قصہ خوانی شہر پشاور

جوابات

(۱) مولانا آزادؔ نثر میں "صاحبِ طرز" ہیں۔ اگرچہ اُن کے اندازِ نثر نگاری میں قدامت کی جھلک ہے۔ میرزا غالبؔ کی نثر کی تازگی اور برجستگی آزاد کی نثر میں نہیں، لیکن بہر انداز آزادؔ کا اسلوبِ نگارش سہل الممتنع ہے۔ اُن کے رنگ میں دو سطریں بھی کامیاب پیروی کے ساتھ لکھنی دشوار ہیں۔ مختصر یہ کہ نثر میں آزادؔ اپنے رنگ کا موجد بھی ہے اور خاتم بھی۔ آزادؔ کے بعد کوئی دوسرا آزاد اب تک پیدا نہیں ہوا۔

مولانا حالیؔ کا اندازِ تحریر استدلالی ہے، یعنی دعوے کی دلیل وہ ساتھ ساتھ بیان کرتے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ حالیؔ کی طرزِ تحریر معلمانہ ہے۔ گستاخی نہ سمجھی جائے تو مَیں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اُن کا تصنیفی رنگ کسی خاص اور محسوس امتیاز کا حامل نہیں۔ البتہ اُن کے خطوط اور بعض دیباچوں کی نثر میں اُن کی انفرادیت جھلکتی ہے۔ بہرحال نثر نگاری میں حالیؔ کو آزادؔ سے کوئی نسبت ہی نہیں۔

البتہ بہ حیثیت تنقید نگار حالیؔ آزادؔ سے بہت آگے ہیں۔ حالیؔ کا اسلوبِ تنقید نگاری آزادؔ، شبلیؔ اور دوسرے ہمعصر مصنفین سے ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ شاعری میں آزادؔ کو حالیؔ سے کوئی نسبت نہیں۔ حالیؔ بہت پختہ مشق، قادر التحریر شاعر ہے "مسدس حالیؔ" کو اس

دعوے کی دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ آزاد کی مسلسل نظم ہو یا غزل "تعقید لفظی" کے نقص سے معمور ہوتی ہے۔ حالی کا کلام اس عیب سے بالکل پاک ہے۔ مولانا آزاد نے ۱۸۷۴ء میں جس جدید شاعری کی بنیاد لاہور میں رکھی تھی، اگر حالی جیسا قادر الکلام ساحر اس میں شریک نہ ہوتا تو یہ مشاعرہ جدید اردو شاعری کی علمبرداری میں کامیابی حاصل نہ کر سکتا۔ لیکن اس کے باوجود ہم آزاد کو اس شرف سے محروم نہیں کر سکتے کیونکہ وہ جدید اردو شاعری کا بانی ہے اور اردو شاعری کے لئے ترقی کی بیکراں وسعتیں پیدا کرنا آزاد ہی کا کام تھا۔

(۲) شباب جوانی کا عربی نام ہے۔ یعنی جوانی فارسی لفظ ہے، اردو میں بھی اپنے اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ عربی میں جوانی کا ترجمہ شباب کے لفظ سے کیا جائے گا۔ مختصر یہ کہ جوانی فارسی زبان کا لفظ ہے اور شباب عربی کا اور یہ دونوں ایک ہی چیز کے نام ہیں۔ البتہ شباب اور "شاب" دو چیزیں ہیں ایک نہیں۔ شباب کے معنی جوانی اور شاب کا مطلب جوان ہے۔ شاب کی عربی جمع "شبان" آتی ہے۔ آپ نے بعض اسلامی انجمنوں کا نام "شبان المسلمین" سنا ہوگا یہ شبان المسلمین "دی ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن" کا ترجمہ ہے۔

سوال: علامہ محترم کرم فرما کر اردو نثر کے پہلے، دوسرے اور تیسرے دور پر مختصر انداز میں ایک نوٹ درج شاہکار فرمائیے ممنون ہوں گا۔

——— محمد رشید بی۔اے ملتان پاک دروازہ

جواب

اُردو نثر کا پہلا دور: اس دور کی ابتدا دکن میں ہوئی۔ دکن میں اُردو نثر کی بعض کتابیں دستیاب ہوئی ہیں۔ جن کا عہد تصنیف سنہ ۸۰۰ھ کے قریب ثابت ہوتا ہے۔ اس حساب سے اردو کی ابتداء کو آج سے کم و بیش ساڑھے آٹھ سو سال گزر چکے ہیں۔ ۸۰۰ھ میں شیخ گنج العلم کے فقہی رسائل خواجہ بندہ نواز کی معراج العاشقین اور ہدایت نامہ، سید محمد عبداللہ کا اردو ترجمہ نشاط العشق، میراں جی شمس العشاق کی کتاب جل ترنگ اس دور کی نثری تصانیف ہیں۔

اس عہد کی اُردو کیا ہے؟ درحقیقت ہندی، تامل تلنگو اور اسلامی اصطلاحات سے مل جل کر ایک مرکب تیار ہوا ہے جسے اُردو کی شکل ہیولانی کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

اَور کی بجائے ہور، سے کی جگہ تے، اپنے کو اپنڑے، مجھے کو منجے، کہ کے موقعہ پر کون، فرماتے ہیں، کی جگہ فرمائے ہیں، نہ کی بجائے نا، ہو کو ہوئے لکھتے تھے، زبان کا ڈول اس درجے بے ڈھنگا اور ناتراشیدہ تھا کہ آج اسے قرائن کی مدد کے سوا سمجھنا دشوار ہے، نثر تو خیر لیکن اس عہد کی نظم کو تو بہ مشکل ہی اُردو نظم کا نام دیا جا سکتا ہے۔ نظم میں دکنی الفاظ اُت گت استعمال کیے جاتے تھے ذیل کے اقتباسات سے پہلے دور کی نثر کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

حضرت خواجہ بندہ نواز رحمتہ اللہ علیہ اپنی کتاب معراج العاشقین میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"نبی کہے تحقیق خدا کے بیان نے ستر ہزار پردے اوجیالے کے ہور اندھیارے کے اگر اس میں تے یک پردہ اٹھ جاوے تو اس کی آنچ تے میں جلوں ہو، ایک وقت ایسا ہوتا ہے، سمجھو اور دیکھو بے پروا اندھارے کے اوجیالے کے عارفاں پر ہے۔ دے واصلاں پر پردے نورانی، و بے واصلاں کا صفا پردا ہوتا ہے۔ محمدؐ کا نور اے عزیز اول ربوبیت کا پردہ سوائے تن جمالی جسم کے پردے کوں اپنڑے یا ج اس جمال الوہیت کے پردے ممکن الوجود کوں اپنڑ سکے۔" (معراج العاشقین مطبوعہ تاج پریس حیدر آباد صفحہ ۱۲)

"اے عزیز مرید صادق اچھے پیر کے سوا کون امر خدا ہو، رسول پیدا کیا ہے۔ اپنے بوج کوں ممکن کون یہی ہے، نصیحت کرنے کوں اس بات میں امام جعفر صادق خوب فرمائے ہیں، پیر کوں درکار ہیں، دس جتو سمجھتا، سو اس پر فرض ہوتا ہے۔ اول علم اچھے دانائی کا بوج کا، دوئم سخاوت اچھے دل کا، سوم عمل اچھے دانائی کا، چہارم مرید کے مال سوں طمع نہ کرنا حرص کا، پنجم نادانی کا بات نہ کرے مریداں میں؛

ششم عقل اچھی، ہفتم شجاعت اچھی، ہشتم یاد میں رہنا، نہم حال پر حال پہنچے، دہم توجہ بوجہ کا مالک ہونے تا (معراج العاشقین عبارت ترجمہ)

اُردو نثر کا دوسرا دَور:

اُردو نثر کے اس دَور کی بنیاد اٹھارہویں صدی عیسوی کے اخیر میں ڈاکٹر گلکرائسٹ کے مبارک ہاتھوں سے رکھی گئی۔

کلکتے کے مشہور قلعہ فورٹ ولیم میں حکومت برطانیہ کی جانب سے اُن تازہ ولایت انگریزوں کی تعلیم کے لئے ایک کالج قائم کیا گیا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہو کر ہندوستان آیا کرتے تھے۔ ۱۸۰۰ء میں لارڈ ولزلی نے ڈاکٹر گلکرائسٹ کو اس کالج کا پرنسپل مقرر کیا۔ صاحب موصوف کو ہندوستانی زبان میں تصنیف و تالیف کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ انہوں نے خود بھی انگریزی زبان میں اردو گرامر اُردو ڈکشنری اور چند اور کتابیں تصنیف کیں۔ اور دُور دُور سے نامور اردو ادیب تلاش کر کے ایک دارالترجمہ والتالیف قائم کیا۔

اس لٹریری سوسائٹی کے ممبروں میں حضرات ذیل میں قابلِ ذکر ہیں:-

میر امن دہلوی، حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس، لالہ نہال چند لاہوری، مرزا علی لطف، مرزا کاظم علی جوان، مظہر علی ولا، سری للو لال کوی۔

مؤخرالذکر نے ہندی نثر میں کہانیاں لکھنے کے ساتھ ہی اردو مصنفین کو ہندی سے اُردو میں ترجمہ کرنے میں مدد دی۔

چونکہ کہانیوں سے انسان کو بدرِ فطرت سے اُنس چلا آتا ہے۔ ڈاکٹر گلکرائسٹ نے فطرت کی ادا شناسی سے کام لے کر حضرات مذکورہ سے فارسی قصّوں کو ہندی نثر میں ڈھالنے کا کام لیا۔ تاکہ کہانیوں کے ساتھ ساتھ اُردو زبان بھی ملک میں ہر دلعزیزی حاصل کر سکے۔ یہ تدبیر اس قدر کامیاب ثابت ہوئی کہ اُردو دنیا آج نصف صدی بعد بھی اُس عہد کے قصّے کہانیوں کو فراموش نہ کر سکی چنانچہ شمالی ہند کے عام اردو خوانوں میں اب تک بھی قصّے چہار درویش، طوطا کہانی، آرائش محفل وغیرہ رونق بزم و انجمن بنی ہوئی ہیں۔

اس اُدبی محفل کی جانب سے جو اردو کتابیں شائع ہوئیں اُن میں ذیل کی تصانیف نے خاص طور پر قبولیت حاصل کی:

باغ و بہار، طوطا کہانی۔ آرائش محفل۔ تاریخ اردو۔ گلزار دانش، نثر بے نظیر، گل بکاؤلی۔

اِس عہد کی اردو نثر دَورِ اوّل کی اردو سے بہت مختلف ہے۔ پہلے دَور کی اُردو میں تعقید لفظی و معنوی حروف ربط کا بے جا استعمال، تنافرِ حروف، بے ربط جملے، بے جوڑ فقرے، دکنی الفاظ کی بھرمار کے سبب عبارت عسیر الفہم ہوتی تھی، اِس دَور کی نثر درحقیقت اردو نثر کا صحیح نام پانے کی مستحق سمجھی جا سکتی ہے۔

اس دَور کے مصنفین نے اردو کو صیقل کر دیا ہے۔ بے ڈھنگے اور سامعہ خراش الفاظ کو تراش خراش کے بعد مترنم بنا دیا ہے تنافرِ حروف کے عیب سے عبارت پاک ہے۔ فورٹ ولیم لٹریری سوسائٹی نے جس سادہ سلیس عام فہم گنجلک اور تعقید سے پاک اردو کے نمونے پیش کئے وہ آج بھی اردو کے ترقی یافتہ انشاء پردازوں کے لئے مشعل راہ بن سکتے ہیں۔

اسی اردو کو مرزا رجب علی سرور لکھنوی نے فسانۂ عجائب میں "اردوئے معلّیٰ" سے اردوئے معلّیٰ بنا کر زبان کی فطری سادگی کو آرٹ کے سانچے میں ڈھال دیا۔ پیچ در پیچ استعارے، تشبیہات کے شکن در شکن زنجیرے، دور از کار ربط بے کار مبالغے مقفیٰ و مسجع فقرے۔ اس قسم کی پابندیوں نے زبان کو چیستان کی طرح عسیر الفہم بنا دیا۔ اس وقت اودھ کے پُر تکلف و پُر تصنع تمدن و معاشرت کا زندگی کے ہر شعبے پر اثر پڑ رہا تھا۔ بھلا زبان اور لٹریچر اس بادِ سموم سے کیوں کر محفوظ رہ سکتے تھے۔

فسانۂ عجائب کی طرزِ انشائی اس قدر مقبول ہوئی کہ ہر ادیب فیشن کے طور پر اسی طرز کا تتبع کرنے لگا۔

مرزا غالب جو اردو نثر کے تیسرے دَور کا بانی ہے۔ مکاتیب کے علاوہ اپنی دوسری اردو تحریروں کو اس رنگ سے نہ بچا سکا

غالب کے معاصرین مولینا غلام امام شہید اور مولینا بے خبر پر تو یہ رنگ صرف کھلا ہی نہیں بلکہ جم گیا ہے۔

اُردو نثر کا تیسرا دَور :۔ اس دَور کی بنیاد مرزا غالب کے اُن خطوط پر رکھی گئی ہے جو "اُردوئے معلیٰ" کے نام سے شایع ہوئے۔ اُن خطوط کی اُردو اس عہد میں سب سے جُدا سب سے ممتاز ہے اور اس وقت سے اب تک حیرت انگیز طور پر غالب نے اس طرز میں اپنے کسی حریف کو اُبھرنے نہیں دیا۔

غالب کی اس اردو پر "سرسید اسکول آف اردو" کی بنیاد رکھی گئی۔

غالب سے پہلے اور اس کے عہد تک بھی مرزا رجب علی سرور لکھنوی کی مقفیٰ و مسجع نثر ہندوستان کے اس سرے سے اس سرے تک ہر دلعزیزی حاصل کر چکی تھی۔ خطوط کے علاوہ خود غالب کی دوسری تحریریں بھی اسی صنعتی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں غالب کے معاصر مولینا بے خبر اسی طرز کا اتباع کرتے رہے۔ یہ اُردو کی خوش نصیبی تھی کہ غالب کو ضعف دماغ طاری ہوا اور انہوں نے اس وقت کے دستور کے خلاف فارسی میں خطوط نویسی کی جگہ کاویوں سے تنگ آکر اپنے دوستوں، شاگردوں اور عزیزوں کو اُردو میں خطوط لکھنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ وہ اپنے شاگرد کے شکایتی خط کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "کیا کروں دماغ اس قابل نہیں رہا کہ فارسی میں خطوط نگاری کر سکوں۔ اس لئے مجبوراً اردو میں تمہیں خط لکھ دیا"

ورنہ اگر خدا نخواستہ اخیر عمر تک دماغ غالب کا ساتھ دے سکتا تو صرف یہی نہیں کہ اردو ادب "اردوئے معلیٰ" جیسی گراں پایہ کتاب سے محروم ہو جاتا بلکہ اردو نثر کے تیسرے دَور کا آغاز ایک مدت دراز کے لئے معرض التوا میں پڑ جاتا۔

سرسید کی دوربین نگاہ تاڑ گئی کہ اردو کو علمی زبان بنانے کے لئے ضروری ہے کہ سرور کی غیر قدرتی صنعتی پابندیوں سے آزاد کرکے اُردو کو سلیس، عام فہم اور سادہ بنایا جائے۔ مرزا غالب کی اردوئے معلیٰ کو نمونہ بنا کر انہوں نے اور اُن کی پارٹی نے اسی سلیس اور سادہ اردو میں وہ یادگار کتابیں لکھیں جو آج تک اردو ادب کا بہترین سرمایہ سمجھی جاتی ہیں۔

سرسید کو حسن اتفاق سے ساتھی ایسے ملے کہ جو اپنی اپنی جگہ فخر روزگار تھے۔ اس علمی سوسائٹی نے اپنی بیش بہا تصانیف سے اُردو کو اردو بنایا۔ اِس دَور کی اردو نثر کی خصوصیات حسب ذیل ہیں :۔

سادہ سلیس، عام فہم، عربی الفاظ کی آمیزش، پیرایۂ بیان عالمانہ تلمیحات کی کثرت اس دَور میں زیادہ تر اصلاحی، مذہبی، سیرت نگاری، تاریخی اور علمی کتابیں لکھی گئیں۔

سرسید، پروفیسر ذکا اللہ، ڈاکٹر نذیر احمد، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولوی چراغ علی، علامہ شبلی، مولینا حالی اور اُن کے ہم عہد مصنفوں میں مولینا محمد حسین آزاد دھلوی، پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مولینا عبدالحلیم شرر لکھنوی وغیرہ ہم بھی "سرسید اسکول آف اردو لٹریچر" کے قابل قدر ممبر تھے۔ ان کی سحر نگاریوں نے اُردو کے اس دَور کو کامیاب بنایا۔

سوالات

آپ نے نومبر کے شاہکار میں جو سوال کا جواب دیا ہے اُس کا شکریہ۔ اسی سلسلے میں مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔

میں نے حضرت اصغر کے مجموعۂ کلام "نشاط روح" پر اقبال احمد سہیل ایم۔اے کا مقدمہ پڑھا ہے۔ اُسی کے ساتھ حضرت جگر کے کلام پر مرزا احسان احمد وکیل اعظم گڈھ اور فانی کے دیوان پر پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مقدمات پڑھنے کا بھی اتفاق ہوا ہے۔ فانی صاحب کے متعلق آپ کی مختصر رائے تو صدیقی کے طویل مقدمے کی تائید کرتی ہے۔ لیکن اصغر و جگر کے کلام پر جو مولوی اقبال احمد سہیل اور مرزا سہیل احمد کے مقدمے ہیں آپ کی رائے ان کی تائید نہیں کرتی۔ ان مقدمہ لکھنے والوں نے تو انہیں آسمان پر چڑھا دیا ہے۔ مرزا صاحب کے مقدمے

و پڑھ کر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جگر سے بڑا کوئی شاعر نہیں گزرا۔ اسی طرح سہیل صاحب اصغر کو اردو شاعروں کا سرتاج بتاتے ہیں۔ سبب ہے آپ نے بھی ان مقدمات کو پڑھا ہوگا۔ نہ پڑھا ہو تو میں بھیج سکتا ہوں انہیں ایک نظر پڑھ ڈالیئے۔ پھر رائے قائم کیجیئے! ممکن ہے آپ کی رائے بدل جائے — ——حامد حسین رتنگ بی۔اے

(۲) آپ جگہ جگہ "شبابیات" کے متعلق اظہار رائے فرماتے ہیں۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ شبابیات سے آپ کی کیا مراد ہے؟ اور کون حضرات اس صنعت کو رواج دے رہے ہیں۔ ——ڈی۔ سی۔ منظل ایم۔اے۔ ایم اوایل پروفیسر مسلم کالج امرتسر

(۳) مجموعہ جذبات حضرت جوش ملیح آبادی اور ان کی شاعری پر آپ کی کیا رائے ہے؟ —ضمیر احمد ایس وی۔ ٹیچر ماجناله

(۴) مولانا نیاز اور مولانا سیماب میں آج کل جنگ ہو رہی ہے۔ آپ نے دونوں طرف کے مضمون پڑھے ہوں گے۔ ہماری راہنمائی کے لیئے کوئی فیصلہ دے سکتے ہوں تو شاہکار کے ناظرین کو مستفید فرمایئے۔ —— بہاری لال شاکر بی اے ڈی بی ہائی سکول پٹھانکوٹ

جوابات :-

(۱) میں نے ہر سہ حضرات کے کلام پر مذکورہ بالا نقادوں کے مقدمات پڑھے ہیں۔ تفصیلات میں تو میں کسی نقاد کا ساتھ نہیں دے سکتا البتہ اُن کے بعض حصوں سے اتفاق رائے رکھتا ہوں۔ حضرت اصغر گونڈوی کے متعلق مولوی اقبال احمد سہیل کی یہ رائے کہ "اصغر میں غالب، میر اور غالباً انیس کے کلام کی خصوصیات جمع ہیں (او کما قال)

میں اس رائے سے قطعاً متفق نہیں۔ مولانا اصغر کا کلام بلا مقابلہ قابل قدر ہے۔ اور چونکہ تصوف کے مسائل اُن کے کلام کا ماخذ ہیں اس لئے کلام میں پاکیزگی، رفعت اور کہیں کہیں گہرائی بھی ہے۔ سر اقبال کے خیالات کو بھی اپنے انداز میں لانے کی سعی کرتے ہیں، اس میں کہیں تو کامیاب ہو جاتے ہیں اور کہیں یہ اُستادی کھل بھی جاتی ہے۔ ان کے بعض اشعار حد درجہ دلکش ہیں مثلاً :-

مدت ہوئی کہ چشم تحیر کو ہے سکوت   اب جنبش نظر میں کوئی داستان نہیں

یہ شعر بے مثال ہے۔

باقی اُن کی اِس قسم کی شاعری کہ ع

"پردے پہ مصوّر ہی تنہا نظر آتا ہے"

اچھے انداز میں منظوم تصوف ہے اور کچھ نہیں، ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ مسائل تصوف کی تبلیغ ان اشعار سے بہت ہی موثر طریقے پر ہوتی ہے، بہرحال بلند رتبہ شاعروں میں انہیں سمجھتا ہوں۔ رہے مقدمہ نگار، یہ حضرات تو عموماً قصیدہ نگار ہوا کرتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ان کے قصیدے نظم کی بجائے نثر میں ہوتے ہیں۔ حضرت جگر کے مقدمہ نگار کی حیثیت بھی ایک قصیدہ طراز سے زیادہ نہیں، بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ کسی شاعر یا مصنف کی یہ شامت اعمال ہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی تصنیف مقدمہ نگار کے حوالے کر دیتا ہے، اس لیئے میں سمجھتا ہوں کہ اصغر و جگر کی شاعری کو اُس کے مقدمات نے موزوں مقام حاصل کرنے سے روک دیا ہے۔

(۲) شبابیات کی صنعت کو رائج کرنے والے کون کون حضرات ہیں؟ سوال کا یہ حصہ غیر ضروری سا ہے، البتہ یہ عرض کئے دیتا ہوں کہ شبابیات کیا ہیں؟

شبابیات سے میری مراد اُس قسم کی نظموں یا منثورات سے ہے جن میں فسق و فجور پر برانگیختہ کرنے والے ہوس کارانہ خیالات اور عریاں تشبیہات و استعارات ہوں۔ شبابی شعراء بیں اکثر عربی سے ناآشنا ہیں، مگر اپنی دماغی تہی دستی کو عربی کے مغلق الفاظ کے بے محل استعمال سے چھپانا چاہتے ہیں۔

نثر میں بدنام "ادبِ لطیف" اور نظم میں "شبابیات" درحقیقت لٹریچر کی عفونت کے دو نام ہیں۔

وہ ذہین کو معتنیٰ کر کے اس مکروہ صنعت کے علم بردار عموماً وہ تنگ بند اور خام مشق ہیں جن پر جوانی بھنگ کا نشہ بن کر طاری ہو رہی ہے یا اب ادھیڑ ہو چلے ہیں لیکن اس قسم کی عریاں نگاری کے سبب ملک کے بے سواد نوجوانوں میں قبولیت حاصل کرنے کی خاطر اپنی نام نہاد شاعری کو جان شاعری ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ آبرو باختہ عورتوں سے خط و کتابت، اُن کے پرائیویٹ خطوط کی اشاعت اُن کے حسن و جمال پر (خواہ وہ اس نعمت سے محروم ہی ہوں) ہوس انگیز قصیدے لکھنا، ایکٹرسوں اور طوائفوں کو اپنی نظموں میں مخاطب بنانا اور اس قسم کے ناستودہ کردار ان شبابیوں کے محبوب مشاغل ہوتے ہیں

اس صنفِ ادب نے ملک کے لٹریچر کو متعفن بنا رکھا ہے یہ لٹریچر ہمارے نوجوانوں کے دل و دماغ کو ماؤف کئے ہوئے ہے۔ شبابیات یا ادبِ لطیف کے دلدادوں کے الفاظ محدود اور پیرایۂ بیان محدود در محدود ہوتا ہے۔ دوشیزہ، دوشیزگی، شباب جان رانیں، سینۂ مرمریں، ساقِ بلوریں، موسیقی حزیں، ساری کا آنچل، رقاصہ، مغنیہ، حسین جھرمٹ، موج رنگ و بو، ارتعاش لرزاں ہستی پراں، رومان حیات، آنکھوں کی غمگین موسیقی، نگاہوں کا برقی رقص، اداؤں کا شیریں نغمہ، سلمیٰ، عذرا وغیرہ ذالک من الفہوات والمہملات۔ الفاظ مذکورہ بالا شبابیات اور ادبِ لطیف کے پیٹنٹ الفاظ ہیں۔ انہیں کے ہیر پھیر سے اس صنف کی تعمیر و آرائش ہوتی ہے۔ ادبِ لطیف اگر لائٹ لٹریچر کا ترجمہ ہے، تو اُس سے لٹریچر کی وہ صنف مراد ہونی چاہیئے، جو عدیم الفرصت اور کثیر الاشغال لوگوں کے تھکے ہوئے دماغوں اور کسلمند طبائع کے لئے تفریح کا باعث ثابت ہو، لیکن اُردو میں "ادبِ لطیف" کی مہمل اور مغلق عبارات اور مبتداء و خبر کے درمیان بے ربط و بے معنی نقطے اور علاماتِ وقف و استفسار و حیرت، دماغ کے لئے تفریح کی بجائے کاوش و کاہش کا موجب بن جاتی ہے۔

اِس صنف کو اُردو میں سب سے پہلے سید سجاد حیدر مصنف خیالستان نے روشناس کرایا۔ مگر سجاد حیدر کا "ادبِ لطیف" غنیمت تھا کہ اُس میں معنی و مفہوم کی جستجو ناکام نہ رہتی تھی، بے باکی اور شوخی تھی مگر عریانی نہ تھی۔ نہ سجاد حیدر اپنے پیروؤں کی طرح آوارگیٔ خیال کے مرض میں مبتلا نہ جانی کو انہوں نے سر پر بھوت بنا کر چڑھایا تھا۔ اُن کی عبارت آرائی میں آمد کا زور نمایاں تھا۔

سید سجاد حیدر کی شادی نے انہیں اس لائن سے نکالا تو حضرت نیاز فتحپوری نے اس صنف کو اپنانے کی کوشش کی، مگر یہاں آورد تھی، آمد نہ تھی، دونوں کے ادبِ لطیف میں اصل و نقل کا سا فرق تھا، بے باکی ترقی کر کے شوخ عریانی بن گئی تھی، مگر چونکہ نقاشِ ثانی پختہ مشق اور طبّاع تھا وہ اسے کسی حد تک نباہتا رہا، مگر بہت سی مہمل اور بے معنی ترکیب سے نیاز کا ادبِ لطیف گراں بار بھی ہو گیا، لیکن اس کے کچھ ٹکڑے بے انتہا دل آویز بھی ہیں۔ نیاز نے رسالہ نقاد آگرہ کے ذریعے اس اسکول کو اس قدر ہمہ گیر بنایا کہ ہر اُردو خواں کالج کے آخری درجوں سے لے کر مڈل کی پنچوں تک اسی رنگ میں نظر آنے لگا۔ ادھر نیاز نے ٹیگور کی گیتان جلی کا ترجمہ شائع کیا اُس ترجمے نے اس آگ میں بارود کا کام دیا اور پھر تو یہ دماغی مالیخولیا وبائی صورت اختیار کر گیا اور اس کا نام ادبِ لطیف کی بجائے نیازی رنگ، نقادی رنگ، ٹیگوری رنگ پڑ گیا۔

اِس رنگ کی ہندوستان گیر پیروی نے خام مشق و خام طبع نوجوانوں کے ہاتھوں اس میں عفونت پیدا کر دی۔ اور اس پردے میں مہمل نگاری عام ہو گئی یہ مہمل اور عفونت زدہ لٹریچر ہمارے ناولانہ و عزلی ادب سے زیادہ گھنونا اور بہت زیادہ شرم سوز اور معطل میں انبار در انبار ہو گیا۔ دماغی فسق و فجور کی اسی طغیانی نے مہدی افادی جیسے بے مثل ادیب کو بھی پیٹ لیا آتشک کے لئے "تمغۂ عشق" اور پستانوں کے لئے "مقیاس الشباب" کی ترکیبیں اُسی حسن کے فلاسفر کی نادر ایجادات میں سے ہیں۔

رسالہ پیمانہ آگرہ نے ادب لطیف کو ادب خلیط بنا کر حیا فروشی کو پریس ایکٹ کی زد تک ترقی دی۔ اس میں "دوشیزہ کی ڈائری" کے عنوان سے ایک کوک شاستر مسلسل شائع ہوتا رہا۔ شرم وحیا، انسانیت و تہذیب نے آنکھیں بند کر لیں۔ آبرو باختہ عورتوں کے نام سے "پیمانہ" کے "نوجوان حسین" ایڈیٹر کی تصویر پر بوس ریز نظمیں شائع ہوتی رہیں۔ ملک کی دوشیزاؤں کے نام ایڈیٹر کا ایک پیغام شائع ہوا کہ گھروں کی چار دیواری سے باہر نکل آؤ اور اردو ادب کو اپنی جمیل نگارش سے رنگین کر دو۔" (او کما قال)

اس رسالے کو نوجوان طبقے میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ خدا خدا کر کے کسی حادثے نے اس شرم سوز رسالے کی زندگی ختم کر دی، ورنہ یہ زندہ رہتا تو نہ جانے حریم عصمت میں کیا کیا طوفان رسوائی برپا کرتا۔

ادب لطیف کے اس ہنگامۂ عام کے خلاف متین طبقوں سے متفقہ صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ ادبی اداروں میں اس کے خلاف پُر زور مخالفت کا یہ اثر ہوا کہ حضرت نیاز نے رسالہ نگار جاری کرتے ہوئے سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ "اس رسالے میں وہ رنگ جو میری جانب منسوب ہو چکا ہے مطلق نہ ہوگا۔"

پچھلے نو دس سال ادب لطیف کے لئے ناساز گار ثابت ہوئے اور نہایت سرعت کے ساتھ قعر انحطاط کی جانب اس کا رُخ رہا ــــــ لیکن جن طبائع کے ضمیر میں پستی رچ گئی ہے اُن کے سفلی جذبات نے "شبابیات" اور "صنفی معلومات" کے نام سے نیا میدان تلاش کر لیا۔ شاعروں نے ادب لطیف کو منظوم صورت دے کر "شبابیات" اس کا نام رکھ دیا اور نثر نگاروں نے "صنفی معلومات" کے نام سے کوک شاستروں کی اشاعت شروع کر دی۔ یہ دور شبابیات اور صنفی معلومات کا دور ہے۔ ہر صنفِ ادب کو اس دور نے مغلوب کر رکھا ہے، جس رسالے میں شبابیات کا چٹخارہ نہ ہو بے سواد نوجوان اُسے زیانِ باصرہ خیال کرتے ہیں۔

دوشیزاؤں کے نام منظوم خطوط کی اشاعت بے جھجک ہو رہی ہے۔ متین ادبیات کو اس دور مظلم نے بے موسم کی چیز بنا دیا ہے اور ایسی کیا ہے ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں   محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

(۱۳) جوش ملیح آبادی ملک کے منتخب شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن کی شاعری کا وہ حصہ جو رباعیات کے نام سے شراب و ساقی کا حامل ہو کر شائع ہو رہا ہے بہت بے کیف ہے۔ باقی ان کا اکثر کلام بہت بلند اور بعض نظمیں تو بے انتہا بلند اور معیاری قسم کی ہوتی ہیں۔ یہ پہلا شاعر ہے جس نے عاشق و معشوق کے الفاظ کی بجائے، حسن و عشق کی آویزشوں سے کلام میں جدت پیدا کی ہے، موصوف کو نظر انداز کر کے اُس کی صفات کو معرض بیان میں لایا، مناظر فطرت کو اُن کے اصلی سادہ انداز میں پیش کیا۔ اس کے "اخلاقیات" بھی بہت ہی بلند اور موثر ہیں۔

اگرچہ خود شاعر پر اُس کے کلام کا کچھ اثر نہیں ہوا مگر اس کا کلام نصف صدی کے بعد جب کہ اُس کے جاننے والے مر چکے ہوں گے اُسے ایک بلند اخلاق شاعر تسلیم کرا دے گا۔

(۱۴) مولانا سیماب و حضرت نیاز کی ادبی جنگ کا مجھے تفصیلی حال معلوم نہیں۔ "شاعر" میں اس سلسلے کا ایک مضمون میں نے ضرور پڑھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ نیاز صاحب نے مولانا سیماب کے دیوان پر کوئی تنقید لکھی تھی، جس میں اُن کے کلام پر کچھ اعتراض کیے تھے۔ اُن اعتراضات نے باہمی جنگ کی بنیاد ڈالی ہے۔ میری نظر سے وہ اعتراض گزرے نہ اُن پر نکتہ چینی، کہ اپنی رائے کا اظہار کر سکوں۔ البتہ اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ وہ اعتراضات اگر معقول ہیں تو بُرا ماننے کی ضرورت نہیں کہ وہ بھی انسان ہیں اور انسان کا کلام اضافی ہوتا ہے ربانی نہیں ہوتا۔ رحم اللہ من ہدانی الی عیوبی۔ اور اگر اعتراضات میں کوئی وزن نہیں تو پھر بُرا ماننے کی بجائے مولانا کو نیاز صاحب کا

شکر گزار ہونا چاہیئے کہ وہ غلط پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ تنقید و نکتہ چینی پر تبرا ماننے ہی کی رسم نے صحیح تنقید سے اردو ادب کو محروم کر رکھا ہے ہاں تنقید نگار کو آغا و مرحوم کی زبان استعمال کرنی چاہیئے یعنی اپنی نگارش کو دل آزاری کے پہلو سے بچانا ضروری ہے۔ اور معاصر لندن چالک کرنے سے اجتناب بھی ناگزیر ہے۔ مولانا سیماب شاگردوں کی ایک پوری امت کے رہنما ہیں ان کی لغزش دور رس نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اس لئے اُن کے کلام کی فروگذاشتوں سے صرف نظر کرنا ایک ادبی گناہ ٹھیرے گا۔

مجھے آپ مولانا کے متنازع فیہا اشعار اور اُن پر نکتہ چینی سے باخبر کریں۔ تو کوئی فیصلہ دے سکوں گا۔ اتنا اب بھی گزارش کر سکتا ہوں کہ سیماب کا کلام تخیل کی رفعت، اسلوب بیان کی جدت سے مالا مال اور ابتذال سے پاک ہوتا ہے۔ اور کوئی نکتہ چینی انہیں اپنے حاصل کردہ رتبۂ شاعری سے گرا نہیں سکتی۔

سوالات

(۱) پرچار کا لفظ ہندی ہے پروپیگنڈا اس سے زیادہ معانی پر حاوی ہے۔ پرچار صرف تبلیغ کے ہم معنی ہے ان دونوں لفظوں سے مذہبی اشاعت کے معنی زیادہ نکلتے ہیں۔ پھر کیوں نہ پروپیگنڈا کا لفظ پرچار کی بجائے استعمال کیا جائے؟

—— عزیز احمد بی۔ اے امرتسر

(۲) حادثہ کی جمع حوادث ہے اور یہی صحیح ہے۔ پھر حادثات کو کیوں حادثہ کی جمع بنایا جاتا ہے۔ یہ ہندی طرز کی جمع جیسے اسلامی کی جمع اسلامیات یہ عربی جمع نہیں ہے جدید قسم کی مصنوعی جمع ہے۔

غلام حسین ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل۔ لاہور چونا منڈی

(۳) آج کل اکثر رسالوں پر فہرست مضامین کی جگہ محض فہرس لکھا ہوتا ہے۔ کیا یہ لفظ فہرست کی ت حذف کر کے بنایا گیا ہے۔ اگر جواب اثبات میں ہے تو لفظوں کے محذوف یا ایزاد کرنے کا حق صرف مدیران رسائل ہی کو پہنچتا ہے یا کسی اور کو بھی؟ اور اگر ایسا نہیں تو فہرست کی بجائے فہرس لکھ دینے سے معانی میں تو کوئی فرق نہیں پڑتا؟ امیر حسن غار خورشید لاج لالیاں

(۴) انسان کی عمرِ طبیعی کیا ہے؟ آپ عمرِ طبیعی تک جینا پسند کرتے ہیں یا نہیں؟ بڑھاپے میں جبکہ ہاتھ پاؤں میں رعشہ ہو منہ میں طاقت نہ ہوں جسم میں سکت نہ ہو۔ نگاہ ایک حرف کو چار دیکھنے لگے۔ ایسی زندگی سے کیا فائدہ؟ عمر کے اس مرحلے تک تو میں جینا پسند نہیں کرتا۔ آپ کی کیا رائے ہے؟ رام لال اختر

جوابات

(۱) پرچار، پروپیگنڈا، تبلیغ، اشاعت، یہ تمام الفاظ ہم معنی ہیں۔ چونکہ ابتدا میں سیاست کی بجائے مذہب حکمران تھا۔ اس لئے مذہبی احکام کی اشاعت کے لئے ہندوستان میں پرچار اور عرب میں تبلیغ کے الفاظ استعمال کیے گئے۔ ورنہ لغت کے اعتبار سے ہر قسم کی اشاعت کے لئے ہندی میں پرچار اور عربی میں تبلیغ کا لفظ وضع کیا گیا ہے۔ اردو چونکہ گنگا جمنی زبان ہے۔ اس لئے پرچار پروپیگنڈا تبلیغ اور اشاعت جیسے تمام ہم معنی اور خوشگوار الفاظ اس میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔

میرے خیال میں پروپیگنڈا کے تلفظ میں خوشگواری نہیں۔ اس لئے اس کی بجائے پرچار کا لفظ استعمال کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ اب اردو بن چکا ہے عمومیت بھی اسے حاصل ہے۔ زبان کو سہل بنانے کے اصول کو پیش نظر رکھا جائے۔ تو پرچار کا لفظ پروپیگنڈا سے زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

(۲) حادثہ کی جمع تکسیر حوادث ہے اور جمع سالم حادثات اور یہ دونوں عربی گریمر کے قاعدے سے بنائی گئی ہیں۔ جمع تکسیر وہ ہوتی ہے

جس میں واحد کی ترتیب حروف قائم نہ رہے۔ حادثہ سے حوادث جمع بنائی تو حادثہ کی ترتیب حروف شکست ہو گئی۔

حوادث۔ واحد کے حروف کی ترتیب جمع میں ح۔ د۔ ث۔ و۔ ا۔ بن کر ٹوٹ گئی۔

جمع سالم جمع تکسیر کے برعکس ہے۔ اس میں واحد کے حروف کی ترتیب قائم رہتی ہے۔ حادثہ۔ حادثات۔ یہ غیر مصنوعی عربی نما جمع نہیں بلکہ عربی لفظ کی عربی گرامر کے قاعدے کے مطابق دو جمع ہیں اور دونوں صحیح ہیں۔ اردو میں دونوں کا استعمال صحیح بھی ہے اور فصیح بھی۔ اسی طرح عمائد اور عمائدین دونوں صحیح ہیں۔ ایک جمع تکسیر دوسری جمع مذکر سالم۔ واحد مذکر کی جمع ی۔ ن اور و۔ ن کے ساتھ آتی ہے۔ مسلم سے مسلمون اور مسلمین۔

حادثات جمع مونث سالم ہے۔ کیونکہ حادثہ کا لفظ عربی میں واحد مونث ہے۔

البتہ اسلامی کی جمع اسلامیات اردو جمع ہے۔

(۳) فارسی میں انڈکس کو فہرست کہتے ہیں۔ یہ لفظ یونانی الاصل معلوم ہوتا ہے (واللہ اعلم بالصواب) عربی والوں نے اسے معرب کر کے فہرس بنا لیا۔ عربی کی تمام مستند تصانیف اور عربی جرائد مصر و عراق میں فہرست کی جگہ فہرس استعمال ہوتا ہے۔ اردو کے بعض اہل قلم نے جو یا تو عربی سے بالکل بے بہرہ ہیں یا کچھ بہرہ مند ہیں، عام تعلیم یافتہ طبقے پر اپنی مولانائیت کا رعب طاری کرنے کے لئے مصری جرائد کی کورانہ تقلید میں فہرست کو فہرس لکھنا شروع کر دیا ہے۔ میں اس تصرف کو غیر ضروری بلکہ غیر مناسب بھی خیال کرتا ہوں۔ فہرست اچھا خاصا لفظ ہے۔ عام و خاص میں قبولیت اور رواج حاصل کر چکا ہے پھر بے ضرورت کیوں اسے فہرس بنایا جائے۔ بہر حال یہ لفظ غلط نہیں ہے۔ اگرچہ اردو میں غیر ضروری ہے۔

(۴) طب یونانی کے نقطۂ نظر سے انسان کی عمر طبیعی ۱۲۰ سال ہے۔ گویا وہ بہ قیام ہوش و حواس ۱۲۰ سال تک زندہ رہ سکتا ہے زار درآغا نے اس نظریے کو باطل کر دیا تھا، ۱۵۶ سال کی عمر میں اُس کی آخری شادی ہوئی تھی۔ اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض سنیاسی ۲۰۰ سال کی عمر کے ابھی تک بہ قید حیات ہیں مگر یہ سنیاسی پرچار "کایا کلپ" کی طرح مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے۔ جرمن ڈاکٹر وارنوف بندر کے غدود کی قلم لگا کر اعادۂ شباب کا دعویدار ہے۔ مگر اندور کے مشہور لکھ پتی سیٹھ "۴ لاکھ روپے" ڈاکٹر موصوف کے قدموں پر نچھاور کر کے بھی "لیت الشباب یعود" کاش جوانی واپس آتی کے گیت گا رہے ہیں۔

ہماری رائے تو یہ ہے کہ زندگی کا لطف "دل زندہ" کے دم تک ہے۔ جب تک دل زندہ ساتھ دے رہا ہے مرنے کا نام نہ لیجئے عمر طبیعی کے ۱۲۰ سال یا زار درآغا کے ۱۵۶ سال۔ یہ سوالات سب بے معنی ہیں۔ دل میں جان ہے تو جئے چلے جائیے۔ کسی کی نہ سنئے! جہاں سے یہ رفیق راہ بچھڑ جائے اُسی منزل کو اپنا مرگھٹ یا مرقد حسب اپنے بنا لیجئے۔ زندگی کا فلاسفر بھی یہی رائے رکھتا ہے۔

"مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے   کہ زندگی تو عبارت ہے تیرے جینے سے"

ہندوستان کا لسان الغیب بھی یہی کہتا ہے ؎

جب سے دل زندہ تو نے ہم کو چھوڑا   ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی   حالی

آپ کی ہدایت کے لئے اپنا خیال ہم نے آپ کو بتا دیا ہے لیکن اپنے متعلق اس نظریئے سے بھی دس قدم آگے نکل گئے ہیں وہ یہ کہ دل زندہ ہمارا ساتھ دے تو سبحان اللہ ہم جئیں گے اور اگر ساتھ چھوڑ دے تو ہم زندگی کی راہ بے منزل کو کسی مرحلے پر بھی منزل بنانے کے لئے تیار نہیں۔ دل زندہ زندگی سے کبھی اکتا جائے تو اکتا جائے، ہم زندگی کا دامن چھوڑنے پر آمادہ نہیں کئے جا سکتے۔ جس بڑھاپے کی دردناک تصویر آپ نے کھینچی ہے وہ بڑھاپا جب آئے تو آپ بڑیا بھانک لیجئے۔ ہم تو اس بڑھاپے کو بھی ازلو زندگی

کا خضر بنا کر ساتھ لے چلیں گے۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے   رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

سوالات

(۱) "قومی شاعری میں جوشؔ اور اقبالؔ میں سے کس کا مرتبہ بلند ہے"؟ ——— غلام احمد سلیم لالہ موسیٰ

(۲) اکثر با وقار رسالوں اور کتابوں میں لفظ محبتؔ، بضم میم، عروسؔ بضم عین۔ بشرہؔ، بضم اول۔ وصعتؔ۔ بفتح اول عصمتؔ، بفتح عین۔ مشاعرہؔ بفتح میم و بکسر عین، اور خلوتؔ بکسر اول مرقوم ہوتے ہیں۔
کیا میں انہیں صحیح سمجھوں؟ اور اسی طرح بولوں اور لکھوں؟ جبکہ مندرجہ بالا الفاظ کے اعراب لغات میں یوں درج ہوتے ہیں
(۱) مَحَبَّت ——— غیاث از تحقیقات میر نور اللہ احراری ——— (۲) عَرُوس، مدار، کشف۔ منتخب، صراح، بہار عجم، مزیل و لطائف
(۳) بَشَرَہ ——— کشف، منتخب وغیرہ   (۴) وُسعت ——— غیاث و منتخب
(۵) عِصمت ——— بحر الجواہر و مزیل   (۶) مُشاعَرَہ ——— غیاث
(۷) خَلوت ——— مؤید، مدار، کشف، منتخب، مزیل و بہار عجم ——— قیصر عثمانی

(۳) عدمؔ، اختر شیرانی، احسان دانش کی شاعری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ ان میں سے کس کو زیادہ کامیاب شاعر کہہ سکتے ہیں؟

(۴) کیا "ہنستی" کے مقابلے میں "برستی" یا "پیتی" کے قوافی آسکتے ہیں؟ آپ قوافی کی پابندیوں کو کہاں تک جائز سمجھتے ہیں؟
——— اثر چکوالی

(۵) (الف) صحیح لفظ "روح و رواں" ہے یا "روح رواں"۔ بڑے بڑے سحر القلم ادیب بلا امتیاز لکھتے ہیں۔
(ب) انگریزی لفظ کیریکٹر (Character) اردو میں بہت زیادہ رائج ہے اگر اس کی بجائے اردو لفظ "رویہ" کو رواج دیا جائے تو کیا یہ اس کے مطلب کو ادا نہ کر سکے گا؟ میرے خیال میں لفظ "رویہ" اس سے کم وسیع المعانی نہیں۔
(ج) ماہ اکتوبر کے شاہکار کے سوال و جواب میں سوال نمبر ۵ میں ایک فقرے کی تصحیح اس طرح ہوئی ہے کہ "زخم رڑکتا رہتا ہے" کی بجائے "زخم رستا رہتا ہے" صحیح ہے۔ لیکن زخم کا رسنا زخم کے رڑکنے کے مفہوم کو ادا نہیں کر سکتا۔ رڑکنا پنجابی کا لفظ ہے اردو میں اس کے مقابلے کا لفظ "کھٹکنا" ہے لہذا مذکورہ صدر فقرے کی تصحیح اس طرح ہونی چاہیئے کہ "زخم کھٹکتا رہتا ہے"
——— محمد علی کلدانی مدچھوری (ابوہر)

(۶) ترنم سے پڑھنے والے شعراء کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟
——— سادھو رام شاد بی۔ اے ہندو مسلم ہائی اسکول ہریانہ

جوابات

(۱) قومی شاعری سے اگر ملکی شاعری مراد ہے تو اقبالؔ نے ادھر بہت کم توجہ کی ہے۔ صرف "نیا شوالہ" اور "ہندوستان ہمارا" دو نظمیں اُن کے کلام میں ملتی ہیں اور جوشؔ صاحب کی ملکی شاعری اردو ادب کا ایک سرمایہ ہے اور اگر اس سے ملّی شاعری مراد ہے تو اقبالؔ ہمارا ملّی شاعر ہی ہے۔ اُس کی ملّی شاعری ادب و شعر کی متاع بے بہا ہے اور اس رنگ میں اُس کا کوئی حریف نہیں بہرصورت موازنے کی گنجائش نہیں۔

(۲) محبت بہ فتح میم صحیح ہے اور فصحا میں اس کا اصلی تلفظ یہی رائج ہے۔ مگر بہ ضمہ میم کو بھی میں غلط قرار نہیں دے سکتا کہ یہ

تلفظ بھی عام وخاص میں ترویج پا چکا ہے۔

عروس، بہ فتحۂ عین اردو میں غیر مانوس ہے۔ عربی میں اس کا تلفظ کچھ ہی ہو اردو کے مستند اہل قلم جس طرح بولتے ہیں وہی تلفظ اردو میں صحیح ہوگا۔

بشرہ، کا اردو تلفظ ہی صحیح ہے۔ بہ فتحہا اردو میں مستعمل نہیں۔

مُشاعرہ، بہ کسرعین اردو تلفظ ہے بہ فتحۂ عین اردو میں صحیح نہ ہوگا۔

خلوت، کا اردو تلفظ جو فصحا میں رائج ہے بہ فتحۂ خا ہے بہ کسر خا مستند لوگ نہیں بولتے۔

عِصمت، کا اردو تلفظ بہ کسر عین ہے اور یہی صحیح ہے، بہ فتحۂ عین عوام کا تلفظ ہے۔ مستند نہیں

وصعت، یہ نہ تو عربی لفظ ہے نہ اردو۔ غالباً وسعت کے متعلق آپ کا سوال ہے۔ اس کا فصیح تلفظ بہ فتحہ واو ہے۔

مختصر یہ کہ خواہ کسی زبان کا لفظ ہو اور اس کا تلفظ اس زبان میں کچھ ہی ہو اردو میں اس کا وہی تلفظ فصیح اور صحیح مانا جائے گا جو فصحائے اردو کی زبان پر دائر وسائر ہوگا۔

(۳) عدم کے کلام میں پاکیزگی، تخیل میں رفعت اور خیالات میں رہنمائی ہے۔ عدم نفسیات کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اظہار جذبات میں گداز سے کام لیتا ہے۔

اختر شیرانی کا کلام تغزل کی رنگینی سے شرابور ہے۔ خیالات میں شبابی رسوائیاں جھلکتی ہیں۔ اس شباب آرائی کے رستے سے الگ ہو کر کوئی نظم کہتا ہے تو اپنی پستی سے بہت بلند ہو جاتا ہے۔

احسان ابن دانش منظر آرائی میں امتیاز کا خاص مالک ہے۔ اس کی منظر آرائی میں فلسفیانہ رنگ بھی نمایاں ہے۔ منظر کے کسی ضروری پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا بلکہ ایسی عام چیزوں کے ذکر سے جنہیں نگاہ کم بین حریف توجہ نہیں بناتی اپنی نظم کو زیادہ موثر بنا دیتا ہے۔

ہر سہ شعراء جدید دور شاعری کے تازہ ترین نمایندے ہیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ مشق بھی بڑھتی گئی تو تخیل، انداز نگارش اور فن کی خامیاں بھی مفقود ہو جائیں گی۔

(۴) قافیہ نگاری کی رو سے ہنستی کا قافیہ پھنستی ہوگا۔ برستی یا پستی ہنستی کے ہم قافیہ نہیں۔ لیکن میری رائے میں صوتی اتحاد کو اصل قرار دے کر ہنستی کے قافیے میں برستی، اور پستی کو قافیہ بنانا جائز ہونا چاہیئے۔ قافیے کے قدیم قواعد ترمیم کے سزاوار ہو چکے ہیں۔

(۵) اس میں صحیح لفظ روح و رواں ہے۔ مرکب عطفی ہے، توصیفی نہیں یعنی روح رواں صحیح نہ ہوگا۔

(ب) کیریکٹر کے مفہوم کو روتیہ کا لفظ پورے طور پر ادا نہیں کرتا۔ میری رائے میں تو کیریکٹر بہ کثرت استعمال سے اردو بن چکا ہے اس لئے اس کا ہم معنی دوسرا لفظ بنانے کی ضرورت ہی نہیں۔

(ج) "زخم رڑکتا ہے" کی تصحیح زخم رستا ہے یہ سمجھ کر کی گئی تھی کہ شاید پنجابی میں رسنا کو رڑکنا کہتے ہیں۔ آپ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ رڑکنا کے وہ معنی نہیں جو میں نے خیال کئے تھے۔ لیکن "زخم کھٹکتا ہے" اردو محاورے کے خلاف ہے۔ زخم میں ٹیک پڑتی ہے۔ زخم میں ٹیس ہو رہی ہے۔ محاورہ ہے۔

(۶) ترنم میں پڑھنے والے جو اچھے شعراء ہیں وہ اچھے ہی ہیں اور جو پست ہیں انہیں ترنم بلند نہیں بنا سکتا۔

عربی زبان کے شعراء ترنم میں پڑھتے تھے، انشاء کے معنی ہی ترنم سے شعر پڑھنے کے ہیں۔ مقامات حریری میں ابوزید کے متعلق ایک جگہ آتا ہے فانشد متر نما۔ اس نے ترنم سے شعر پڑھے۔ البتہ ایک فرق ضرور ہے کہ موسیقی کے قاعدوں کو پیش نظر رکھ کر مشاعروں میں گانا ہرگز

روا نہیں ہونا چاہیئے تاکہ مغنی اور شاعر کے حدود الگ الگ رہیں۔ اور خوش آوازی سے شعر پڑھنا اس سے مختلف ہے۔ اس میں کچھ حرج نہ تھا کہ ترنم اچھے شعر کے اثر کو دوبالا، سہ بالا اور بعض اوقات بست بالا کر دیتا ہے۔ لیکن اردو شاعری کے موجودہ دور بے مذاقی میں ترنم ہو یا موسیقی مشاعرے یا اسٹیج پر شاعر کے لئے مناسب نہیں کیونکہ :

(۱) ترنم آرائی اور موسیقی شاعر کی فنی خامیوں کی پردہ دار بن جاتی ہیں۔ سامعین شاعر کی خوش آوازی سے متاثر ہو کر اس کے شعر کے حسن و قبح سے توجہ ہٹا لیتے ہیں اور اسے داد دے کر ایک طرف تو اپنی خامیوں کو دور کرنے کے مواقع سے اسے محروم کر دیتے ہیں۔ دوسری جانب خود بھی ذوقِ شعر فہمی سے غیر محسوس طور پر ناآشنا بنتے چلے جاتے ہیں۔

خود شاعر بھی شاعری کے پردے میں موسیقی کی داد پا کر اس زعم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ میرا کلام لغزشوں سے پاک اور ضرورت اصلاح سے بے نیاز ہے۔

(۲) بدمشق مگر خوش گلو متشاعروں کو ایک اصلی اور مستحق شاعر کی شہرت مل جاتی ہے اور معیار استاد خوش گوئی کی بجائے خوش گلوئی رہ جاتی ہے۔

(۳) پختہ مشق اور نغز گو شعرا تحت اللفظ پڑھنے کے سبب اہلِ بزم کی داد سے ناروا طور پر محروم ہو جاتے ہیں اور ہجوم بے ذوقی سے گھبرا کر شاعری سے دست برداری کو ضروری سمجھنے لگتے ہیں۔ اس طرح شاعری کی ترقی رک جاتی ہے۔

(۴) خوش گلو تک بندیے بازی کے طفیل قبولیت عامہ حاصل کر کے شاعری میں ابتذال پیدا کرنے کا موجب بن جاتے ہیں اور اپنی ہر دل عزیزی کے باعث نگاہ عام و خاص میں مستند سمجھے جاتے ہیں اور اس راستے شاعری میں زبان و بیان کی غلطیاں داخل ہو کر ادب کو نقصان پہنچاتی ہیں۔

مختصر یہ کہ نغمہ سرا شاعر اور ترنم پسند سامعین بے امتیازی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ نہ شاعر کو یہ احساس ہوتا ہے کہ میں شاعری کی آڑ میں خوش الحانی کی داد پا رہا ہوں نہ سننے والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم شاعر کے دماغ کی بجائے اس کے گلے کی داد دے رہے ہیں۔

حالت اب یہ ہو گئی ہے کہ بڑے سے بڑا نغز بیان شاعر بلند سے بلند نظم تحت اللفظ پڑھ کر سنائے تو عموماً سرسبزی نہیں ہوتی اور کچھ سخن فہموں کی طرف سے داد بھی ملتی ہے تو ترنم نواز جن کی اکثریت ہوتی ہے جمائیاں لینے لگتے ہیں اور کوئی کور ذوق تو یہ بھی کہہ اٹھتا ہے کہ "مقطع پڑھیئے"۔ پنجاب میں تو بے ذوقی اور کج سوادی کی بیماری میں ننانوے فی صدی تعلیم یافتہ مبتلا ہیں۔ یہاں کی مجلسوں میں تو تحت اللفظ پڑھنے والا شاذ و نادر ہی پوری نظم پڑھنے کا موقعہ پاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ گذشتہ دس بارہ سال میں جو یہاں اردو شاعری کا ذخیرہ فراہم ہوا ہے اس میں جاندار عنصر بہت ہی کم ہے۔ اس سارے ذخیرے میں فن شکن شاعرانہ غلطیاں دیمک کی طرح پھیل گئی ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس خرابی کی اصلاح کیوں کر کی جائے۔ اس کا جواب دینا آسان نہیں ہے کیونکہ جن شاعروں نے اپنی شاعرانہ شہرت کی تعمیر سرود و غنا کے سیمنٹ سے کی ہے وہ تحت اللفظ پڑھنے پر رضامند نہیں ہو سکتے کہ ان کی بنی بنائی سربلند عمارت دھڑام سے نیچے آ رہے گی۔

اور جو تحت اللفظ پڑھتے ہیں وہ دماغ کو گلا بنانے کی پستی اختیار کرنا پسند نہیں کریں گے۔

البتہ ایک صورت اور بھی ہے۔ اسے اختیار کیا جائے تو ذوق شعر فہمی کی کچھ نہ کچھ اصلاح ہو سکتی ہے۔

وہ صورت یہ ہے کہ مشاعرے کی دو نشستیں کر دی جائیں۔ ایک نشست صرف تحت اللفظ پڑھنے والوں کے لئے مخصوص

کر دی جائے اور اس نشست میں فلمکاروں کو زحمت سرود نہ دی جائے بلکہ ممکن ہو تو ان میں سے کچھ نفوس کو تحت اللفظ پڑھنے کے اختیار پر آمادہ کیا جائے اور دوسری نشست نغمہ پردازوں کے لئے مخصوص ہو ۔ اور اگر بضرورت کی ایک نشست ہو تو اسے دو وقفوں پر تقسیم کر کے دونوں فریقوں کو ایک ایک وقفہ دے دیا جائے ۔

اس طریقے سے ذوق شعر گوئی و شعر فہمی کو نشو و نما کا موقعہ میسر آ سکے گا ۔ ورنہ موجودہ صورت تو اردو شاعری کو ... و پست خوائی کی جانب کشاں کشاں لئے جا رہی ہے ۔

سوالات

(۱) عام طور سے اہلِ زبان ندی کو بہ تشدید حرف دال نظم کرتے ہیں ۔ کیا یہ درست ہے ؟ میرے خیال میں ندی بتخفیف حرف دال ہونا چاہیئے ۔

—— تبسم ۔ متوسط ٹاؤن بینک راولپنڈی

(۲) (الف) چہارم ۔ پانچ ... لکھنا صحیح ہے یا غلط ؟

(ب) یوپی کے ایک استاد کی غزل کے مندرجہ ذیل اشعار پر یہاں کے اہلِ ذوق میں زیرِ بحث میں ...

شبِ عیش ختم ہے بلبلو چلو جا کے پھولوں میں سو رہو ۔ کہیں رازِ دوش نہ فاش ہو کہ قریب صبح ...

اعتراض یہ ہے کہ شبِ عیش کے بعد اگر صبح بہار آنے والی ہے تو رازِ دوش کے افشا کا کیا خطرہ ہے کیا شبِ عیش ... تھی اور کیا شبِ عیش کو ہم رازِ دوش بھی کہہ سکتے ہیں ۔ دوسرا شعر یہ ہے ۔

ہم اسیر باغ میں ہو گئے نہ کہا کسی نے زبان سے یہ ۔ نہ کرو جدا اسے باغ سے یہ ... ہے

اس شعر میں تنفرِ گریہ کا عیب نظر آتا ہے ۔

(۳) آٹھویں جماعت کے لئے جو اردو کورس مؤلفہ سر اقبال ہے اس میں منشی درگا سہائے سرور مرحوم کی نظم "..." بھی درج ہے اس نظم کے حسبِ ذیل اشعار کا مطلب حل نہیں ہوتا ۔

وہاں چاپلوسی ، تملق ، خوشامد ۔ خوشامد بر آمد سے بلند سرآمد

دو رنگی دل دوستاں کی شد آمد ۔ وفا کی جدا آمد ، جفا کی جدا آمد

—— ہیڈ ماسٹر لوئر مڈل اسکول بیگم پورہ جنڈیالہ

(یہ سوال کئی اور استادوں کی جانب سے بھی آیا ہے ۔)

(۴) حضرت جوش ملیح آبادی نے ایک مضمون بعنوان "جوانی" لکھا ہے ۔ اس میں یہ فقرہ سمجھ میں نہیں آیا ۔

"چھالوں کی تپک تلواروں سے آنکھیں ملتی ہے"

—— محمد صدیق ... پیرزادہ پیری

(۵) (الف) دورِ حاضرہ کے کئی شعراء نے لفظ "تلک" اور "دگر" کو ترک کر دیا ہے ۔ کیا یہ واقعی قابلِ ترک ہیں ؟

(ب) زندگی کرنا ۔ یہ محاورہ اردو میں کہاں تک درست ہے ؟

(ج) ہندوستان کی اصلی زبان کون سی ہے ؟

—— (ہرسہ ... شاد)

(۶) مولانا ظفر علی خاں کی شاعری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ؟ مفصل تحریر فرمائیں ۔

—— عبد ... ذہرا

(۷) (ا) لفظ "دوش" بمعنی کندھا گرامر میں مؤنث ہے یا مذکر؟ مولانا سیماب اکبرآبادی نے مؤنث لکھا ہے ؎

دوشِ مشرق قابلِ گیسوئے مغرب ہوگئی

کیا یہ صحیح ہے۔ جواب با اسناد مرحمت فرمائیں۔

(ب) "مرحمت" کا تلفظ کیا ہے۔ مرحمت (بہ فتح راء وسکونِ حائے حطی؟) یا مرحمت (بہ سکونِ راء و فتح حائے حطی) یا دونوں طرح درست ہے؟ کیا یہ مصرع صحیح ہے؟ ؎

نگاہ لطف سے اتنی اجازت تو مرحمت ہو ——— حسن محمد احسن

(۸)

دل کو کسی غریب نے خاک میں کیا ملا دیا — لوحِ جہاں سے آپ نے نقشِ وفا مٹا دیا
رات کو خواب ناز میں وہ بھی یہ کہہ کے چونک اٹھے — ہائے یہ کسی کی آہ تھی جس نے مجھے جگا دیا
اُن کے گنہگار ہم ہیں تو مگر خطا معاف — اٹھ کے پھر کے درد نے دل ہی تو ہے دکھا دیا
سب ہیں تمہاری بزم میں دورِ شراب سے شریک — غالب خستہ دل کو کیوں تم نے ادب سکھا دیا

ان اشعار کے مقطع میں غالب تخلص سے ظاہر ہے کہ یہ اشعار غالب کی کسی غزل کے ہیں لیکن مجھے باوجود سخت کوشش کے غالب کے کسی دیوان کے نسخے میں یہ اشعار نہیں ملے۔ از راہِ کرم بذریعہ "شاہکار" جواب دیں کہ یہ اشعار واقعی غالب کے ہیں۔ یا نہیں؟ میرے خیال میں یہ اشعار کسی اور شاعر کے ہیں اور اگر آپ ان کو غالب کے اشعار سمجھتے ہوں تو مکمل غزل شائع فرما دیں اور بتائیں کہ یہ کس نسخے میں موجود ہیں؟ ——— (خانصاحب) وحیدالدین ڈی۔ ایم کالج موگا

جوابات

(۱) اصل لفظ ندّی بہ تشدید حرف دال ہے۔ اسی لئے جمع میں دال کی تشدید ضروری ہے "ندّیاں" بغیر تشدید دال درست نہیں۔ البتہ ندی بصورت واحد بغیر تشدید حرف دال بھی غلط نہیں۔

(۲) (ا) درست ہے

(ب) پہلا اعتراض صحیح ہے دوسرے اعتراض میں تاویل کی گنجائش ہے۔ پہلا شعر غلط ہے اور دوسرا کمزور

(۳) شعر کا مطلب حسب ذیل ہے:

وہاں خوشامد اور چاپلوسی سے عزت حاصل کی جاتی ہے۔
دوستوں کے دل کا آنا جانا ایک دو رنگی ہے اصلیت سے دُور
وفاداری اور جفا کاری کی حدیں جدا جدا ہیں۔

الفاظ سے تو یہی مطلب نکلتا ہے مگر یہ ضرور کہوں گا کہ دونوں شعر بحیثیت مجموعی معنوں کا گورکھ دھندا ہیں۔ کوہ کندن و کاہ برآوردن۔ پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں "خوشامد برآمد" کی بجائے "خوشامد و درآمد" ہونا چاہئیے۔ دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ بے معنی سا ہے اور دوسرے مصرعے میں جدا آمد کے تکرار سے شاعر نے یہ مغالطہ دینا چاہا ہے کہ جدا آمد شد آمد کی طرح فعل مرکب ہے۔ حالانکہ جدا اور مدارات الگ ہیں

(۴) خراز دوی سے پاؤں کے تلووں میں چھالے پڑ جاتے ہیں اور ان میں ٹیس پیدا ہو جاتی ہے اسی درد اور ٹیس کو ٹپک کہتے ہیں۔ مضمون کے پہلے فقروں کو ملا کر پڑھنے سے مطلب واضح ہو جاتا ہے

(۵) داغ مرحوم کے متروکات میں تمام بھی شامل ہے۔ داغ کے سلسلے کے اساتذہ اسے کبھی تم بھی استعمال نہیں کرتے۔

مولینا حسرت موہانی اور اکثر اساتذہ تک اور تلک دونوں کا استعمال جائز خیال کرتے ہیں۔ جدید طبقۂ شعراء جن میں اہل الرائے حضرات کی کمی نہیں تلک کو بے تکلف استعمال کرتا ہے۔ میں نے تو ابتدائے شاعری سے آج تک اسے متروک الاستعمال نہیں سمجھا۔ میرے خیال میں تک اور تلک میں ایک نازک سا فرق ہے وہ یہ کہ تک کی بہ نسبت تلک میں انتہا کا مفہوم زیادہ ہے اور مجھے تو اس میں ترنم بھی محسوس ہوتا ہے۔

(ب) متقدمین شعرائے فارسی مصدر زندگی کردن کا ترجمہ کرکے زندگی کرنا کو زبان میں داخل کر لیا ہے۔ مرزا جان جاناں علیہ الرحمۃ کے کلام میں یہ مصدر موجود ہے اور مرزا صاحب سے زیادہ اردو زبان کا مستند شاعر کون ہو سکتا ہے۔ اگرچہ محاورۂ عام اب تک اس سے مانوس نہیں ہو سکا لیکن اب بھی سلیقے سے کوئی نظم کر دے تو اسے غلط تو کیا غیر فصیح بھی نہیں کہہ سکتے۔

(ج) تقریباً ڈیڑھ صدی سے تو ہندوستان کی اصلی زبان اردو بن گئی ہے جسے مغربی سیاح اپنے سفرناموں میں "ہندوستانی" یا "لنگویج آف انڈیا" کے نام سے قلم بند کرتے ہیں اور عہد قدیم میں سنسکرت سے پہلے ہندوستان کی کوئی ایک زبان نہ تھی بلکہ خطے خطے میں مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں جیسے کہ آج بھی پنجاب کی پنجابی، بنگال کی بنگالی، سندھ کی سندھی اور گجرات کی گجراتی ہے۔ لیکن چونکہ اس وقت کا ہندوستان آج کے ہندوستان کی طرح ایک ملک نہیں تھا بلکہ مختلف اقوام کے زیر حکومت اس کے مختلف رقبے تھے، ایک گوشے کے باشندے دوسرے گوشے کے رہنے والوں سے کسی قسم کا ربط و ضبط بھی نہ رکھتے تھے۔ اس لئے کوئی ایک زبان جسے سارے ملک کے لئے لنگوا فرینکا کہا جا سکے نہ تھی۔ عہد قدیم کی اتنی بات تو اب تک بھی باقی ہے کہ ملک کے مختلف گوشوں میں رہنے والی قومیں اپنے اپنے دائرۂ حیات کی مخصوص زبانیں بولتی ہیں۔ لیکن چونکہ جدید دور زندگی میں جدید اسباب ترقی نے پشاور سے پانڈیچری کے ڈانڈے ملا کر ملک کو ایک بستی بنا دیا ہے۔ اس لئے ایک زبان معاشرتی ضرورت نے ایسی بھی بنا ڈالی جس کے ذریعے دور دراز خطہ ہائے ملک کے ہندوستانی آپس میں تبادلۂ خیالات کرتے یا کر سکتے ہیں اور وہ زبان ایک ہی ہے جسے مسلمان اردو، ہندو ہندی اور یورپین ہندوستانی کہتے ہیں۔

(۴) مولینا ظفر علی خاں کی شاعری زیادہ تر ہنگامی قطعوں پر مشتمل ہے۔ یہ نظمیں ارتجالاً کہی جاتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ندرت، جدت اور سلاست کے اوصاف کی حامل ہیں۔ مشکل سے مشکل زمین کو بھی ظفر علی کی عجوبہ کار شاعرانہ جولانی سرسبز کر دیتی ہے۔

(۷) (الف) برجستہ بروزن گرمدست بہ سکون رائے و فتحۂ تائے حطی ہے۔ البتہ گفتگو میں بہ فتحۂ را بولنے والوں کو ٹوکنا مناسب نہیں کیونکہ یہ تلفظ بھی خاص و عام میں رائج ہو گیا ہے۔

(۸) دیوان غالب کے جتنے نسخے میری نظر سے گزرتے ہیں ان میں یہ غزل درج نہیں۔ اس کا انداز نگارش بھی مرزا کے اسلوب بیان سے بہت مختلف ہے اور پست بھی۔

سوالات

(۱) بعض اخبار و رسائل کو "واحد آرگن" "واحد ترجمان" واحد علمبردار کے سے جملے استعمال کرتے دیکھا ہے۔ یہ خود ستائی مبالغے سے مملو اچھی نہیں لگتی۔ کیا یہ ترک نہیں ہو سکتی؟

(۲) اسی طرح بعض مولوی صاحبان اپنے نام سے پہلے 'خادم العلماء' اس لئے لکھتے ہیں کہ لوگ انہیں عالم سمجھیں۔ صحیح علماء کی کسر نفسی کی جگہ جو فروشوں کی گندم نمائی نے لے لی ہے۔ اب تمیز کیسے ہو؟

(۳) بچوں کے رسالہ جات میں عشق و محبت کی کہانیوں (پری، شہزادی یا بت، شہزادہ کی شادی وغیرہ) کو کیوں ضروری یا مفید سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ رسالے بچیوں کے ہاتھوں میں بھی جاتے ہیں۔ کیا اخلاقی قصے یا تاریخی واقعات ان کا بدل نہیں ہو سکتے؟

(۴) اہلِ سنت والجماعت شیعہ بھائیوں کو کوستے ہیں۔ کہ وہ تعزیہ کی بدعت کا ارتکاب کرتے ہیں۔ شیعہ صاحبان سنیوں کو بے دردی محبّانِ یزید وغیرہ سمجھتے ہیں اور مغائرت بڑھتی جاتی ہے۔ غالباً دونوں غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہیں۔ یقیناً ہر مسلمان کو اہلِ بیت سے سچی محبت ہے اور شہادتِ حضرتِ امامؓ کا گہرا غم۔ پھر جب محمد علی ڈے، اقبال ڈے، لاہپت ڈے، یہ ڈے وہ ڈے منائے جائیں تو حسینؓ ڈے منانا کیوں ضروری نہ سمجھا جائے۔ حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی یادگار فرض ہے تو حضرت حسینؓ کی قربانی کے دن کو بطور یادگار منانا بھی لازم ہے۔ البتہ تقریب کے مقصد کو مدِ نظر رکھ کر صحیح و مفید طریقِ اہتمام اختیار کیا جائے تو دونوں عظیم الشان فرقوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کا موجب ہو سکتا ہے۔ کیا کوئی بندۂ خدا تحریک کرے گا؟

——— اخلاص نقش امام بخش افسر مدارس میانوالی

(۵) حضرت علامہ!

میں آج کل مصری لٹریچر کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ مگر مصری زبان میں ایسے ہزاروں الفاظ کا اضافہ ہو گیا ہے کہ عربی لغات کی کتابوں میں ان کا سراغ نہیں ملتا۔ بعض اوقات اچھے مضامین سے استفادہ ان الفاظ کی وجہ سے عسیر الفہم ہو جاتا ہے۔ ایسے الفاظ کی فہرست تو بہت ہی طویل ہے۔ لیکن ذیل کے الفاظ اکثر عبارات میں آتے ہیں۔ ان کے خط کشیدہ الفاظ کے معنی سے مطلع فرمائیے:

خطاب العرش۔ موافقت امامہ۔ الدعایۃ النازیہ۔ ایطالیا تقاوم مساعی البلاشفۃ فی البلقان۔ الفاشیستیۃ والبلشیفۃ تتصارعان ملعب الورق۔ برنامج الاذاعۃ۔ تتہال علیہ الطنان التراب الخ۔ حفلۃ التنس السنویہ۔ اسطوانات۔ الثقۃ علی الوزارۃ

——— مسیح الزماں استاذ عربی مدرسہ دینیہ دہلی

(۶) دو سال سے پنجاب کے کالجوں میں فارسی بی۔ اے کورس پڑھایا جا رہا ہے۔ جس میں بزرگانِ دین پر سخت تبرا ہے۔ میں نے ۱۳ جون کو مدینہ اخبار میں اس کی اطلاع بھی دی۔ مگر کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ جس سے یہاں کے مسلمانوں کے جمود اور بے حسی کا پتہ چلتا ہے۔ یہ کورس پروفیسر اقبال صاحب نے ترتیب دیا ہے اور پروفیسر شیرانی صاحب سے بھی نجی طور پر مشورہ لیا گیا ہے۔ یہ دونوں حضرات بحمد اللہ حنفی المذہب ہیں۔ اس کے سوا اور کیا قیاس کیا جائے کہ جن اشعار میں تبرا ہے وہ ان صاحبان کی سمجھ میں نہیں آئے۔ مگر حیرت یہ ہے ——— کہ کیا پنجاب بھر میں کوئی ان کو نہ سمجھ سکا؟ اور اگر سمجھا تو اس کی رگِ غیرت و حمیت جنبش میں کیوں نہ آئی؟

میں وہ اشعار بغرضِ ملاحظہ نقل کیے دیتا ہوں۔ غور فرمائیے۔ کہ ان میں حضرت عمرؓ کو سامری اور یہودی بتایا ہے۔ سلطان محمود کو خوک سے تشبیہ دی ہے۔ حضرتِ ابوبکرؓ کو (خاکم بدہن) یہ لوگ بقر کہتے ہیں۔ پھر عام سنیوں کو احمق، گدھا، بیوقوف کہا ہے۔

(قصیدۂ ناصر خسرو، فارسی بی اے کورس "آئینِ دانش")

پسندیدہ است باز ہد عمار و بوذر — کند مدح محمود مر عنصری را

من آنم کہ در پای خوکاں نریزم — مر این قیمتی دُرِّ لفظ دری را

بشوی ای امامی کہ خط بر رخش است — بتعویذ خیر است مر چنبری را

نیارد نظر کردی زی نورِ علمش — کہ درد است چشم خرد ظاہری را

اگر ظاہری مردمی را بجستی — بطاعت بروں کردی از سر خری را

و لیکن بقر نیستی سوی دانا — اگر جویدی حکمت با قدری را

مرا بچہ خود خر ہمی چوں شمارد — چہ ماند ہمی غل مر انگشتری را

پیمبر بداں داد سر علم حق را | کہ شائستہ دیدش مرین مہتری را
بہارون ما داد موسیٰ سر آنرا | نبود است دستی بداں سامری را

——— عبدالباقی توحید منزل، اچھرہ لاہور

جوابات

(۱) بعض اخبارات کسی خاص طبقے کی انجمن یا سبھا کی جانب سے جاری کئے جاتے ہیں یا جاری تو کرتا ہے اس طبقے کا کوئی ایک فرد، مگر وہ انجمن اسے اپنا آرگن تسلیم کر لیتی ہے۔ اس نوع کے اخبار کے سرورق پر لکھ دیا جائے تو یہ واقعیت کا اظہار ہوگا۔ لیکن عام اخبارات جو اپنے سرورق پر "ہندو جاتی کا اکیلا آرگن" یا "ملت اسلام کا واحد علمبردار" وغیرہ جیسے الفاظ شائع کرتے رہتے ہیں۔ یہ طریقہ خودستائی اور اس سے زیادہ غلط آرائی کے ذیل میں آجاتا ہے۔

(۲) اسی طرح خادم العلماء کے الفاظ کو اپنے نام کا ضمیمہ اس لئے بنا لینا کہ لوگ ہمیں عالم خیال کریں مناسب نہیں۔ خادم العلماء کے لقب میں مصنوعی ہی سہی مگر انکسار کا ہلکا سا رنگ ضرور ہے۔ مگر آج کل تو یہ تکلف بھی غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اب دنیا ان حدود سے بھی آگے بڑھ آئی ہے، چنانچہ اب کسی جھجک کے بغیر مصور جذبات، فطرت نگار، باقی انقلاب یادگار میر، مجدد الطب، لقمان الملک وغیرہ کے الفاظ اپنے نام کے ساتھ لکھنے لگے ہیں۔ اس ہنر فروشی کا انسداد ہمارے آپ کے ہاتھ میں نہیں۔ تعزیرات ہندکی بھی کوئی دفعہ اس کو جرم نہیں ٹھیراتی۔ رہی تعزیرات اخلاق۔ اس نئی روشنی میں اس کا پڑھنا فیشن کے خلاف ہے۔ اخلاق کے بنیادی اور فروعی اصول یکسر تبدیل ہو چکے ہیں۔ اب تو مولانا حسرت موہانی کا سخن گسترانہ اظہار تو دیکہ ؎

"نہیں ہے قدرداں کوئی تو میں ہوں قدرداں اپنا | میں اپنی داد خود سے لوں کہ میں بھی کیا قیامت ہوں"

ہر ایک کا لائحۂ عمل بن رہا ہے، ہر تک بند، ہر جیل رسیدہ، ہر ایڈیٹر، سٹیج پر بولنے والا ہر لیڈر، انجمن کا سیکرٹری "مولٰینا" بنا ہوا ہے۔ یہ طوفان بے امتیازی بڑھتے بڑھتے اب بے نیاز ساحل ہو چکا ہے۔

(۳) بچوں کے پرچوں میں دیو، پری، جن بھوت، شہزادہ شہزادی کے معاشقے اور اسی قسم کے دور از کار وہم آفریں اور مخرب اخلاق کہانیوں کی اشاعت حد درجے ناروا ہے۔ مگر اس میں ان پرچوں کے بے دماغ ایڈیٹروں کے برابر ہی وہ محروم نظر حضرات بھی اس جرم ناروا کی نشوونما کے ذمہ دار ہیں جو اچھے برے اور کھرے کھوٹے میں امتیاز نہیں رکھتے اور اپنے معصوم بچوں کے لئے کوئی پرچہ منگاتے وقت ذوقِ انتخاب سے کام نہیں لیتے یا صحیح لفظوں میں لے ہی نہیں سکتے۔ اس سے قطع نظر محکمۂ تعلیم کی منظور کردہ فہرست رسائل و اخبار دیکھنے کے بعد شاید یہ کہنا بھی بے جانہ ہوگا کہ ان مزخرفات کو زندہ رکھنے میں محکمے کی مسیحائی بھی بہت حد تک شریکِ گناہ ہے۔

(۴) حسینؓ ڈے منانے کی تجویز بہت مبارک ہے۔ حضرت امام الشہداء علیہ السلام سے عقیدت و محبت میں اہل السنت والجماعت شیعہ بھائیوں کے برابر کے حصہ دار ہیں۔

یزید علیہ ما علیہ سے نفرت و بیزاری میں ہم اُن سے ایک قدم بھی پیچھے رہنا پسند نہیں کرتے۔ شیعہ سنی اختلاف درحقیقت ایک فروعی اختلاف ہے۔ اصولِ توحید و رسالت، قرآن و اسلام ہمارے اور اُن کے لئے مشترکہ متاعِ عزیز ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ حضرت نبی کریم علیہ التسلیم کے بعد افضل ترین جناب امیر علیہ السلام کی ذاتِ گرامی ہے؟ اس مسئلے میں اختلاف ضرور ہے۔ مگر یہ وجہ نزاع کبھی نہیں بنا۔ اہلِ سنت والجماعت جو حضرات "علوی" کہلاتے ہیں، اُن کا بھی یہی عقیدہ ہے اور اس عقیدے پر آج تک کسی سنی عالم نے اُن سے ردّ و قدح نہیں کی۔ تمام صوفیائے کبار جناب امیر علیہ السلام کی ستودہ صفات ذات

کو سرچشمۂ ولایت و اقامت مانتے ہیں ۔

روحی فدا ہم اہلبیت علیہم الصلوٰۃ والسلام سے محبت کو اہل سنت اپنے لئے ذریعۂ نجات تصور کرتے ہیں ۔ اب رہی تعزیہ داری البتہ اسے ہم روا نہیں رکھتے ۔ لیکن شیعہ بھائی اس کا اعتراف کریں گے کہ تعزیہ داری کی تمام رونق عوام اہل سنت کے دم سے قائم ہے ہر سال تعزیہ داری پر سُنی جس قدر زر و مال لٹاتے ہیں شیعہ بھائی بحیثیت مجموعی اس کا پچاسواں حصہ بھی صرف نہیں کرتے ۔ پھر تعزیہ داری کے سلسلے میں غیر مسلموں سے تصادم کی صورت میں سنی عوام اپنا خون پانی سے زیادہ ارزاں کرتے رہتے ہیں ۔ محرم کے فسادات میں قید و بند اور دار و رسن کے مصائب بھی بلا شرکتِ غیرے صرف سنیوں کے حصے میں آتے ہیں ۔

آج بھی کہ ہندوستان کے شیعہ سُنی نزاع نے غیر اسلامی رنگ اختیار کر لیا ہے ۔ اسلامیانِ ہند کا قائد اعظم ایک شیعہ ہے ۔

(۵) مصر ہی پر کچھ منحصر نہیں تمام بلاد عربیہ میں آج کل جو زبان استعمال کی جا رہی ہے ۔ اُس میں الفاظ معرب و دخیل کا ایک طوفان برپا ہے ۔ خصوصاً صحافتی زبان میں تو انگریزی و فرانسیسی الفاظ بے تحاشا داخل ہو رہے ہیں ۔ جو عربی ہم نے آپ نے پڑھی ہے وہ کچھ اور تھی ۔ آج کی عربی اُس سے بہت مختلف ہے ۔ موجودہ رواج پذیر عربی کو سمجھنے کے لئے تھوڑی بہت انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کی تعلیم بھی ضروری ہے ۔ مشکل یہ ہے کہ جدید عربی الفاظ کی کوئی ایسی ڈکشنری بھی نہیں ملتی ۔ جو عربی جرائد و رسائل کے مطالعے میں پوری امداد دے سکے ۔ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولوی مسعود عالم ندوی کی مرتبہ "لغات جدیدہ" بہت ہی مختصر ہے ۔ مصر و عراق کے عربی اخبارات میں ہزاروں جدید الفاظ ایسے ملتے ہیں ، کہ "لغات جدیدہ" کا دامن اُن سے خالی ہے ۔ مجھے بھی پہلے پہلے مصری ادب و صحافت کے مطالعے میں یہی دقت پیش آئی تھی ۔ پہلی بار روزنامہ الاہرام قاہرہ پر نظر ڈالی تو ایسا محسوس ہوا کہ خط نسخ میں انگریزی و فارسی عبارتیں لکھی ہوئی ہیں ۔ لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری ۔ مسلسل مطالعہ کرتا چلا گیا ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عبارتوں کے سیاق و سباق نے تمام مشکل حل کر دی ۔ اب بفضلہ میں بے تکان عربی جرائد پڑھ لیتا ہوں ۔

ممالک عربیہ میں مصر مرکزی حیثیت کا حامل ہے ۔ حضارۃ جدیدہ و قدیمہ کا سرچشمہ ہے ۔ مصر کی علمی ترقیاں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے ۔ مغربی ممالک سے اس کے سیاسی تعلقات اور خصوصاً برطانوی حکم برداری نے اسے جدید مغربی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا دیا ہے ۔ مغربی علوم و فنون کے بے شمار اصطلاحات مغربی تہذیب کی ہزاراں ہزار اشیاء کے مغربی نام ، طب مغربی کے آلات کے اسماء مغربی و مغربی ممالک کے سیاسی ، تجارتی ، اقتصادی اور حکومتی اصطلاحات و اسماء بحری و بری و فضائی جنگی ایجادات مختصر یہ کہ آج کل کی عربی بھی ایک لحاظ سے اردو زبان کی طرح ہمہ گیر و ہمہ نوش بن رہی ہے ۔ عربی میں غیر زبانوں کے الفاظ کی سیلابی درآمد نے آج سے دس سال پہلے کی عربی ڈکشنریوں کو بیکار کر دیا ہے ۔ چنانچہ وزارۃ تعلیم مصر نے ۱۹۳۷ء سے جدید عربی لغات کی ترتیب کے لئے اپنی نگرانی میں ماہرین لغت کی ایک مجلس قائم کر رکھی ہے اس مجلس میں عربی زبان کے منتخب اساتذہ ترتیب لغات کی خدمت انجام دے رہے ہیں ۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ عربی زبان کی کوئی ایسی جامع لغت جس میں تازہ معرب الفاظ مندرج ہوں بلاد عربیہ میں بھی موجود نہیں ۔

اب ملاحظہ ہوں الفاظ مسئولہ کے معانی

خطابُ العرش شاہی تقریر ۔ مواقفُ ۔ موقف کی جمع ۔ موقف ۔ صورتِ حال ۔ موجودہ حالت ۔ کہیں کہیں پالیسی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ حیثیت اور درجہ کے معنوں میں بھی آتا ہے ۔ الدّعایۃ النازیہ ۔ نازی حکومت کا پروپگنڈا ۔ " ایطالیا تقاوم مساعی البلاشفۃ فی البلقان " اٹلی بلقان میں بالشویکوں کی سرگرمیوں کا مقابلہ کر رہا ہے " الفاشستیۃ والبلشفیۃ تتصارعان " فاشیست اور بالشویکیت (فاشزم اور بالشوزم) متصادم ہیں ۔ ملعبُ الورق ۔ تاش کا کھیل ۔ برنامج ۔ پروگرام ۔ اُذاعۃ ۔ اطلاع عام ۔ سرکاری اطلاع ۔ تنہال علیہ الطنان التراحیب ۔ اس

پر سیکڑوں من مٹی ڈالی جاتی ہے۔ اطنان جمع طن۔ طن ٹن کا معرب ہے ایک ٹن ۲۸ من کے برابر ہوتا ہے۔ التنفش۔ ٹینس کا معرب۔ اسطوانات اسطوانہ کی جمع۔ گانوں کے ریکارڈ۔ الثقتہ علی الوزارہ۔ کابینہ وزارت پر اعتماد۔ پارلیمنٹ کی اپوزیشن پارٹی جب کسی اہم سیاسی مسئلے پر کابینۂ وزارت سے اختلاف کرتی ہے تو وزارت کے خلاف عدم اعتماد کا ریزولیوشن پیش کر دیتی ہے۔ اب اگر ہاؤس کی اکثریت تجویز اعتماد کی تائید کرے تو وزارت قائم رہتی ہے۔ اسی صورت کے لئے پارلیمنٹری اصلاح ہے " الثقتہ علی الوزارۃ۔

(۲) ناصر خسرو ایک ذلیل قسم کا دشنام طراز شاعر ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد اگر فارسی بی۔ اے کورس کی ترتیب وتہذیب کسی ایسے شخص کے سپرد کرتے جسے براہِ راست فارسی ادب کے مطالعہ کرنے کا موقعہ میسر ہوا در فارسی شاعری سے صحیح ذوق بھی رکھتا ہو تو ناصر خسرو کی دشنام طرازی سے فارسی نصاب پاک نظر آتا۔

مگر یونیورسٹی اس دردسر کی زحمت مفت میں کیوں خریدے جب کہ پبلک فنڈ کے بیجا استعمال پر صدائے احتجاج بلند کرنے کی توفیق بھی نہیں رکھتی۔

فارسی کے بی۔ اے کورس میں ناصر خسرو کے تبرائی ہفوات کو کچھ اس لئے پناہ نہیں ملی کہ یونیورسٹی ایڈیٹرز بزرگان دین کی شان میں سب وشتم کو روا رکھتے ہیں، بلکہ اصلی وجہ وہی ہے جو آپ نے واشگاف انداز میں بیان کر دی کہ ان اشعار تبرا کی زبان فدا مشکل تھی انہوں نے یہ حسن ظن قائم کر لیا کہ شاعر نے ضرور ان اشعار میں حقائق ومعارف کا دریا بہایا ہوگا۔

تیورس سال یونیورسٹی ایڈیٹر کے اسی حسن ظن نے قصائد قاآنی کے یونیورسٹی ایڈیشن میں لواطت اور امرد پرستی کے شرمناک فواحش کو شامل انتخاب کر دیا تھا۔ جو اہل نظر فارسی زبان کو جاننے کی طرح جانتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ قاآنی اپنے اکثر قصائد کی تشبیب میں لواطت اور محبوب کی سراپا نگاری کرتے ہوئے مزے لے لے کر اُس کے سُرین کی مدح کرتا ہے۔

اس پہلو میں یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ قاآنی کے قصیدوں کی اکثر تشابیب فحاشی کے مرقعے ہیں۔ قاآنی، ناصر خسرو اور خاقانی کی طرح مغلق نگار نہیں لیکن اپنی روش کے خلاف ایک قصیدے کی تشبیب کے گیارہ شعروں میں آس نے محبوب کے ساتھ رقیب کے فعل شنیع کا جو خیالی نقشہ کھینچا ہے اور جس میں وہ انسانیت کے جامہ سے باہر ہو گیا ہے۔ شاید اپنے اخلاقی افلاس کی پردہ پوشی کی خاطر ان گیارہ اشعار میں اس نے مشکل زبان اختیار کی ہے۔ یونیورسٹی ایڈیٹر ان اشعار کو سمجھنے سے قاصر رہا اور حسن ظن سے کام لیتے ہوئے اُس نے اشعار مذکورہ کو شامل نصاب کر دیا۔

اپنی زبان میں ان اشعار کا ترجمہ تو در کنار میں وہ اشعار ترجمے کے بغیر بھی یہاں نقل کرنا اخلاق عامہ کی توہین سمجھتا ہوں۔ اگر "پریس برانچ" کے مترجم ان اشعار کا ترجمہ اپنے افسر انچارج کے سامنے پیش کر سکتے۔ تو یقیناً قصاید قاآنی کا یونیورسٹی ایڈیشن بحق ملک معظم ضبط ہو جاتا۔

قصائد قاآنی میں یہ منظوم فواحش دیکھ کر میں نے پنجاب ویلفیر سوسائٹی کے سیکرٹری پنڈت سری رام کو توجہ دلائی تو انہوں نے وہ اشعار مع ترجمہ وائس چانسلر کو پیش کر دیئے۔ وائس چانسلر نے نہ صرف ان اشعار ہی کو یونیورسٹی ایڈیشن سے خارج کرایا بلکہ دیگر فارسی نصابوں پر بھی نظر ثانی کرا کے فحش حصے نکلوا دیئے۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ نظر ثانی کے باوجود قصائد قاآنی کے چھوٹے سے مجموعے میں مختلف تشبیبوں کے کم وبیش چالیس اشعار اب بھی ایسے رہ گئے ہیں جن میں محبوب کے سراپا کی تصویر کشی کے ذیل میں "سرین" کو ہوس انگیز انداز میں سراہا گیا ہے۔

پنجاب یونیورسٹی میں السنہ مشرقیہ کی جو درگت ہو رہی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ صرف یورپ کی ڈگریوں کو قابلیت

کا معیار قرار دے لیا گیا ہے۔ ۲۰ سال کے تجربے کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ السنۂ مشرقیہ کے ولایت گرد اساتذہ میں ۹۵ فی صدی ایسے ہوتے ہیں جو اپنی اختیار کردہ زبان میں صرف ان کے انگریزی ترجموں کے ذریعے ماہرین کر آتے ہیں۔ اس زبان میں براہ راست اُنہیں اتنی بھی لیاقت نہیں ہوتی کہ کوئی کتاب سمجھ کر پڑھا سکیں۔ اُن سے کورسز کے منتخبہ حصوں کے انگریزی تراجم لے لئے جائیں تو اُس زبان کی تمام کتابیں اُن کے لئے لاطینی زبان کی کتابیں بن جاتی ہیں۔ اُن کی لیاقت کا سہارا اس زبان سے متعلق مغربی مستشرقین کی تاریخی چھان پھٹک تک محدود ہے۔ اُس کے ادب العالیہ سے اُنہیں کوئی مس نہیں ہوتا۔ بعض ذی استعداد طلبا جب غلط ترجمہ کرانے پر اُنہیں ٹوکتے ہیں تو بگڑ جاتے ہیں۔ طلبا یہ خیال کر کے کہ امتحان کی منزل میں انہی سے واسطہ پڑے گا، خاموشی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ آج ان حضرات سے یہ تخریبی اقتدار چھین لیا جائے تو پھر ایک دن بھی ان کے لئے پڑھانا لوہے کے چنے چبانے کی بابر دشوار ہو جائے۔

محترم وائس چانسلر السنہ مشرقیہ کے کورسز کی ترتیب میں اگر مقامی کالجوں کے باخبر اساتذہ کے مشورے لینا چاہیں تو میرا خیال ہے اُن کا تعاون کسی معاوضے کے بغیر حاصل ہو سکے گا۔ اس صورت میں یونیورسٹی ایڈیٹرز کی قابلیت بھی تشہیر سے بچ جائے گی اور کورسز تبرا، سب وشتم اور ہوس آفرین عناصر سے بھی پاک ہو جائیں گے۔"

سوالات

(۱) جناب عالی ! ذیل کے الفاظ کا صحیح استعمال بتا کر ممنون کیجئے۔

"مجھے داد دینی پڑی" یا "داد دینا پڑی"

"آنکھ لڑنی تھی کہ بیخود ہو گئے" یا "آنکھ لڑنا تھی" ——— پیارے لال شاکر ایم۔اے سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور

(۲) حضرت علامہ! تسلیم و نیاز!

یہاں سائنس کے مؤنث و مذکر ہونے میں اختلاف ہے۔ آپ پر فیصلہ ٹھیرا ہے۔ براہ کرم رہنمائی فرمائیے۔

——— رشید الدین بی۔اے گوالمنڈی لاہور

(۳) ایک صاحب "اہالیان" کے لفظ کو غلط بتاتے ہیں۔ حالانکہ یہ اہل کی جمع ہے۔ پنڈت برجموہن کیفی کی کتاب منشورات میں اہالیان کا لفظ کئی بار استعمال ہوا ہے۔ آپ شاہکار کے ذریعے اس سوال پر روشنی ڈالیں تو بڑی عنایت ہو۔

——— اے۔ ایم نظیر بی۔اے پاک دروازہ ملتان شہر

جوابات

(۱) "آنکھ لڑنی تھی" "داد دینی پڑی" اہل دہلی بولتے ہیں اور "داد دینا پڑی" اہل لکھنؤ کا روزمرہ ہے۔ محشر لکھنوی ؎

حشر میں داد ستم ملنا ہے کیا چلتے ہیں خیر ——— یہ تو کہنے کو نہ ہو سب آئے محشر رہ گیا

آئینے سے آنکھ لڑنی تھی کہ بیخود ہو گئے ——— بن گئے وہ بھی تماشائی تماشائی کے ساتھ

میرے خیال میں اہل پنجاب تہذیب جدید کے نو دخیل الفاظ کی تذکیر و تانیث میں خود اہل زبان کا درجہ رکھتے ہیں۔ موٹر، ٹیلیفون، ہوائی جہاز، سائنس، فلاسفی اور اس قسم کے مغربی الفاظ پنجاب میں تذکیر یا تانیث جس حیثیت میں بھی بولے یا لکھے جاتے ہیں، سند ہیں کم سے کم پنجاب کے لئے سند ہیں۔ ان الفاظ کی تذکیر و تانیث کی تعیین میں ہمیں دلی لکھنؤ کی جانب دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ عام یا خاص معاشرت کے الفاظ یا محاورات متفقہ طور پر مدتہائے دراز سے مذکر یا مونث بولے جا رہے ہیں۔ ان کی تذکیر و تانیث میں اہل پنجاب کو تبدیلی کا حق نہیں پہنچتا۔

اس کے علاوہ ایسے الفاظ یا محاورات بھی ہیں جن کی تذکیر یا تانیث میں اہلِ دہلی یا لکھنؤ میں اختلاف ہے۔ اہلِ پنجاب کے لئے قرب مکانی کے سبب اہلِ دہلی کی پیروی مناسب ہے یوں اگر کوئی پنجابی ادیب لکھنؤ کا اتباع کرنے پر مصر ہو تو اس کی تغلیط یا تردید نہیں کی جا سکتی۔ راقم الحروف بعض اوقات ایک ہی مضمون میں بالارادہ مختلف فیہ لفظ یا محاورے کو کبھی اہلِ دہلی کے استعمال کے مطابق کبھی اہلِ لکھنؤ کے موافق لکھ جاتا ہے اور لفظ بدلی ہیں یک رنگی بنا ضروری خیال نہیں کرتا۔ اکثر ادبا کا بھی یہی حال ہے کہ ان کی ایک ہی تحریر میں بعض الفاظ و محاورات مختلفہ دونوں طرح لکھے نظر آتے ہیں۔

اس لئے میرے خیال میں متنازعہ فیہ الفاظ و محاورات کے استعمال پر نکتہ چینی یا حرف گیری کے ہم معنی ہو سکتی ہے۔

(۲) سانس کا لفظ لکھنؤ میں مؤنث اور دہلی میں مذکر استعمال کیا جاتا ہے۔ ذوق دہلوی نے بھی اسے مؤنث استعمال کیا ہے۔ نواح دہلی و لکھنؤ سے باہر کے علاقوں میں اردو بولنے اور لکھنے والوں کو اختیار ہے جس طرح چاہیں لکھیں اور بولیں۔

(۳) "اہالیان" اہل کی جمع ہے۔ اہل کی جمع اہالی ہے جو حضرات اہالیان لکھتے یا بولتے ہیں غلطی کرتے ہیں۔ "اہالی" بھی ایسی جمع ہے کہ اہل علم نے کی تسہیل تا۔ روہی پر اس کا استعمال موزوں معلوم ہوتا ہے ورنہ اہالی کی بجائے اہل استعمال کرنا چاہیئے کہ اہل اسم جمع ہے۔ لہٰذا اہالی لاہور۔ اہالی پشاور صحیح اور اہلِ لاہور اہلِ پشاور بولنا صحیح بھی ہے اور فصیح بھی۔

بات یہ ہے کہ اردو اور خصوصاً بلند اردو میں عربی الفاظ کا استعمال چونکہ بکثرت ہونے لگا ہے اور عربی تو درکنار موجودہ زمانے میں لوگ فارسی زبان سے بھی نا آشنا ہو چکے ہیں۔ لیکن اپنی بے مایہ علمیت جتانے کے لئے اپنی گفتگو اور تحریر میں بے ضرورت طور پر عربی الفاظ کی آمیزش کرتے رہتے ہیں۔ پھر چونکہ عربیت سے کورے ہوتے ہیں اس لئے عربی الفاظ کو عموماً غلط استعمال کر جاتے ہیں "اہالیان" کا نامعقول لفظ بھی اسی بے خبری کے صدقے اردو زبان میں استعمال ہو رہا ہے۔

جو لوگ عربی یا فارسی سے نا آشنا ہیں وہ اگر سادہ اردو لکھنے پر اکتفا کریں تو ممکن ہے مشق و مزاولت سے ان کی سادہ نگاری میں کوئی دلکش ادا پیدا ہو جائے۔ خواہ مخواہ اپنی زبان و تحریر کو عربی و فارسی کے شاندار الفاظ سے گراں بار بنانا جبکہ ان الفاظ کے صحیح استعمال سے بھی واقفیت نہ ہو غیر مناسب ہے۔ بجو

سوالات

(۱) حضرت فانی بدایونی کیا آپ کی رائے میں جدید شعراء کی نمایندگی کرتے ہیں؟

—— سادھو رام شاد بی۔ اے ہندو مسلم ہائی اسکول ہریانہ

(۲) ایف۔ اے کے نصاب اردو میں حضرت ذوق دہلوی کا دیوان ہے۔ میں اسے طالبات کو پڑھاتے ہوئے جھجک محسوس کرتا ہوں۔ میری رائے میں یہ دیوان شاعری اور اخلاق ہر دو نقطۂ نظر سے اردو نصاب میں شامل کرنے کے قابل نہیں۔ اس بارے میں آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

—— رام دتا مل ضیا ایم۔ اے پروفیسر ڈی اے وی کالج لاہور

(۳) صوبۂ سرحد میں "وزیر اعلیٰ" نے ایک سرکلر جاری کیا ہے کہ ہندی اور گورمکھی سرکاری اسکولوں میں نہ پڑھائی جائے۔ کیا یہ متعصبانہ کارروائی نہیں؟ اس قسم کی تحریکات صوبے کے امن و امان کو نقصان نہ پہنچائیں گی؟ —— کرتار سنگھ بی۔ اے خالصہ کالج امرتسر

جوابات

(۱) حضرت فانی جدید شاعری کی نمایندگی ضرور کرتے ہیں۔ لیکن ان کے کلام میں قدیم طرزِ نگارش کی بھی جھلک موجود ہے۔ ان کا جدید شاعرانہ اسلوب دلکش ہے۔ خیالات میں عمق، جذبات میں پاکیزگی، اندازِ بیان میں جدت پائی جاتی ہے لیکن اس قسم کے بلند اشعار میں جب کوئی شعر قدیم رنگ کا آجاتا

ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شکر میں غلطی سے کوئی نمک کی ڈلی پس کر مل گئی ہے۔ میں نے یہ تشبیہ اس لئے دی کہ قدیم اندازِ تحریر کچھ غیر مرغوب نہیں ہے۔ لیکن اس گنگا جمنی طرزِ نگارش کا میں حامی نہیں ہوں۔

قدیم رنگ میں بھی اگر سلیقے سے شاعری کی جائے تو اُس میں بھی دلکشی کی کمی نہیں ہوتی۔ مگر جدت و قدامت کا اختلاط شاعر کے اصلی رجحانِ طبع کو مبہم بنا دیتا ہے۔ اس نمبر میں جو اُن کی "غزل" باقیات فانیؔ کے عنوان سے شائع ہو رہی ہے۔ اُسی کو دیکھ لیجئے اُس میں جہاں اس قسم کے جدید الصورۃ و المعنی اشعار ہیں ؎

دوری ہی بھلا اچھی تھی نزدیکیٔ منزل سے — کشتی کو ملا ساحل ٹکرا گئی ساحل سے
غربت میں غنیمت ہے اتنا بھی نشاں فانیؔ — کچھ خاک کے ذرّے ہیں لپٹے ہوئے منزل سے
ایمان محبت کی بجھتی نہیں چنگاری — اُٹھتا ہے دُھواں اب تک خاکِ حرمِ دل سے

ان کے ضمن میں ایسے اشعار بھی آجاتے ہیں جن کا انداز پرانا ہے ؎

شاید مرے مرنے کا دلچسپ نہ تھا منظر — آج اُن سے مری حالت دیکھی گئی مشکل سے
تجھ کو یہ خبر ہوگی ہم کو تو نہ تھی ناصح — پہلی ہی نظر اُٹھ کر لڑ جائے گی قاتل سے

میرے خیال میں یہ رنگ دیرینہ رواج ہونے کے سبب شاعر کے جدید انداز کو اس کی خصوصیت بننے سے محروم کر دیتا ہے۔

(۲) ایف۔ اے کے نصاب اُردو میں دیوانِ ذوقؔ کی شمولیت ملاظت ہے جا کا حکم رکھتی ہے۔ میں اس پر شاہکار کے کسی گزشتہ نمبر میں اظہارِ خیال کر چکا ہوں۔ ذوقؔ کے کلام کا زیادہ حصہ بے جان ہے۔ اُس میں ابتذال، پستی اور عریانی کی بہتات ہے۔ اصل میں ذوقؔ صنایع و بدایع کا شاعر ہے۔ بلکہ میں تو اُسے ایک شاعر سے زیادہ ایک ناظم کی حیثیت دیتا ہوں۔ اُس کا مقصد شاعری محاورات اور صنایع بدایع کو نظم کرنا ہے یا اخلاقیات کی تبلیغ۔ جدتِ خیال داد اور رفعتِ مطالب و معنی کے مقابلے میں وہ صنعت و محاورے کو نظم کر دینا زیادہ اہم سمجھتا ہے۔ آپ دیوانِ ذوقؔ طالبات کو پڑھانے میں جھجک محسوس کرتے ہیں میں تو اُسے طالب علموں کو پڑھانے میں بھی مضائقہ سمجھتا ہوں۔ یونیورسٹی کا "بورڈ آف سٹڈیز" جو امتحانات کے لئے نصاب تجویز کرتا ہے بدقسمتی سے اُردو، فارسی اور عربی کے نصاب ہائے تعلیم کو تجویز کرنے میں کور ذوق واقع ہوا ہے اور اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والا تو اُن میں کوئی بھی نہیں۔

(۳) میں پچیس سال سے اُردو زبان کی خدمت کر رہا ہوں۔ اس سے ظاہر ہے کہ مجھے اس زبان سے دلی اُنس ہے۔ لیکن میں اُردو زبان کا خادم ہو کر ہندی، گورمکھی اور دوسری ملکی زبانوں سے بھی پریم رکھتا ہوں۔ میرے خیال میں تو ہر سچے محبِ وطن کا یہ فرض ہے کہ ملکی زبانوں اور لٹریچر کی خدمت اپنی بساط بھر کرے۔ اگر کوئی مسلمان اپنی ساری زندگی ہندی یا گورمکھی کی خدمت میں صرف کر دے تو میرے نزدیک اُس نے اپنے وطن کی قابلِ قدر خدمت کی۔

اسی طرح کوئی سکھ یا ہندو اگر عمر بھر اردو زبان کی خدمت کرتا رہے تو اُسے بھی سچا خادمِ ملک خیال کرتا ہوں۔

اب رہا صوبۂ سرحد کے "ہندی گورمکھی محکمہ سرکلر" کے متعلق سوال؟ اس سلسلے میں میں ہندو پریس کے غوغائے بے ہنگام کو متعصبانہ بلکہ ظالمانہ خیال کرتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس سرکلر میں صرف ہندی اور گورمکھی ہی کا ذکر نہیں پشتو زبان کی تعلیم بند کر دینے کا بھی ذکر ہے۔ آپ کو علم ہے کہ پشتو سرحدیوں کی مادری، قومی اور صوبجاتی زبان ہے اور اہلِ سرحد اُسے اپنے لئے زندگی کی ایک ضرورت اور اپنی قومیت کے حق میں سندِ افتخار خیال کرتے ہیں۔ لیکن سرکلر میں ہندی گورمکھی کے ساتھ ہی پشتو کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

رہی اُردو تو وہ صوبۂ پنجاب کی طرح صوبۂ سرحد کی بھی تعلیمی زبان ہے۔ سرحد یا پنجاب میں وہ ہندی گورمکھی کے ساتھ حریفانہ نسبت نہیں

رکھتی۔ اس لئے ان صوبوں کے تعلیمی اداروں میں اس کی تعلیم و تدریس کسی صورت بند نہیں کی جاسکتی ۔

بات یہ ہے کہ سرحد میں گورمکھی، ہندی اور پشتو کی تعلیم بجٹ کی تہی دامنی کے سبب سرکاری اسکولوں میں بند ہوئی اس لئے نہیں کہ گورمکھی سکھوں اور ہندی ہندوؤں کی مذہبی زبانیں ہیں، مگر ہندو اہلِ صحافت کو ایسی توفیق کیوں ملنے لگی کہ وہ اس امر واقعی کو سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ آج کل ہندو پریس کا سارا زورِ قلم سکھ بھائیوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے پر صرف ہو رہا ہے ساسی زنجیر کی ایک یہ بھی کڑی ہے، لوگ اخبار نویسوں کو ایک دیوتا خیال کر بیٹھے ہیں۔ اُن کی زہریلی تحریروں کو بھی آکاش بانی سمجھتے ہیں۔ ان تحریروں کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے ۔ یہ تو آپ کے سوال کا جواب ہوا اس پر میں یہ اضافہ اور کرانا چاہتا ہوں کہ سارا جھگڑا بجٹ کی گنجائش کا ہے آج تک کہ سرحدی کونسل کو قایم ہوئے کئی سال گزر چکے کبھی اس سرکلر کی ضرورت پیش نہیں آئی ۔ اگر تعصب اس کے اجراء کا سبب ہوتا تو سرکلر نکالنے والے "وزیر اعلیٰ" ابتدا سے وزیر اعلیٰ ہیں، اُنہیں ابتدا ہی میں یہ سرکلر جاری کر دینا چاہیئے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ بجٹ کی کمی نے اُنہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندی گورمکھی ہی کو کیوں مظلوم ثابت کیا جا رہا ہے؟ سرحد میں سندھی بھی رہتے ہیں اور بلوچ بھی بہ تعداد کثیر آباد ہیں۔ آخر ہندو پریس اس فریاد میں بلوچی اور سندھی زبان کی مظلومیت کو بھی شریک کیوں نہیں کرتا؟ کہ احتجاج میں زیادہ تڑپ پیدا ہو سکتی ہے۔ مگر وہ ایسا اس لئے نہیں کرتے کہ پشتو اردو کی طرح سندھی اور بلوچی کو بھی مسلمانوں کی زبان خیال کرتے ہیں۔

"ہندی گھاتک"۔ "ہندی گھاتک" کے ناخوشگوار اور بھدے الفاظ سنتے سنتے کان پک گئے ہیں یہ بے سُرا راگ ختم ہی ہونے میں نہیں آتا۔

یہ سب کچھ کہنے کے بعد بھی میری خواہش ہے کہ سرحدی کونسل کے "وزیر اعلیٰ" کوئی نہ کوئی سبیل نکال کر اس سرکلر کو واپس لے لیں ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے کہ سکھ بھائی گورمکھی سے مذہبی تعلق رکھتے ہیں اُن کے لئے واقعی یہ سرکلر پریشان کن ہو رہا ہوگا۔ لیکن ہندو پریس کے غوغائیوں کو ہندی سے جتنا اُنس ہے اُس کی حقیقت سے سب آگاہ ہیں۔ یہ غوغائی اس احتجاج کے پردے میں ہندو مسلمانوں اور سکھوں میں فساد پیدا کرنے کی جد و جہد میں لگے ہوئے ہیں۔ ورنہ سرحد کے سرکلر پر اظہار بیقراری سے پہلے اُنہیں اپنے اردو اخبارات کو ہندی میں شائع کرنا چاہیئے، یہ کیا کہ جہاں تجارتی مفاد پیشِ نظر ہو وہاں ہندی وندی کی محبت نظر انداز کر دی جائے اور جہاں ذاتی مفاد کا تعلق نہ ہو وہاں ہندو مسلم سوال بنا کر شور و شغب برپا کیا جائے۔ میری رائے میں پنجاب میں سب سے بڑا ہندی گھاتک خود ہندو پریس ہے ۔

مسلمانوں کے دو تین اخبارات ہیں وہ بھی محدود اشاعتیں رکھتے ہیں اور صرف مسلمان اُن کے خریدار ہیں۔ کوئی ہندو انہیں خریدنے کا پاپ کرنا پسند نہیں کرتا لیکن ہندوؤں کے اردو اخبارات کثیر الاشاعت ہیں اور سچ پوچھئے تو اُردو کی اشاعت اور ترقی ہندو اخبارات و رسائل اور کتابوں ہی سے وابستہ ہے۔ یہ اخبارات قدرتاً ہندی زبان کی اشاعت و نشو و نما میں حارج بنے رہے ہیں۔ مگر چونکہ ان اخبارات کی کثیر الاشاعتی سے تجارتی فائدہ حاصل ہو رہا ہے اس لئے ہندی کی اشاعت کو فرض فائدے پر قربان کیا جا رہا ہے لیکن جب مسلمانوں کو بدنام کرنا ہو تو پھر ہندی ملک کی مشترکہ زبان بن جاتی ہے۔ اور مسلمانوں کو ہندی گھاتک کا خطاب دے کر رسوا کیا جاتا ہے۔ میرے خیالات سے جو ہندو، مسلمان حضرات واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ میں نے ہندو مسلم اتحاد کے شغل کو زندگی کا مشن بنا رکھا ہے۔ اور اس راہ میں بہت سی مصیبتیں جھیل چکا ہوں۔ مجھے میرے بعض مسلمان حریف اہلِ صحافت بے جا طور پر ہندو پرست کا خطاب دے کر مسلمانوں میں بدنام کرنے کی سعی میں لگے رہتے ہیں، لیکن میں ہندو قوم میں ایک بے تعصب مسلمان کی ہوسِ شہرت پر اپنی ملت کے ساتھ بے انصافی نہیں کر سکتا۔ میں دیانت داری سے یہ رائے رکھتا ہوں کہ ہندی کی حمایت ہندو بھائیوں کے اردو اخبارات میں غیر مخلصانہ طور پر ہو رہی ہے، ورنہ اگر ہندی کے لئے ان میں کوئی خلوص ہوتا تو وہ مسلمانوں کو "ہندی گھاتک" کا خطاب دینے سے پہلے اپنے اخبارات کو ہندی میں شائع کرنے کا حوصلہ کرتے ۔

سوالات

(۱) مولانا محمد حسین آزاد دہلوی اور نواب مرزا داغ کی شاعری میں کیا فرق ہے؛ خاقانی ہند ذوق کی رہنمائی کا ان دونوں میں سے کس پر زیادہ اثر پڑا؟

——— رام فتا مل ضیا ایم - اے ، پروفیسر پرائیویٹ ورمن کالج لاہور

(۲) ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے غالب کے دیوان پر جو مقدمہ لکھا ہے وہ ان لفظوں سے شروع ہوتا ہے ؛

"خدا نے ہندوستان کو دو الہامی کتابیں عطا کیں ۔ وید مقدس اور غالب کا دیوان"

اس تبصرے کے متعلق آپ کا خیال ہے ؛ ——— سلیمان خاں - پی سی - ایس مجسٹریٹ درجہ اول امرتسر

(۳) آج کل کے غزل نگار شعراء میں فانی ، اصغر ، جگر اور یاس زیادہ مشہور ہیں ان میں سے آپ کے خیال میں کون زیادہ مقبول اور کون دوسروں پر تفوق رکھتا ہے ؛ ——— حامد حسین رشک بی - اے - کانپور - مستی گنج

(۴) لفظ "کئی" کا صحیح استعمال کیا ہے مثال دے کر وضاحت فرمائیے ۔ ——— سادھو رام شاد - بی - اے ہندو مسلم ہائی سکول پرپلز

جوابات

(۱) آزاد و داغ کی شاعری میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔ داغ کی شاعرانہ زبان منجھی ہوئی اور سلجھی ہوئی متروکات سے پاک ، جذبات ہوس سے لبریز محاورے اور روزمرہ سے آمیز شوخی ، معاملہ بندی اور واردات حسن و ہوس سے معمور ہے ۔

آزاد اگرچہ جدید دور شاعری کا بانی ہے ۔ مگر شاعرانہ حیثیت میں داغ سے پست ہے ۔ اُس کی نئی قسم کی نظمیں بھی کیف و لذت سے نا آشنا ہیں ۔ اُس کی شاعری کی زبان داغ کے مقابلے میں کوئی درجہ نہیں رکھتی ۔ اُس کے اشعار ہر قسم کے جذبات سے عاری ہیں ۔ البتہ وعظ و نصیحت کا عنصر اُن کی شاعری میں زیادہ ہے ۔ آزاد متروکات سے اجتناب نہیں کرتا ۔ اُس کے کلام میں شوخی رندی برائے نام ہے ۔ محاورہ بندی اُس کے کلام میں بھی ہے صنائع و بدائع کا زیادہ اہتمام کرتا ہے اور یہ تمام تر اثر ہے ذوق کے فیض صحبت کا ۔ داغ کی شاعری دل کی آپ بیتی ہے ۔ البتہ آزاد نثر کا شہنشاہ علی الاطلاق ہے

(۲) ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ایک انتہا پسند نقاد ہیں ۔ اسی لئے غالب کی محاسن شماری میں اُنہوں نے غلو سے کام لیا ہے ۔ میں چونکہ سنسکرت سے نا آشنا ہوں اس لئے وید مقدس کے درجۂ رفعت کا مجھے اندازہ نہیں ۔ البتہ غالب کو تمام اردو شاعروں کا رہنما مانتا ہوں ۔ مگر اس کے کلام کو ربانی کلام تسلیم نہیں کرتا مثلاً غالب کا یہ شعر ؎

ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن   دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا

الہام نہیں کہا جا سکتا ۔ اس کے علاوہ اُس کی غزلیات اور غزلیات کے اشعار یقیناً فہم و مطالب بتانے سے یکسر قاصر ہیں اور اس کا اعتراف خود اُن کے فدا کار شاگرد خواجہ حالی کو بھی ہے میں نہ مرزا یاس کی طرح غالب کو نا شائستۂ التفات سمجھتا ہوں نہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن مرحوم کی طرح اس کی شاعری کو انسانی معلومات سے پاک خیال کرتا ہوں ۔ میری رائے یہ ہے کہ غالب کا انداز نگارش سب سے بلند و ارفع اور اُس کا دماغ خلّاق معانی ہے ۔ وہ غیر معمولی شاعر ہے اُس کی شاعری معجزہ تو نہیں البتہ سحر طراز ضرور ہے ، غالب جیسا جدید الفطرت سحر کار جس زبان کو نصیب ہو جائے وہ زبان بڑی خوش نصیب ہے ۔

(۳) زندہ شاعروں کے متعلق اظہار رائے قبل از وقت معلوم ہوتا ہے لیکن سوال کا جواب دینا ضروری ہے اس لئے عرض کرتا ہوں ۔ ان میں سے آخر الذکر تین شاعر میرے ساتھ اردو مرکز میں کام کر چکے ہیں ۔ فانی صاحب سے روشناس نہیں ۔ چاروں بلند پایہ غزل نگار ہیں اور مقبول ہیں ۔ فانی کا کلام فلسفہ رفعت عاشقانہ سوز و گداز ، پختہ مشق جذبات آرائی اور جدت بیان سے مالا مال ہے ۔

اصغر تصوف کے مسائل کو اپنا دلنشیں انداز میں قلم بند کرتے ہیں ۔ اُن کے اکثر اشعار دلکشی کا نمونہ ہوتے ہیں ۔ اقبال کے بعض خیالات کو اپنے رنگ میں اپنا لیتے ہیں کہیں کسی کا کوئی شعر پسند آ جائے تو اُسے یہ سمجھ کر کہ ع

"میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا"

اُن پر اس استادی سے چھاپہ مار لیتے ہیں کہ عام نگاہیں پہچاننے سے عاجز آجاتی ہیں۔ یوں بہت قادر الکلام شاعر ہیں۔ بہت ہی ذہین البتہ اُن کی ذہانت تخریبی عنصر زیادہ رکھتی ہے۔ میرے دوست ہیں۔ میں اُن کی قدر کرتا ہوں اُن کی نثر اُن کی شاعری سے بھی زیادہ دلکش ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت طباع ادیب ہیں۔ فرائض تنقید سے مجبور ہو کر اصلی رائے کا اظہار کر رہا ہوں کہیں ملے تو معافی مانگ لوں گا۔

جگر شراب پیتے ہیں مگر اُسے شراب طہورا بنا کر مست کن اشعار میں ظاہر کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی بدمستی میں چھاپہ بھی مار بیٹھتے ہیں کوئی غزل رکھی پھیکی بے مزہ بھی غالباً تعمیل فرمائش کے طور پر کہہ دیا کرتے ہیں۔ جس غزل میں جی لگ جاتا ہے اُسے سحر بنا دیتے ہیں اور بعض شعر بے خبری میں اور شاید بلا ارادہ بھی کبھی کبھی ایسا کہہ جاتے ہیں کہ اُسے پیش کر کے "متبتی" کی بلند آہنگی کے ساتھ چاہیں تو شاعرانہ نبوت کا دعوے کر سکتے ہیں۔

مرزا یاس۔ طنزیات کے مالک ہیں کلام پختگی، سوز و ساز ناکامی و نامرادی کے جذبات سے معمور ہے۔ ان کی شاعری کے مضامین و خیالات محدود ہیں مگر انداز بیان سے تکرار خیالات کو تازہ کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ لکھنؤ اور غالب کے متعلق چھچھورپن کے اظہار سے اجتناب نہیں کرتے اور اس گناہِ ادبی کی پاداش میں آج تک مصیبتیں جھیل رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میرا کلام اگلی صدی کے لوگ سمجھیں گے "میری رائے میں یہ اپنے متعلق حسن ظن ہے۔ یا اس صدی کے لوگوں سے سوءِ ظن کیونکہ ان کے کلام میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں ہوتی یا یوں کہہ لیجئے کہ اس قدر آسمان پیما رفعت نہیں ہے کہ اگلی صدی کے لوگ جو مریخ والوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے اُن کی رفعت پرواز کا صحیح اندازہ کر سکیں گے۔

مختصر یہ کہ شاعرانہ حیثیت سے یہ حضرات اس قابل ضرور ہیں کہ زمانہ ان کی قدر کرے۔

(۴) کئی کا لفظ جمع قلت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ دو چار مہمانوں کو کئی مہمان اور دو چار بار کو کئی بار کہہ سکتے ہیں۔ جمع قلت کا اطلاق دس تک ہو سکتا ہے اس سے زیادہ کے لئے بہت کا لفظ بولا جائے گا۔ لیکن پنجاب میں "کئی" کا استعمال جمع کثرت کے لئے استعمال ہوتا ہے بہت مہمان کی جگہ کئی مہمان۔ اکثر بار کی بجائے کئی بار بولا جاتا ہے اور یہ غلط ہے۔

سوالات

(۱) مندرجہ ذیل سوالات کا جواب مطلوب ہے:

(الف) اخلاق کو شاعری سے کیا تعلق ہے؟ شاعر لوگ عام طور پر عیاش اور بداخلاق کیوں ہوتے ہیں؟

(ب) ہندی اردو قضیے کے متعلق اپنے خیالات واضح طور پر اظہار فرمائیں۔

(ج) ذوق کی شاعری کو آپ عریاں اور پست قرار دیتے ہیں۔ کیا اردو زبان کا کوئی ایسا شاعر ہو گزرا ہے جس کے کلام میں بالکل ابتذال نہ ہو۔ ذوق کا منتخب کلام کسی دوسرے شاعر کے کلام سے کسی صورت میں بھی کم نہیں۔ پھر آپ ذوق کے اس قدر خلاف کیوں ہیں؟

(د) فن شاعری کا اصل مقصد کیا ہے؟ تفریح طبع یا زندگی کے مختلف امور کا ذکر؟ آرنلڈ شیلی اور دوسرے انگریزی شعراء کے مختلف نظریے پڑھ کر میری عقل چکرا گئی ہے۔ اپنی صحیح رائے سے رہنمائی فرمائیں۔

——— چرنجی لال گپتا آتش بی۔ اے فیروزپور

(۲) انٹرمیڈیٹ کے نصاب اردو میں حسب ذیل کتابیں ہیں:۔

خیالستان، دیوان حالی، مقدمہ شعر و شاعری، انتخاب مضامین، سرسید، اردوئے معلیٰ۔ کیا آپ کے خیال میں ان کتابوں کے مطالعے سے اردو ادب کے متعلق طلباء کو ضروری معلومات حاصل ہو جاتی ہیں؟

رامد تامل ضیا ایم۔ اے پروفیسر ڈی۔ اے وی کالج لاہور

سوالات

(۱) مولانا محمد حسین آزاد دہلوی اور نواب مرزا داغ کی شاعری میں کیا فرق ہے؟ خاقانی ہند ذوق کی رہنمائی کا ان دونوں میں سے کس پر زیادہ اثر پڑا؟

——— رام فتا مل ضیا ایم۔اے، پروفیسر پرائیویٹ وومن کالج لاہور

(۲) ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم نے غالب کے دیوان پر جو مقدمہ لکھا ہے وہ ان فقروں سے شروع ہوتا ہے:

"خدا نے ہندوستان کو دو نعمتیں عطا کیں۔ ویدِ مقدس اور غالب کا دیوان"

اس فقرے کے متعلق آپ کا خیال ہے؟

——— سلیمان خاں۔ پی سی ایس مجسٹریٹ درجہ اول امرتسر

(۳) آج کل کے غزل نگار شعراء میں فانی، اصغر، جگر اور یاس زیادہ مشہور ہیں ان میں سے آپ کے خیال میں کون زیادہ مقبول اور کون دوسروں پر تفوق رکھتا ہے؟

——— حامد حسین رشک بی۔اے۔ کانپور۔ مسٹن گنج

(۴) لفظ "کئی" کا صحیح استعمال کیا ہے مثال دے کر وضاحت فرمائیے۔

——— سادھو رام شاد۔ بی۔اے ہندو مسلم ہائی سکول سرہند

جوابات

(۱) آزاد و داغ کی شاعری میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ داغ کی شاعرانہ زبان منجھی ہوئی اور سلجھی ہوئی متروکات سے پاک، جذبات ہوس سے

لبریز محاورے اور روزمرہ سے آمیز شوخی، معاملہ بندی اور واردات حسن و ہوس سے معمور ہے۔

آزاد اگرچہ جدید دور شاعری کا بانی ہے۔ مگر شاعرانہ حیثیت میں داغ سے پست ہے۔ اس کی نئی قسم کی نظمیں بھی کیف و لذت سے نا آشنا

ہیں۔ اس کی شاعری کی زبان داغ کے مقابلے میں کوئی درجہ نہیں رکھتی۔ اس کے اشعار ہر قسم کے جذبات سے عاری ہیں۔ البتہ وعظ و نصیحت کا عنصر ان

کی شاعری میں زیادہ ہے۔ آزاد متروکات سے اجتناب نہیں کرتا۔ اس کے کلام میں شوخی و رندی برائے نام ہے۔ محاورہ بندی اس کے کلام میں بھی ہے

صنائع و بدائع کا زیادہ اہتمام کرتا ہے اور یہ تمام تر اثر ہے ذوق کے فیضِ صحبت کا۔ داغ کی شاعری دل کی آپ بیچ سے ہے۔ البتہ آزاد نثر کا شہنشاہ علی الاطلاق ہے

(۲) ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری ایک انتہا پسند نقاد ہیں۔ اسی لئے غالب کی محاسن شماری میں انہوں نے غلو سے کام لیا ہے۔ میں چونکہ سنسکرت سے نا آشنا

ہوں اس لئے وید مقدس کے درجۂ رفعت کا مجھے اندازہ نہیں۔ البتہ غالب کو تمام اردو شاعروں کا رہنما مانتا ہوں۔ مگر اس کے کلام کو ربانی کلام تسلیم نہیں کرتا

مثلاً غالب کا یہ شعر

ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن ——— ورنہ دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا

الہام نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے علاوہ اُس کی غزلیات اور غزلیات کے اشعار یقیناً فہم و مطلب بتانے سے یکسر قاصر ہیں اور اس کا اعتراف خود غالب

کے فدا کار شاگرد خواجہ حالی کو بھی ہے میں نہ مرزا یاس کی طرح غالب کو ناشائستہ التفات سمجھتا ہوں نہ ڈاکٹر عبدالرحمن مرحوم کی طرح اس کی شاعری کو انسانی

لغزشوں سے پاک خیال کرتا ہوں۔ میری رائے یہ ہے کہ غالب کا اندازِ نگارش سب سے بلند و ارفع اور اُس کا دماغ خلاقِ معانی ہے۔ وہ غیر معمولی شاعر ہے

اُس کی شاعری معجزہ تو نہیں البتہ سحر طراز ضرور ہے۔ غالب جیسا جید الفطرت سحر کار جس زبان کو نصیب ہو جائے وہ زبان بڑی خوش نصیب ہے۔

(۳) زندہ شاعروں کے متعلق اظہار رائے قبل از وقت معلوم ہوتا ہے لیکن سوال کا جواب دینا ضروری ہے اس لئے عرض کرتا ہوں۔ ان میں سے

آخر الذکر تین شاعر میرے ساتھ اردو مرکز میں کام کر چکے ہیں۔ فانی صاحب سے روشناس نہیں۔ چاروں بلند پایہ غزل نگار ہیں اور مقبول ہیں۔ فانی کا کلام فلسفیانہ

رفعت عاشقانہ سوز و گداز، پختہ مشقی جذبات آرائی اور جدت بیان سے مالا مال ہے۔

اصغر تصوف کے مسائل کو استادانہ انداز میں قلم بند کرتے ہیں۔ ان کے اکثر اشعار دلکشی کا نمونہ ہوتے ہیں۔ اقبال کے بعض خیالات کو اپنے رنگ

میں اپنا لیتے ہیں کہیں کسی کا کوئی شعر پسند آجائے تو اسے یہ سمجھ کر کہ سچ

"میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا"

اُس پر اس استادی سے چھاپہ مار لیتے ہیں کہ عام لوگ اِس پہچاننے سے عاجز آجاتے ہیں۔ یوں بہت قادرالکلام شاعر ہیں۔ بہت ہی ذہین البتہ اُن کی ذہانت تخریبی عنصر زیادہ رکھتی ہے۔ میرے دوست ہیں۔ میں اُن کی قدر کرتا ہوں اُن کی نثر اُن کی شاعری سے بھی زیادہ دلکش ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت طباع ادیب ہیں۔ فرائض تنقید سے مجبور ہو کر اصلی رائے کا اظہار کر رہا ہوں کہیں سنے تو معافی مانگ لوں گا۔

جگر مُشَرا پیتے ہیں مگر اُسے شراب طہور بنا کر مست کن اشعار میں ظاہر کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی بدمستی میں چھاپہ بھی مار بیٹھتے ہیں کوئی غزل روکھی پھیکی بے مزہ بھی غالباً تعمیل فرمائش کے طور پر کہہ دیا کرتے ہیں۔ جس غزل میں جی لگ جاتا ہے اُسے سحر بنا دیتے ہیں اور بعض شعر بے خبری میں اور شاید بلا ارادہ بھی کبھی کبھی ایسا کہہ جاتے ہیں کہ اُسے پیش کر کے "متبنّیؔ" کی بلند آہنگی کے ساتھ چاہیں تو شاعرانہ نبوت کا دعوےٰ کر سکتے ہیں۔

مرزا یاس۔ طنزیات کے مالک ہیں کلام بے تکلفی، سوز و ساز ناکامی و نامرادی کے جذبات سے معمور ہے۔ ان کی شاعری کے مضامین و خیالات محدود ہیں مگر انداز بیان سے تکرار خیالات کو تازہ کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ لکھنو اور غالبؔ کے متعلق چھچھورپن کے اظہار سے اجتناب نہیں کرتے اور اس گناہِ ادبی کی پاداش میں آج تک مصیبتیں جھیل رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میرا کلام اگلی صدی کے لوگ سمجھیں گے۔ میری رائے میں یہ اپنے متعلق حسن ظن ہے۔ یا اس صدی کے لوگوں سے سوءِ ظن کیونکہ ان کے کلام میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں ہوتی یا یوں کہہ لیجیئے۔ اس قدر آسمان پیما رفعت نہیں ہے کہ اگلی صدی کے لوگ جو مریخ والوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے اُن کی رفعتِ پرواز کا صحیح اندازہ کر سکیں گے۔

مختصر یہ کہ شاعرانہ حیثیت سے یہ حضرات اس قابل ضرور ہیں کہ زمانہ ان کی قدر کرے۔

(۴) کئی کا لفظ جمع قلت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ دو چار مہمانوں کو کئی مہمان اور دو چار بار کو کئی بار کہہ سکتے ہیں۔ جمع قلت کا اطلاق دو سے نو تک ہو سکتا ہے اس سے زیادہ کے لئے بہت کا لفظ بولا جائے گا۔ لیکن پنجاب میں "کئی" کا استعمال جمع کثرت کے لئے استعمال ہوتا ہے بہت سے مہمان کی جگہ کئی مہمان۔ اکثر بار کی بجائے کئی بار بولا جاتا ہے اور یہ غلط ہے۔

سوالات

(۱) مندرجہ ذیل سوالات کا جواب مطلوب ہے:

(ا) اخلاق کو شاعری سے کیا تعلق ہے؟ شاعر لوگ عام طور پر عیاش اور بداخلاق کیوں ہوتے ہیں؟

(ب) ہندی اردو قضیے کے متعلق اپنے خیالات واضح طور پر اظہار فرمائیں۔

(ج) ذوق کی شاعری کو آپ عریاں اور پست قرار دیتے ہیں۔ کیا اردو زبان کا کوئی ایسا شاعر ہو گزرا ہے جس کے کلام میں بالکل ابتذال نہ ہو۔ ذوق کا منتخب کلام کسی دوسرے شاعر کے کلام سے کسی صورت میں بھی کم نہیں۔ پھر آپ ذوق کے اس قدر خلاف کیوں ہیں؟

(د) فن شاعری کا اصل مقصد کیا ہے؟ تفریح طبع یا زندگی کے مختلف امور کا ذکر؟ آرنلڈ شیلی اور دوسرے انگریزی شعراء کے مختلف نظریے پڑھ کر میری عقل چکرا گئی ہے۔ اپنی صحیح رائے سے رہنمائی فرمائیں۔

——— چرنجی لال گپتا آتش بی۔اے فیروزپور

(۲) انٹرمیڈیٹ کے نصاب اردو میں حسب ذیل کتابیں ہیں:۔ خیالستان، دیوان حالی، مقدمہ شعر و شاعری، انتخاب مضامین، سر سید، اردوئے معلّیٰ۔ کیا آپ کے خیال میں ان کتابوں کے مطالعے سے اردو ادب کے متعلق طلباء کو ضروری معلومات حاصل ہو جاتی ہیں؟

رام دتا مل ضیا ایم۔اے پروفیسر ڈی۔اے وی کالج لاہور

پنجاب لاہور

(۳) آپ نے ایک بار رسالہ ادبی دنیا میں جب وہ آپ کی ملکیت تھا "تصحیح" کے عنوان کے تحت یہ بتایا تھا کہ "قابو کر لینا" جو پنجاب میں بولا جاتا ہے صحیح نہیں۔ اس کی بجائے "قابو میں کر لینا یا قابو پا لینا" کہنا چاہیے۔ لیکن میں اخبار زمیندار کا پرانا فائل دیکھ رہا تھا اُس میں مولینا ظفر علی خاں صاحب کے ایک مضمون میں یہ فقرہ درج پایا:

"عاتکہ بنت معاویہؓ نے اُن خطوط کو قابو کر لیا"

مولینا ظفر علی خاں صاحب کے متعلق یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ زبان غلط لکھتے ہیں۔ پھر "قابو کر لینا" کو بھی صحیح ماننا پڑے گا؟

—— محمد اشرف بی۔ اے (آنرز)، پشاور

(۴) سوالاتِ ذیل کا جواب بذریعہ شاہکار عنایت فرما کر مشکور فرمائیں:

(ا) مولینا محمد اسماعیل میرٹھی کا درجہ دُنیائے شاعری میں کیا ہے؟

(ب) مرکب اضافی میں آخری حرف اگر نون ہو تو بموجب قاعدہ فارسی اس کا اعلان نہیں کیا جاتا۔ یہ تو مسلم ہے لیکن ایسے مرکبات میں جن کا ثانی اگر عربی ہو تو نون کا اخفا کانوں کو بُرا معلوم ہوتا ہے۔ اور مشاہیر شعراء بھی ایسے نون کا اعلان کرتے ہیں مثلاً جگر مراد آبادی —

لُٹا دے دولتِ کونین اور میرے لئے ۔۔۔ بس اک تبسم عاجز نواز رہنے دے

حضرت جوہر مرحوم —

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے ۔۔۔ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ایسے مرکبات میں اصولاً اعلانِ نون ہونا چاہیے یا نہیں؟

—— مرزا خادم ہوشیارپوری

جوابات

(۱) (ا) نفس شاعری کو اخلاق سے بلاواسطہ تو کوئی تعلق نہیں، ورنہ عرب کے ملک الشعراء امراء القیس اور انگلستان کے سحر طراز بائرن کو شاعروں کے زمرے سے خارج کرنا پڑے گا۔

بائرن نے زندگی عشرت حال وقال میں بسر کی۔ اس کی شاعری کا زیادہ حصہ عورتوں کے حسن و جمال کے قصائد کا مجموعہ ہے

عرب کے امراء القیس کا تمام تر رنگ شاعری یہ ہے —

"فمثلک حبلیٰ قد طرقت و مرضع ۔۔۔ فالہیتہا عن ذی التمائم محول"

تہذیب نگارش ترجمے کی اجازت نہیں دیتی، ورنہ غیر عربی دان بھی کچھ اندازہ کر سکتے۔ شاعری کے متعلق موجودہ مغربی نظریہ بھی یہی ہے کہ شاعر شاعر ہے معلّم اخلاق نہیں۔

لیکن میرے خیال میں شاعر شاعر ہونے کے ساتھ ہی انسان بھی ہوتا ہے اور بحیثیت انسان اس کے کمال شاعرانہ پر بنی نوع انسان کے کچھ حقوق بھی ہیں۔

بنا بریں ایک شاعر اپنی شاعرانہ جولانیوں میں انسانیت اور سوسائٹی کے حقوق کو نظر انداز کر دے تو لٹریچر کا مورخ اُسے کبھی معاف نہ کرے گا۔ اس سے قطع نظر اُس کی شخصیت کے زیر اثر اس کی شاعری سے سوسائٹی پر جو اخلاقی تباہی آئے گی اس کا ذمہ دار بھی وہی گردانا جائے گا۔

مختصر یہ کہ ایک شاعر بحیثیت شاعر واعظ یا معلّم اخلاق نہ سہی لیکن بحیثیت انسان اُس کی شاعری اُس کے ملک و ملت اور عالم انسانیت کے مفاد سے وابستہ ہے۔ بلکہ میں کچھ اس سے بھی آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ میری رائے میں شاعر کو بحیثیت شاعر بھی ہوس کاری اور تزئین فواحش کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ شاعر ایک پیغمبر بے کتاب ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ اپنی الہام بیانیوں سے انسانیت کی

تدریج پہنچانا ہے ۔

جرمنی کا مشہور مفکر اور شاعر گوئٹے شاعری کا مقصد متعین کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

"کائنات کی ہر شے اپنے اندر ایک راز رکھتی ہے ۔ عام انسانوں کی نگاہ اس راز تک نہیں پہنچ سکتی ۔ البتہ ایک پیغمبر اور ایک شاعر اس راز تک رسائی حاصل کرتا ہے ۔ پس شاعری کا مقصد یہ ہے کہ کائنات وجود کے رازوں کو بے نقاب کرے ۔"

اسی کے قریب قریب ایمرسن کا قول ہے کہ :۔

"موجودات عالم کے صورِ ظاہری سے گزر کر ان کے وجود کی علت غائی کو معلوم کرنا شاعر کا کام ہے ۔ شاعر کی نگاہ حقیقت میں کی رسائی زندگی کی ماہیت تک ہوتی ہے ۔"

جان رسکن کہتا ہے کہ :

"احساس ، معیارِ شرافت ہے ۔ انسانی طبیعت کی شرافت کا اندازہ اس کی قوتِ احساس سے کرنا چاہیئے ۔"

شاعر کے احساسات قوی اور لطیف ہوتے ہیں ۔ کائنات میں ہر ذرے کی جنبش اس کے لطیف حسیات پر اثر انداز ہوتی ہے ۔ عالمِ فطرت کا ہر راز اس کی نگاہ نکتہ رس کا آئینہ بن جاتا ہے ۔"

خلاصہ یہ کہ اسرارِ قدرت کی موزوں ترجمانی ہی کو شعر سے تعبیر کرتے ہیں ۔ شاعری کے متعلق ان مفکرین کے تمام نظریے اسی ایک نکتے پر مرتکز ہوتے ہیں کہ شاعر کا منصب زندگی اور قدرت کے سربستہ رازوں کو بے نقاب کرکے انسانیت کو خالق کائنات کے قریب تر کر دینا ہے ۔

مولینا روم شاعری کی پیغمبری شان کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ۔

"شاعری جزوے است از پیغمبری"

قدیم اہلِ یونان میں شاعر اور پیغمبر دونوں کے لئے ایک ہی لفظ (vate) استعمال کیا جاتا تھا ۔ یونانی شاعر کو بھی پیغمبر کی طرح فطرت کا محرمِ راز تصور کرتے تھے ۔

"الشعراء تلامیذ الرحمٰن" کا زریں مقولہ بھی شاعر کے منصب نبوت کی تائید کرتا ہے ۔

یقیناً ایک شاعرِ کامل الہام ربانی کا گہوارہ ہوتا ہے ۔ بعض اوقات بلند اور صحیح الفکر شعراء کے علاوہ سطحی درجے کا کوئی شاعر بھی بلا ارادہ ایسی درخشاں حقیقت نظم کر جاتا ہے جسے الہام الٰہی کے سوا اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا ۔

نتیجہ بحث یہ ہے کہ شاعر کے منصب پیغمبری پر نظر رکھتے ہوئے عالم انسانیت کے متعلق اس کی ذمہ داریاں بہت گرانبار ہیں اسے عشرت فروزیوں اور فحش نگاری کی اجازت نہیں دی جا سکتی ۔

(ب) اردو ہندی قضیے کے متعلق میں متعدد بار اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں ۔

میری رائے میں اردو ہندی کا تنازعہ افتراق پسند لوگوں کا پیدا کردہ ہے ۔ ورنہ اردو ہندی ماں بیٹیوں کا رشتہ رکھتی ہیں ۔ اردو کے تمام افعال ہندی ہیں ۔ نوے فی صدی اسماء ہندی ہیں ۔ اردو کی ساخت ہندی ہے ۔ کچھ الفاظ دوسری زبانوں کے مل جانے سے اسے بدیشی نہیں کہا جا سکتا ۔ اور مسلمانوں کی ملی زبان تو یہ ہرگز نہیں ہے نہ کبھی پہلے ہوئی ۔ کیونکہ ان کی مذہبی زبان عربی ہے اور ہندوستان میں ان کی حکومتی زبان ہمیشہ فارسی رہی ہے ۔ اردو زبان مرزا غالب کے وقت تک بھی سندِ افتخار نہیں بن سکی تھی ۔ مرزا غالب خط و کتابت فارسی میں کیا کرتے تھے ۔ اخیر عمر میں ضعفِ دماغ کے سبب (جیسا کہ وہ ایک خط میں معذرت کے طور پر لکھتے ہیں) مراسلہ نگاری اردو میں کرنے لگے تھے ۔ اس حقیقت بینہ کی موجودگی میں اسے صرف مسلمانوں کی زبان قرار دینا تاریخی ناواقفیت کے اظہار کے علاوہ اردو کے ساتھ سخت بے انصافی

ہے۔ پھر آں کارواں در کارواں ہندو انشا پردازوں اور شعراء کی حق تلفی بھی ہے جنہوں نے مسلمانوں کے دوش بدوش اسے پروان چڑھانے میں اپنی عمر عزیز کی طویل ساعتیں قربان کی ہیں۔ مجھے اردو سے محبت ضرور ہے لیکن آرزو مند ہوں کہ ہندی زبان میں بھی درک حاصل کروں یہی نہیں بلکہ ملک کا تعلیمی نظم و نسق میرے ہاتھ میں آجائے تو ملک کے بچوں کے نصاب میں اردو ہندی دونوں کو اس طرح شامل کر دوں کہ ہر ہندوستانی بچے کے لئے دونوں زبانوں کا سیکھنا ضروری ہو جائے۔

(ج) ذوقؔ سے خدانخواستہ مجھے کوئی عداوت نہیں کہ غریب میری پیدائش سے بھی قرنوں پہلے وفات پا چکا ہے۔ لیکن فرض تنقید کی ذمہ داری کو ادا کرنا بھی ضروری خیال کرتا ہوں۔ یہ تو آپ صحیح فرماتے ہیں کہ دوسرے شعراء کے کلام میں بھی پستی اور عریانی کی جھلک موجود ہے۔ میں اس کا منکر نہیں لیکن میرا کہنا تو یہ ہے کہ ذوقؔ کا منتخب کلام بھی ابتذال اور پستی اور فرسودگی کا سرمایہ دار ہے۔ دوسروں کے منتخب کلام میں اس درجے پستی نہیں اور اگر کوئی شاعر اس خصوصیت میں ذوقؔ کا شریک قسمت ہے تو میں اسے بھی ذوقی ہی قرار دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ ذوقؔ اپنے رجحان طبعی اور کچھ شاہ نصیر کے فیض صحبت کے سبب صرف صنایع و بدایع کو کمال شاعری تصور کرتا رہا۔ اس کا جو شعر صنعت پرستی کے تلوث سے پاک ملے تو سمجھ لیجئے کہ اس شعر کی تخلیق میں اس کے ارادے کو مطلق دخل نہیں کہ ارادۃً وہ صنایع و بدایع کو نظم کر دینا ہی کمال شاعری سمجھتا ہے۔ کہیں بلا ارادہ کسی شعر میں کسی جذبے کا اظہار ہونے لگتا ہے تو وہ کوئی نہ کوئی صنعت ملا کر اس جذبے کی روح کو سلب کر لیتا ہے۔

دل عشق لب جاں بخش پر جاں طرۂ مشکیں پہ ہے   عیسائی اپنے دین پہ ہے موسائی اپنے دین پہ ہے
پیس مردنی بھی دنیا دار مردہ خوار دنیا ہے   کہ اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہے

شعر میں صنعت اگر شاعرانہ بلندی کے ساتھ سلیقے سے بندھ جائے اس طرح کہ پڑھنے اور سننے والے کو یہ نہ محسوس ہو سکے کہ شاعر نے اس صنعت کو شاعرانہ قالب میں ڈھالنے کے لئے یہ شعر کہا ہے تو شعر کو صنعت چار چاند لگا دیتی ہے۔ دیکھئے مرزا غالبؔ "صنعت تضاد" کا عاشق ہے لیکن اس کے کسی شعر میں یہ صنعت قوت سامعہ پر بار نہیں ہوتی۔ بلکہ شعر کی دلربائی میں اضافہ کر دیتی ہے۔ اس کی صنعت نگاری کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا   درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا
رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج   مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہو گئیں
محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا   یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

(د) انسان کے لطیف حسیات کو ابھار کر اسے قدرت کا محرم اسرار بنانا شاعری کا اصل مقصد ہے جس شاعری سے یہ مقصد پورا ہوتا ہے وہ انسان کے لئے تفریح کا باعث بھی ہو گی اور اسے زندگی کا سبق بھی سکھائے گی۔

آ ملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک   بزم گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائے گی
آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش   اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز   اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں   محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

ان اشعار کو پڑھ کر دل موج سرور سے معمور ہو جاتا ہے اور ان میں صحیح زندگی کے لئے روشن اشارے بھی مضمر ہیں

(۲) نہیں دیوان حالیؔ سے طلبہ کو صرف مولینا حالیؔ کی شاعری سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ باقی شعراء کے کارنامہائے شاعری سے وہ کورے رہ جاتے ہیں۔

باقی اردو نثر اُس کے ادوارِ ارتقاء، اصنافِ نثر اور قابلِ ذکر اردو نثاروں سے اُن کی بے خبری معصومانہ اور ان کی واقفیت مضحکہ خیز ہوتی ہے ملکی ادبیات سے طلبہ کی اس بے خبری کے ذمہ دار پنجاب یونیورسٹی کے "بورڈ آف سٹڈیز" کے وہ بے دماغ ممبر ہیں جو اس مضمون سے بالکل نابلد ہیں۔ بلکہ ادبی ذوق رکھنے والے اکثر طلبہ ان مجوزین نصاب اردو سے بہت زیادہ واقفیت کے مالک ہوتے ہیں۔

پنجاب یونیورسٹی میں جب تک ایسے آدمی نہ لئے جائیں گے۔ جو مشرقی اور ملکی زبانوں کے ادبیات سے براہِ راست (انگلش کے واسطے کے بغیر) واقفیت رکھتے ہوں۔ تعلیمات میں ان زبانوں کے لئے کوئی گنجائش نہ نکلے گی۔ پچھلے سال تک انٹرمیڈیٹ کے نصاب اردو میں دیوانِ ذوق مع قصائد داخل تھا اس سے زیادہ ان بے خبر ممبروں کی بدذوقی کی رسوائی اور کیا ہو سکتی ہے؟

(۳) "قابو کر لینا" صحیح نہیں۔ فقرہ محولہ بالا میں قابو کر لیا لکھنا چاہیئے تھا۔ زبان کی دامن درازی کسی بڑے سے بڑے زبان داں کو بھی اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا کرتی۔

مولانا ظفر علی خاں صاحب قبلہ اردو ادب (نظم و نثر) کے صاحبِ طرز انشاپرداز ہیں لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ اُن کا کلام لغزش سے بالکل مبرّا ہونا چاہیئے۔ یہ امتیاز تو خالق السنہ نے صرف اپنے لئے محفوظ رکھا ہے۔

آپ "قابو کر لیا" کبھی نہ بولیئے اس کی بجائے "قابو میں کر لیا۔ قابو پا لیا۔ قبضے میں کر لیا" کہنا درست ہوگا۔

(۴) (ا) مولانا اسمٰعیل مرحوم کی وہ نظمیں جو بچوں کے لئے انہوں نے کہی ہیں اور ابتدائی درسی کتابوں میں درج ہیں اپنے رنگ میں لاجواب ہیں۔ آسان بھی ہیں اور دلکش بھی۔

اُن کا شاعرانہ درجہ متعین کرنا میرے لئے مشکل ہے۔ کسی آئندہ نمبر میں اُن کا کلام بالاستیعاب پڑھ کر اظہارِ رائے کر سکوں گا۔

(ب) اوّل تو یہ حقیقت پیش نظر رکھیئے کہ اردو گریمر کے ایک صدی پہلے کے قواعد موجودہ اردو زبان کے لئے پرانے ہو چکے ہیں ضرورت ہے کہ اس دور کی ترقی یافتہ اردو زبان کے لئے جدید قواعد وضع کئے جائیں۔ ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ قدیم السن قواعد کی رو سے بہت سے مستند اور مسلم الثبوت اہلِ قلم غلط نگار قرار دیئے جائیں گے۔

سوال مندرجہ کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ جن مرکبات اضافی میں جزو ثانی عربی اور عَلَم ہو اُس کے اخیر میں حرف نون ہو تو اظہارِ نون بعض صورتوں میں ضروری اور بعض میں جائز ہوگا۔ جواز کی صورتوں میں بھی اخفائے نون انسب ہوگا۔ "قتلِ حسینؓ" اور "دولتِ کونین" میں اخفائے نون جائز نہیں۔ ہاں حافظِ قرآن میں ہر دو جائز ہونے چاہئیں اور اس صورت میں فارسی گریمر کے پرانے قاعدے کو نظرانداز کر دینا چاہیئے۔ باقی عام صورتوں میں اخفائے نون ضروری ہے جیسے دورِ آسماں، حسنِ بتاں وغیرہ۔ واللہ تعالےٰ اعلم

سوالات

(۱) دو نو۔ اور دونوں میں کیا فرق ہے؟ میں دیکھتا ہوں کہ کہنہ مشق مضمون نگار بھی بلا کسی امتیاز کے لکھتے ہیں۔

(۲) میں نے کئی لوگوں سے سنا ہے کہ شاہکار اب ادبیات کو چھوڑ کر تعلیمی رسالہ بن رہا ہے اس خیال میں کہاں تک صداقت ہے؟

——— چرنجی لال گپتا آتش بی۔اے موگا ضلع فیروزپور

(۳) اصغر گونڈوی کے مجموعۂ کلام پر جناب نیاز نے جو اصلاح دی ہے آپ کی نظر سے ضرور گزری ہوگی۔ ذیل کے اشعار حضرت نیاز کی اصلاح مندرجہ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

اصغر:۔

اشک اب نہیں تھمتے، دل پہ اب نہیں قابو   خود کو آزما بیٹھے مجھ کو آزمانے سے

پہلا مصرعہ پر اصلاح نہیں کی گئی دوسرے کو اس طرح بدل دیا ہے۔

نیاز: کیا ملا آنہیں آخر مجھ کو آزمانے سے

اصغر

میں اس کو فرطِ شوق کہوں یا جمالِ دوست اک برق ہے جو کوند رہی ہے نقاب میں

نیاز۔ دوسرا مصرعہ

اک برق سی ہے، کوند رہی ہے نقاب میں

——— سرمد بہاری۔ شیر پور۔ بہار شریف

(۴) سننے میں آیا کرتا ہے کہ فلاں عورت کو جن آتا ہے یا فلاں عورت کو فقیر آیا ہے۔
اس جن یا فقیر سے کیا مطلب ہے کیا جن اور فقیر مردوں کو بھی آیا کرتے ہیں۔ یہ مصیبت ہندوستانیوں ہی کے لئے خاص ہے یا
انگریزوں وغیرہ کو بھی آیا کرتے ہیں؟
جب کسی عورت کو جن یا فقیر آتا ہے تو عورت طبلے کی تھاپ پر قوالی سن کر وجد میں آجاتی ہے۔ اس کی کیا اصل ہے؟

——— شیر محمد اکرمی ڈیرہ غازی خاں نمبر ۱۵۱

(۵) مجھے مندرجہ ذیل فقرات و محاورات کی ترکیب اور محل استعمال میں شبہ لاحق ہوا ہے۔ جناب مہربانی فرما کر رسالہ شاہکار میں
ان کو درج کر کے اہلِ قلم کو دعوتِ فکر دیں:

——— محمد اکبر ہیڈ ماسٹر مسلم ہائی اسکول لائلپور

(۱) ہم میں سے اکثر اپنی خوشی کو صرف اس لئے تباہ کر دیتے ہیں، کہ نکتہ چینی کا خوف ہر آن ہمارے / ان کے دامن گیر رہتا ہے۔
(۲) جو شخص کسی کے بتلانے کے باوجود جرم کا ارتکاب کرتا ہے اسے اپنی غلطی کا خمیازہ ضرور بھگتنا (کھینچنا۔ اٹھانا) پڑتا ہے۔
(۳) تیر نیم کش کا زخم ہمیشہ رِستا رہتا ہے۔
(۴) نفس کی مخالف قوا میں ہمیشہ جنگ و جدل رہتا / رہتی ہے
(۵) جتنا وقت ورزش اور سیر و تفریح میں گزرتا ہے۔ اسے یہ لوگ ضائع شدہ (ضائع) سمجھتے ہیں۔
(۶) نہ تو مصائب کا دیو اور نہ عیش و عشرت کی پری اسے اپنے ارادے سے ہٹا سکے
(۷) بنی نوع انسان کی خدمت کرنے کی بجائے غریبوں کے گلے پر اُلٹی چھری پھیرے گا (چلائے گا)
(۸) اپنے ہاتھ سے تیشہ چلا کر / مار کر روزی کمانا کسی کے طفیلی بننے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔
(۹) صاحب عزم کے لئے دنیا خود بخود راہ / راستہ صاف کر دیتا ہے (راہ دیتا ہے)
(۱۰) میرے پاس مرد اور عورتیں آئیں / آئے

(۶) ہندوستان کے پریس پر اظہارِ خیال کر کے ممنون فرمائیں۔ میٹرک کے امتحان میں اکثر اس قسم کا سوال آجاتا ہے۔

——— رام چند ہندو مسلم ہائی اسکول ہریانہ

(۷) پنجاب اسمبلی کے امیدواروں کے نام شائع ہو رہے ہیں۔ میری خواہش تھی کہ آپ بھی بطور امیدوار کھڑے ہوتے۔ آپ کا چانس یقینی
تھا۔ اردو زبان کے تمام بہی خواہ آپ کی امداد کریں گے۔ صوبے کی پارلیمنٹ میں ادیب نمائندے کی ضرورت بھی ہے۔

——— نجم الدین نظر محلہ مصری شاہ لاہور

جوابات

(۱) اس لفظ کا اصل املا "دونوں" ہے۔ اس کے بصورت اعداد تینوں۔ چاروں، پانچوں پر قیاس کر لیجئے۔
"دونو" زیادہ تر پنجاب میں لکھا جاتا ہے اور یہ بھی رواج پذیر ہو رہا ہے۔ اس لئے اسے بھی غلط نہ سمجھنا چاہیئے!

(۲) شاہکار کے سرورق پر یہ عبارت مندرج ہے۔
"اردو مرکز لاہور کا علمی، ادبی، تعلیمی اور فنی ماہنامہ"
اسی کے مطابق اس میں تعلیمات پر بھی ایک آدھ نوٹ اور ایک دو مضمون شائع کئے جاتے ہیں۔ اور چونکہ اس کے جہازی سائز کے پچھتر صفحات میں کئی رسالوں کی برابر مضامین سما جاتے ہیں۔ اس لئے چھ سات صفحے تعلیمات کے لئے وقف کر دینے سے شاہکار کی ادبیت میں فرق نہیں آتا۔

کوئی سا نمبر اٹھا کر مطالعہ کر لیجئے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ شاہکار خالص تعلیمی رسالہ بن رہا ہے یا ہر قسم کی علمی، ادبی، تعلیمی فنی دلچسپیوں کا مرقع بن کر شائع ہوتا ہے؟

واقعیت صرف اتنی ہے کہ دوسرے رسالوں کو تعلیمات سے کوئی دلچسپی نہیں اور شاہکار کے اغراض و مقاصد میں یہ بھی شامل ہے کہ ملک کے اساتذہ اور نوجوانوں کو ترقی یافتہ ممالک کی رفتارِ عالم، نظریۂ تعلیم، طریقہائے تعلیم، نتائج تعلیم سے باخبر رکھے اور اساتذہ کے حقوق کی حفاظت و حمایت کرے۔ بنا بریں شاہکار میں دو مستقل عنوان "تعلیمات" اور "تعلیمی ادارت" قائم کئے گئے ہیں۔

(۳) حضرت اصغر کے کلام پر حضرت نیاز کی تنقید میری نظر سے نہیں گزری، تنقید محولہ کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ،
حضرت اصغر کے مصرعۂ ثانی میں "وہ" کی ضرورت تھی، وزن کی تنگ میدانی نے "وہ" کے استعمال کی اجازت نہ دی۔ شعر کے مفہوم میں قدرے ابہام ضرور پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن بے مفہوم نہیں ہے۔ باقی حضرت نیاز نے اسم اشارہ استعمال کر کے فنی نقطۂ نگاہ سے اصلاح تو کی مگر شعر کے مفہوم کو رفعت سے پستی میں گرا دیا۔
دوسرے شعر میں لفظی کتر بیونت کے سوا اصل شعر کا مفہوم باقی ہے۔
حضرت اصغر مصرعۂ ثانی میں "کہ" کی بجائے "جو" اس لئے لائے کہ کہ کوندے میں دو کاف کے اجتماع سے تنافر سا پیدا ہو جاتا ہے
حضرت نیاز نے اپنی اصلاح میں "جو" کو نکال دیا۔ درست۔ مگر کہ بیانیہ کی ضرورت کو پورا نہ کر سکے۔
مختصر یہ کہ پہلی اصلاح نے شعر کے مفہوم کو پست بنا دیا۔ اور دوسری اصلاح میں کہ بیانیہ کی کمی نے مصرعۂ ثانی کے تسلسل میں فرق پیدا کر دیا۔

(۴) جن، بھوت پریت، سایہ، آسیب، دیوی، "شیخ سدھو" "گوردیو" وغیرہ لوگوں کے سر آیا کرتے ہیں، یہ سنی سنائی باتیں ہیں میں نے بھی سنا ہے۔ کبھی کو مبتلا نہیں دیکھا۔
عورت، مرد کی اس میں خصوصیت نہیں، البتہ معمول کا ہندوستانی ہونا شرط ہے۔ انگریز چونکہ ان چیزوں کے قائل نہیں۔ عموماً ان مصیبتوں سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ لیکن مغربی ممالک میں بھی اس خیال کے لوگ پائے ضرور جاتے ہیں۔
ہندوستانی عورتیں اس معاملے میں بہت ذہین واقع ہوئی ہیں، انہیں جب گھر والوں یا برادری پر اپنا رعب جمانا یا کسی خاص مقصد کی تکمیل مقصود ہوتی ہے۔ اکثر یہ سوانگ رچایا کرتی ہیں۔ مذہبی نقطۂ نظر بھی اس کا انکار نہیں کرتا۔ پیغمبرِ اسلام علیہ السلام نے فرمایا ہے، "اِنَّ ہٰذَا الحَشِیشُ لَمُحتَضِرَۃٌ"

مقامات نجاست میں آسیب کا اثر ہوتا ہے۔اس لئے جب بیت الخلاء (پاخانہ) میں رفع حاجت کے لئے جاؤ! یہ دعا پڑھو!
"اللّٰھم نعوذ بک من الخبث والخبائث"
اے خدا ہم اس گندہ مقام کی بلاؤں سے تیری پناہ چاہتے ہیں۔
بعض نہایت معتبر اور صادق اللہجہ حضرات سے اُن کے عینی واقعات سُنے گئے ہیں جنہیں سُن کر جن بھوت آسیب وغیرہ کی نقصان رسانی کے خیال کو خیال خام نہیں کہا سکتا۔ واللہ تعالےٰ اعلم بالصواب۔

(۵) (۱) انہیں دامن گیر رہتا ہے۔
(۲) خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔
(۳) زخم ہمیشہ رستا رہتا ہے۔
(۴) جنگ وجدل رہتا ہے ـــــ اس مرکب عطفی کی تذکیر و تانیث پہ اہل نظر مزید غور وفکر فرمائیں۔
(۵) دونوں صحیح۔ لیکن "مضائقہ سمجھتے ہیں" صحیح بھی ہے اور مختصر بھی۔
(۶) صحیح ہے۔
(۷) الٹی چھری پھیرے گا۔
(۸) تیشہ سے کر روزی کمانا۔ فقرہ پھر پھیپھسا ہے۔ تیشہ بجا کر روزی کمانا ہی درست ہے۔
(۹) راستہ صاف کر دیتی ہے یا راستہ چھوڑ دیتی ہے۔
(۱۰) مرد اور عورتیں آئیں۔

(۶) میری رائے میں موجودہ ہندوستانی پریس سوختنی اور اس کے مالک گردن زدنی ہیں۔ ملک میں تمام فسادات، کشت و خون اور بدامنی کا براہ راست ذمہ دار موجودہ پریس ہے۔ خصوصاً اردو اخبارات تو باہمی خونریزی کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ میں تو ہندوستانی پریس کی جرائم پیشگی سے اس قدر بیزار ہوں کہ اس کی خوبیوں کا ذکر پسند نہیں کرتا۔
آپ چاہیں تو کلکتے کے "ہند جدید" اور دہلی کے "ریاست" کو اس بزم خونخواراں سے مستثنیٰ کر لیں۔

(۷) پنجاب اسمبلی کی امیدواری اور میں؟ "توبہ توبہ گنہگار ہوں سے مرکب ہے بشر"
میرے علم کے مطابق میرے گناہ ابھی تک محدود ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کش مکش میں پڑ کر ممبری کی بجائے غیر محدود گنہگاری کا مالک قرار دیا جاؤں۔ دوسرے یہ کہ جس خاندان کا فرد ہوں اُس کا مصدقہ نسب نامہ خاندان میں محفوظ چلا آتا ہے۔ اپنے حسب و نسب کے متعلق کسی حریف انتخاب کو زحمت تحقیق دینا پسند نہیں کرتا۔
البتہ جن حضرات کو اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی رسوائی میں لطف محسوس ہوتا ہو وہ اس خارزار میں زحمت جلوہ ضرور فرمائیں! یا جس خاندان کو اپنی تحقیق منظور ہو وہ اپنے کسی فرد کو کسی حلقے سے امیدوار بنا دے۔ اُس کے امیدوار کا حریف وقت عزیز کے بہترین لمحات اُس خاندان کی نسبی ریسرچ پر صرف کر کے اُس خاندان کا مکمل نسب نامہ مرتب کر دے گا۔
رہی یہ ترغیب کہ تمام بہی خواہان اردو میری امداد کریں گے۔ میرے لئے مطلق کشش نہیں رکھتی کیونکہ بیس سال کے تجربات سے اس صحیح نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام کے سوا دُنیا میں اردو کا کوئی بہی خواہ نہیں۔ اور حضور موصوف کا ووٹ برطانوی علاقے میں کسی امیدوار کے حق میں استعمال نہیں ہو سکتا۔ اس لئے قطع نظر ممبری کے لئے میں اور کسی قسم کی سندات اہلیت بھی نہیں رکھتا۔

خلافِ عمل کبھی نہیں کیا۔ دیانا چاہتا ہوں اور خدا سے بھی نہ جانے۔ شہید گنج اور کشمیر کی ہنگاموں میں بھی شرکت کی توفیق سے محروم رہا۔ باہر سرکار سے مجھے خوش نہیں ہے تو نا واقف بھی نہیں۔ پھر سیاسی چندوں کی لوٹ میں بھی کسی ہنگامی نے مجھے مجالِ شمولیت نہیں بخشی۔ یعنی ووٹ خریدنے کی استطاعت بھی نہیں رکھتا۔

البتہ اس سلسلے میں قادیانیوں کے خلاف سبّ و شتم ؛ ہاں یہ موسم کا نغمہ ہے اور میری کے استحقاق کی ایک ممتاز حیثیت۔ مگر بدقسمتی سے قصیدہ نگاری کی طرح شتم آرائی کے فن سے بھی بالکل کورا ہوں۔ ع

"ہمہ حیرتم کہ دہقاں بچہ کارِ کشت ما را"

مختصر یہ کہ جس حال میں ہوں۔ جیسے بھی ناسازگار ماحول میں بسر کرتا ہوں، مجھے اسی حال میں اور اسی فضا میں پڑا رہنے دیجیے ؛ ؎

کچھ میری بے خودی سے تمہارا زیاں نہیں   تم جانتا کہ بزم میں اک خستہ جاں نہ تھا

آپ اپنے اس زعم کی بھی اصلاح کیجیے کہ پنجاب اسمبلی میں ادیبوں یا اُن کے کسی نمایندے کی ضرورت ہے۔ قطعاً نہیں، ادب کے متاعِ گراں مایہ کی دنیا کے کسی بازار میں پوچھ نہیں، پھر اسمبلی میں تو ادیبوں کی بجائے زیادہ تر بے ادبوں کی کھپت ہوگی۔ وہاں بھلا ادیبوں کا کیا کام۔ وہ کوئی مشاعرے یا مناظرے کی مجلس تو نہیں۔ خدانخواستہ اگر میں وہاں پہنچ جاؤں اور اسمبلی کے اجلاس میں بجٹ کی تقریر پر گلا صاف کرکے "مطلع عرض ہے" کی شعری تمہید کے ساتھ گنگنانا شروع کردوں تو میری بے وقت کی شہنائی پر کون کان دھرے گا ؛ پھر بھلا ادیب نمایندہ وہاں کس مد میں کام آ سکے گا ؛

"تختۂ مسجد سوختنی نہ فروختنی"

علم و ادب کے خدمت گزار پہلے ہی بہت کچھ ذلیل ہو چکے ہیں۔ اسمبلی میں پہنچا کر انہیں زیادہ خوار نہ کیجیے ؛

سوالات

(۱) حسب ذیل انگریزی الفاظ کا اردو ترجمہ شائع فرما کر ممنون کیجیے۔

(۱) سوشلزم	Socialism.	(۲) کمیونزم	Communism.
(۳) بولشویزا	Bolshenism	(۴) سوسائٹی	Society.
(۵) ہیومن سوسائٹی	Human Society.	(۶) ریزولیوشن	Resolution.
(۷) ریلوے اسٹیشن	Railway station	(۸) ایکس رے	X-ray.
(۹) ڈیل گیٹ	Dale gate.	(۱۰) وائٹ پیپر	White paper.
(۱۱) ایکسٹریمسٹ	Extremist.	(۱۲) ماڈریٹ	Moderate.
(۱۳) بلاٹنگ	Blotting.		

——— محمد علی سیکنڈ ماسٹر مڈل سکول جھاورا

(۲) آپ نے جس کارخانے کا ذکر کیا ہے کہ وہ اُجرت سے کر نظمیں یا ہر فن کی کتابیں اُجرت ادا کرنے والے کے نام سے لکھ دیتا ہے۔ اس کے نام اور پتہ سے مطلع فرمایئے ؛ مہربانی ہوگی۔

——— کرتار سنگھ ناز گوجرانوالہ

(۳) مرزا غالب کے مندرجہ ذیل شعر کی تشریح مطلب واضح الفاظ بیان کیجیے ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی   ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

——— نذیر حسین بی۔ اے۔ بی ٹی (پشاور)

(۴) آپ کے خیال میں لڑکیوں کو سینما دیکھنا جائز ہے یا نہیں ؟

—— پرکاش لال گپتا جالندھر

(۵) مس سلوچنا اور کجن بانی سینما کی مشہور سٹارز ہیں۔ آپ کی رائے میں ان میں سے کس کا ایکٹنگ اچھا ہے ؟

—— پورن سنگھ تبتر انوری ایڈیٹر فلم اسٹیج امرتسر

(۶) اردو رسالے عموماً نقصان پر کیوں چل رہے ہیں جب کہ اردو زبان اس قدر ترقی پر ہے ؟

—— دیندیال بی۔اے کرتار پور

(۷) پچھلے دنوں میں لاہور گیا تھا انارکلی میں گزرا تو خیال ہوا کہ رسالہ "شاہکار" خریدتا چلوں" ایجنٹ سے اخبار طلب کیا تو اس نے کہا "شاہکار تو مدت کا بند ہو گیا" مجھے اس خبر سے بڑا صدمہ ہوا۔ دہلی واپس آ کر ایک دوست سے میں اظہار تاسف کرنے لگا کہ دیکھو شاہکار جیسا بلند رسالہ بھی جاری نہ رہ سکا۔ اس نے میرے تاسف پر افسوس کا اظہار کیا اور مجھے جولائی کا پرچہ میز کے دراز سے نکال کر دکھایا۔ آپ اس ایجنٹ سے باز پرس کیجیے وہ "شاہکار" کے خلاف کیوں پروپیگنڈا کرتا رہتا ہے ؟

—— محمد حسین سبق بارہ ہندو راؤ دہلی

(۸) اکثر خطوں میں لکھا جاتا ہے کہ ؟
"برائے مہربانی یہ کام کر دیجیے" کیا برائے مہربانی کا لفظ صحیح ہے ؟

—— سادھو رام شاد بی۔اے ہندو مسلم ہائی سکول ہریانہ

(۹) میں انشورنس کا کام کرتا ہوں۔ مجھے ایک دوست نے لاہور کے احباب کے جو نام لکھوائے ہیں۔ ان میں آپ کا نام بھی ہے۔ میں عنقریب لاہور حاضر ہوں گا۔ مہربانی فرما کر اپنے دفتر کے پتے سے اطلاع دیجیے اور یہ بھی لکھیے کہ آپ نے کسی بیمہ کمپنی میں اس سے پہلے بھی زندگی کا بیمہ کرایا ہے ؟ میری کمپنی کا پراسپکٹس بہت اچھا ہے یہ انڈیا کی کمپنی ہے۔ اس میں بڑے بڑے والیان ریاست نے اپنی زندگی کا بیمہ کرایا ہے۔ امید ہے آپ بھی مجھے خدمت کا موقعہ دیں گے۔ میں آپ کے کالج کا اولڈ بوائے ہوں۔ اگرچہ مجھے آپ کی شاگردی کا فخر حاصل نہیں۔

—— وضیت رائے ملکر بیمہ ایجنٹ دہلی

جوابات

(۱) الفاظ کا ترجمہ ترتیب وار درج ہے۔ بعض انگریزی الفاظ کو بعینہٖ اردو میں لے لیا گیا ہے۔ اور وہ الفاظ بڑی حد تک مانوس ہو گئے ہیں۔

(۱) اشتراکیت ۔ سوشلزم
(۲) اشتمالیت ۔ کمیونزم
(۳) قوضویت ۔ بالشویزم
(۴) سماج ۔ سوسائٹی
(۵) بنی نوع انسان
(۶) اسٹیشن ۔ ریلوے سٹیشن
(۷) عکس ریز ۔ ایکس رے
(۸) قرارداد ۔ ریزولیوشن
(۹) نمائندہ ۔ مندوب ۔ ڈیلی گیٹ
(۱۰) قرطاس ابیض ۔ وائٹ پیپر
(۱۱) انتہا پسند
(۱۲) اعتدال پسند
(۱۳) جاذب، سیاہی چوس

(۲) ادارے کا نام بتانا معاصرانہ مصلحت کے خلاف ہے۔ معلوم ہوتا ہے آپ اُس ادارے سے کوئی خدمت لینا چاہتے ہیں۔ میں ایک غلط منزل

کی طرف آپ کی رہنمائی نہیں کرسکتا۔ اگر آپ ملکۂ شاعری واستعداد تصنیف و تالیف سے محروم ہیں تو یقین کیجئے کہ تعزیراتِ ہند میں کوئی ایسی دفعہ نہیں جو غیر شاعر اور غیر مصنف کو مجرم گردانتی ہو۔

(۳) خون گرم۔ سعی۔ جد و جہد۔ صورت و ہیولیٰ۔

فلسفے کی اصطلاحیں ہیں۔ فلسفۂ قدیم جسم کو دو اجزا سے مرکب مانتا ہے پہلا جزو ہیولیٰ (مادۂ اولیٰ) ہے دوسرے جزو کا نام ہے صورت جسمیہ ان دو اجزا کی ترکیب سے جسم بنتا ہے پھر صورت نوعیہ لاحق ہو کر اجسام کو ایک دوسرے سے ممتاز بناتی ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ میری ترکیب و تعمیر جن اجزاء سے ہوئی ہے اُن میں فنا بھی ایک جزو ہے۔ بنابریں میری نشو و نما کے ساتھ میرا عنصر ترکیبی (فنا) بھی اپنا کام کر رہا ہے۔

گویا کسان کی گرم کاری اور سعی عمل اُس کے خرمن کے لیے برقِ خرمن سوز کا عنصر ترکیبی ہے۔ کسان کشت کاری میں جتنی جد و جہد بھی کرتا ہے اُس کی وہ ساری جد و جہد اس کے خرمن کے لئے ایسی بجلی بناتی ہے جو خرمن کو خاکستر بنا دیتی ہے۔

مختصر یہ کہ انسان کی عمر جتنی بڑھتی ہے اتنی ہی گھٹتی رہتی ہے۔

"ومن نعمّرہ ننکّسہ فی الخلق" (قرآن کریم)

(۴) موجودہ سینما مشرقی تہذیب پر ایک بارِ گراں ہے۔ عشق و ہوس کی رنگینیاں پردۂ سیمیں پر آکر جوان خون میں اشتعال پیدا کرنے کا موجب بن رہی ہیں۔ لڑکیوں کا تو ذکر کیا ہے۔ میں تو لڑکوں کے لیے بھی مروجہ سینما کو مخربِ اخلاق تصور کرتا ہوں۔ لیکن تہذیب جدیدہ کی یہ بدعت اب ہندوستانی زندگی کی بھی ایک ضروری لعنت بنتی جا رہی ہے۔ اس سے نوجوانوں کو روکا نہیں جا سکتا۔ البتہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس میں مناسب اصلاح کر کے اسے مشرقی تہذیب کے لئے قابلِ برداشت بنایا جائے۔ یہ ناممکن اگر ممکن کی صورت اختیار کر سکے تو پھر لڑکیوں کا سینما میں جانا قابلِ اعتراض نہ ہوگا۔ مگر نا ممکن کا ممکن بنانا طاقت بشری سے خارج ہے۔ اس لئے آپ راضی ہوں یا ناراض، سینما جو رنگ اختیار کر چکا ہے اُس رنگ پر جاری رہے گا بلکہ شاید اس کی رنگا رنگی آئندہ اس سے بھی زیادہ عبرت نظر بننے پر اصرار کرے۔ جو کچھ ہو رہا ہے ہونے دیجئے۔ دیکھتے جائیے۔ حرفِ شکایت زبان پر نہ لائیے! بس ع

"آنکھ آئینے کی پیدا کر نہ بن تصویر کا"

(۵) مس سلوچنا اور مس کجّن میں ان دونوں مسوں کے شرفِ زیارت سے محروم ہوں۔ اور ایکٹنگ کے آرٹ سے بھی لگاؤ نہیں رکھتا۔ اس لئے اگر انہیں ایکٹ کرتے دیکھ بھی لوں پھر بھی آپ کے سوال کا صحیح جواب نہیں دے سکتا۔ ملک کے مشہور ڈراما نویس حکیم احمد شجاع آپ کے سوال کا جواب دے سکیں گے کہ وہ اس راہ کے رہنما ہیں۔

(۶) جو اردو رسالے کوک شاستروں کو نظم و نثر کی صورت میں شائع کر رہے ہیں۔ وہ تو اپنی گرمئی بازار سے تمام اچھے اردو رسالوں کے محور بنے ہوئے ہیں۔ اکثر علمی رسالوں کی قبولیت عامہ بھی وحشتناک حد تک بڑھ رہی ہے۔ بات یہ ہے کہ جن پرچوں میں مذاقِ عام کی تسکین کا سامان ہے۔ انہیں کوئی نقصان نہیں۔ نقصان تو درکنار انہوں نے تو اپنے لئے ہر عامی کے بحث میں تڑپ پیدا کر رکھی ہے۔ البتہ بلند مذاق کو اپیل کرنے والے رسالے قبولیت عوام سے تو اس لئے محروم ہیں کہ اُن کے مذاق کی چیز نہیں اور طبقۂ خواص میں پسندیدگی کی نظر سے اس شرط پر دیکھے جاتے ہیں کہ ہر صاحب ذوق کو مفت مہیا کئے جایا کریں۔

الغرض جو پیسے صرف کر کے رسالہ خریدتے ہیں وہ رسالوں میں ایڈیٹرسوں کی تقدس آزما تصاویر، ہوس خیز افسانے، شباب ریز نظمیں تلاش کرتے ہیں اور جو اہل نظر ہیں وہ سوچنے کی زحمت سے آزاد ہیں کہ رسالوں کے کاغذ، کتابت، طباعت اور دفتری عملے پر جو پیسہ صرف ہوتا ہے اس کی کسر اخبارات کے ایجنٹوں کی نادہندگی نے پوری کر دی ہے۔

اردو زبان مزید ترقی کر رہی ہے مگر اردو ادب زوال پذیر ہے۔

(۷) لاہور کے ایجنٹ اخبارات نے جو اطلاع آپ کو دی ہوئی اس کا پہلا جزو تو آپ نے بیان نہیں کیا، یا شاید بھول گئے۔ دیکھیے حافظے پر زور ڈالیئے، اُس نے یہ بھی تو ضرور کہا ہوگا کہ "مولانا تاجور کا جب سے انتقال ہوا ہے اُسی وقت سے شاہکار بند ہے"۔ اُس نے یہ جزو ضرور بیان کیا ہوگا۔ کیوں کہ اخبارات کے نادہندہ اور خائن ایجنٹوں کو جب پرچہ دینا بند کر دیا جائے تو وہ مطالبہ کرنے والے خریداروں سے یہ کہنے کی توفیق کہاں سے لائیں کہ پرچہ تو جاری ہے مگر ہم نے مفت گیری کا شیوہ اختیار کر لیا ہے اس لیے ہمیں پرچہ بھیجنا بند کر دیا گیا ہے۔ اپنی خیانت مجرمانہ پر پردہ ڈالنے کے لئے اس پرچے سے وابستگی رکھنے والے خریداروں کو اس کے بند ہونے کی بشارت دیتے رہتے ہیں۔

حالات یہ ہیں کہ اس وقت "شاہکار" کے ایجنٹوں کے ذمے دفتر کا ہزار روپے سے زیادہ نکلتا ہے۔ تقاضوں کے خطوط کا جواب بھی نہیں دیتے۔ سچ تو یہ ہے کہ لٹیروں کی یہ قوم اردو صحافت اور ادب کو سب سے زیادہ پامال کر رہی ہے۔ اخبارات کے ایجنٹ دفتر سے دوری مسافت اور اس صحیح یقین کا ظالمانہ فائدہ اٹھا رہے ہیں کہ رسائل و اخبارات کے مالک ہمارے خلاف قانونی چارہ جوئی نہیں کریں گے آپ جس اخبار اور رسالے کے دفتر سے معلوم کریں گے آپ کو اخبارات کے ایجنٹوں کی بددیانتی اور نادہندی کا گلہ گزار ضرور پائیں گے۔

ان کالی بھیڑوں کے گلے میں سبھی خدا دنی اور گردن زدنی نہیں، بلکہ کچھ لوگ جن کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے ایسے دیانت دار اور خوش معاملہ بھی ہیں جو صحیح معنی میں کاروباری کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ میں کسی آئندہ فرصت میں ایجنٹ اخبارات کے متعلق اپنے "تلخ تجربات" شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، اُسے مطالعہ کر کے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ اردو ادب و صحافت کی حالت کیوں روبہ زوال ہے۔

(۸) "برائے مہربانی" صحیح نہیں۔ اس کی بجائے ازراہِ مہربانی، ازراہِ کرم، ازراہِ توجہ لکھنا چاہیئے!

(۹) آپ انشورنس کا کام کرتے ہیں، بہت اچھا کرتے ہیں، ضرور کیجئے۔ میں نے تو اپنے تجربے کے پیشِ نظر اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ آپ لوگوں کو بے وقوف بنانے کا "بزنس" کرتے ہیں۔ ہے نا یہی بات؟

آپ کے جس دوست نے اپنے لاہوری احباب کو آپ کی تقریر کا نخچۂ مشق بننے کے لیے تجویز کیا ہے، کرم فرما کر اُس فہرست میں سے میرا نام نکال دیجئے۔ اس سے پہلے ایک بیمہ کمپنی کا ایجنٹ مجھے دو مرتبہ بیوقوف بنا چکا ہے۔ میری دو پالیسیاں ضبط ہو چکی ہیں جن کا سات سو روپیہ میرے تنگ دامن بجٹ سے نکل چکا ہے۔ دنیا میں تو یہ بیمہ کمپنی والے میرا روپیہ واپس کرنے کی حامی نہیں بھرتے۔ ہاں خدا کے ہاں ان سے وصول کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔

آپ میرے کالج کے اولڈ بوائے ہیں، بہت خوب۔ تو گویا مجھ پر واقفیت کا جرمانہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی کمپنی واقعی بہت اچھی ہوگی اور اُس کا پراسپکٹس اُس سے بھی اچھا ہوگا۔ اور آپ کمپنی اور پراسپکٹس دونوں سے زیادہ قابلِ قدر ہیں۔ یقیناً کچھ والیانِ ریاست بھی آپ کے دامِ تزویر یا تقریر میں پھنس چکے ہوں گے۔ لیکن مجھ صید زبوں پر توجہ ضائع نہ فرمائیں کہ میں آپ کی منزل کا پہلے ہی زخم خوردہ ہوں۔ اور یہ کیا تحریر فرمایا آپ نے؟ کہ آپ کی بیمہ کمپنی انڈیا کی کمپنی ہے۔ یعنی میں اس سے اس وہم میں مبتلا ہو جاؤں؟ کہ انڈیا کی بیمہ کمپنیاں زیادہ خوش معاملہ ہوتی ہیں۔ میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ اس ملک کا ہر لیڈر ایک بیمہ کمپنی کا موجد بن رہا ہے۔ ہندوستان میں اتنے جاندار نہیں جتنے ملکی بیمہ کمپنیوں کے شکاری (ایجنٹ) زندگیوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔

آپ لاہور تشریف لایئے۔ میرے دفتر میں بھی زحمت جلوہ فرما سکتے ہیں۔

"دیدہ و دل فرشِ راہ"

البتہ اس التماس کو پیشِ خیال رکھیں کہ موضوعِ گفتگو "بیمہ" نہ ہو۔ کچھ اور ہو مبادا مجھے اپنا سات سو روپیہ یاد آ جائے اور میرے دل میں

آپ کے خلاف گستاخانہ جذبات رونما ہو جائیں۔

سوالات

(۱) علامہ گرامی!

A.M اور P.M انگریزی حروف وقت ظاہر کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ A.P اختصار ہے (Ant meridian) کا جس کے لغوی معنی نصف النہار سے پہلے ہوتے ہیں۔ اصطلاح میں یہ رات کے ۱۲ بجے کے بعد سے دوپہر کے ۱۲ بجے تک کا وقت ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح P.M سے مراد (Past. maridian) ہے یعنی نصف النہار کے بعد۔ یہ دوپہر کے ۱۲ بجے کے بعد سے رات کے ۱۲ بجے تک کا وقت ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی 4.P.M. لکھے تو اس کے معنی شام کے چار بجے کے ہوں گے اور 6 A.M. صبح کے چھ بجے ظاہر کرے گا۔ چنانچہ انگریزی کی ہر قسم کی تحریروں میں ان کا عام استعمال ہوتا ہے اور وقت سمجھنے میں کسی غلط فہمی کا اندیشہ نہیں رہتا۔

اردو میں انگریزی کی تقلید یا ترجمہ کرتے وقت A.M اور P.M کی بجائے "صبح اور شام" کے الفاظ شامل ہوتے ہوئے دیکھے ہیں لیکن اکثر ایسے لفظوں نے غلط فہمی پیدا کی ہے مثلاً 1.A.M. کو اردو میں ایک بجے صبح لکھا جائے تو پڑھنے والا شاید ہی "آدھی رات کے ایک بجے" سمجھے۔ فوراً اس کا دماغ دن کے ایک بجے کی طرف منتقل ہوگا۔ یا اگر کوئی 1.P.A کو ایک بجے شام لکھے تو سننے والا منہ دیکھنے لگے گا کہ عین دوپہر کے وقت شام کیسے ہو گئی۔ اور اگر وہ نئی روشنی کا تعلیم یافتہ منطقی نہ ہوا تو ممکن ہے رات کے ایک بجے سمجھ لے۔ بعض اوقات اس مشکل کو محسوس کرتے ہوئے زیادہ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں، مثلاً صبح، شام، دوپہر، رات وغیرہ، لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ ان مشکلات کا حل نہیں ہے۔ بلکہ بڑھاتا ہے۔ اگر اس انگریزی طرز کو قائم ہی رکھنا ہے تو ہمیں ویسے ہی دو مناسب الفاظ تلاش کرنے چاہئیں تاکہ ان کے اختصار کو ہم خط و کتابت اور مختلف تحریروں میں بلا تکلف استعمال کر سکیں۔

انگریزی میں A. (Ante) اور P (Post) قبل اور بعد کے معنی دیتے ہیں۔ ان کے ساتھ M (Meridian) کا ہوتا ہے۔ اس کے معنی نصف النہار کے ہوتے ہیں۔ تو کیا ہمارے لئے (Ante Meridian) کے لئے "قبل نصف النہار" اور (Past Meridian) کے لئے "بعد نصف النہار" کا استعمال اور A.M. اور P.M. کی بجائے ان کا اختصار "ق۔ ن" اور "ب۔ ن" مناسب نہیں؟ مثلاً اگر ہم 2 P.M. کو اردو میں "۲۔ ق۔ ن" اور 4P.M. کو "۴۔ ب۔ ن" لکھیں تو کیا قباحت ہے؟

اگر یہ تجویز پسند نہ ہو تو اس کے بجائے اور بہتر صورت پیش کی جائے۔ بہرحال ضرورت ہے کہ اہل علم حضرات اس طرف توجہ مبذول فرمائیں اور جلد فیصلہ کریں تاکہ وہ اصطلاح پھر ہر قسم کی تحریروں اور تراجم میں استعمال ہو سکے۔

——— نیاز آگیں ——— احسان اللہ خاں مضطر۔ صدر پانار ساگر

(۲) قادرِ مطلق صحیح ہے یا قادرِ مطلق؟ مطلِق یا مطلَق صحیح ہونے کی صورت میں سند سے بھی سرفراز کریں۔ ممنون ہوگا۔

——— نیازمند، دینا ناتھ از کرنال

(۳) خضرِ راہِ ادب حضرت علامہ تسلیم۔

میں کچھ ٹوٹی پھوٹی تک بندی کیا کرتا ہوں۔ اگرچہ میری نظمیں کئی رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ میری شاعری میں خامیاں موجود ہیں۔ آج تک بغیر کسی کی اصلاح کے خود ہی نظرثانی کر لیا کرتا ہوں۔ کیوں کہ مجھے اب تک کوئی ایسا رہنما نصیب نہیں ہوا جو فن کی خامیوں پر آگاہ کر کے مجھے منزل مقصود تک پہنچا دے۔ آج جرأت کر کے آپ کی خدمت میں چند ٹوٹے پھوٹے اشعار بھیج رہا ہوں۔ آپ جیسے ماہر فن استاد نے اگر توجہ فرمائی تو یقین ہے کہ آپ کی رہنمائی سے میں اپنی شاعری کی غلطیاں درست کر سکوں گا۔ امید ہے کہ مرسلہ نظم آپ کی اصلاح

کے بعد اس قابل ہو جائے گی کہ شاہکار کے صفحات میں جگہ حاصل کر سکے گی۔ آپ نے بہت سے نومشقوں کی اصلاح کر کے انہیں شہرت کے زینے پر پہنچا دیا ہے۔ کیا عجب ہے کہ میں بھی گمنامی کے گڑھے سے نکل سکوں۔ اگر آپ نے حوصلہ افزائی فرمائی تو آئندہ ہر مہینے شاہکار کے لئے ایک دو نظمیں بھیجا کروں گا۔

جس نمبر میں میری یہ نظم شائع ہو وہ مجھے ضرور بھجوا دیا جائے۔ اور میرے لائق جو خدمت ہو اس سے مطلع فرمایا جائے۔

——— خادم ا۔ سراج دین روشن از سرگودھا

(۴) علامہ شبلی شعر العجم میں زبان پر اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "زبان تغیر پذیر ہے۔ ساکن نہیں" اس فقرے کی تشریح کا طالب گار ہوں۔

——— پیارے لال شاکر بی۔ اے (ایم۔ بی ہائی سکول پٹھانکوٹ)

(۵) آئے دن اخبارات میں نوجوانوں کی خودکشی کے حالات شائع ہوتے رہتے ہیں۔ فاقہ کشی اور تنگدستی ہندوستان کے افق پر چھائی ہوئی ہے۔ کانگریسی وزارتیں بھی اس مصیبت عام کے ازالے سے عاجز دکھائی دیتی ہیں۔ آپ کی رائے میں اس موجودہ بدحالی کے دور کرنے کی کوئی صورت ہو تو مطلع کیجئے!

——— غلام حسین انور سہارنپور محلہ کھاسے ہاپ

جوابات

(۱) مشرقی ممالک میں غروب آفتاب سے لے کر طلوع سحر تک کے وقت پر رات کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس لئے ۸ بجے شب، ۱۲ بجے شب، ۲ بجے شب، ۴ بجے شب میں اشتباہ کی کوئی وجہ نہیں۔ البتہ دن کی تقسیم صبح۔ دوپہر اور شام سے کی جاتی ہے پھر دوپہر خصوصاً موسم گرما میں ۱۲ بجے سے ۲ بجے تک متصور ہوتا ہے۔ دوپہر کو نہ ہم صبح میں شامل کر سکتے ہیں نہ شام میں۔ اس وقت کو دور کرنے کی حسب ذیل صورتیں نکل سکتی ہیں:

(۱) دوپہر کو مستقل حیثیت دی جائے۔ اس صورت میں ۱۲ دوپہر ۱۔ دوپہر ۲ دوپہر کی تفصیل اشتباہ کو دور کر سکتی ہے۔ دوپہر کے لفظ کو مخفف کرنے کی ضرورت نہیں۔ طلوع سحر سے لے کر دوپہر سے قبل تک تمام وقت پر صبح اور دوپہر کے بعد سے غروب آفتاب کا تمام وقت پر شام کا اطلاق کیا جائے تو کوئی التباس پیدا نہ ہوگا۔ مثلاً موسم سرما و گرما کے طلوع و غروب کو پیش نظر رکھتے ہوئے ۵ ص۔ ۱۱ ص۔ ۲ ش ۴ ش۔ ۵ ش وغیرہ کی تفصیل منفعت طلب ہو سکتی ہے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ طلوع سحر سے غروب آفتاب کے وقت کو دو حصوں میں اس طرح تقسیم کر لیا جائے کہ طلوع سحر سے ۱۲ بجے تک صبح اور اس کے بعد سے غروب آفتاب تک شام متصور ہو۔ پھر ۱۲ ص اور ۱ ش کے اظہار میں اشتباہ نہ ہوگا۔

(۳) تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دن اور رات کے آٹھ پہر کو صبح صادق، چاشت، نصف النہار، سہ پہر، شام اور شب پر تقسیم کیا جائے۔ کہ یہ وقت کے مصطلحہ حصے ہیں۔ اس تقسیم میں قباحت یہ ہے کہ عام لوگ سمجھ نہ سکیں گے۔

مندرجہ بالا صورتیں اسی حالت میں غور طلب ہو سکتی ہیں کہ تہذیب جدید کے اس علاج کی پیروی ضروری سمجھ لی جائے، ورنہ صبح صادق۔ صبح، دوپہر، سہ پہر، شام، اول شب، نصف شب، آخر شب یا بجے کی تفصیل کے ساتھ ۵ بجے صبح، بارہ بجے دن، ۴ بجے شام۔ ۸ بجے، ۱۰ بجے، ۲ بجے شب تخفیف الفاظ کے بغیر لکھ دینے میں وضاحت بھی ہو جائے گی اور کاغذ یا وقت کی تضییع بھی نہ ہوگی۔

میری یہ ناچیز رائے ہے سا اہل نظر کے لئے صلائے عام ہے۔

(۲) "قادر مطلق" میں مطلق کا لفظ بہ فتحہ لام (لام کے زبر سے) صحیح ہے۔ بہ کسرۂ لام (لام کے زیر سے) غلط ہے۔

مطلق کا مادہ طلق ہے۔ اسی سے "اطلاق" مصدر آتا ہے۔ اطلاق کے معنی چھوڑ دینا۔ مُطلَق بہ فتحۂ لام اسم مفعول ہے یعنی بے قید آزاد مختار۔ ماضی مطلق۔ جس ماضی میں زمانہ گزشتہ قریب و بعید کی قید سے آزاد ہو۔ طلاق ملی ہوئی عورت کو مُطلّقہ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ

نکاح اور شوہر کی عائد شدہ پابندیوں سے آزاد کر دی جاتی ہے۔

قادرِ مطلق۔ جس کا اقتدار بے کراں، بے انتہا اور غیر محدود ہو۔ مُطلِق بہ کسرۂ لام (لام کے زیر سے) اسم فاعل ہے جس کے معنی ہیں چھوڑ دینے والا۔ سارد و میں قادرِ مطلق بہ کسرۂ لام غلط ہوگا۔ اردو نظم میں مُطلق کا نقطہ قافیے کی صورت میں نظر سے نہیں گذرا۔ اس لئے سند میں کوئی شعر پیش نہیں کیا گیا۔

(۳) آپ کی مرسلہ نظم سے مجھے یہ اندازہ ہوا ہے کہ آپ ایک شاعر بننے کی بہ نسبت ایک قانون پیشہ اور ریاضی داں بننے کی زیادہ اہلیت رکھتے ہیں لہٰذا میرا ناچیز مشورہ تو یہ ہے کہ شاعری کے کوچے سے اُلٹے پاؤں واپس ہو جائیے! ابھی کچھ نہیں بگڑا، مرض کا آغاز ہے۔ مبادا یہ درد لا دوا نہ ہو جائے۔ خود دماغ سوزی کرنے کی بجائے آپ کے لئے یہ بہتر ہوگا کہ وقت بے وقت طبیعت مچلنے لگے تو حدود خلوت میں کسی دوسر کے اشعار گنگنا لیا کیجئے! اور اگر خدانخواستہ داد لینے کا چسکا پڑ گیا ہے تو نیم سخن دوستوں کا ایسا ماحول فراہم کر لیجئے جس تک اردو رسالوں کی پہنچ ناممکن ہو۔ پھر آتی امداد نہیں کروں گا۔ اگر کیا کروں گا کہ آپ کے پرائیویٹ پتے پر "شاہکار" بھجوا دیا کروں گا اس میں جس کی غزل یا نظم آپ کی نگاہ چڑھ جایا کرے سب سے خطرے سے اپنے نام سے دوستوں کو سُنا کر ان بے داد گروں سے داد حاصل کر لیا کیجئے! ایسا کرنا اگرچہ اخلاقی جرم میں داخل ہوگا اور مجھے بھی اعانت جرم کا سزاوار بننا پڑے گا۔ لیکن اس گناہ کبیرہ کے مقابلے میں شاعر بننے کی سعی نارسا میں جتنے گناہ آپ سے سرزد ہوں گے وہ ایک پوری آبادی کو جہنم تک پہنچانے کے لئے کافی ہو سکتے ہیں۔ مگر آپ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ میری بات مانیں گے نہیں، کیونکہ شادی اور شاعری کا جنون شوقِ ناصح کی خشک نصیحت کا متحمل نہیں ہوا کرتا۔ ورنہ میں دو بیویوں کا شوہر اور تیس سال سے خارزارِ شاعری کا رہرو ہونے کی حیثیت میں اس قابل ضرور ہو گیا ہوں کہ ان دونوں پیچیدہ مسئلوں کے متعلق جس رائے کا اظہار کروں اس پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے اپنے متواتر تلخ تجربات کے پیشِ نظر میری رائے تو یہ ہے کہ شاعری اور شادی کی راہیں بے منزل اور ان کا آغاز محرومِ انجام ہے۔

شادی خدا جانے آپ نے ابھی تک کی ہے یا نہیں؟ نہ کی ہو تو خدارا نہ کیجئے! اور اگر یہ گور کے لڈو کھا چکے ہیں تو اب شاعری کی مصیبت نہ خرید بیٹھئے۔ کہ زندگی کو سزا کے زندگی بنانے کے لئے شادی کرنے کی عقلمندی ضرورت سے زیادہ ہے اور شاعری شادی شدہ زندگی کے اضطراب کو التہاب میں تبدیل کر دیتی ہے۔

میں اس راہ کا رہنما یا آپ کے بقول خضر و مضر ہرگز نہیں۔ بلکہ ایک افتادۂ راہ ہوں۔ نہ میں نے نومشقوں کو شہرت کے زینے پر پہنچا کر کوئی ایسا کارنامہ کر دکھایا ہے جس پر فخر کرنے کا مجھے حق حاصل ہو۔ راہِ ادب و شاعری میں میری رہنمائی اگر وہ اس خطاب کی مستحق ہے تو عرب شاعر کی بیان کردہ عبارتِ غراب کے مطابق ہے ؎

"ولو کان الغراب دلیل قوم   سیہدیہم طریق الہالکین"

خیال تو کیجئے اردو زبان ہندوستان میں اب چند روز کی مہمان ہے۔ دربار و سرکار سے اسے نکالے مل رہے ہیں۔ اس کے قدر شناس ایک ایک آسودۂ خاک ہو چکے۔ پھر شعر و شاعری کا صحیح ذوق اور فہم رکھنے والے بھی اکسیر کی صورت نایاب ہو گئے۔ مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ شاعر کی قبولیت دماغ کی بجائے اب گلے سے وابستہ ہو رہی ہے۔ یعنی ایک تک بند خواہ دماغی افلاس میں کتنا ہی مبتلا ہو اگر خوش گلو ہے تو میر و سودا کا ہم رتبہ خیال کیا جاتا ہے اور کوئی بلند سے بلند شاعر اگر مطربانہ خوش گلو نغمہ پیشگی سے بے بہرہ یا اس پستی کو گوارا کرنے کے ایثار سے قاصر ہے تو خواہ اس کی شاعری میں ستاروں کی موسیقی تحلیل ہو جائے ہر بزم و انجمن سے راندۂ التفات رہے گا۔ ان ناسازگار حالات میں شاعری کرنا اپنے ساتھ اس مقدس فن کو بھی ذلیل کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟

بھائی میں نے تو شاعری سے توبہ کر لی ہے۔ اگرچہ یہ کوئی کافر شناس کوچے کی ہیرا پھیری پر کبھی کبھار اب بھی مجبور کر دیتا ہے۔ لیکن اس

تفریح کو زندگی بنانے کے جرم سے تو قطعی دست بردار ہو چکا ہوں۔

"پس از سی سال ایں معنی محقق شد بہ خاقانی"

عزیزو زندگی کے تیس سال اس راہِ بے منزل کی رہ نوردی میں برباد کرنے کے بعد دیکھتا ہوں تو ماضی و حال کی طرح مستقبل کی پیشانی پر بھی بخطِ جلی آغاز ہی لکھا ہوا نظر آ رہا ہے۔

اس لئے آپ اور ہر اُس نوجوان کو جس پر اس ہلاکت زار میں قدم بڑھانے کی بدبختی سوار ہے اپنے زندگی سوز تجربات کی بلند آہنگ فریاد میں خبردار کر دینا اپنا فرض خیال کرتا ہوں کہ شاعر پیشگی پر خودکشی کو ترجیح دینا کیونکہ خودکشی کی تکلیف آنی ہے۔ مگر شاعر کا عذاب جاودانی ہے

"میری سخن گوئی کوشش حقیقت نیرش ہے"

(۴) علامہ شبلی مرحوم کا یہ ارشاد حقیقت کی تصویر ہے۔

انسان کی تغیر پذیری تو ایک بدیہی بات ہے جسمانی طور پر وہ آج بوڑھا ہے کل جوان تھا۔ اور پرسوں بچہ۔ یہ اس کا جسمانی تغیر ہے۔ پھر جب وہ بچہ تھا اُس کے خیالات طفلانہ اور معصوم تھے۔ جوان ہونے پر اُن میں رنگینی اور جذبات میں تڑپ پیدا ہو گئی۔ بوڑھا ہوا تو خیالات سے رنگینی اور جذبات سے بیقراری زائل ہو کر عادات و اطوار اور خیالات میں متانت نے راہ پائی۔ یہ انقلاب انسان کی ذہنیت کا تغیر ہے زبان چونکہ انسان کے شوقِ تجسس و تحصیل سے متعلق ہے اس لئے اُس میں بھی عمر کے نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ انسان کی طرح زبان بھی ایک ساکت حالت میں کبھی نہیں رہ سکتی، اولتی بدلتی اور بڑھتی رہتی ہے۔ ایک زبان جو اپنے ہر بولنے والے کے منہ سے ہمیں یکساں نظر آتی ہے درحقیقت مختلف شکلیں رکھتی ہے بلکہ اُس کی اتنی ہی شکلیں ہیں جتنے بولنے والے۔ اگرچہ زبان کے مفہوم کی یکسانیت ہمیں اس فرق کو محسوس نہیں ہونے دیتی۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص کی جسمانی صلاحیت اور نفسانی کیفیت میں چونکہ تفاوت ہوتا ہے اور یہی دو کیفیتیں تخلیق زبان کا ذریعہ ہیں، ہر انسان کی جسمانی حالت اور جسمانی کیفیت عموماً مختلف اثرات کے ماتحت بدلتی رہتی ہے اس کا اثر لازمی طور پر زبان کے حصول و صدور پر بھی پڑا کرتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ انسان کی کیفیات جسمانی و نفسیاتی کے تغیر کے ساتھ ساتھ زبان میں بھی تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ بنا بریں یہ کہنا زبان ساکن نہیں تغیر پذیر ہے بالکل درست اور راست ہے۔

(۵) میرے خیال میں نوجوانوں میں خودکشی کی وبا جو پھیل رہی ہے۔ اس کی اصلی وجہ عام حالات میں ایسی فاقہ کشی اور تنگدستی نہیں کہ وہ زندگی کو قائم رکھنے سے عاجز ہو چکے ہیں۔ بلکہ بے کاری اور بے روزگاری اس کا اصلی سبب ہے۔ وہ اپنی طاقتِ عمل کے اظہار کا موقعہ نہیں پاتے۔ جس ذکاوت اُنہیں بے مشغلہ اور بے کار بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتی وہ اپنے جوہرِ ذاتی کی قدر شناسی سے محروم ہیں۔ اس لئے اپنی جامد زندگی سے تنگ آ چکے ہیں۔ جب تنگیٔ وسائل و کاراں کی فطری جولانیوں کے ظہور و طلوع کے تمام راستے روک دیتی ہے تو ضبط و استقلال کے فقدان کے باعث اِن کی قوتِ فیصلہ تباہ ہو کر اُن پر حیرت و یاس طاری کر دیتی ہے اور وہ زندگی ہی کو آلام زندگی کا سبب گردان کر اسے ختم کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں

ہمہ گیر فاقہ کشی عالمگیر بیکاری کے سبب ہے۔ ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ طبقے میں تو اس عام بدحالی بلکہ پامالی کا ذمہ دار زیادہ تر ہمارا نظامِ تعلیم ہے اور غیر تعلیم یافتہ طبقات میں "مشینری سسٹم" اس تباہ کن بے روزگاری کا سبب ہے۔

ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم انتہا درجے ناقص اور ضرر رساں ہے۔ کسانوں اور پیشہ وروں کی اولاد موجودہ تعلیم حاصل کر کے اپنے آبائی پیشوں سے متنفر اور اپنے خاندانی پیشوں کو ترقی دینے کی بجائے دفتری بابو بننے کی سعی ناکام میں سرگرداں رہتی ہے۔ موجودہ تعلیم انہیں گھر اور گھاٹ کہیں کا بھی نہیں چھوڑتی۔ اس تعلیم نے کسانوں اور دستکاروں کی اولاد کو دفتری کلرک بنا کر دروازوں پر قفل لگا دیا ہے لاکھوں تعلیم یافتہ نوجوان اپنے آبائی پیشوں سے بیگانہ ہو کر نوکری کے عنقائے بلند آشیاں کی تلاش میں دربدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔

وہ تعلیم نہ پاتے تو والدین کا روپیہ، اپنا وقت اور دماغ بچا کر اپنے خاندانی پیشوں میں لگ جاتے اور اس طرح ملک کی صنعت و حرفت اور زراعت تباہی سے بچ جاتی۔ نوجوانوں کے لئے کام اور رزق مہیا ہوتا ملک کے لئے یہ دولت بنتے۔

اس مصیبت عام کا ازالہ اس فرسودہ اور ناکارہ رفتہ تعلیمی نظام میں بنیادی انقلاب کے بغیر نہیں ہو سکتا اور افسوس ہے کہ اس سبب سے اہم ضرورت کو آج تک قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا۔

ان پڑھ طبقوں میں عام بیکاری مشینری نظام کی کثرت اور وسعت کے سبب پھیل رہی ہے۔ مشینوں نے ساری دنیا کے مزدوروں کو معاشرت کی بے ضرورت چیز بنا دیا ہے۔ جس مقدار کی انجام دہی کے لئے دو سو مزدوروں کی محنت درکار ہوتی اسے دو چار مشینیں دو پانچ مزدوروں کی مدد سے کم وقت میں سرانجام دے لیتی ہیں باقی ۱۹۰ مزدور بے کار اور بے روزگار ہو جاتا ہے پھر چونکہ عام بے روزگاری کے سبب لوگوں میں طاقت خرید بھی نہیں رہی ہے۔ اس لئے مشینری کا تیار کیا ہوا کام بازار میں خریدار کی تلاش میں پڑا رہتا ہے۔ اس پر انی غلامانہ بے بسی کے ملک کی درآمد برآمد پر غیر ملکی آقاؤں کا اقتدار مسلط ہے۔ ہندوستان کا تمام خام مال غیر ممالک میں کوڑیوں کے مول بھیجی جا رہی ہیں اور پھر ہمیں اجناس کو مختلف غیر ملکی صنعتوں کی صورت میں اشرفیوں کی تول ہمیں خریدنا پڑ رہا ہے۔

آخر اس سے زیادہ ہماری بے بسی کیا ہو گی کہ ہندوستان کے اڑھائی ساڑھے سات لاکھ دیہات کے کروڑوں دودھ دینے والے مویشیوں کی موجودگی میں ہر سال لاکھوں من بناسپتی گھی ہندوستان کی صحت عامہ کے بیچ ... عام ہو رہا ہے اور ہم اس مصیبت کے روکنے سے قاصر ہیں اپنے غلامی وائے غلامی۔ ہمارے ملک سے مشینری نظام غارت ہو جائے غیر ملکی اشیاء کی درآمد پر ہمیں اختیار میسر آئے تو دس کروڑ ہندوستانیوں کی ضروریات زندگی کی بہم رسانی ملک کے بے شمار بے کار مردوں کو روزگار اور روزی مہیا کر سکتی ہے۔

یہ خواب شیریں شرمندۂ تعبیر ہو جائے تو فاقہ کشوں کا یہ برّاعظم پھر ہندوستان جنت نشان کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔

سوالات

(۱) بعض مستند انشاپردازوں کی تحریروں میں "اولیایانِ شہر" کی ترکیب استعمال ہوتی ہے۔ کیا آپ کے خیال میں یہ ترکیب صحیح ہوتی ہے؟ اسی طرح بعض مضمون نگار کسی فرد واحد کے لئے "اہلِ قلم" "اہلِ علم" کی صفات بیان کرتے ہیں آپ کی رائے میں یہ درست استعمال ہے؟

—— پورن سنگھ ایڈیٹر رسالہ جیون وفلم سیٹج امرتسر

(۲) حسب ذیل الفاظ کی تذکیر و تانیث مشتبہ ہو رہی ہے۔ رہنمائی فرما کر ممنون فرمایئے۔

طرز۔ فکر۔ سانس۔ بلبل۔ نقاب۔ ایجاد۔ مینا۔ موٹر

—— ضیاء درّانی۔ ڈی ہائی سکول سری گوبند پور

(۳) ذیل کے الفاظ بصورت جمع صحیح ہیں یا غلط؟

عمائدین۔ حوادث۔ کوٹھیات۔ کھنڈرات۔ تنوع جات۔ باغات

اور اگر درست ہیں تو انہیں مرکبات اضافی یا توصیفی بنایا جا سکتا ہے یا نہیں؟

—— پیارے لال شاکر بی۔اے، ڈی بی ہائی اسکول سیالکوٹ

(۴) اہلِ شوق کی بجائے لفظ شائقین کا استعمال درست ہے کہ نہیں؟

—— ڈی کے مقبل ایم۔اے پروفیسر ایم۔او کالج امرتسر

(۵) کیا ہندوستان میں کسی جگہ خاوند عورت کو بی بی کہہ کر بھی پکارتا ہے؟ —— سردار جسونت سنگھ راٹھور نائب مدرس لوئر مڈل اسکول کالیوال

(۴) مولینا احسن مارہروی کی ایک نظم "ہندو مسلم سے خطاب" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اُس نظم میں ذیل کا شعر بھی ہے

ہم اوراقِ پریشاں بن کے کب تک منتشر ہوں گے ۔۔۔ چلیں گی آندھیاں بغض و حسد کی ہند میں کب تک

اس نظم کا قافیہ خبر، نظر، بشر ہے۔

سوال یہ ہے کہ لفظ منتشر بہ فتحۂ شین معجمہ درست ہے؟ یہاں چند استادوں میں یہ شعر مابہ النزاع بن رہا ہے۔

—— سادھو رام شاد بی۔اے ہندو مسلم ہائی اسکول ہریانہ

جوابات

(۱) "اہالیانِ شہر" کی بجائے اہالیٔ شہر صحیح ہوگا۔ اور اہلِ شہر فصیح۔ اہل کی جمع اہالی ہے "اہالیان" نہیں۔

فردِ واحد کے لئے اہلِ قلم، اہلِ علم یا اہلِ ذوق استعمال کرنا صحیح نہیں، اس کی بجائے صاحبِ قلم، صاحبِ علم، صاحبِ ذوق صحیح ہوگا۔ آپ کہیں گے بیوی کو اہلِ خانہ کہتے ہیں اور وہ فردِ واحد ہے۔ میری رائے میں یہ لفظ اُن لوگوں کی ایجاد ہے جو تعددِ ازدواج کے قائل تھے۔ ان کے گھر میں کئی بیویاں ہوتی ہوں گی۔ انہوں نے بیویوں کے لئے اہلِ خانہ کا لفظ تراش لیا۔ پھر کثرتِ استعمال سے ایک بیوی کے لئے بھی بولا جانے لگا۔ واللہ اعلم۔

(۲) طرز، فکر، بلبل، لعاب

مذکورہ بالا الفاظ کو بعض اساتذہ نے مذکر باندھا ہے لیکن جمہور اہلِ زبان انہیں مؤنث ہی باندھتے ہیں۔

طرز: ؎ یہ بھی طرزِ خرام ہوتی ہے
ایک خلقت تمام ہوتی ہے ۔۔۔ داغ دہلوی

بلبل: بلبل کی جمع بلبلیں آتی ہے اور یہ جمع مؤنث ہے ؏
"بلبلیں اڑ جائیں گی سونا چمن رہ جائے گا"

اڑی خزاں میں یہ کہکر چمن سے بلبلِ زار ۔۔۔ کہ جی بچیں گے تو اگلی بہار دیکھیں گے ۔۔۔ تاجور

فکر: فکر کی تانیث ہی صحیح و فصیح قرار دی جائے گی۔ اگرچہ دہلی میں فکر کی تذکیر عام طور پر رائج ہے۔ لیکن محتاط شعراء و ادباء آج کل فکر کو مؤنث ہی لکھتے ہیں۔ ذوق مرحوم نے بھی فکر کو مؤنث ہی باندھا ہے۔

لعاب: اس لفظ کو میر انشاء نے مذکر باندھا ہے۔ اور بھی کچھ اساتذہ انشاء کے ہمراہی ہیں۔ باقی تمام مستند اہلِ قلم اسے مؤنث تسلیم کرتے ہیں۔ اور اب تو اس کی تانیث مسلمۂ جمہور کی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔ لیکن اگر کوئی ان الفاظ کو مذکر لکھنے پہ اصرار کرے تو اُسے غلط نگار نہیں کہہ سکتے۔

سانس: یہ لفظ دہلی میں مذکر اور لکھنؤ میں مونث بولا جاتا ہے۔ دہلی میں محاورہ ہے۔ سانس پھول گیا، سانس اکھڑ گیا وغیرہ لکھنوی حضرات متفقہ طور پر سانس کو مؤنث بولتے ہیں ؎

سانس دیکھی تنِ بسمل میں جو آتے جاتے ۔۔۔ اور چرکا دیا جلاد نے جاتے جاتے

ایجاد: مولانا آزاد دہلوی نے کرنل ہال رائڈ ڈائرکٹر محکمہ تعلیم پنجاب کے سامنے ایجاد کی تذکیر پہ بطور سند سودا کا حسب ذیل شعر پڑھا تھا۔ ؎

ہائے کس بھڑوے کا یہ ایجاد ہے ۔۔۔ نسخے میں معجونِ زر اِنہاد ہے

لیکن اب لفظ ایجاد کو عام فصحا مؤنث ہی تسلیم کرتے ہیں۔ اور میری رائے میں ایجاد کی تذکیر اب صحیح ہو یا نہ ہو، غیر فصیح ضرور ہو گئی ہے۔

مینا، شراب کی صراحی کے معنی میں مذکر ہے ؎

مینا ترے سر ٹیک رہے ہیں ساغر ترے منہ کو تک رہے ہیں — منیر شکوہ آبادی

اقبال نے مینا کو مؤنث باندھا ہے۔ مینا کی تانیث صحیح نہیں۔

موٹر، مغربی تہذیب کے ساتھ جو جدید الفاظ آئے ہیں۔ ان کی تذکیر و تانیث کے لئے دلی، لکھنؤ کے فصحا کی پیروی ہمارے لئے ضروری نہیں۔ ان الفاظ کا مستند مرکز لاہور بھی ہے۔ موٹر تمام پنجاب میں مؤنث ہی بولی جاتی ہے۔ اس کی جمع بھی اردو کی جمع مؤنث سالم کے انداز پہ "موٹریں" بنائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے ایک نظم میں موٹر کو مذکر باندھا ہے ؎

"موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش"

یہ استعمال شاذ قرار دیا جائے گا اور "الشاذ کالعدوم" کی زد میں آجائے گا۔

(ب) عمود کی جمع عمائد اور جمع الجمع عمائدین۔ جیسے رکن کی جمع ارکان اور جمع الجمع اراکین۔ اس لئے عمائد ملک صحیح بھی ہے اور فصیح بھی اور عمائدین صحیح ضرور ہے فصیح ہونے میں کلام ہے۔

حوادثات۔ حادثہ واحد۔ اس کی جمع تکسیر حوادث اور جمع سالم حادثات۔ پھر حوادث کی جمع الجمع حوادثات۔ جیسے نادر کی جمع تکسیر نوادر اور نوادر کی جمع الجمع نوادرات۔ یہ استعمال صحیح بھی ہے اور فصیح بھی۔

باغات، باغات ہندی جمع ہے اور درست ہے اس کی فارسی اضافت و توصیف جائز نہ ہوگی۔ یعنی بہار باغات یا باغات شہر کی تراکیب ناجائز قرار دی جائیں گی۔

کوٹھیات، گھنڈرات، نمونہ جات اردو کی پرانی گرامر کی رو سے صحیح نہ ہوں۔ لیکن اب توسیع زبان کے سبب وہ گرامر از کار رفتہ بن چکی ہے۔ ریاستوں میں افسران کے عہدے اس قسم کے ہوتے ہیں۔ منصرم کوٹھیات، ناظم محکمہ جات، افسر جنگلات، محکمہ ٹھیکہ جات محتاط اہلِ قلم ایسی تراکیب سے اجتناب کرتے ہیں۔ لیکن یہ احتیاط حد افراط تک پہنچ گئی ہے۔ آخر ان محکموں کے لئے اور کون سے الفاظ استعمال کئے جائیں!

کوٹھیوں کے منصرم، جنگلوں کے افسر، محکموں کے ناظم، کے الفاظ تو طویل بھی ہیں۔ کاروباری طرح کے بھی نہیں ہیں۔ کھنڈرات بھی بالکل جائز اور فصیح ہے۔ مستند اہل قلم کے مضامین نظم و نثر میں بے تکلف یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

مختصر یہ کہ یہ الفاظ بصورت جمع صحیح ہیں۔ البتہ ان کی فارسی تراکیب صحیح نہ ہوں گی۔ اس عدمِ صحت کی حدود سے نظام حکومت کے محکمے مستثنیٰ ہوں گے۔ کہ وہ علم کی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں۔

(۴) اہلِ شوق کی بجائے شائقین کا لفظ لغتہً تو درست نہیں کیونکہ شائق عربی لغت میں مشتاق یا صاحب شوق کے معنی میں نہیں آتا۔ بلکہ لفظ شوق سے جو افعال مشتق ہوتے ہیں متعدی ہوتے ہیں۔ شوق باب نَصَرَ یَنصُرُ سے متعدی آتا ہے۔

"شاقَ یَشُوقُ شوقاً بہوست اِلیٰ" "ولا شاقنی من سائقی لوصالہ"

(مقامات حریری (مقامہ اول)

مختصر یہ کہ شائق کے معنی ہیں شوق دلانے والا۔ مشتاق کے معنی میں شائق کا استعمال لغتہً صحیح نہیں۔ لیکن فارسی میں چونکہ شائق کو بعض شعراء نے مشتاق کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اس لئے اردو بولنے والے اسے مشتاق کے لفظ کا قائم مقام بنا سکتے

ہیں، اور اس کی فارسی ترکیب ... انی و توصیفی بھی صحیح قرار دی جائیں گی۔

دوسرے یہ کہ اردو میں ... ان عموماً مشتاق کا ہم معنی تصور کیا جاتا ہے۔ اہل قلم نے اسے مشتاق ہی کے معنی میں بہت استعمال کیا ہے۔ اس سے اگر یہ غلط ... خیال بھی تھا تو غلط العام ہونے سے صحیح ہوگیا۔ واللہ تعالےٰ اعلم بالصواب۔

(۵) مجھے علم نہیں۔ بیوی کن معنوں میں استعمال ہوتا ہے، منکوحہ، گھر کی مالک، صاحب عزت عورت، دوست۔

اسی طرح میاں کا لفظ ... معنی رکھتا ہے۔ خاوند، گھر کا سردار، دوست یعنی صاحب، عورتیں کسی مرحوم مرد کا ذکر کرتے ہوئے کہا کرتی ہیں "خدا اسے ... کا میاں بنائے" یہاں میاں مالک اور سردار کے معنی میں استعمال ہوا ہے "میاں کہاں جاتے ہو سنو تو سہی" یہاں میاں ... صاحب آپ کی جگہ بولا گیا ہے۔

بی بی، منکوحہ کی جگہ ... نہیں۔ بی بی گھر کی سردار، مالکہ، بیگم یا صاحب عزت خاتون کے معنی میں استعمال ہوا کرتا ہے۔ لڑکیوں کے نام بی بی، رحمت بی بی، ... بی بی وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ بی بی منکوحہ کے معنی میں بولنا صحیح نہیں۔ خاوند بھی اپنی بیوی کو گھر کی سردار ... عورت خاتون کے معنی میں بی بی کہہ سکتا ہے۔

(۶) منتشر باب انفعال ... لازم ہے متعدی نہیں۔ انتشار سے مفعول کا صیغہ نہیں بنایا جا سکتا۔ اس لئے منتشر بروزن منتزہ مختصر صحیح نہیں۔ بلکہ منتشر ... بروزن منتظر (بمعنی انتظار کنندہ) صحیح ہے۔ مولینا احسن ایک باخبر استاد ہیں اس لفظ کا غیر صحیح استعمال ان کی ... لاعلمی نہیں بلکہ "بے پروائی یا بے خیالی" سے یہ فروگذاشت ہوئی ہے۔

سوالات

(۱) غالبؔ، مومنؔ اور ذوقؔ ... ہمعصر تھے۔ ان کے کلام پر موازنہ کرتے ہوئے ان کی امتیازی خصوصیات پر روشنی ڈال کر ممنون فرمایئے تذکرہ گل رعنا کے مصنف مولانا ... حکیم عبدالحی صاحب نے غالب پر مومن کو فوقیت دی ہے۔ دوسری جانب ڈاکٹر سید محی الدین زور قادری پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی نے اپنی ... تصنیف اصول تنقید میں ذوق کو غالب کا ہم پایہ ٹھہرایا ہے۔ ان ترجیحات کے متعلق اپنی غیر جانبدارانہ رائے کا اظہار فرمایئے!

—— سادھو رام شادؔ بی۔ اے (ہندو مسلم ہائی اسکول ہریانہ)

(۲) مہاتما گاندھی آج کل ہندی کے پرچار پر تمام وقت اور طاقت صرف کر رہے ہیں اور اردو کو صوبجاتی زبانوں میں شمار کرتے ہیں۔ اُن کا ارشاد ہے کہ صوبجاتی زبانیں صوبوں میں برقرار رکھی جائیں اور ہندی کو لینگوا فرینکا بنا دیا جائے آپ اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟

—— ایس۔ اے۔ ملک ایم۔ اے۔ بی ٹی

(۳) حضرت اصغرؔ گونڈوی کے کلام پر مختلف پرچوں میں لے دے ہو رہی ہے آپ بھی ملاحظہ فرماتے ہوں گے۔ ادھر رشید احمد صدیقی صاحب نے ایک رسالے کے سالنامے میں اُن کی تعریفوں کے پُل باندھ رکھے ہیں۔ میرا ناقص خیال یہ ہے کہ اس معاملے میں افراط و تفریط سے کام لیا جا رہا ہے۔ آپ اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کر کے رہنمائی فرمائیں۔

—— پورن سنگھ ہنرؔ انوری ادیب فاضل ایڈیٹر رسالہ چمن

(۴) آپ اردو رسالوں پر وقتاً فوقتاً شاعرات کا اردو کلام پڑھا کرتے ہوں گے مَیں یہ دیکھتی ہوں کہ ان میں اکثر کا کلام بالکل ایک جیسا ہے، مقررہ ترکیبیں، خیالات میں یک رنگی، انداز ادا میں مطلق کوئی امتیاز نہیں۔ مجھے تو شبہ ہوتا ہے کہ ان میں سے کئی خاتونوں کا کلام کسی ایک ہی کا لکھا ہوتا ہے۔ کیا اس پر آپ روشنی ڈال سکتے ہیں؟

—— حمیدہ سلطان کوئن میری کالج لاہور

(۵) آپکے معزز رسالے "شاہکار" میں پے کس استادوں کی حمایت کے متعلق پُرزور مضامین پڑھ پڑھ کر میری طرح تمام اس رسالہ کے لیے دعا کرتے ہیں کہ "اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ" یقین جانیئے کہ "شاہکار" کے ہر نمبر کا انتظار تعلیمی حلقوں میں بڑی بے تابی سے کیا جاتا ہے۔ حاشا کہ یہ خوشامد نہیں حقیقت ہے۔ پرائیویٹ اسکولوں میں زندگی بسر کرنے والے استادوں کی حالت زار پر بھی کبھی محکمے کی توجہ دلایئے۔ ان بیکسوں کی مجبوریوں سے بے جا فائدہ اٹھانے والے پرائیویٹ اداروں کے منیجروں کی زیادتیاں حد سے گزر چکی ہیں۔ خدارا کبھی ان کی بپتا بھی خود سُن کر محکمے کے افسران بالا کے گوش گزار کیجئے!

—— غلام حسین ایس۔ وی ورنیکلر ٹیچر مقام ضلع گورداسپور

جوابات

(۱) بات یہ ہے کہ موازنہ ہوا کرتا ہے ہم رتبہ معاصرین میں۔ اس لئے میں ذوقؔ کا نام غالبؔ اور مومنؔ کے ناموں کے ساتھ ملانا جائز نہیں سمجھتا۔ ذوقؔ کے کلام میں اس درجہ ابتذال ہے کہ کوئی صاحبِ ذوق ... پھر پری لئے بغیر اسے مسلسل نہیں پڑھ سکتا۔

ابتذال اور حشو و زوائد کی کثرت، اندازِ بیان کی پستی، خیالات کی نارسائی، جذبات کے افلاس، صنایع و بدایع بلکہ ضلع جگت کی بھرمار نے ذوقؔ کو غالبؔ و مومنؔ سے ایک طویل مسافت پر چھوڑ دیا ہے۔

حکیم مومنؔ خاں اگرچہ علم و فضل میں غالبؔ اور ذوقؔ دونوں سے بمدارج بلند ہے۔ اس نے شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے تکمیل علوم و فنون کی ہے۔ طب، ہیأت، رمل و جفر کے فنون میں بھی ید طولیٰ رکھتا ہے۔ مگر شاعری میں مرزا غالبؔ کو نہیں پہنچا۔ البتہ اپنے باقی معاصرین سے اس میدان میں بازی لے گیا ہے۔ صاحبِ طرز شاعر ہے۔ متین شوخی، شوخ اندازِ بیان، اونچے درجے کی معاملہ بندی، وارداتِ عشق کی صحیح ترجمانی، جذباتِ محبت کی دلکش مصوری۔

یہ ہیں مومنؔ کے کلام کی خصوصیات۔ مرزا غالبؔ کا رنگِ شاعری سب سے جدا، سب سے بلند، سب سے مؤثر اور آج بھی کہ شاعر کو دنیا چھوڑے ہوئے نصف صدی گزر چکی ہے اور سرزمینِ شعر آسمان سے باتیں کرتی نظر آتی ہے۔ غالبؔ کے حدودِ شاعری کو کوئی عبور نہیں کر سکا۔

اُس کے کلام کی ہر خصوصیت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ اُس کے حریف کے لئے شاعری کے ماضی و حال کی وسعتیں تنگ ہیں۔ وہ کبرسنی کے کٹھن منازل طے کرتے ہوئے بھی اظہارِ جذبات میں نوجوان معلوم ہوتا ہے۔ ایسے شہنشاہانہ انداز میں اظہارِ خیال کرتا ہے کہ ہر کس و ناکس کا فہم اُن خیالات تک نارسائی کا گلہ گزار رہے۔ ایسے دقیق، عمیق اور شیریں خیالات اپنے دماغ سے اختراع کرتا ہے کہ اُسے خلاق المعانی کہنا کسی صورت بیجا نہیں۔

یہ ہے میری ناچیز رائے غالبؔ مومنؔ اور ذوقؔ کی شاعری کے متعلق۔ باقی غالبؔ پر مومنؔ کو ترجیح کے متعلق میں مصنف "گل رعنا" کا ہمنوا نہیں ہوں۔ میرے نزدیک مومنؔ کے کلام کی تمام دلکش خصوصیات بمقدار نمونہ مرزا غالبؔ کے کلام میں موجود ہیں۔ مگر غالبؔ اپنی مخصوص شاعرانہ اداؤں میں اپنا حریف نہیں رکھتا۔ ڈاکٹر سید محی الدین زورؔ قادری کا یہ ارشاد کہ "ذوقؔ کا منتخب کلام غالبؔ کے منتخب کلام سے کسی طرح کم نہیں"۔ اس کے متعلق ڈاکٹر صاحب کی رائے کا احترام کرتے ہوئے صرف یہی عرض کر سکتا ہوں کہ "نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی"۔ میری نگاہ میں تو ذوقؔ کے منتخب اشعار غالبؔ کے عام اشعار کے مقابلے میں بھی پیش کئے جانے کے قابل نہیں۔ سچ پوچھیئے تو ذوقؔ کی یہ بڑی بدنصیبی تھی کہ وہ غالبؔ اور مومنؔ کا ہم عہد ہے۔

(۲) مہاتما گاندھی ہندی کے پرچار پر وقت صرف کر رہے ہیں۔ تو کیا گناہ کر رہے ہیں؟ آخر ہندی کوئی بیرونی زبان تو ہے نہیں

بلکہ جہاں تک بول چال کا تعلق ہے میں اردو ہندی کو دو زبانیں خیال ہی نہیں کرتا۔ البتہ رسم الخط دونوں کا جدا ہے تو ہندی رسم الخط کی ترویج بھی کوئی پاپ نہیں۔ ہاں یہ نیکی بدی میں اُس وقت تبدیل ہو جاتی ہے جب اردو کی وسعتوں کو سمیٹ کر ہندی کو دولت، طاقت اور سیاسی اقتدار کے زیر سایہ مخالفانہ قبضہ دلانے کی سعی کی جائے۔ مہاتما گاندھی کوئی بعض مسلمانوں کی طرح نراٹ، شاطر اور ہندو سبھائی ذہنیت کا لیڈر ہرگز خیال نہیں کرتا۔ وہ اگر اردو کی ہندوستان گیری کے خلاف سرگرم عمل نظر آتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف کوئی کام کر رہے ہیں نہیں میرے خیال میں وہ ایسا کبھی نہیں کریں گے۔

بات یہ ہے کہ مہاتما جی کا ماحول بالکل ہندیانہ ہے۔ اُس کے کسی گوشے سے بھی کوئی آواز اردو کی حمایت میں نہیں اٹھتی۔ خود اردو جانتے نہیں، اس لئے اُس کی فطری کشش کا صحیح اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ اُنہیں ہر طرف سے یہی بتایا جاتا ہے کہ اردو کا رسم الخط مشکل ہے اور اس رسم الخط کی باقی تمام خوبیوں کی جانب سے اُن کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی ہے۔ اس لئے وہ بے ارادہ اردو کے خلاف تعصب کا شکار ہو رہے ہیں۔ جب علی برادران اُن کی شش جہت بنے ہوئے تھے تو مہاتما جی اُنہی کی آنکھ سے اردو کی دلکش تصویر دیکھا کرتے تھے۔ آج بابو راجندر پرشاد، راجہ کالیکر ہیں۔ تو اُن کی عینک سے ہندی کو نیاز پرستاری پیش کر رہے ہیں۔ اس میں نہ خرتانیث کو دخل ہے نہ تعصب کو۔

اُردو کو صوبجاتی زبانوں میں داخل کرنا مہاتما جی کی بے خبری پر دال ہے۔ بدنیتی پر نہیں۔ انصاف یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان اور ہندوستان ہی پر کیا منحصر ہے۔ افغانستان، عدن، حجاز، مصر اور جہاں جہاں ہندوستان کی فلاکت پہنچ چکی ہے وہاں وہاں ہندوستانیوں کی زبان اردو ہی ہے۔ وہاں رسم الخط بھی دیوناگری نہیں، اردو کا مروجہ رسم الخط ہے۔ صوبجاتی زبانیں دراصل یہ ہیں، گجراتی، مرہٹی، بنگالی، پنجابی، کشمیری، کناری، پشتو، تامل، تیلگو، سندھی وغیرہ۔

پشتو ہندوستان کے کسی صوبے میں نہیں سمجھی جاتی نہ بولی جاتی ہے۔ یہی حال مذکورہ بالا صوبجاتی زبانوں کا بھی ہے۔ لیکن اردو ملک کے ہر صوبے میں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ باقی سادہ ہندی دراصل سادہ اردو ہے۔ دونوں میں فرق ہی نہیں سا۔ اردو کا رسم الخط ہمارے ہمسایہ ملکوں کے رسم الخط سے ملتا ہے۔ آزاد ہندوستان کو یہ رسم الخط ان ممالک سے روابط اتحاد رکھنے میں بہت مدد دے گا۔ پھر اس رسم الخط میں مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ) کو الگ ایک فن بنانے کی ضرورت نہیں مختصر نویسی کی تمام خصوصیات رکھتا ہے۔ یہ رسم الخط ہندوستان کی لیلگو افرنیکا کے لئے زیادہ موزوں اور مفید ہوگا۔

(۳) مولینا اصغر گونڈوی ایک بلند شاعر اور اُس سے بلند تر ادیب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک خانوادۂ تصوف میں بیعت ہیں اس لئے تصوف کے مذاق سے بھی شاد کام ہیں۔ قدرتاً اُن کے شاعرانہ خیالات مجازی کی بہ نسبت حقیقت سرائی کی جانب زیادہ مائل ہیں۔ مگر اُن کا اندازِ نگارش اس کیف سرمدی کو شاعرانہ پیرایے میں ادا کرتا ہے۔ اس لئے اُن کی شاعری متصوفانہ خیالات کی حامل ہونے کے جرم میں ناگفتنی قرار نہیں دی جا سکتی۔ اُن کی شاعرانہ شہرت ہندوستان گیری حاصل کر چکی ہے جو نقاد اُنہیں ایک شاعر کی حیثیت سے گردن زدنی تجویز کرتے ہیں حق پر نہیں ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ بھی جو اُن کے پیکر کو غالب، انیس، میر، مومن گویا پوری ایک جماعت کا مرکب اور نمائندہ ثابت کرنے کی جدوجہد میں منہمک ہیں۔ سعی لاحاصل میں وقت ضائع کر رہے ہیں۔

اصغر ایک شاعر ہے بہت اچھا شاعر، ایک ادیب ہے بلند رتبہ ادیب۔ اپنا نمائندہ آپ ہے کسی کی نمائندگی نہیں کرتا۔ بس یہ فخر اُس کے لئے کافی ہے۔ اُس کی بدنصیبی اُس کے دیوان "نشاطِ روح" کے مقدمے سے شروع ہوتی ہے۔ مقدمہ نگاروں نے اُس کی شاعری کو اردو کے چند سر برآوردہ مرحوم و موجود سحر طرازوں کے شاعرانہ محاسن کا جلوہ زار تسلیم کرانے پر زور دیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مشہور مقدمہ نگار مولوی عبدالحق کو چھوڑ کر کہ وہ اس ذمہ داری کو پورے احساس کے ساتھ ادا کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ عموماً مقدمہ نگار جس کتاب یا دیوان پر مقدمہ لکھتے ہیں، صاحب کتاب کو انسان سے خدا بنانے کے خبط میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے میری رائے تو یہ ہے کہ خدا کسی شاعر یا مصنف کو سمجھ دے تو وہ اپنی جگر کاویوں کو مقدمہ بازوں کے

حوالے ہر گز نہ کرے۔ کہ یہ نادان دوست اُسے فرشتہ بنا کر انسانوں میں زندگی بسر کرنے کے حق سے بھی محروم کر دیتے ہیں۔
(۴) آپ شاعرات کا ذکر کرتی ہیں۔ میں بہت سے جدید النسل نوجوانوں کی شاعری کو بھی اسی ایک رنگ میں شرابور دیکھ رہا ہوں۔ اُن کا
کلام کسی ایک ہی دماغ کا رہینِ منت معلوم ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ملک میں ایک ایسا ادارہ قائم ہے جو اشتہارات کے ذریعے مدت سے
یہ اعلان کر رہا ہے کہ:
"آپ مصنف کیوں نہیں بنتے؟ شاعری کی شہرت سے کیوں محروم ہیں۔ جب کہ ہمارا ادارہ آپ کو آپ کے نام سے ڈرامے،
ناول، افسانے بلکہ ہر مضمون پر کتابیں لکھ کر دے سکتا ہے۔ بلکہ غزلیات، نظمیں، مثنویاں آپ کے لئے مہیا کر سکتا
ہے اس سلسلے میں آپ کی خط و کتابت بسلسلۂ راز محفوظ رکھی جائے گی۔ وغیرہ وغیرہ"
اس ادارے کو مقررہ قیمت بھیج دیجئے۔ آپ کو گھر بیٹھے ہر قسم کے مضامین نظم و نثر آپ کے نام سے لکھ کر مہیا کر دے گا۔ اس ادارے
سے جو لوگ وابستہ ہیں اور اُن کی تعداد محدود نہیں ہے سب کا رنگ قدرتاً ایک ہی قسم کی خصوصیات کا حامل نظر آتا ہے۔
باقی رہا اس ادارے کا قیام، تاریخ نظم و نثر کے لئے جائز ہے یا ناجائز۔ یہ امر جدا ہے۔ میرے خیال میں تاریخ ادب اس تجارت کو
جائز قرار نہ دے گی۔ لیکن اس ادارے کے بانی کے معاشی حالات ممکن ہے اس حرام کو حلال بنا رہے ہوں۔ یہ بھی ملک کی ایک بدنصیبی ہے
کہ آج اچھے سے اچھے اردو شاعر اور مصنف کے لئے جو اپنا ذریعۂ معاش کچھ اور نہ رکھتا ہو، جرم شاعری و انشاء پردازی کی سزا کے طور پر
فاقہ کشی کی مصیبت نوشتۂ تقدیر بن جاتی ہے۔
اس ادارے کا بانی ایک قابلِ قدر ادیب اور شاعر ہے۔ لیکن اپنی گراں بار معاشی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لئے اس کے پاس اور کوئی
ذریعہ نہیں۔ یقیناً وہ اس سخن فروشی کو ضمیر کے خلاف اور تاریخ ادب سے ایک خیانت تصور کرتا ہوگا۔ مگر یہ احساس اُس کی ضروریاتِ زندگی کو
پورا نہیں کر سکتا۔ اس لئے غالباً یہ گناہ اس کے لئے گناہ نہیں رہا ہوگا۔ البتہ اُس کے خریداروں کے لئے یہ سودا باعثِ عزت قرار نہیں دیا جا سکتا۔
(۵) آپ نے مئی کے "شاہکار" میں پڑھا ہوگا کہ میں نے "تمہاری گردن چھوٹی ہے" کے عنوان سے ماسٹر امر ناتھ بی۔ اے گورداسپوری
سے متعلق "مختصرات" میں ایک نوٹ دیا تھا۔ اُس نوٹ کو پڑھیے اُس میں پرائیویٹ اسکولوں سے متعلق ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کرنے
کی ضرورت کا اظہار کیا گیا ہے۔
علاوہ ازیں مجھے آپ کے ضلع کے بعض پرائیویٹ اسکولوں کی بدعنوانیوں کا حال معلوم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پرائیویٹ اسکولوں کی
اصلاح کے کام کو ایک مہم بنا کر شروع کروں۔ لیکن اس مہم کو کامیاب بنانے کے لئے پرائیویٹ اسکولوں کے مظلوم استادوں کی امداد کی ضرورت
ہے۔ جب تک اُستاد اپنے اپنے اسکولوں کی بدعنوانیوں سے مطلع نہیں کریں گے یہ مہم جاری نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلے میں استادوں کو
جرأت سے کام لے کر آگے آنا چاہیئے۔ نیز اپنے اپنے اسکولوں کے مینجروں کی قانون شکنیوں، زر پرستیوں، فرعونی اقتدار کے صحیح صحیح حالات
بہم پہنچائیں۔ اور اس ایجی ٹیشن میں نڈر ہو کر حصہ لیں۔ اور جو اتنی جرأت نہیں رکھتے اُنہیں چاہیئے کہ تمام ایسے حالات سے راقم الحروف کو
مطلع کر دیں اور اطمینان رکھیں کہ اُن کے خطوط کو کوئی دوسری نظر کبھی نہیں پڑھ سکے گی۔ انہیں ان خطوط کی وجہ سے نقصان پہنچنے کے تمام
خطرات کا میں ذمہ دار ہوں، میں اُن کا حامی، ہمدرد، آشنا اور نمائندہ ہونے کی حیثیت میں اُن کی تحریروں کو ایک امانت کی طرح حفاظت کروں گا۔
لیکن جن میں اتنی زندگی بھی باقی نہیں کہ وہ اس سلسلے میں اپنے نام سے کوئی صحیح اطلاع بہم پہنچانے کو اپنے لئے خطرہ خیال کرتے
ہیں وہ اتنا کریں کہ اپنے اسکول کی بدعنوانیوں کی تفصیل کسی دوسرے سے لکھوا کر گمنام طور پر دفتر شاہکار میں بھیج دیں۔ تاکہ مجھے یہ تو اندازہ
ہو سکے کہ پرائیویٹ اسکولوں میں کس کس قسم کی مصیبتیں استادوں پر نازل ہو رہی ہیں۔ صحیح معلومات اور سچے واقعات کی بہم رسانی کے بغیر

میرے لئے اس مہم کو جاری رکھنا بہت دشوار ہوگا۔

میں یہ تحریر جن استادوں کی نگاہ سے گزرے وہ اپنا یہ ذہن سمجھ لیں کہ تعلیمی برادری کے دوسرے مظلوم استادوں کو اس سے آگاہ کر کے اس سلسلے میں انہیں ممکن امداد پر آمادہ کریں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ اس مہم کے جاری رکھنے میں ہر قسم کی تکلیفیں برداشت کر سکتا ہوں۔ اب اگر استادوں کو ان نازیبا مظالم کا کچھ احساس ہے جو ان پر توڑے جا رہے ہیں اور اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کی سچی طلب رکھتے ہیں تو پہلی فرصت میں وہ شاہکار کو اپنے اپنے اسکولوں کی بدانتظامیوں، بدعنوانیوں، قانون شکنیوں، استادوں کی حق تلفیوں کے علیٰ صحیح صحیح بے کم و کاست اصلی واقعات کی تفصیل سے مجھے مطلع کریں تاکہ میں اس مہم کو جاری کر دوں اور آنریبل وزیر تعلیم اور ممبران پنجاب کونسل کو استادوں کی مصیبتوں پر توجہ دلا کر پرائیویٹ اسکولوں کے ناموافق حالات کو سازگار بنا دوں۔

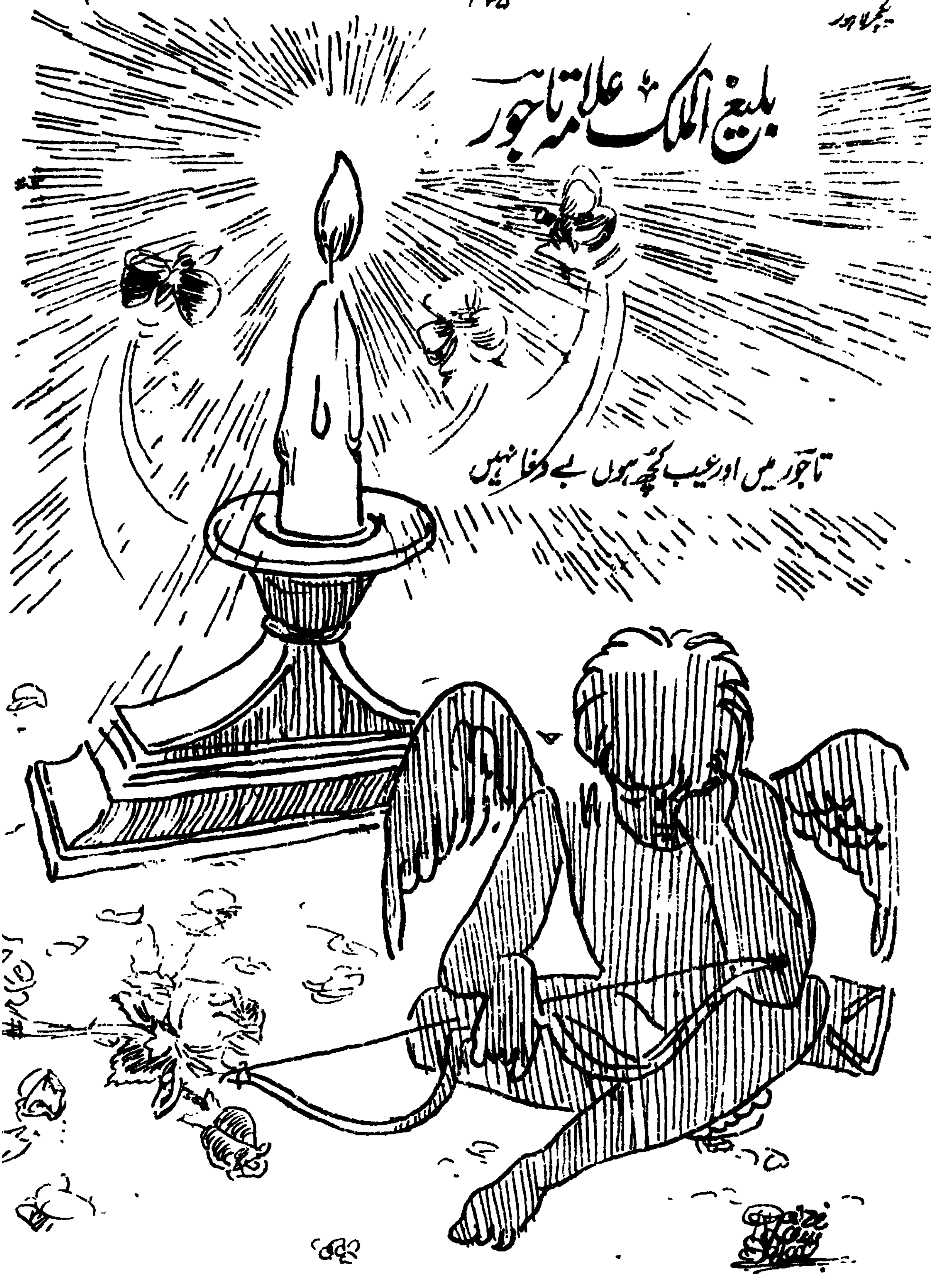
★

تاجور اور اقبال

"میں غالب اور اقبال کو نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیا کے لئے سرمایۂ ناز و افتخار سمجھتا ہوں۔ خصوصاً اقبالؒ کو حقیقی معنی میں سحر طراز ہے۔ اور ملی شاعر کی حیثیت میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ میری تمام عقیدت اس کی شاعری سے وابستہ ہے، لیکن اسے اس لئے بڑا شاعر نہیں سمجھتا کہ وہ افکار باکرہ کا مالک ہے بلکہ اس لئے کہ اس نے اسلامیات کو اردو میں ساحرانہ خصوصیات کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس کے بلیغ و بلند کلام کو پڑھ کر اس کی شاعری کی عظمت دلوں پر چھا جاتی ہے۔"

علامہ تاجور

شاہکار نومبر ۱۹۳۵ء


بلیغ الملک علامہ تاجورؒ
تاجور میں اور عیب کچھ ہوں بے وفا نہیں

کلام تاجور

اُردُو زبان شعر کی دولت سے مالا مال ہے قلی قطب شاہ والیٔ گولکنڈہ کے وقت سے لے کر ہمارے زمانے تک انگنت شاعروں نے اس رسیلی زبان کو اظہار جذبات کا ذریعہ بنایا اور یہ سلسلہ یقیناً جاری رہے گا لیکن شعرائے کرام کی اس بڑی تعداد میں ایسے شاعر کم ہی ہیں جو اپنے اندازِ بیان اور خیالات کی ندرت کے باعث پہچانے جاتے ہوں اور جن کا کلام سینے سے لگا کر رکھنے کے قابل ہو۔

شمس العلماء علامہ تاجورؔ خوش نصیب شعراء کے گروہ میں نہایت ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ علامہ موصوف کے تساہل اور حالات کی ناسازگاری کے باعث ان کا دیوان اب تک شائع نہ ہو سکا ورنہ وہ خود اس دعوے کی ناقابلِ تردید دلیل ہوتا۔ اس نمبر میں علامہ مرحوم کی کچھ نظمیں اور کچھ غزلیں پیش کی جا رہی ہیں۔ زمانے کے ساتھ ساتھ کاروانِ شاعری کئی منزل آگے بڑھ آیا ہے اور علم و مشاہدے کی وسعت نے نئے نئے مضامین سے اردو شاعری کے دامن کو کفِ گلفروش بنا دیا ہے لیکن کلامِ تاجورؔ میں آپ موجودہ دور کے اکثر شاعروں سے زیادہ تازگی اور طلاوت پائیں گے' بالخصوص زبان کی چاشنی اور خیالات کی پاکیزگی میں تو علامہ کا کلام لاجواب ہے۔

ہمیں اس بات کا اعتراف ہے۔ کہ نمبر کی کوتاہ دامنی اور پورا کلام فراہم نہ ہونے کے باعث شاعری کے اس انمول خزانے کا بہت تھوڑا حصہ پیش کر سکے اور انتخاب میں بھی دقتِ نظر سے کام نہ لیا جا سکا۔ پھر بھی جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے اس سے اہلِ ذوق مطمئن ہوں گے ٭ (ن۔ ر)

مرتبہ مولانا محمد عبداللہ قریشی

کلامِ تاجور

مولانا محمد عبد اللہ قریشی صاحب مولانا کے اُن رفقاء میں سے ہیں جنھیں اُن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ قریشی صاحب نے مخزن کی پرانی جلدوں میں سے علامہ مرحوم کا کلام تلاش کر کے اس نمبر کے لیے مرتب کیا ہے۔ ہم شکریے کے ساتھ نذرِ قارئین کرتے ہیں۔

نعت

محبت افروز ہے فروغِ جبیں، ہوس سوز ہیں نگاہیں
جمالِ عصمت سے رُخ درخشاں ہے عفت آموز ہیں نگاہیں
نظر کی احساس آفرینی دلوں کو درد آشنا بنا دے
خدا کا منکر بھی زد پہ آ جائے تو اسے باخدا بنا دے

جلال اتنا کہ حسن میں بھی ہے جس سے شانِ نیاز پیدا
جمال ایسا کہ جس کی تابش سے پتھروں میں گداز پیدا
وجاہت اتنی کہ شوقِ دیدار کو مجالِ نظر نہیں ہے
لیاقت ایسی کہ کم سوادوں کو جرأتِ گفتگو نہیں ہے

ذہانت اتنی کہ عقلِ خود بیں کو تو اسیرِ نیاز رکھے
صداقت ایسی کہ شاعروں کو مبالغے سے بھی باز رکھے
ظرافت اتنی کہ تلخ نوشِ غمِ محبت کو بھی ہنسائے
متانت ایسی کہ عشق و الفت کی شوخیوں کو ادب سکھائے

فصاحت اتنی بیاں میں جس سے خوش بیانوں پر وجد طاری
طلاقت ایسی زباں میں جیسے نیر پانی کی نہر جاری

سرشت اتنی لطیف سنج و صفا کا گنجینہ جس کو کہیے
طبیعت ایسی شریف مہر و وفا کا آئینہ جس کو کہیے

عطوفت اتنی کہ جو سراپا ادب کے جرم و گناہ بخشے
مروت ایسی کہ دشمنِ جاں طلب کو بھی تو پناہ بخشے

پسند اتنی بلند تعلیمِ ذوق دے چشمِ بے ہنر کو
مذاق ایسا نفیس حسنِ مذاق جس سے ملے نظر کو

حسد تری بزم میں چھپے لائے خلق تیرا غلام کر لے
جو رَم کرے تجھ سے ازرہِ بغض تو اُس کو رام کر لے

سمجھائی تو نے ہی مجھ کو اے دوست یعنی ماسوا پرستی
تجھی سے سیکھا کہ خود پرستی ہے درحقیقت خدا پرستی

جو تیرے جلووں سے ہو منور اُس آئینے میں نہ بال آئے
مٹے خیالِ گناہ دل سے جو دل میں تیرا خیال آئے

ترے فروغِ جمال کی تابشیں یہ بتا رہی ہیں
کہ تیری صورت میں تیری سیرت کی طلعتیں جگمگا رہی ہیں

خدا کو مانا ہے دیکھ کر تجھ کو کہ اُس کی شانِ جمیل تو ہے
خدا کی ہستی پہ میرے نزدیک سب سے روشن دلیل تو ہے

خدا کی صورت کبھی نہیں اور خدا کی صورت کوئی اگر ہے
تو وہ حریفِ نقوشِ تصویر تیری صورت میں جلوہ گر ہے

میں شش جہت کی فضا کو جلووں سے تیرے لبریز دیکھتا ہوں
ترے محبت بھرے فسانے کو زندگی خیز دیکھتا ہوں

یہ دیکھتا ہوں کہ تیرے اقوال خود بخود منہ سے بولتے ہیں
یہ دیکھتا ہوں کہ تیرے احوال خود دلوں کو ٹٹولتے ہیں

یہ دیکھتا ہوں کہ تیرے افکار شوکت آرائے بحر و بر ہیں
یہ دیکھتا ہوں کہ تیرے انوار طاعت افزائے بحر و بر ہیں

یہ دیکھتا ہوں کہ تیری نظروں میں ہیچ ہے فرِّ شہریاری
یہ دیکھتا ہوں کہ تیرے قدموں پہ صدقے ہوتی ہے تاجداری

یہ دیکھتا ہوں غلام وفا کا [illegible] تو نے مٹا دیا ہے
یہ دیکھتا ہوں [illegible] شاہ [illegible] گدا [illegible] بنا دیا ہے

یہ دیکھتا ہوں [illegible] ویرانے [illegible]
[illegible]

تیرے [illegible] ہوا
تیرے [illegible] ہوں

[illegible] کو دیکھتا ہوں
[illegible] کو دیکھتا ہوں

تیرے [illegible] دیکھتا ہوں [illegible]
تیرے [illegible] دیکھتا ہوں [illegible]

[illegible] کو دیکھتا ہوں [illegible] نگاہیں
[illegible] نگاہیں

عید شدید

(۱)

اے ہلالِ عید اے سرمایہ دارِ انبساط
اے ہلالِ عید [illegible] انبساط

عید کا پیغام دینے خلق کو آیا ہے تو
عید کی خوشیاں جہاں کے واسطے لایا ہے تو

تیرے دیوانے بہت بیتاب تھے تیرے لئے
اک جہانِ دیدۂ بے خواب تھے تیرے لئے

اہلِ عالم کو تمنا تھی ترے دیدار کی
جستجو تھی چشمِ انجم کو ترے انوار کی

بن گئی تیری تجلی راحت افروزِ حیات
آج ہر انساں ہوا ہے بہجت اندوزِ حیات

تیرے دامن میں مگر میرے لئے کچھ بھی نہیں
آہ تیری دید سے حاصل مجھے کچھ بھی نہیں

تیرا نظارہ ہے آشوبِ نظر میرے لئے
اب نئے عید کی ہے نشتر بہ جگر میرے لئے

دید تیری تھی کبھی میرے لئے پیغامِ [illegible]
میرے غم خانے میں بھی ہوتا تھا فیضِ عامِ عید

میرے گھر بھی تو نوید عیش لاتا تھا کبھی
میرے گھر کا آسماں بھی جگمگاتا تھا کبھی

تیرے شوقِ دید میں رہتے تھے دونوں بیقرار
ہفتوں پہلے سے کیا کرتے تھے تیرا انتظار

کیا کہوں وہ میرے گھر کے ماہ پارے کیا ہوئے
میری دنیا جن سے روشن تھی وہ تارے کیا ہوئے

وہ ترے بدمست میرے گھر سے رخصت ہو گئے
آہ وہ تارے چراغِ شامِ تربت ہو گئے

میرے ویرانے میں تیرا منتظر کوئی نہیں
اس سیہ خانے میں تیرا منتظر کوئی نہیں

[illegible] کے لئے
میرا دا تیری مسرت خیز تھی جن کے لئے

ان کو پہنایا ہے اپنے ہاتھ سے میں نے کفن
پھوٹا پڑتا تھا کفن میں سے بھی ان کا بانکپن
بن گئی ہے میرے حق میں گردشِ افلاک عید
عید میرے گھر بھی آئی ہے مگر غمناک عید

(۲)

عید کے دن عید کی خوشیاں منائے گا جہاں
عشرتِ فردوس کا منظر دکھائے گا جہاں
گدگدائے گی ہر اک دل کو تمنائے نشاط
ہر بشر کی روح ہوگی نغمہ پیرائے نشاط
بیخودی سی سرسرائے گی ہوا میں ہر طرف
شادمانی مسکرائے گی فضا میں ہر طرف
گلشنِ آفاق کی ہر شے جواں ہو جائے گی
ہر گل کھل کر حریفِ گلستاں ہو جائے گی
عید میں سب نوجواں کپڑے بدل کر آئیں گے
عیدیاں اپنے بزرگوں سے مچل کر پائیں گے
مسجدِ جامع کو جائیں گے سب اتراتے ہوئے
اپنی سج دھج سے نرالی شان دکھلاتے ہوئے
لیکن اس عیش و طرب کے جانفزا ہنگام میں
محو ہوگا دل مرا اک آرزوئے خام میں
یاد اپنے دو جوان مرحوم مجھ کو آئیں گے
دل سے اک فریاد اٹھے گی کہ دل ہل جائیں گے
جستجو ان دو جوانوں کی مٹا دے گی مجھے
یاد ان کی اپنے مرکز سے ہلا دے گی مجھے
جن کے دم سے ہر گھڑی اک عید تھی میرے لئے
جن کی صورت مطلعِ خورشید تھی میرے لئے
نشۂ جاوید سے مخمور تھا جن کا شباب
میری آنکھوں میں سراپا نور تھا جن کا شباب
میرے غم خانے میں جن کے قہقہوں کی تھی بہار
جن کی نورانی جبیں سے تھی مسرت آشکار
آہ وہ دن کیا ہوئے مجھ کو بھی جب بھاتی تھی عید
یاد آیا میکہ میرے گھر میں بھی آتی تھی عید
اے مہِ نو! اب کہاں ہیں وہ تمنائی ترے
کونسی دنیا میں رہتے ہیں وہ سودائی ترے
آ دکھاؤں تجھ کو وہ دنیا جہاں رہتے ہیں وہ
پہلے رہتے تھے کہاں اور اب کہاں رہتے ہیں وہ
اک فسردہ سرزمیں لاہور کی بستی سے دور
بزمِ عالم سے پرے ہنگامۂ ہستی سے دور
ذرہ ذرہ ہے یہاں کا درد غم سے لبریز دیکھ
اے سفیرِ آسماں! یہ منظرِ غم ریز دیکھ
شہرِ خاموشاں کے ہیں سب تودہ ہائے خاک چپ
چھائی ہے ساری فضا پر ایک دہشتناک چپ
بے صدا نالے ہیں قبروں کے ہوا میں بیقرار
ہے مسلط ہر طرف خاموشیِ فریاد کار
جھاڑیاں خاموش، سبزہ چپ ہے اور بیلیں اداس
دو جواں مرگوں کی دو قبریں بنی ہیں پاس پاس
آہ! ان قبروں میں میرے دو خزانے دفن ہیں
ان میں میری زندگی کے دو فسانے دفن ہیں
دو جواں بھائی ہیں ان خاموشیوں میں محوِ خواب
ان نقابوں میں ہیں دو چہرے مثالِ آفتاب
میری بزمِ خانداں کے انجمن آرا تھے یہ
قالبِ خاکی کے آئینے میں مہ پارہ تھے یہ
میری بزمِ خانداں رشکِ گلستاں ان سے تھی
آہ! شامِ زندگی میری فروزاں ان سے تھی
اُٹھ گئے وہ میری دنیا میں اندھیرا چھا گیا
آفتابِ زندگی میرا لبِ بام آ گیا
دم قدم سے ان کے میری کارواں تھی زندگی
ان جواں مرگوں کے جلوؤں سے جواں تھی زندگی

یہ فضا پرواز سے آزاد طائر کی طرح
ایک سیلِ تند رو تھے طبعِ شاعر کی طرح
یہ کسی کے قبضۂ قدرت میں آ سکتے نہ تھے
بیکراں تھے اپنی دنیا میں سما سکتے نہ تھے
ان کے شریانوں میں بجلی بن گیا تھا دورِ خوں
کیسے صیادِ اجل کا چل گیا ان پر فسوں
ان پہ کیا بیتا پڑی ایسی کہ یوں مجبور ہیں
آج ان محدود زندانوں میں کیوں محصور ہیں

(۴)

کس زمیں پہ آج زیرِ آسماں ڈھونڈوں تمہیں
اے میرے افغان شہزادو کہاں ڈھونڈوں تمہیں
دیدۂ پُرنم رہینِ خواب ہے تیرے لئے
آہ! اے عرفان! دل بیتاب ہے تیرے لئے
کیا خبر تھی مجھ سے پہلے ہی تجھے موت آئے گی
یہ تری اٹھتی جوانی خاک میں مل جائے گی
میری دنیا بھر کی راحت مٹ گئی ہے تیرے ساتھ
میں نے اپنی ساری دنیا دفن کی ہے تیرے ساتھ
آہ! اے رضوان! اے میرے رفیقِ مہرباں
اے مشیرِ نکتہ داں، اے فیلسوفِ نوجواں
چین آتا تھا نہ تجھ کو اک گھڑی میرے بغیر
قبر میں کیسے تجھے نیند آ گئی میرے بغیر
گھر کی ہر شے تیری فرقت میں ستاتی ہے مجھے
اب تو ہر منظر سے تیری یاد آتی ہے مجھے
صبر کی تلقین کرتے ہیں مجھے احباب کیوں
ضبطِ گریہ کے سکھاتے ہیں مجھے آداب کیوں
بیس دن کے آگے پیچھے دو جواں بیٹوں کی موت!
موت پھر تم جیسے فرزانہ بیٹوں کی موت

(۵)

صبر بے شک صبر لیکن صبر کی کچھ حد بھی ہے
جبر ہے یہ جبر پھر اس جبر کی کچھ حد بھی ہے!
ہاں کروں گا صبر تم کو اپنے مر جانے کے بعد
دل سے بھولوں گا تمہیں جی سے گزر جانے کے بعد
زندگی میں دید کی امید باطل ہو چکی
مجھ میں تم میں قبر کی دیوار حائل ہو چکی
تم سے ملنے اب تمہارے پاس خود آؤں گا میں
اس طلب میں بزمِ ہستی سے نکل جاؤں گا میں
دلکشی اب بزمِ ہستی میں نہیں پاتا ہے دل
اب تو اس اجڑی ہوئی محفل سے گھبراتا ہے دل
موت نے تاراج کر ڈالی بہارِ زندگی
ہو رہا ہوں زندگی میں دل فگارِ زندگی

(۶)

لیکن اس تاراج و بربادی کا میں شاکی نہیں
ہاں! اجل کی نوحہ گر میری جگر چاکی نہیں
خارجی تحریک سے ہے موت کی بے داد بھی
ہائے کیسا خوب ہے فاخر کا یہ ارشاد بھی
آدمی مجبور ہے تو موت بھی مجبور ہے
اس کی ہیئت میں بھی اک بیچارگی مستور ہے
یہ بھی ہے فرماں پذیر اس حاکمِ مختار کی
کانپتی ہے جس سے جباری ہر اک جبار کی
جس کی دہشت سے ہے لرزہ وادی و کہسار میں
جو تلاطم آفریں ہے قلزمِ ذخّار میں
جس کے جلووں میں درخشاں ہیں فسانے برق کے
جو لگاتا ہے فلک کو تازیانے برق کے
جس کے تابندہ تبسم میں جھلکتا ہے شباب
نور بن بن کے چمکتا ہے، دمکتا ہے شباب

گنج گلشن بن جاتا ہے جو فانوس میں بہار
ذرے ذرے کو عطا کرتا ہے جو مہکی بہار

بخشتا ہے خاک کو جو لذتِ نشانِ حیات
کر رہا ہے موت کے پردے میں تکمیلِ حیات

دل اس کے داغ ہیں ہے مرگِ ناگہاں بھی
ہے اسی کے حکم کا پابند یہ سفاک بھی

آہ! اس خونخوار ظالم کی شکایت کیا کروں!
اپنے آقا کی مشیت سے بغاوت کیا کروں!

نویدِ مستقبل

زندگی بھی بن جائے گی گستاخ و شرمناک
ہر منافق راندۂ بزمِ جہاں ہو جائے گا

ہر جبیں بن جائے گی اسرارِ دل کا آئینہ
دورِ یک رنگی میں ہر چہرہ زباں ہو جائے گا

خون چوسے گا نہ اب مزدور کا سرمایہ دار
بلکہ خود مزدور کا راحت رساں ہو جائے گا

اب نہ یہ قانون ہو گا جس کی لاٹھی اس کی بھینس
دہر میں انصاف کا سکہ رواں ہو جائے گا

بالفرض تفریق ہوگی نہ سطوت کی بات
خانہ جنگی بزمِ آئینِ جہاں ہو جائے گا

پست قومیں اب نہ پائیں گی سزائے زندگی
زندگی کا ان کی ضامن آسماں ہو جائے گا

حکم برداری نہ ہوگی کمزور قوموں پہ عذاب
حکم برداری کا یہ سودا گراں ہو جائے گا

ٹوڈیت، بغض و حسد، عشق بازی و خود مطلبی
ان جرائم میں سے ہر اک بے نشاں ہو جائے گا

موت ہوگی اب تعصب کی سزا قانون میں
اور یہ قانون ہر جا حکمراں ہو جائے گا

تازہ ہنگاموں سے وابستہ ہے جن کی لیڈری
خون ایسے لیڈروں کا کارواں ہو جائے گا

رہنمائے نیک خو، تصویرِ ایثار و خلوص
جانِ جاں آرامِ جاں، جانِ جہاں ہو جائے گا

اب نہ سرمائے کو آقائی کبھی ہوگی نصیب
آدمی اب بے نیازِ این و آں ہو جائے گا

اپنے اپنے ملک میں آزاد ہوں گے اہلِ ملک
شوقِ استعمار پامالِ زماں ہو جائے گا

عہدِ نو میں جرم بن جائے گا جانداروں پہ ظلم
یعنی ہر جاندار اب حقدارِ جاں ہو جائے گا

شیر اور بکری پئیں گے اب سے پانی ایک گھاٹ
ظلم ظالم پر عذابِ ناگہاں ہو جائے گا

آڑ میں مذہب کی لامذہب نہ کھیلیں گے شکار
دشمنِ جاں ایسے فتنوں کا جہاں ہو جائے گا

نام پر مذہب کے خود مطلب نہ لڑنے پائیں گے
زندگی کا فتنہ سازوں کی زیاں ہو جائے گا

دامنِ ہستی کے سب دھبے مٹا دے جائیں گے
پاک داماں گل بداماں، گل جہاں ہو جائے گا

اصل مذہب آئے گا لے کر محبت کا پیام
دارِ ہستی ایک دن دارالاماں ہو جائے گا

خود بخود مٹ جائیں گے قوموں کے جغرافی حدود
اور وطن انساں کا سارا جہاں ہو جائے گا

کوئی دن میں انقلابِ آسماں ہو جائے گا
سازگارِ زندگی سارا جہاں ہو جائے گا

اس شگفتہ عہد میں افسردگی مٹ جائے گی
خون شریانوں میں بوڑھوں کے جواں ہو جائے گا

ختم ہو جائے گا اب دنیا کو کل کا انتظار
آج میں زرّیں مستقبل عیاں ہو جائے گا

ڈھونڈتی ہے چار سو جس کو نگاہِ منتظر
اب وہی جلوہ فروغِ بزمِ جاں ہو جائے گا

خشک کھیتی آرزوؤں کی ہری ہو جائے گی
یعنی ہر ویرانۂ دل گلستاں ہو جائے گا

پست قومیں آئیں گی اوجِ ترقی پر نظر
ایک دن یہ خاک داں افلاک داں ہو جائے گا

جرم ٹھہرے گا جہاں میں امتیازِ نسل و رنگ
مغرب و مشرق میں ربطِ جسم و جاں ہو جائے گا

اقترانِ مشرق و مغرب کا ہوگا یہ اثر،
ہر جواں اس عہد میں صاحبقراں ہو جائے گا

اشرف المخلوق ہوگا فی الحقیقت ہر بشر
آدمی انسانیت کا ترجماں ہو جائے گا

آرہا ہے بلکہ وہ عہدِ مبارک آگیا،
جب کہ عالم اک جہانِ قدسیاں ہو جائے گا

جب کہ عظمت کی بنا خدمت پہ رکھی جائے گی
جب یہ شیوہ شیوۂ پیر و جواں ہو جائے گا

جب سیادت کی بنا نیکی سے ہوگی استوار
جب نکوکاری طریقِ رہبراں ہو جائے گا

جب کہ ہوگی جلوت و خلوت میں یکرنگی کی شان
جب کہ ایماں آدمی کا پاسباں ہو جائے گا

جرم ہوگی دوستی کی آڑ میں خود مطلبی،
خود غرض رسوائے بزمِ دو جہاں ہو جائے گا

مذہبِ انسانیت ٹھہرے گا معیارِ شرف
اس کسوٹی پہ ہر اک کا امتحاں ہو جائے گا

ایک ہی آواز اب دیر و حرم سے آئے گی
رابطہ، ناقوس و اذاں میں بے گماں ہو جائے گا

اب اذاں ہوگی برہمن کے لئے فردوسِ گوش
شیخ کا معبود مسجودِ بتاں ہو جائے گا

غم نہ کھا اے سرنگوں ہندوستانی سر اٹھا
جلد تو بھی سرفراز و کامراں ہو جائے گا

رونے والے تیرے ہنسنے کے بھی دن آنے کو ہیں
شادماں تیرا دلِ ناشادماں ہو جائے گا

گردشِ ایام سے تیرے بھی دن پھر جائیں گے
تیرے مقصد کے موافق آسماں ہو جائے گا

ختم ہونے کو ہے میعادِ اسیری ہم صفیر!
بے نیازِ برق، اپنا آشیاں ہو جائے گا

پھر چلے گی اس غلام آباد میں بادِ مراد
یہ جہنم زار پھر جنت نشاں ہو جائے گا

ہند، یہ باغِ وطن، نذرِ خزاں بے بہار
اس میں اب دورِ بہارِ بے خزاں ہو جائے گا

ہندو و مسلم دو قالب ایک جاں ہو جائیں گے
ایک دن ہندوستاں ہندوستاں ہو جائے گا

حسنِ فطرت بھی تجلی بار ہوگا ہر طرف،
شاہدِ فطرت کا ہر اک رازداں ہو جائے گا

اک جھلک سے جس کی چیخ اٹھے تھے سینا پہ کلیم
اب وہ جلوہ کارواں در کارواں ہو جائے گا

وادیِ فانی اک بہشتِ سرمدی بننے کو ہے
یہ حیات افروز منظر جاوداں ہو جائے گا

شہید توحید

ذیل کی نظم میں نے گرو نانک کے یوم ولادت پر سردار امر سنگھ صاحب اڈیٹر لائل گزٹ کے اصرار پر لکھی تھی۔ میں گرو نانک کو موحد اور اسلام کا سچا پیرو سمجھتا ہوں۔ اس لیے ذیل کے جذبات نمائشی یا فرمایشی نہیں بلکہ میرے دل کے ترجمان ہیں۔

تاجور

آج کچھ طبع شگفتہ کے دکھاؤں جوہر — منکر سحر بھی ہو قائل اعجاز بشر
وصف نانک میں لکھوں نظم کوئی جاں پرور — شعر ہوں جس کے نظر کے لیے فردوس نظر
نظم کو اپنی حریف دم عیسےٰ کر دوں
سلک اشعار کو ہم سلک ثریا کر دوں

قدسی عالم افلاک گرو نانک تھے — بحر توحید کے پیراک گرو نانک تھے
جاں نثار رخ لولاک گرو نانک تھے — پیکر دہر میں ادراک گرو نانک تھے
دل تھا اک مطلع انوار گرو نانک کا
نظر افروز تھا دیدار گرو نانک کا

کفر و اسلام کے جھگڑوں سے بپا تھا محشر — ہر گھڑی رہتی تھی آمادۂ شر نوع بشر
محفل اہل وطن ہو چکی تھی زیر و زبر — نظم ہستی کے بیاں اوراق تھے تتر بتر
چلتی رہتی تھی وطن والوں میں باہم تلوار
خون سے پیاس بجھاتے تھے یہ ہندی خونخوار

تو نے اے دہلۂ لاقول تھا تصویر عمل — ہند میں نعرۂ توحید سے ڈالی ہل چل
گونج اٹھے تری تکبیر سے کل دشت و جبل — وقف تعلیم ہوئی سلطنت لات و ہبل
تفرقے مٹ گئے باہم شکر و شیر ہوئے
کفر و اسلام بھی آپس میں بغلگیر ہوئے

شمع وحدت سے ہوئی ہند کی دنیا روشن — ہند میں باد بہاری چلی گلشن گلشن
بن گیا رشک گلزار ارم باغ وطن — گلے ملنے لگے اخلاص سے باہم دشمن
ہندو و مسلم و عیسائی کو یک جا دیکھا
یعنی تثلیث میں توحید کا نقشہ دیکھا

از سر نو ہوا وحشت کدۂ ہند آباد — صفحۂ دل سے مٹا حرف دوئی نقش عناد
برکت سے تری بر آئی ہر اک دل کی مراد — سکھ ملا سکھ کو ہوا مسلم ناشاد بھی شاد
تو نے دونوں کو کیا بندۂ احسان اپنا
سکھ تجھے اپنا سمجھتے ہیں مسلماں اپنا

مخزن دسمبر ۱۹۱۹ء

تصویر بہار

★

دے ایسی شراب ناب ساقی — پیتے ہی رہیں نہ ہوش باقی
مدہوش بنا دے مے پلا کر — اڑنے لگیں ہوش پہ لگا کر
چھائی ہے گھٹا شراب دے دے — اس رات کا آفتاب دے دے
ہر اشک شراب ناب ہو جائے — ہر قطرۂ خوں گلاب ہو جائے
پیمانۂ چشم شوق بھر دے — اک آنکھ دکھا کے مست کر دے
چھائی ہے گھٹا چمن میں ہے عید — دم دے رہا ہے فریب امید
سبزہ ہے چمن کا سبز و شاداب — ہیں خواب میں مست خضر کمخواب
مصروف صبا ہے دل لگی میں — اک پھوٹ پڑی کلی کلی میں
ہر گل کا مزاج لامکاں پر — بلبل کا دماغ آسماں پر
کھولا سورج مکھی نے چہرا — پو پھٹ گئی آفتاب نکلا
ہے سرو پہ جاں نثار قمری — طوطی کی سنو ترانہ سنجی
تیتر کی زباں پہ نام جاری — کوئل کی وہ کوک پیاری پیاری
کبک دری محو ذکر یا ہو — کیا مست ہے فاختہ کی کوکو
پھل لانے لگے ہیں نقش دیوار — گلزار بنا ہے خطۂ گلزار
چکر میں ہر ایک دائرہ ہے — نقطہ بھی خوشی میں خط ہوا ہے
یک رنگی دکھا رہا ہے ہر گل — بلبل میں چمن، چمن میں بلبل
صیاد خود باغباں بنا ہے — گلزار کا ناغ بھی ہما ہے
وہ دھوم بہار کی مچی ہے — گلشن کی ہوا بندھی ہوئی ہے
حوریں بھی یہ دیکھتی ہیں ساماں — فردوس سے جھانکتے ہیں رضواں
قبروں میں جو بوئے گل گئی ہے — مردوں میں بھی جان پڑ گئی ہے
اے تاجور! اتم ہو کس محسن میں — گر آج چلے چلو چمن میں

گلشن میں سنائیں گے فسانہ
بلبل سے ملائیں گے ترانہ

مخزن مئی ۱۹۱۵ء

ساقی نامہ

دریائے سرور موج پر ہے
خورشید نشاط اوج پر ہے
تارے بدمست ہو رہے ہیں
سارے بدمست ہو رہے ہیں
ہے شمس و قمر کی چال بدمست
ہر ایک شجر کا حال بدمست
پانی کی روانیوں میں مستی
شاخوں کی جوانیوں میں مستی
ذروں پہ ہے حسنِ شاہدِ گل
گل چھرّے اڑا رہی ہے بلبل
گلشن میں ہے آج رت نرالی
ہے حسنِ بہار ڈالی ڈالی
ہر پھول میں رنگِ زندگی ہے
بدمستِ نمو کلی کلی ہے
ہر پتے سے حسن چھن رہا ہے
تصویرِ بہار بن رہا ہے
ہے رنگِ بہار ہر چمن میں
نوروز برس رہا ہے بن میں
کعبے سے اٹھا ہے گھر کے بادل
جنگل میں منا رہا ہے منگل
اے ساقیٔ دلستاں کدھر ہے
رندوں کی بھی کچھ تجھے خبر ہے

رندوں کو ہے انتظار تیرا
ہر رند ہے بیقرار تیرا
چھائی ہے گھٹا شراب دیدے
اس رات کا آفتاب دیدے
رندوں میں تری پکار ہے آج
سب کو ترا انتظار ہے آج
بدمست ہر ایک کو بنا دے
ساغر نہیں خم کے خم لنڈھا دے
دلشاد ہیں اہلِ بزم سارے
مدہوش ہیں سب خوشی کے مارے
پیمانۂ چشم شوق بھر دے
آنکھیں ہی ملا کے مست کر دے
ہر قوم کے آدمی یہاں ہیں
ہر بات کے آدمی یہاں ہیں
لالوں[2] سے ہے لالہ زار یہ بزم
ان پھولوں سے نوبہار یہ بزم
کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں زیادہ
اس واسطے جیتے ہیں زیادہ
آ لوٹے ہیں خوش ثمر کے بدلے
نل پیتے ہیں اولڈ ٹام[3] کے بدلے
جو شام سے گھر میں پڑ کے سو جائیں
اور گولیاں کھا کے مست ہو جائیں

[1] یہ ساقی نامہ فیروز پور کے نمائندہ جلسے میں پڑھا گیا۔ [2] لالوں سے یعنی مہاجنوں سے [3] ایک شراب کا نام ہے

کیا جانیں شراب کیا بلا ہے
یہ خانہ خراب کیا بلا ہے

ہیں خالصہ جی نشوں سے بیزار
سکھ مت ہیں ہے نشہ اپنا چار

اس قوم کو ہے نشوں سے نفرت
اس مت پہ ہے واگرو کی رحمت

البتہ کہیں جو دیکھ پائیں
اتنا ہو نشہ کہ جھوم جائیں

اسلام کے ہیں جو ماہ پارے
ان پر ہیں نشے حرام سارے

ہے نام شراب قہر ان کو
ہے جام شراب زہر ان کو

البتہ جو انصرام ہو جائے
پیسوں کا کچھ انتظام ہو جائے

یا کوئی ادھار ہی منگا دے
یا مفت کوئی سخی پلا دے

ٹھرّے سے بھی منہ کبھی نہ موڑیں
تلچھٹ بھی شراب کی نہ چھوڑیں

لاتا ہے نوید جام ساقی
آتا ہے سحر خرام ساقی

اہلِ نظر آؤ آ کے دیکھو
ساقی کا بناؤ آ کے دیکھو

دل تھام لو آ رہا ہے ساقی
اب جام لو آ رہا ہے ساقی

ساقی ہے کہ جانِ دلستاں ہے
ساقی ہے کہ شمع بزمِ جاں ہے

چتون سے گداز دل میں پیدا
کن انکھیوں سے راز دل میں پیدا

یہ آنکھیں خدا پناہ تیری
یہ پلکیں خدا پناہ تیری!

ساقی کی بہارِ حسن دیکھو!
یہ نادر کارِ حسن دیکھو!

چہرے کا جمال شانِ رنگیں
چہرہ ہے کہ بستانِ رنگیں

گرما گئیں دل کو یہ نگاہیں
تڑپا گئیں دل کو یہ نگاہیں

رفتار کہ خضر بھی بہک جائیں
گفتار کہ بجلیاں کھٹک جائیں

اعجاز ہے اس کی نغمہ خوانی
بوڑھوں میں بھی آ گئی جوانی

کافر کا شباب جاں ستاں ہے
ساحر کا رباب جاں ستاں ہے

آواز ہے عشق خیز کیسی
ہر تان ہے درد ریز کیسی

وہ دھج ہے کہ لوٹ پوٹ آنکھیں
وہ ضرب کہ کھائیں چوٹ آنکھیں

صناع کے ہاتھ چوم لیجے
صنعت کو بھی صاف چوم لیجے

یہ پیکرِ راز جانے کیا ہے؟
ساقی ہے کہ ساز جانے کیا ہے؟

رکھا نہ یہ امتیاز باقی
موسیقی ہے رقص میں کہ ساقی

ان آنکھوں کے کفر سے بچا لو!
میں تو چلا لو مجھے سنبھالو!

سدھ بدھ نہیں کچھ مجھے جہاں کی
ایمان کی لوں خبر کہ جاں کی

اے ساقیٔ خوش صفات ادھر دیکھ
دریوزۂ التفات اِدھر دیکھ

ملا کے لبوں پہ ذکرِ ہو ہے
کیانی کی زبان پہ واہ گرو ہے

مندر کے پجاریوں میں ہے شور
گرجا کے پجاریوں میں ہے شور

مسلم ہیں کہ باخدا بنے ہیں
بیکہ بھی بڑے پارسا بنے ہیں

ہندو ہیں کہ پھیرتے ہیں مالا
عیسائی ہیں محو یاد عیسیٰ

ساقی کوئی معجزہ دکھا دے!
تب جانوں کہ گل کوئی کھلا دے!

ہر دل کو سیاہ کار کر دے
ان سب کو گناہگار کر دے

تو رقص دکھائے اور یہ ناچیں
تو جادو جگائے اور یہ ناچیں

اعجاز یہ رقص کا دکھا دے
بڈھوں کو بھی نوجوان بنا دے

دکھلا انہیں شانِ دلربائی
توڑ ان کا غرورِ پارسائی

ہر ایک سبو بدوش ہو جائے
ہر نیک شراب نوش ہو جائے

ہر تقوے کو پاش پاش کر دے
قدرت کے بھی راز فاش کر دے

آزاد اسیرِ حال ہو جائیں
بے فکرِ غمِ مآل ہو جائیں

مُردوں کو پیامِ زندگی دے
مُردوں کو دوامِ زندگی دے

اے ساقیٔ خوش بیاں ادھر آ!
کچھ مجھ سے بھی سُن بیاں ادھر آ!

مدہوش کلامِ تاجور سُن:
خاموش! کلامِ تاجور سُن!

شاعر کی لطافتِ زباں دیکھ!
ساحر کی فصاحتِ بیاں دیکھ!

—— ★ ——

بنگال کا کال

بھوک سے ہلچل مچی ہے صوبۂ بنگال میں
بیچتی ہیں مائیں بچے گود کے اس کال میں

غم سے ہیں بدحال لوگ
کال سے پامال لوگ
زندگی کو جانتے ہیں جان کا جنجال لوگ

٥

بیے ضرورت گھر میں غلہ رکھ نہ اے دنیا کسان
مر رہے ہیں بھوک سے وہ جو تسلا کرتے ہیں مان

بھوک سے رنجور ہیں
رنج و غم سے چُور ہیں
وقت کو پہچانتے ہیں وقت سے مجبور ہیں

٥

صوبۂ بنگال میں بے آسرا ہے زندگی
کال کے بے درد ہاتھوں سے فنا ہے زندگی

وقت کو پہچان لے
میرا کہنا مان لے
تجھ کو داتا جانتے ہیں تو نہ ان کی جان لے

٥

برسات

برسات آئی برسات آئی

مینہ سے بیاباں رنگِ گلستاں
پھولوں کی برکھا دونوں میں یکساں
کوئل کی کو کو باغوں میں رقصاں
جگنو کی جگ مگ بن میں چراغاں

برسات آئی برسات آئی

رُت ہے سہانی نیچر ہے دھانی
بارش کی چھم چھم آکاش بانی
ہر سبز کھیتی کھیتوں کی رانی
جس سمت دیکھو پانی ہی پانی

برسات آئی برسات آئی

نالے کی لالی بن بن دیوالی
کالی گھٹائیں گھنگھور کالی
جاے ہے باہر باغوں میں مالی
مالن کے گجرے پھولوں کی ڈالی

برسات آئی برسات آئی

شب رنگ بادل مینہ کے ہراول
تپتی زمینیں پانی سے جل تھل
فرشِ زمیں پہ سبزے کی مخمل
برسات سے ہے جنگل میں منگل

برسات آئی برسات آئی

دلکش سماں ہے دل شاداں ہے
خوشیوں کا ہر سو دریا رواں ہے
دل شاد اِک اِک پیر و جواں ہے
برسات کی رت جانِ جہاں ہے

برسات آئی برسات آئی

شراب خانہ خراب

میں کیا کہوں. تجھ سے رند میکش شراب خانہ خراب کیا ہے.
خدا کی دنیا میں جس سے بل چل مچی ہوئی ہے یہ وہ بلا ہے.
نہیں ہے ویران اس کے ہاتھوں کچھ ایک وحشت کدہ وطن کا
چمن میں یورپ کے اس دیا سے نیا شگوفہ کھلا ہوا ہے

پہلا سین

سناؤں اے اہلِ بزم میں تم کو عبرت انگیز اک فسانہ
سنو اسے گوش دل سے یہ اک رئیس زادے کا ماجرا ہے
وہ وقت ہے یہ کہ جا چکی بچپنے کے ساتھ اس کی سادگی بھی
جوان ہے خیر سے اب اس پر نشہ جوانی کا چڑھ رہا ہے
اٹھا پدر کا جو سر سے سایا، تو ٹوٹا بلی کے بھاگوں چھیکا
اب آرزوؤں کا دل کے دریا میں اک طوفان اٹھ رہا ہے
ملی ہے قسمت سے ہاتھ ورثے میں باپ دادا کی سب کمائی
وہ رنگ لائی ہے میکشی اب کہ رات دن دور چل رہا ہے
شباب ہی کا نشہ نہ تھا کم. پھر اس پہ طرہ خمارِ دولت
شراب کی اک کمی تھی قسمت نے یہ بھی سامان کر دیا ہے
جہان بھر کے شریر، آوارہ گرد آ کر اس کے بنے مصاحب
جما ہے مجلس کا رنگ. ہر ایک رنگ رلیاں منا رہا ہے
ہے نوشا نوشی کا گرم بازار. میکشی کا ہے دور دورہ
رئیس صاحب کا سارا جلسہ نشے کے رانچے میں ڈھل گیا ہے

دوسرا سین

اِدھر یہ بدمستیوں میں تھے مست اُدھر زمانے نے رنگ بدلا
اٹھا حقیقت کے رُخ سے پردا تو سامنے سین دوسرا ہے
نہ اب وہ پہلی سی رنگ رلیاں نہ اب وہ پہلے سے بادہ کش ہیں
کہاں کی مے ہے کیسی بادہ نوشی ہے کہ اب تو نقشہ بدل گیا ہے

نہ کوئی ساتھی، نہ کوئی ہمدم اکیلا بیٹھا ہے سر جھکائے
ہوا جو پیسے سے ہاتھ خالی تو سارا مجمع بچھڑ گیا ہے
وہ منہ دکھاوے کی دوستی کرنے والے مطلب کے آشنا تھے
اب ان کا مطلب نہیں ہے اس سے کہ ان کا مطلب نکل چکا ہے

غمِ افلاس نے بھلا دی غزال چشموں کی یاد دل سے
پلائی وہ مفلسی نے آتشی نشہ ہرن جس سے ہو گیا ہے
نہ تن پہ کپڑے نہ پاس دمڑی نہ بھوک سے بولنے کی طاقت
ہر ایک کے ہاتھ پر نظر ہے ہر ایک کے منہ کو دیکھتا ہے

نشہ چڑھا تھا تو زور و زر تھا خمار اترا تو خواب تھا سب
وہ بادہ نوشی کی ابتدا تھی یہ بادہ نوشی کی انتہا ہے
چلی ہے اب کے ہوا یہ کیسی جو چڑھی ہے کچے گھڑے کی سب کو
کچھ ایک دو پر نہیں ہے آوے کا آوا سارا بگڑ گیا ہے

یہ سوچ رکھو ہے بادہ مستی کے ساتھ ہی فقر و فاقہ مستی
شراب اگر ہے دو آتشہ تو نشہ بھی اس کا دو آتشہ ہے
ہے خانہ ویرانی ہم رکاب اس کے وہ خزاں ہے یہ بادہ نوشی
پڑا ہے جس گھر پہ اس کا سایہ بسا بسایا اجڑ گیا ہے

ادھر بشر کی سرشت میں "شر" ہے اس طرف "شر" شراب میں ہے
خدا بچائے بشر کے حق میں شراب اک بس بھری بلا ہے
یہ دورِ جام اے شراب نوشو! فلک کی گردش سے کم نہیں ہے
چلا ہے یہ دور جس جگہ اس زمیں کا تختہ الٹ دیا ہے

مخزن جون ۱۹۱۸ء

قطعہ

نہ دے بشارتِ فصلِ بہار اے صیاد
چمن سے کیا انہیں جو بال و پر نہیں رکھتے
جو دیکھتے ہیں تجھے بلکہ دیکھ سکتے ہیں
مری نگاہ میں ذوقِ نظر نہیں رکھتے

علامہ تاجور

جہانگیر اور اُس کا مقبرہ

مزار سے خطاب

انتخابِ ہفت کشور خطۂ پنجاب ہے — اور تو پنجاب کا اک گوہرِ نایاب ہے
یہ سپہرِ حسن تو خورشیدِ عالم تاب ہے — تیری پیشانی دل افروزِ اولو الالباب ہے

یہ جو محمل ہے تو اس کا صاحبِ محمل ہے تو
پہلوئے پنجاب میں کچھ شک نہیں ہے دل ہے تو

زندگی کی کشمکش سے جس کا جی گھبرا گیا — سیر سے جو اس تمدن زار کی اُکتا گیا
جو ہجومِ غم سے گھبرا کر ترے پاس آ گیا — رازِ ہستی تو اشاروں میں اسے سمجھا گیا

حل کیا تو نے یہ مضمونِ ادق اس کے لیے
بن گیا تو زندگی کا اک سبق اس کے لیے

ہو نہ کچھ تاریکیٔ انجام کا جس کو خیال — جس کے دل سے مٹ گئی ہو یک قلم یادِ مآل
نذرِ مستقبل ہوا جو بے خودِ ماضی و حال — جس کے حق میں زندگی بن جائے لاینحل سوال

اس کے دل سے پردۂ غفلت اٹھا دیتا ہے تو
سچ تو یہ ہے آدمی اس کو بنا دیتا ہے تو

شہنشاہ جہانگیر سے خطاب

اے شہنشاہِ جہانگیر اے جہانِ حسن و عشق — تیرے حسن و عشق سے رنگین بیانِ حسن و عشق
قبر تیری کعبۂ دل دادگانِ حسن و عشق — تیرا مرقد ہے مجسم داستانِ حسن و عشق

زینت افروزیٔ اربابِ مروت تجھ سے ہے
گرمیٔ ہنگامۂ بزمِ محبت تجھ سے ہے

وامق و عذرا کے قصے بن گئے ہیں نقش آب — لیلیٰ و مجنوں کے افسانے ہیں مدفونِ کتاب
داستانِ خسرو و شیریں ہے اک بھولا سا خواب — الغرض تاریخِ حسن و عشق ہے زیرِ نقاب

ہاں مگر تیرے سبب اے شہریارِ حسن و عشق
آج تک ہے شہرۂ ہنگامہ زارِ حسن و عشق

غم پرستوں کی خبر لے اے شہِ عشرت پرست — فاقہ مستوں کو بھی دیکھا اے شہر یارِ بادہ مست
تیرے عہدِ امن کا زیبِ وزیر ہے بندوبست — جس کو دیکھو پھر رہا ہے آج وہ تہی دست
خوابِ راحت سے اٹھ اے آسودۂ خوابِ گراں
دیکھ اپنی آنکھ سے بربادیٔ ہندوستاں
عہدِ ماضی میں ترے اے خسروِ ہندوستاں — لوگ کہتے ہیں یہ ویرانہ تھا اک جنت نشاں
اس کو فردوسِ زمیں کہتے تھے کل اہلِ جہاں — تھا موافق اس کے ہر مقصد کے دورِ آسماں
غیرتِ گلشن تھا یہ جنت نشاں یادش بخیر
تھا کبھی ہندوستاں ہندوستاں یادش بخیر
کل کے اس جنت نشاں ہندوستاں کو آج دیکھ! — آہ! اس گلزارِ تاراجِ خزاں کو آج دیکھ!
کھول آنکھ اس عبرت آبادِ جہاں کو آج دیکھ — اس کو دیکھ اس کے زمین و آسماں کو آج دیکھ!
ہر روش اس کی مجسم شکوۂ تقدیر ہے
پتہ پتہ اس چمن کا درد کی تصویر ہے

(ہمایوں فروری ۱۹۲۳ء)

★

ملکۂ نور جہاں

تو اے نور جہاں ہے برقِ طورِ جلوہ آرائی — تو اے نور جہاں ہے رونقِ چشمِ تماشائی
تو اے نور جہاں ہے حسنِ معنی جانِ رعنائی — تو اے نور جہاں ہے دلکش اک تصویرِ زیبائی
ترا حسنِ جہاں آرا جہاں افروزِ الفت ہے
ترا مہرِ تجلی آسماں افروزِ الفت ہے
ہے نازاں ہند تجھ پر نازشِ ہندوستاں تو ہے — نہیں کچھ ہند ہی پر منحصر نور جہاں تو ہے
جہاں اک پیکرِ بے جاں ہے اس پیکر میں جاں تو ہے — جہاں اک آسماں ہے آفتابِ آسماں تو ہے
ترا مہرِ تجلی نور بخشِ چشمِ انجم ہے
ترا دیدارِ حسن اک محشرستانِ تلاطم ہے
جہاں بانی کو تیری مانتا ہے ہر عقیل اب بھی — ہیں تیرے کارنامے کامرانی کی دلیل اب بھی
مسلّم کشور آرائی تیری بے قال و قیل اب بھی — مورخ کی زباں پر ہے ترا ذکرِ جمیل اب بھی
زمیں گیری نے تیری کی ہے حاصل آسماں گیری
شکستہ قبر تیری دیتی ہے درسِ جہاں گیری

درخشاں سطحِ راوی پر ہے تیری آب و تاب اب تک — درخشانی ہے تیری سر بہ سر چشمِ حباب اب تک
ترے نظارے ہیں آسودۂ آغوشِ آبِ اٹک — ہے تیرا منتظر پانی میں عکسِ آفتاب اب تک

لبِ راوی کسی دن دیکھ پائی تھی جھلک تیری
کلیجے سے لگائے پھرتی ہیں موجیں چمک تیری

لحد ہے چپ تجھے لیکن زبانِ حال گویا ہے — تری خاموشیٔ مرقد میں بھی اک بات پیدا ہے
تو زیرِ خاک ہو کر بھی زیارت گاہِ دنیا ہے — شکستہ قبر تیری کعبۂ چشمِ تماشا ہے

زمینِ شہدرہ! تو ہے حریفِ چرخِ مینائی
کہ تجھ میں دفن ہے ہندوستاں کی کشور آرائی

مخزن، فروری و مارچ ۱۹۲۰ء

نوائے غم

گل گریباں چاک ہیں گلشن میں شبنم اشکبار — کس پریشانی میں ہے سنبل کا جامہ تار تار
قمریٔ گلزار کی گردن میں ہے کیوں طوقِ غم — نرگسِ بیمارِ گلشن کو ہے کس کا انتظار
دن کا چہرہ کس کے دردِ عشق سے ہے زرد رنگ — کی سیہ پوشی یہ کیوں لیلائے شب نے اختیار
عشق اس غم میں کہ ہوں دنیا میں محرومِ اثر — حسن کو یہ فکر بس دو دن کی ہے میری بہار
بہہ پڑیں دنیا میں نالوں سے زمیں کے ندیاں — اشکہائے کوہ جاری ہیں بشکلِ آبشار
ٹکڑے ہوتا ہے جگر سن کر پپیہے کی صدا — اللہ اللہ کتنی غم افزا ہے گلبانگِ ہزار
باغ میں ہے کس قدر کوئل کی کُو کُو درد ریز — کس کا دردِ جستجو رکھتا ہے اس کو بے قرار
گل بظاہر ہنستے ہیں کرتے ہیں لیکن زہرخند — اپنی ہستی دیکھ کر گلزار میں ناپائیدار
دل کی آنکھوں سے ذرا غم خانۂ عالم کو دیکھ — غم کی اک تصویر ہے ہستی کی یہ ساری بہار
خندۂ عشرت ہے اے دل گریۂ غم کا پیام — بس خزاں کی مختصر تمہید ہے فصلِ بہار
عیشِ کامل گلشنِ ہستی میں ہے عنقا صفت — پھول ہنستے ہیں تو ہو جاتی ہے شبنم اشکبار
غم کی بیباکی نہیں مخلوق پر کچھ منحصر — ہے خدا غم خوار بھی بندوں کا گر ہے غمگسار
غم کی یہ ہر دلعزیزی عام ہے اے تاجور — غم کا دلدادہ ہے پروردہ ہو یا پروردگار

غم کی عالمگیریاں چھائی ہوئی ہیں چار سو
ہے بس اس غم کی جہانگیری کا سب پر اقتدار

(مخزن اگست ۱۹۱۷ء)

رنگِ تغزل

اس بت کی تجلی کو اے اہلِ نظر دیکھا
تم دیکھنے والوں کا پتھر کا جگر دیکھا

یکجی جبیں پامالی کیا دیکھنے والوں کی
دل آئی تری شامت پھر دیکھ ادھر دیکھا

آتش کدۂ دل سے اٹھتا تھا دھواں شاید
دنیائے محبت میں اٹھتے تھے شرر دیکھا

دل میں اتر آتا ہے آنکھوں سے وہ بت کیا ہے
اے اہلِ نظر مجھے اے اہلِ نظر دیکھا

جس دیکھنے والے کی تم شمعِ شبستاں تھے
ہنگامِ سحر اس کو پامالِ نظر دیکھا

اے تاجورِ رنگیں کیا شعلہ بیانی ہے
سن سن کے پگھلتے ہیں پتھر کے جگر دیکھا!

★

وجہ بربادیٔ دلِ عشق فسوں ساز نہ ہو
صاحبِ شانہ کہیں خانہ برانداز نہ ہو

ضبطِ فریاد سے ہو جائیں نہ آنکھیں پرنم
پردہ داری ہی کہیں پردہ درِ راز نہ ہو

روح پرواز کرے گی قفسِ عنصر سے
قفسِ بلبل میں اگر طاقتِ پرواز نہ ہو

صدرِ محفل نہ ہو تو ہی کہیں اس محفل کا
بزمِ محشر بھی تری انجمنِ ناز نہ ہو

ہوک سی اٹھنے لگی دل میں خدا خیر کرے
جس کا انجام نہیں اس کا یہ آغاز نہ ہو

تاجورِ ترکِ محبت کی قسم ٹوٹ نہ جائے
وہ فسوں ساز کا انداز وہ انداز نہ ہو

★

ہے قیدِ قفس چشمِ بصیرت سے ذرا دیکھ
تو دام سمجھتا ہے جسے دام نہیں ہے

لائے گا کبھی رنگ ترا رنجِ اسیری
اک رنگ یہ ابلقِ ایام نہیں ہے

"الیسر مع العسر" اگر سچ ہے تو پھر کیا
اس صبحِ حقیقت کی کوئی شام نہیں ہے

آزادیٔ کامل تجھے ہوگی کبھی حاصل
یہ تیری تمنا ہوسِ خام نہیں ہے

صیاد نے گر قید میں رکھا تو ہوا کیا — پابندِ قفس گردشِ ایام نہیں ہے

★

اے آرزوئے شوق تجھے کچھ خبر ہے آج — حسنِ نظر نواز حریفِ نظر ہے آج
ہر راز داں ہے حیرتیِ جلوہ ہائے راز — جو باخبر ہے آج وہی بے خبر ہے آج
کیا دیکھئے کہ دیکھ ہی سکتے نہیں اسے — اپنی نگاہِ شوق حجابِ نظر ہے آج
ہے جلوہ کار کس کا جمالِ جہاں فروز — ہم رنگِ نورِ جلوۂ شام و سحر ہے آج
کیا سازگارِ عشق ہوئی ہے فضائے دہر — ہر آہِ نارسا میں بھی رنگِ اثر ہے آج
ظلمت فساں ہے رنگِ نمودِ سحر میں کون — کس درجہ دل فروز جمالِ سحر ہے آج
دل بھی نہیں ہے محرمِ اسرارِ عشقِ دوست — یہ راز داں بھی حلقۂ بیرونِ در ہے آج
ایماں فروزِ عشق ہے نیرنگیٔ جمال — ہر آن شانِ دوست برنگِ دگر ہے آج
کل تک تھی دل میں حسرتِ آزادیٔ وطن — آزاد آج ہیں تو غمِ بال و پر ہے آج

کل تک کہ تھا فسانۂ ہر بزم و انجمن
عبرت کا ہے مقام وہی تاجور ہے آج

★

درد ہی دل کیلئے خود ہے دوائے دردِ دل — ابتدائے دردِ دل ہے انتہائے دردِ دل
دولتِ دنیا ملی تجھ کو تو دردِ دل ملا — دردِ دل کی قدر کر اے مبتلائے دردِ دل
باغ میں اک اک کلی ہے اک پیامِ دردناک — پتے پتے پر لکھا ہے ماجرائے دردِ دل
درد بڑھتے بڑھتے آخر شعلۂ غم بن گیا — آتشِ جاں سوز ہے دل میں بجائے دردِ دل
درد سے حاصل ہوا ہے دل کو لطفِ زندگی — دل مرے سینے میں زندہ ہے برائے دردِ دل
دل بھی دردِ دل کی صورت کر چکا ہے اختیار — کچھ نہیں سینے میں میرے کیا سوائے دردِ دل

ہاں کوئی فولاد کا ٹکڑا ہے وہ اے تاجور
دل اگر پہلو میں ہے نا آشنائے دردِ دل

★

محبتِ دوست تا دمِ مرگ راحتِ جاں فزا رہے گی — زباں پہ جاری رہے گا یہ نام منہ میں جب تک زباں رہے گی
نوازشِ گردشِ زمانہ حریفِ عمرِ رواں رہے گی — حواسِ خمسہ بجا ہیں جب تک جہانِ ہفت آسماں رہے گی
مٹا رہے ہیں وہی ہمیں جن کے عہدِ الفت میں مر مٹے ہم — جہانِ الفت کی بے وفائی بھی یادگارِ جہاں رہے گی

★

غمِ محبت میں دل کے داغوں سے رشکِ لالہ زار ہوں میں
فضا بہاریں ہے جس کے جلووں سے وہ حریفِ بہار ہوں میں

تہ فریبِ ستم کی کیوں یادگار باقی رہے جہاں میں
مجھے مٹا دے ترے طلسمِ فریب کی یادگار ہوں میں

چمن طرازیِ چشمِ خونبار سے بہاریں ہیں جیب و دامن
بہارِ گلشن کو کیا کروں لے کے آپ اپنی بہار ہوں میں

تیری محبت میں میرے چہرے سے ہے نمایاں جلال تیرا
ہوں تیرے جلووں میں محو ایسا کہ تیرا آئینہ دار ہوں میں

مٹوں گا مٹنے کو لیکن اے روزگارِ پر آشوب رنج ہے یہ
کہ تیرے ہوتے ہوئے بھی تختۂ مشقِ گردشِ روزگار ہوں میں

کھٹک رہا ہوں ہر اک کی نظروں میں بچ کے چلتی ہے مجھ سے دنیا
نہ ہے گراں بارئ محبت کہ دوشِ ہستی پہ بار ہوں میں

کہاں ہے تو وعدۂ وفا کر کے اور مرے بھول جانے والے
مجھے بچا لے کہ پائمالِ قیامتِ انتظار ہوں میں

وہ حسن بے اعتماد اے تاجور اب ہوا التفات فرما
تو زندگی اب سنا رہی ہے کہ عمرِ بے اعتبار ہوں میں

★

وفا کے گائے ہوئے گیت گا رہا ہوں میں — سنی سنائی کہانی سنا رہا ہوں میں
جفائے دوست بنی رہنمائے منزلِ دوست — وہ ٹھوکریں ہیں مجھے ان کو پا رہا ہوں میں
ہے میری خاک کے ذروں میں کیوں نمودِ حیات — کہیں ما نہیں تو نہیں یاد آ رہا ہوں میں
سزائے جرمِ وفا مل رہی ہے یہ کہ مجھے — مٹا رہے ہیں وہ جن پہ مٹا رہا ہوں میں
نہ چھیڑ بیکسئ غم میں شکوۂ احباب — کہ اپنی اک نئی دنیا بسا رہا ہوں میں
مرا فسانۂ غم دل نے بھی کبھی نہ سنا — قتیلِ شکوۂ درد آشنا رہا ہوں میں
محبت آہ محبت کی زندگی مت پوچھ — تری مصیبتوں میں مبتلا رہا ہوں میں
متاعِ زیست ہوئی نذرِ بے نیازئ دوست — بلا کے وعدۂ صبر آزما رہا ہوں میں
ہے کائنات کا ہر ذرہ ہمنوا میرا — کچھ ایسا محفلِ ہستی پہ چھا رہا ہوں میں

نہ ہے نصیب ترا دردِ عشق دل کو ملا
نہ ہے نصیب مرا و اپنی پا رہا ہوں میں

اب آرہی ہے مجھے دل نوازیوں کی
اب اپنے آپ کو دل سے بھلا رہا ہوں میں

وفا پرست ہے اے تاجور سرشت مری
ادا پرستِ جہاں بنا رہا ہوں میں

★

حشر میں پھر وہی نقشہ نظر آتا ہے مجھے
آج بھی وعدۂ فردا نظر آتا ہے مجھے

دیکھ کر تجھ کو ہوئے محوِ تحیر مرے ہوش
کیا بتاؤں تجھے تو کیا کیا نظر آتا ہے مجھے

خلشِ عشق مٹے گی مرے دل سے جب تک
دل ہی مٹ جائے گا ایسا نظر آتا ہے مجھے

رونقِ چشمِ تماشا ہے مری بزمِ خیال
اس میں وہ انجمن آرا نظر آتا ہے مجھے

عبرت آموز ہے بربادیٔ دل کا نقشہ
رنگِ نیرنگیٔ دنیا نظر آتا ہے مجھے

وادیٔ عشق ہے وحشت کدۂ ویرانی
ایک اک ذرے میں صحرا نظر آتا ہے مجھے

ان کا ملنا ہے نظربندیٔ تدبیر اے دل
صاف تقدیر کا دھوکا نظر آتا ہے مجھے

رہتی ہے غم کدۂ دل میں تجلی اس کی
دل میں اک داغِ تمنا نظر آتا ہے مجھے

بت کو بت جان کے پوجوں نہیں کافر اے شیخ
بت میں بت ساز کا جلوہ نظر آتا ہے مجھے

تجھ سے اب کیا کہوں اے سوختۂ جلوۂ طور
دل کے آئینے میں کیا کیا نظر آتا ہے مجھے

دل کے پردے میں چھپایا ہے ترے عشق کا راز
خلوتِ دل میں بھی پردہ نظر آتا ہے مجھے

بچ رہا تھا فقط اک تاجورِ شعلہ طراز
وہ بھی بربادِ تمنا نظر آتا ہے مجھے

★

قید میں وردِ زباں شکوۂ صیاد رہے
لبِ فریاد نہ بیگانۂ فریاد رہے

خود فراموشِ محبت کو بھی کرتا کبھی یاد
اور مرے وعدۂ فراموش اگر یاد رہے

غم نوازی نے تری کر دیا غم دوست ہمیں
شاد ہم تیری بدولت دلِ ناشاد رہے

بننا پڑتا ہے ستمگر کو ستم کش آخر
یاد یہ بھی تجھے اے بانیٔ بیداد رہے

دلِ مایوس مسرت کو نہ بہلا ظالم
یہ کبھی شاد رہا ہے نہ کبھی شاد رہے

ایسی گلگشت سے زنداں کی اسیری اچھی
جب چمن میں بھی نہ اہلِ چمن آزاد رہے

★

زبانِ حال سے کہتی ہے باغ میں شبنم — مآلِ غنچۂ خنداں پہ اشکبار ہوں میں
مٹا نہ مجھ کو محبت کی خود فراموشی — کہ اپنے بھولنے والے کی یادگار ہوں میں
ہوں ننگِ زیست کہ جاں کر نہ سکا اس پہ نثار — کسی کے دردِ محبت سے شرمسار ہوں میں
ہوں مثلِ سبزۂ خوابیدہ وقفِ پامالی — چمن میں رہ کے بھی بیگانۂ بہار ہوں میں
زہے وعدۂ صبر آزما خدائی پناہ!
کہ ایک عمر سے پابگلِ انتظار ہوں میں

★

کیسی نیرنگی عجائب خانۂ عالم میں ہے — کوئی سرشارِ مسرت ہے کوئی ماتم میں ہے
کس کی یاد آ کر تجھے وقفِ تحیر کر گئی — خود فراموشِ جنوں اس وقت کس عالم میں ہے
درد کی لذت پہ مرتا ہے جو درد آشنا — وقفِ غم سے پوچھ کتنا کیفِ راحت غم میں ہے
دیکھ ہی لیتی ہے تجھ کو دیکھنے والے کی آنکھ — لاکھ پردوں میں بھی تو مشقِ نظر عالم میں ہے
تو ہوا نذرِ قفس اے تو گرفتارِ قفس — باغ میں ہر گل گریباں چاک تیرے غم میں ہے
تیری ہستی اک معمہ ہے طلسمِ دہر کا — تو سراپا رازِ حیرت خانۂ عالم میں ہے
وہ ہمارے ہو رہیں سارا زمانہ چھوڑ کر
تاجور ایسا بھی کیا سرخاب کا پر ہم میں ہے

★

مری زندگی جو کشاکشِ غمِ زندگی میں بسر ہوئی
تو کہا یہ عشق نے آ ادھر تری زندگی کو سنوار دوں
یہ ہے احترامِ جنونِ عشق یہ فرضِ مذہبِ عشق ہے
کہ بہارِ عمر کو سوگوارِ بہار ہی کے گزار دوں
تجھے کیا سناؤں یہ حادثہ کہ چمن میں جوشِ بہار ہے
تجھے ہم صفیرِ قفس کی قید میں کیا نویدِ بہار دوں

★

★

جور و جفا سے جبر کار صاحبِ جاہ بن گئے
اتنے اُٹھے کہ ہمسرِ منزلِ ماہ بن گئے

تو نے تو اے ستم طراز ان کی بھی کچھ خبر نہ لی
آہ جو تیری راہ میں صدقۂ راہ بن گئے

سینۂ کوہسار میں جاگ اٹھی ہے زندگی
تیرے فشارِ درد سے کوہ بھی کاہ بن گئے

جس نے خودی کی راہ لی اس کیلئے تو اے ندیم
راہ کے خارزار بھی مسندِ الٰہ ہو گئے

کس سے ترا گلہ کرے جبر پذیر زندگی
جبر نواز تیرے جور میرے گناہ بن گئے

جبر پہ صبر کفر ہے گرچہ یہ دیکھتا ہوں میں
جبر پرست جور سے کر کے نباہ بن گئے

★

دلِ ناشاد کو لذت کشِ بیداد نہ کر
خود تو فولاد ہے ظالم اسے فولاد نہ کر

قبر کا بھی نہ رہے میری نشاں یہ تو نہ ہو
اتنا اے خانہ خرابی مجھے برباد نہ کر

روح بے چین ہوئی جاتی ہے میری تنہاک
بھولنے والے مرے بعد مجھے یاد نہ کر

پھونک دے مجھ کو اگر لاگ ہے مجھ سے اے برق
ایک میرے لئے گل باغ کو برباد نہ کر

رکھ کے خنجر وہ گلے پہ مرے فرماتے ہیں
تاجور ضبط کا دعویٰ ہے تو فریاد نہ کر ۱؎

★

محبت میں نہ ہاں کریں تو اسیرِ فغاں کر لوں
شکستہ دل کی آہوں کو حریفِ آسماں کر لوں

نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی نہ وہ بدلے
میں کیسے اعتبارِ انقلابِ آسماں کر لوں

ذرا کر وقفۂ تماشا اے تحیر اتنی مہلت دے
کہ ان سے داستانِ درد کچھ اپنی بیاں کر لوں

زباں نے دامنِ فریاد کو چھوڑا نہیں اب تک
مدد اے جوشِ غم آنکھوں کو ہمرازِ فغاں کر لوں

نہ ہوگی آبرو کچھ وحشت آبادِ محبت میں
نہ جب تک جامۂ ہستی کو اپنے دھجیاں کر لوں

سبب ہر ایک مجھ سے پوچھتا ہے میرے رونے کا
الٰہی ساری دنیا کو میں کیسے رازداں کر لوں

وہ میری داستانِ سوزِ غم مجھ سے اگر سن لیں
انہیں بھی تاجور اپنی طرح آتش بیاں کر لوں

۱؎ یہ غزل ۱۹۱۶ء میں نجیب آباد میں لکھی گئی یہ عہدِ طالب علمی کی ایک یادگار ہے۔

★

سچ ہے کہ دل فریبیٔ رنگِ رخِ بہار کیا
حُسن پہ اعتماد کیوں وقت کا اعتبار کیا

مرنے گئے جو عشق میں ان کا نشاں نہ پا سکی
ان کو تلاش کرتی ہے گردشِ روزگار کیا

اے غمِ مرگِ بیکسی جان تیرے سپرد ہے
دوستِ بہانہ ساز کا کیجئے اعتبار کیا

دیکھ رہا ہوں جلوۂ دوست ہر اک حجاب میں
کس کا چمن کہاں کا دشت کیسی خزاں بہار کیا

اپنی نظر میں بھی مجھے رفعتِ حزن بنا گئی
یہ مری بات بات پر آپ کی بار بار کیا

مان لیا کہ تاجور وہ نہیں اختیار میں
کہئے تو اپنے دل پہ ہے آپ کو اختیار کیا

★

آ۔ اپنے اسیرِ محبت کو آزادِ غمِ دنیا کر دے
دنیا سے نرالے دوست مجھے دنیا سے بے پروا کر دے

دل درد کو درد سمجھتا ہے اس رنگِ محبت پر بھی نظر
دے ذوقِ محبت دل کو یا اس راہ میں اس کو فنا کر دے

اس عہد میں ہر انسان ہوا ہے تیری وفا سے بیگانہ
کر رحم کہ اس مرگِ انبوہ سے مجھ کو مستثنیٰ کر دے

محروم نظر ہے دل میرا اے حسنِ اتم اے بحرِ کرم
اس ذرے کو خورشید بنا اس قطرے کو دریا کر دے

اس دورِ کہن میں خاک نہیں معمورۂ ہستی اور بنا
انکار نہ سے اے شاعر تعمیر نئی دنیا کر دے

فطرت کا ہر منظر اک سربستہ راز بنا ہے قدرت کا
ان مست نگاہوں سے ... قدرت کے راز افشا کر دے

اے واعظ کیا سمجھاتا ہے میں اس کو دیکھنے والا ہوں
جو اپنی ایک نظر سے پتھر میں بھی دل پیدا کر دے

اے دوست ترے ہوتے بھی طلسمِ راز بنی ہے کیوں ہستی
اس چہرے سے بھی نقاب اٹھا اس راز کو بھی رسوا کر دے

اے تاجور ان آلام میں یہ ابہام نوائی کیا کہنا!
عالم جو ہجومِ غم سے ملے کچھ چین تو جانے کیا کر دے

★

اب تو جینے کی تمنا دلِ مضطر میں نہیں
وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تیرے مقدر میں نہیں

بس رہا ہے مری آنکھوں میں وہی جانِ بہار
جس کا ہم رنگ کوئی پھول چمن بھر میں نہیں

محفلِ محشر بھی سونی نظر آتی ہے مجھے
ڈھونڈتی ہیں جسے نظریں وہی محشر میں نہیں

دل کا وہ حال کہ ہر جلوے پہ دم دیتا ہے
ان کی یہ شان ابھی حال ہے ٹھوکر میں نہیں

کیا دل افروز ہے ساقی تری آنکھوں کا خمار
جو مزے ہوش ربا ان میں ہے ساغر میں نہیں

سنگ دل تجھ پہ محبت کا اثر ہو کیونکر
دل میں احساس ہوا کرتا ہے پتھر میں نہیں

تاجور شعر ترے سن کے تڑپ جاتا ہوں
کاش جو تیری زباں میں ہے وہ نشتر میں نہیں

★

گلشن کی ڈالی ڈالی یہ قبضے خزاں کے ہیں
جھنڈے گڑے ہوئے ستمِ آسماں کے ہیں

رہ رہ کے برق گرتی ہے ان پہ ہی بار بار
گلشن میں چار تنکے مرے آشیاں کے ہیں

دل لے چلا ہے جان کو دم دے کے تو کدھر
میں بھی تو پوچھ لوں کہ ارادے کہاں کے ہیں

سارے جہاں کو گنجِ شہیداں بنا دیا
یہ سارے گل کھلائے ہوئے آسماں کے ہیں

اشکوں کی راہ پہ نہ رہا ہو دلِ حزیں
دامن میں میرے پھول یہ کس بوستاں کے ہیں

اہلِ چمن کو قیدِ قفس کی ہے آرزو
صیاد سے بھی بڑھ کے ستم باغباں کے ہیں

ہونے لگا ہے ہند و مسلم میں اتحاد
دن پھرنے والے کشورِ ہندوستاں کے ہیں

سن سن کے اہلِ درد تڑپتے ہیں تاجور
نشتر ہیں جتنے حرف مری داستاں کے ہیں

★

تجھے مرحبا کہ دلِ نژاد بحالِ زار و نزار ہے
ترے دردِ عشق کو آفریں مری زندگی مجھے بار ہے

یہ چلی ہوئی سی بہار کیوں ہے کہاں وہ جانِ بہار ہے
یہ چمن سے کون چلا گیا کہ کلی کلی میں فشار ہے

یہ نشیمنِ غم کدۂ قفس ہے عزیز جاں مجھے ہم قفس
دلِ داغدار بزخمِ بہار میں یادگارِ بہار ہے

تمہیں جاں فروز بنا کے حسن نے جہاں فروز بنا دیا
وہ فروغِ بزمِ جمال کون ہے؟ عشق نادرہ کار ہے

میں بہارِ عمر کو سوگوارِ بہار بن کے گزار دوں
تری یہ رضا ہے تو اس فضا پہ بہارِ عمر نثار ہے

غمِ آشیاں مرے بال و پر نے قفس کو پھونک دئے کہیں
یہ نویدِ مرگ ہے ہم قفس کہ چمن میں جوشِ بہار ہے

ترے باغ میں ہے بہار تجھکو مبارک اے مرے باغباں
جو کھلا ہے میری نظر میں پھول وہ انتخابِ بہار ہے

نہیں اس میں شک کوئی تاجور کہ تڑپ ہے تیرے کلام میں
مگر اس میں تیرا کمال کیا غمِ دوست درد نگار ہے

★

اسی میں خدا کی رضا چاہتا ہوں
بتوں کو بنامِ خدا چاہتا ہوں

ملامت کروں ان کی منہ پہ تمہاری
نہیں بھی اگر چاہتا، چاہتا ہوں

ترا دور داب جاں ستاں بن چلا ہے
مٹا جا رہا ہوں مٹا چاہتا ہوں

یہ غزل برصغیر کی تقسیم سے پہلے کی ہے۔

محبت کی باتیں محبت کی گھاتیں — نہیں جانتا جاننا چاہتا ہوں
نہ ہوگا کوئی مجھ سا تنگِ محبت — کہ اِس درد کی میں دوا چاہتا ہوں
کوئی کاش اُس بزم میں مجھ سے پوچھے — میں کیوں مضطرب ہوں میں کیا چاہتا ہوں
خدا مجھ کو مجھ سے بھی محروم کر دے — جو کچھ اور تیرے سوا چاہتا ہوں
میں کیا چاہتا ہوں بتاؤں تمہیں کیا — میں خود سوچتا ہوں کہ کیا چاہتا ہوں

نظر بھر کے جو دیکھ سکتے ہیں تجھ کو
میں ان کی نظر دیکھنا چاہتا ہوں

★

حسن کو اپنے عروجِ بے کراں پہ ناز ہے — خاکِ دل کا ذرہ ذرہ لامکاں پرواز ہے
سازِ دل پر گا رہا ہے یہ سکوتِ شب میں کون — کس بلا کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز ہے
تھی حریفِ رازِ خاموشی کبھی اب ہے یہ حال — رازِ گفتاری بھی اپنی پردہ دارِ راز ہے
حسن کے پیکر میں نورِ عشق ہے آئینہ کار — حسن کی عالم فریبی عشق کا اعجاز ہے
تیرے جلووں سے فروزاں ہے فضائے کائنات — دہر کے ہر ساز میں تیری حسیں آواز ہے
ہو رہا ہے محفلِ ہستی میں کس کا انتظار — کون آتا ہے کہ عالم گوش برآواز ہے
خود شناسی زندگی ہے خود فراموشی ہے موت — گوشِ دل سے سن اسے یہ وقت کی آواز ہے

بال و پر کے ساتھ یادِ آشیاں بھی مٹ گئی
شوقِ پرواز اب نہیں ہے حسرتِ پرواز ہے

★

ہے دل میں کبھی درد کبھی دردِ جگر ہے — اب آپ کا بیمار اِدھر ہے نہ اُدھر ہے
یہ گردشِ افلاک جو یوں زیر و زبر ہے — آہوں کا اثر ہے مری آہوں کا اثر ہے
دل دے ہی چکا اب مرے پہلو میں جگر ہے — یہ قرض بھی اے خنجرِ جاناں مرے سر ہے
کیا دیکھ کے میں محفلِ دشمن میں گرا ہوں — اللہ رے بے خبری کچھ تجھے میری بھی خبر ہے
بلبل تجھے کیا اپنے نشیمن کا پتہ دوں — میرا تو نشیمن مرے صیاد کا گھر ہے
مدہوش ہوں اک شوخ کی ٹھوکر کی بلائیں — شوریدہ سری آج یہ سودا مرے سر ہے
اک مجھ سے ہے وعدہ کہ محالات پہ موقوف — اک غیر سے وعدہ ہے اگر ہے نہ مگر ہے
خود شوقِ شہادت میں گلا کاٹ رہا ہوں — اے تیغِ تغافل تجھے میری بھی خبر ہے
ڈھونڈے گی کہاں تو مجھے اے خانہ خرابی — آوارہ وطن ہوں مری غربت مرا گھر ہے

بس حضرتِ دل روکیے فریاد و فغاں کو — یہ محفلِ دشمن ہے کوئی آپ کا گھر ہے!
اک تیر ہوا ان کے لیے حرفِ شکایت — جھنجلا کے وہ بولے نہیں آئے کوئی گھر ہے
کوندے تو ذرا آج تری برقِ تبسم — طوفان اٹھانے کو مرا دیدۂ تر ہے
پہلے تو مرے دل کے لیے آفتِ جاں تھی — وہ تیغ وہ سراب کسی دل سے ادھر ہے
شاید کہ خزاں آنے کو ہے موسمِ گل پر — گلشن سے چمن زادوں کے اڑنے کی خبر ہے
دم توڑ رہا ہے کوئی فرقت میں تمہاری — جلد آؤ کہ اک شمع کے بجھنے کی سحر ہے
قربان ہوا تجھ پہ مرا دل بھی جگر بھی — اے تیغِ نظر اب تجھے کیا مدِ نظر ہے
برباد نہ کر کعبۂ دل کو مرے اے بت — اللہ سے ڈر دیکھ یہ اللہ کا گھر ہے
احباب مرے رونے خوں کس پہ کریں گے — ہوں میں بھی ادھر داورِ محشر بھی ادھر ہے
گو اب کے بھی یہ فصلِ گل آنکھوں میں کٹے گی — سنتے ہیں کہ گلشن ہی میں صیاد کا گھر ہے

لے آئے خبر تاب و توانِ دلِ مضطر
بے تاب ترا تاجورِ خستہ جگر ہے

★

اسی پر ظلم جس کے دلربا ہو — بڑے پکے سرے کے بیوفا ہو
بہار آئی ہوا بدلی چمن کی — چمن سے بلبلِ شیدا ہوا ہو
تمہیں سے درد میں کس طرح کہہ دوں — کہ دشمن کے تو تم درد آشنا ہو
بھروں کیا دم تمہاری دوستی کا — کہ دشمن ہو حریفِ مدعا ہو
تمہاری طرح میں بھی سنگدل ہوں — کرو جتنی تمہیں مشقِ جفا ہو
تری رنگینیاں پھر رنگ لائیں — ذرا سا ان میں گر رنگِ وفا ہو
انوکھی ہے تمہاری دلربائی — جہاں میں تم نرالے دلربا ہو
اِدھر ہم ہیں کہ شیدائی تمہارے — اُدھر تم ہو کہ دشمن پہ فدا ہو
بتاؤ تو میں کس کس کو مناؤں — کہ قسمت بھی خفا تم بھی خفا ہو
تجھے سمجھوں گا اے زلفِ مسلسل — رسائی پر ذرا بختِ رسا ہو
ستم پرور کہے گی کس کو دنیا — اگر تم دشمنِ اہلِ وفا ہو
کسی کی جانِ جاں ہوگے جہاں میں — مرے حق میں تو پیغامِ قضا ہو
دوائے درد بن کر دل میں اٹھے — تمہارا درد ہی دل کی دوا ہو
قسم کھاؤں گا میں بختِ عدو کی — کہ تم سا بے وفا اس پہ فدا ہو
مجھے کیا غم شبِ تاریکِ غم کا — کہ تم دل میں مرے جلوہ نما ہو

نہ ہو کچھ غم تری پہلو تہی کا — جو پہلو میں دل بے مدعا ہو
مری تربت پہ یہ کہنا کسی کا — کہ تم کاہِن وفا جانِ وفا ہو
مزہ اس دلبری کا تم بھی پوچھو — تمہارا دل بھی آئے تو مزا ہو
میں معجز پہ تو دم دیتا ہوں لیکن — انوکھا ہو نرالا ہو نیا ہو
بہت اس درد کو دل ڈھونڈتا ہے — مسیحا میرے تم جس کی دوا ہو

بہار آئی ہوئی توبہ سے توبہ
جناب تاجور سا پارسا ہو

مخزن ۔ اپریل ۱۹۱۵ء

★

کسی کی یاد نے جب دل کو بیقرار کیا — بلائیں پاس نہ تھیں بے کسی نے پیار کیا
ہمیں سے طرزِ ستم پوچھ کر ہمیں پہ ستم — ہمیں نے وار سکھایا ہمیں پہ وار کیا
نگاہِ مست نے مدہوش کر دیا دل کو — نشے میں ہو کے ہرن شیر کا شکار کیا
ستم کا نام بھی تم تو جانتے بھی نہ تھے — مری وفاؤں نے تم کو ستم شعار کیا
یہ ان کا حشر میں دعویٰ ہے طلبگار ہوں پر — خدا کے سامنے کیوں مجھ کو شرمسار کیا
ہماری خاک سے اے دل صبا کو لاگ رہی — اڑا کے غیر کے کوچے میں ہم کو خوار کیا
زباں ادا نہ کرے شکوۂ جفا تم سے — ستم ہوا کہ اسے ہم نے رازدار کیا
عدو کی سن کے برائی وہ مجھ سے روٹھ گئے — ذرا سی بات نے مجھ کو گناہگار کیا
ہزار شکر ہے جاں آفرینِ عالم کا — کہ مرتے دم بھی ترا ہم نے انتظار کیا
نہ پوچھ دستِ جنوں کی درازدستی کو — بہار آئی گریباں کو تار تار کیا
وفورِ یاس سے تو ہمت سوال نہ تھی — تری نگاہِ کرم نے امیدوار کیا
ہماری خاک پہ آ گئی ہے اس لیے نرگس — کہ مرتے دم بھی ترا ہم نے انتظار کیا
غمِ فراق میں گھٹ گھٹ کے دل تو بیٹھ گیا — جگر میں درد نے اٹھ اٹھ کے بیقرار کیا

خدا سے حشر میں اے تاجور یہ کہہ دوں گا
کہ تیری شانِ کرم نے گناہگار کیا

مخزن، مئی ۱۹۱۵ء

★

حسرتِ طالبِ دیدار رہی جاتی ہے — اک تمنا مرے سرکار رہی جاتی ہے
جاں بلب میں تری فرقت میں ہوا جاتا ہوں — تیرے سر پرسشِ بیمار رہی جاتی ہے
اچھا طالبِ دیدار کا دم آنکھوں میں — دیکھیے حسرتِ دیدار رہی جاتی ہے

سخت جانی کا نہیں خوف تو پھر اے قاتل　　میان میں کیوں تری تلوار رہی جاتی ہے
چشمِ بیمار سے اک بار ادھر بھی ہو نظر　　حسرتِ نرگسِ بیمار رہی جاتی ہے
تاجور دامنِ صحرا تو چھٹا ہاتھوں سے
آرزوئے خلشِ خار رہی جاتی ہے

مخزن دسمبر ۱۹۱۵ء

★

جب کہا تم رونقِ بزمِ حریفاں ہو گئے　　کیا ہی جھنجھلا کر وہ کہتے ہیں کہ ہاں ہاں ہو گئے
دل میں وہ ذوقِ خلش تھا میرے اے ناوک فگن　　جتنے پیکاں دل میں تو نے دل کے ارماں ہو گئے
تھا امانت جن دلوں میں آہ تیرا ضبطِ عشق　　ایک اک کر کے نثارِ سوزِ پنہاں ہو گئے
نالۂ دل میں تو میرے کچھ اثر ایسا نہ تھا　　چند قطرے اشک کے مل جل کے طوفاں ہو گئے
کہہ گئی کیا جانے ساقی کی نگاہِ آشنا　　مجھ سے دیوانے شریکِ بزمِ عرفاں ہو گئے
یاس نے دل سے مٹا دی کاوشِ امید و بیم　　یاس کے صدقے مرے سب کام آساں ہو گئے
ہائے وہ ارماں جن کو دل سے رکھتا تھا عزیز　　سب کے سب آسودۂ آغوشِ حرماں ہو گئے
کوئی انساں اپنا دشمن آج تک دیکھا نہیں　　تم مری جاں بن کے میرے دشمنِ جاں ہو گئے
اے نمک پاشِ جراحت کہیں وہ لذت پاشیاں[1]　　خالی اک اک زخم پر سو سو نمکداں ہو گئے
اس قدر الجھی ہوئی وہ عائد ہوئیں پابندیاں　　سرو سے آزاد بھی اب پا بجولاں ہو گئے
غیر کی کیا ہے شکایت غیر تو پھر غیر ہے
تاجور اب دوست بھی عزت کے خواہاں ہو گئے

مخزن جولائی ۱۹۱۷ء

★

لاش پر میری پیامی کامیاب آیا تو کیا　　بعد میرے میرے نامے کا جواب آیا تو کیا
خوگرِ دیدارِ جاناں ہے مری برقِ نظر　　حشر میں گر میرے سر پر آفتاب آیا تو کیا
تھی دلِ بلبل میں بوئے الفتِ گل موجزن　　بن کے آنسو چشمِ بلبل میں گلاب آیا تو کیا
میرے بدلے میری قسمت تو رہی مدہوشِ خواب　　میری آنکھوں میں تحیر بن کے خواب آیا تو کیا
پردہ دارِ حسن ہے خورشید کی بے پردگی　　جلوہ گاہِ ناز میں تو بے نقاب آیا تو کیا
کل بھری محفل میں دشمن سے رہے تم بے حجاب　　آج میرے سامنے تم کو حجاب آیا تو کیا
میری قسمت کی تری محفل میں تلچھٹ بھی نہ تھی　　رات بھر گردش میں گو جامِ شراب آیا تو کیا
زندگی میں میری حسرت دل کی دل ہی میں رہی　　بعد میرے گر جہاں میں انقلاب آیا تو کیا
اس کی چشمِ مست نے دیدار کی مہلت نہ دی[2]　　میرے ٹھکرانے کو وہ مستِ شباب آیا تو کیا

---

[1] کیا بلا کی طبیعت پائی ہے، ہر ایک شعر مرصع ہے۔ ایڈیٹر [2] منقول از الصباح

وقت تھا اے دل بکھر جانا تھا ان کی بزم میں
آج اے کم بخت تجھ کو اضطراب آیا تو کیا

خواب میں بھی ان کو بے خوابی کے خواب آئے نظر
خفتہ بختوں کو ترے آنے کا خواب آیا تو کیا

ہو مبارک ان کو اپنی نوجوانی کی بہار
ہو گئے ہم خاک اب ان پر شباب آیا تو کیا

نامہ بر عالمِ نزع میں بے فائدہ ہے گفتگو
کامیاب آیا تو کیا ناکامیاب آیا تو کیا

مجھ سے بیداری میں گر ملتا تو ہاں اک بات تھی
خواب میں میرے اگر وہ مست خواب آیا تو کیا

اس کا ہر ہر لفظ تو اے تاجور دل دوز ہے
نیز بن کر میرے نامے کا جواب آیا تو کیا

مخزن، دسمبر ۱۹۱۶ء

★

مٹایا گردشِ قسمت نے اس بت کی خطا کیا ہے
ہم اس پر مفت کیوں الزام رکھیں ہم کو مرنا ہے

اسے کہتے ہیں الفت عشقِ صادق ایسا ہوتا ہے
کہ مجنوں خاک ہو کر بھی غبارِ راہِ لیلیٰ ہے

وہ ہوں درد آشنا میں درد کی لذت پہ مرتا ہوں
مجھے تو نیشتر بھی مرہمِ زخمِ تمنا ہے

نقاب لن ترانی ہے رخِ انور کی تابانی
تمہاری بے حجابی خود حجابِ روئے زیبا ہے

کلیجے سے لگا کر کیوں نہ رکھوں نقشِ دل کو
بیابانوں کا گلشن ہے چمن زارِ تمنا ہے

ترا حسنِ شرابی ہوش اڑاتا ہے زمانے کا
پھر اس پر چشمِ خواب آلود سونے پر سہاگا ہے

ہوا ہے دل نشیں ایسا نکلتا ہی نہیں دل سے
ترا تیرِ نظر ہے دل میں یا دل کی تمنا ہے

مجھے بہکا لیا اس فتنۂ محشر نے محشر میں
یہ ہنس کر کہہ رہا ہے کہیئے دل کا مدعا کیا ہے

ہوئی فرصت دوا سے شاد باش اے الفتِ بیمار
قضا ہی اب ترے بیمار کے حق میں مسیحا ہے

میں ان سے کہہ چکا سو بار میری آرزو تم ہو
وہ جب کہتے ہیں یہ کہتے ہیں تیری آرزو کیا ہے

حقارت سے نہ دیکھ اے تاجور تو اشکِ حسرت کو
یہی قطرہ اگر طوفان پر آئے تو دریا ہے

★

وادیٔ الفت میں منزل کا پتہ ملتا نہیں
اس کٹھن رستے میں کوئی رہنما ملتا نہیں

درد اک رحمت ہے رنجِ بیکسی میں چارہ گر
درد سے بہتر کوئی درد آشنا ملتا نہیں

خود پرستی کر کہ حاصل ہو خدا سے ارتباط
خود فراموشوں کو دیوانے خدا ملتا نہیں

اپنی ہستی کو بھلا دینا سراسر کفر ہے
آپ کو تو ڈھونڈ کر تجھ کو خدا ملتا نہیں

خود ہو اپنا رہنما اے رہروِ راہِ طلب
خضر جب سے گم ہیں کوئی رہنما ملتا نہیں

خانہ بربادی کے ہاتھ آئی نہ میری بزمِ عیش
بجلیوں کو میرے خرمن کا پتا ملتا نہیں

رہنمائی کر مری غربت میں اے دردِ طلب — جس سے بچھڑا ہوں مجھے وہ قافلہ ملتا نہیں
چارہ گر فکرِ دوائے درد میں حیران ہے — مجھ کو یہ رونا کہ دردِ لا دوا ملتا نہیں
ہے حریفِ جانستاں ہر ذرۂ راہِ وطن — وائے بے دردی کوئی درد آشنا ملتا نہیں
وہ تو ہر شے میں ہے کوئی ڈھونڈنے والا تو ہو — کون کہتا ہے کہ ڈھونڈے سے خدا ملتا نہیں

جس کو دیکھو قوم کا وہ ناخدا ہے تاجور
اب دعا میں تو بھی کوئی باخدا ملتا نہیں

مخزن نومبر ۱۹۱۷ء

★

کسی سے الفت آباد جہاں میں پیار کر لینا — ہے اپنے ہاتھوں اپنی زندگی دشوار کر لینا
کہیں رسوا نہ ہوں رنگینیاں دردِ محبت کی — مرا اتنا خیال اے دیدۂ خونبار کر لینا
ستم کرنا ستم پرور مگر اتنی گذارش ہے — دل آزاری سے پہلے خوگرِ آزار کر لینا
نہیں پابندِ طور اصلا کسی کی جلوہ آرائی — تجلی آشنا بن ہر جگہ دیدار کر لینا
دکھانا دل میں رہ کر دل کو شانِ دلنوازی بھی — رگِ ہر دل میں مرہمائے دردِ عشقِ یار کر لینا
بس اتنی دلو دینا بعد میرے میری الفت کی — میں یاد آؤں تو اپنے آپ کو تم پیار کر لینا
تجھے گر کامیاب مدعا بننا ہے دنیا میں — تو اپنے آپ کو لذت کشِ آزار کر لینا
سراپا سوز ہوں کانٹے سے دل میں بھڑکتے ہیں — مجھے مشکل نہیں آہوں کو آتش بار کر لینا
بڑی سج دھج سے نکلے گی عروسِ تیغِ قاتل کی — ذرا مقتل میں پروازِ خم دامندار کر لینا

چمن والو چمن جب ہو چکا تاراجِ بربادی — قفس کی زندگی اپنے لیے دشوار کر لینا
یہ شانِ بے نیازی حسرتوں کا خون کر دے گی — تو مجھتے مجھتے اپنے آپ کو تلوار کر لینا

شریکِ غم نہ ہو جب بیکسی میں تاجور کوئی
تو دردِ دل کو اپنا مونس و غمخوار کر لینا

مخزن دسمبر ۱۹۱۷ء

★

اے شوخ برابر تری ہوگا کوئی کیا شوخ
تو شوخ، نظر شوخ، چلن شوخ، ادا شوخ
تم دستِ حنائی کو ملاؤ تو شفق سے
سرخیٔ شفق شوخ ہے یا رنگِ حنا شوخ

آتا ہے تو بے پر کی اڑاتا ہوا واں سے
تجھ سے بھی زیادہ ہے ترا تیر ادا شوخ

اے شوخ یہاں تک ہے ترے نام میں شوخی
اڑنے لگا کاغذ جو تجھے خط میں لکھا شوخ

معشوق میں جو شوخی ہے تو شوخی میں شرارت
معشوق جو قسمت سے ملا بھی تو ملا شوخ

ڈرتا ہوں مری خاک کو برباد نہ کر دے
اس شوخ ستمگر کے ہے کوچے کی ہوا شوخ

گر ایک جگہ ہو تو پتہ اس کا لگا لوں
شوخی سے ہیں اس شوخ کی نقش کف پا شوخ

تھا خاک بھی اس کو نہ لڑکپن میں سلیقہ
آتے ہی جوانی کے وہ دو دن میں ہوا شوخ

اس شوخ کے یہ نام ہیں شوخی میں زیادہ
غارت گر دیں، دشمن جاں، ہوشربا شوخ

دل میں ابھی آیا ابھی آنکھوں میں سمایا
ایسا تو کوئی ہم نے نہ دیکھا نہ سنا شوخ

کیا وصف ہو اے تاجور اس شوخ ادا کا
وہ شوخ ہے اور اس کی ادا اس سے سوا شوخ

"جلوۂ یار" جنوری ۱۹۱۴ء

حشر میں بیتابیوں سے دل کی اک چکر میں ہوں
مجھ میں محشر ہے خدا جانے کہ میں محشر میں ہوں

گھر سے لائی دشت میں مجھ کو مری دیوانگی
گھر سے ہوں باہر مگر میں پھر بھی اپنے گھر میں ہوں

کشتۂ لب ہوں کسی کے دل میں ہے میرا خیال
لعل ہوں اے تاجور میں بھی مگر پتھر میں ہوں

مخزن اپریل ۱۹۱۸ء

نظم پروین

تھا جو فدائے نرگس بیمار دستے یار اور تھا   کھو گئی جس کو گردش لیل و نہار اور تھا
چارہ گروں نے اپنی سی کی تو بہت نہ کچھ چلی   کھٹکا کیا جو عمر بھر دل میں وہ خار اور تھا
پیار کی اک نگاہ میں طالب دید لٹ گئے   ساغر چشم یار میں کیف خمار اور تھا
مجھ میں عدو میں دوستی بوالہوسی کا فرق ہے   میری محبت اور تھی غیر کا پیار اور تھا
نذر قفس ہوئی بہار اہل قفس کی ہم صفیر!   سنتے ہیں اب کے باغ میں جوش بہار اور تھا
شکوۂ دردِ ہجر تو بات کوئی نئی نہ تھی   میری طرف سے آپ کے دل میں غبار اور تھا

غیر سے کہہ رہے ہیں وہ سن کے کلام تاجور
اس کی تو بات کیا ہے وہ سحر نگار اور تھا

مخزن اپریل ١٩١٨ء

گلشن کی ڈالی ڈالی پہ قبضے خزاں کے ہیں   جھنڈے گڑے ہوئے ستم آسماں کے ہیں
رہ رہ کے برق گرتی ہے ان پر ہی بار بار   گلشن میں چار تنکے مرے آشیاں کے ہیں
دل لے چلا ہے جان کو دم دے کے لو کدھر؟   کچھ میں بھی تو سنوں کہ ارادے کہاں کے ہیں؟
ساری زمیں کو گنج شہیداں بنا دیا   یہ سارے گل کھلائے ہوئے آسماں کے ہیں
اشکوں کی راہ بہہ نہ رہا ہو دلِ حزیں   دامن میں میرے پھول یہ کس بوستاں کے ہیں
اہلِ چمن کو قیدِ قفس کی ہے آرزو   صیاد سے بھی بڑھ کے ستم باغباں کے ہیں
ہونے لگا ہے ہندو و مسلم میں اتحاد   دن پھرنے والے کشورِ ہندوستاں کے ہیں

سن سن کے اہلِ درد تڑپتے ہیں تاجور
نشتر ہیں جتنے حرف مری داستاں کے ہیں

مخزن مئی ١٩١٨ء

خیالاتِ پریشاں

کہہ سن کے ہاتھ آج بھی بہکا لیا مجھے   محشر میں دے گئے وہ فریبِ وفا مجھے
ایسا ہوا ہوں گم طلبِ کوئے یار میں   میں رہنما کو ڈھونڈتا ہوں رہنما مجھے
سو جاں سے میں اس پہ وہیں ہو گیا نثار   آئی نظر قضا میں جو تیری ادا مجھے
اے عشق شاد باش کہ تیرے طفیل میں   اب کوستی ہے ہاتھ اٹھا کر قضا مجھے
روزِ ازل جسے جو مناسب تھا وہ ملا   ارمان دل کو، جان کو صدمے، وفا مجھے
رسوائے خلق کر کے ستم تم ہوتے کریں؟   ہر ایک کہہ رہا ہے تمہیں بیوفا مجھے؟
مر جاؤں دل میں لے کے نہ میں حسرتِ چمن   لے چل قفس کے ساتھ اڑا کر صبا مجھے
ایمان کیونکر اس بتِ کافر کو سونپ دوں   اس پر مچل رہا ہے کہ کہیے خدا مجھے
چاہت ہو تم کو غیر کی تو مجھ کو کیوں نہ ہو؟   دنیا سے تم سوا ہو وہ تم سے سوا مجھے

[illegible] وفادار تاجور

کلام تاجور

کسی کی نرگسِ جادو کا دل کو سودا ہے
جہانِ شوق میں طوفان سا جو برپا ہے

ادھر بھی ساقیِ بادِ بہار، چشمِ کرم
خزاں نصیب مرا گلشنِ تمنّا ہے

حذر حذر زِ نظر بندیِ طلسمِ بہار
کہ دلفریبیِ گلشن نظر کا دھوکا ہے

ہوئی ہے پردے ہی پردے میں کس کی رسوائی
یہ کس کا رازِ محبت جہاں میں رسوا ہے؟

نگاہِ شوق ہے میری زبانِ شوق نہیں
میں کیا بتاؤں جو میرے دل کی آرزو کیا ہے

کھبی ہے اس کی نظر میں کسی کی رنگینی
کہ بے نیازِ چمن عندلیبِ شیدا ہے

ہوں پائمالِ غمِ عشق۔ کیا خبر مجھ کو!
کہ آرزو کسے کہتے ہیں؟ آرزو کیا ہے!

وہ شعلہ ریز نگاہیں! ارے خدا کی پناہ!
وہ برق پاشِ نظر ایک حشر برپا ہے

غبارِ قیس میں مضمر تھی کیسی ویرانی!
کہ جیب چاک بدوش ایک اک بگولا ہے

کوئی بتائے مجھے کس کی آرزو ہوں میں؟
کوئی جتائے مجھے میری آرزو کیا ہے؟

وہ دل فروز ہے ساقی کی چشمِ بادہ فروش
رہینِ بے خودی ہر ایک بادہ پیما ہے

برس رہی ہیں یہ دل پر تجلیاں کس کی
یہ کون طورِ محبت پہ جلوہ آرا ہے؟

ہے شمعِ حسنِ ازل بے نیازِ دیر و حرم
اس اک چراغ سے ہر ایک گھر اجالا ہے

بہار میں وہ دل آویزیٔ بہار کہیں
کہ پھول پھول سے رنگِ خزاں ہویدا ہے

بنی ہے محشرِ فریاد کیوں زباں تیری؟
خدا کو مان تجھے تاجور ہوا کیا ہے؟

مخزن اکتوبر ۱۹۱۸ء

فریبِ وعدۂ دیدارِ یار دیکھیں گے
تری کشش بھی دلِ بے قرار دیکھیں گے

اڑی خزاں میں یہ کہہ کر چمن سے بلبلِ زار
کہ جی بچیں گے تو اگلی بہار دیکھیں گے

مٹائے گی ہمیں کب تک؟ کہاں تک آخر تو؟
تجھے بھی گردشِ لیل و نہار دیکھیں گے

چمن چھٹا تو چھٹا یہ خبر نہ تھی صیاد
قفس میں جو یہ نسیمِ بہار دیکھیں گے

رہے خیال یہ آئینِ عشق ہے اے دل
جو راز دار نہ ہوں گے وہ دار دیکھیں گے

بہارِ سبز قدم لائی ہے پیامِ قفس
بس اب بہارِ دلِ داغدار دیکھیں گے

حرم فروشیٔ شیخِ حرم معاذ اللہ!
اب اور کیا ستمِ روزگار دیکھیں گے

نبھے گی بوالہوسوں سے یہ دوستی کب تک؟
کہاں تک آپ بڑھائیں گے پیار دیکھیں گے

نہ لاؤ نزع میں للہ ہمدمو ان کو
وہ رو پڑیں گے جو یہ حالِ زار دیکھیں گے

خزاں گئی تو ہوئے تاجورؔ، سپردِ قفس
بہار دیکھنے والے بہار دیکھیں گے

مخزن جون ۱۹۱۹ء

—— ٭ ★ ٭ ——

جذباتِ تاجور

کیسی نیرنگی عجائب خانۂ عالم میں ہے
کوئی سرشارِ مسرت ہے کوئی ماتم میں ہے

رو رہا ہے یادِ گلشن میں نوا سنجِ بہار
گل بداماں ہے جو آنسو دیدۂ پرنم میں ہے

میری مرگِ بے کسی اک حشر برپا کر گئی
ذرہ ذرہ دشتِ غربت کا مرے ماتم میں ہے

عکس تیرے حسن کا اے زینت آرائے بہار
گل میں ہے، گلشن میں ہے، سبزہ میں ہے، شبنم میں ہے

تو ہوا نذرِ قفس اے تو گرفتارِ قفس
باغ میں ہر گل گریباں چاک تیرے غم میں ہے

درد کی لذت پہ مٹتا ہے جو ہے درد آشنا
وقفِ غم سے پوچھ کتنا کیفِ راحت غم میں ہے

کس کی یاد آ کر تجھے وقفِ تحیر کر گئی
خود فراموشِ جنوں اس وقت کس عالم میں ہے

تیری ہستی اک معمہ ہے طلسمِ دہر کا
تو سرا پا رازِ حیرت خانۂ عالم میں ہے

تجھ بغیر اک دشت ہو ہے شورشِ آباد جنوں
اٹھ کہ اب تیری ضرورت ہر طرف عالم میں ہے

اٹھ کے ہلچل ڈال دے معمورۂ آفاق میں
یادگارِ شورشِ آفاق تو عالم میں ہے

ہے فقط غم کی جہانگیری کا سب پر اقتدار
جو شریکِ محفلِ ہستی ہے وہ بھی غم میں ہے

وہ ہمارے ہو رہیں سارا زمانہ چھوڑ کر؟
تاجورؔ کہیے تو کیا سرخاب کا پر ہم میں ہے؟

مخزن جولائی ۱۹۱۹ء

—— ★ ——

سرشارِ خواب

تڑپ رہے ہیں شبِ انتظار سونے دے
نہ چھیڑ ہم کو دلِ بے قرار سونے دے

قفس میں آنکھ لگی ہے ابھی اسیروں کی
گرج نہ باغ میں ابرِ بہار سونے دے

نہ آئیں گے شبِ غم وہ کبھی نہ آئیں گے
خدا کے واسطے اے انتظار سونے دے

ابھی تو سوئے ہیں یادِ چمن میں اہلِ قفس
جگا نہ ان کو نسیمِ بہار سونے دے

اڑا نہ خاکِ لحد خوابِ مرگ طاری ہے
شہیدِ عشق کو زیرِ مزار سونے دے

یہ آدھی رات سے کیوں دی اذان مرغِ سحر!
ابھی تو لازم ہے شب زندہ دار سونے دے

ہوا ہے خواب میں اس بت سے وعدۂ دیدار — نہ اشکبار رہو اے چشمِ زار سونے دے
لگی ہے آنکھ ابھی روتے روتے فرقت میں — خیالِ نرگسِ جادو کے یار سونے دے
تڑپ رہی ہے تمنائے خواب آنکھوں میں
نہ چھیڑ تاجورِ دلِ فگار سونے دے

مخزن مارچ ۱۹۱۸ء

—— * * * ——

کلام تاجور

دل کے ہاتھوں آہ اٹھوائے گئے محفل سے ہم — آج دل برداشتہ سے ہو رہے ہیں دل سے ہم
دل کی اس کم بخت دل کی کشمکش میں مر مٹے — دل کہیں مٹ جاتے ہیں عاجز آ گئے اس دل سے ہم
گھر کے گھر میں آہ کیسی پھوٹ ڈالی عشق نے — ہم سے دل چھوٹا ہمیشہ کے لیے اور دل سے ہم
درد بھی پر درد محبت وہ بھی کس کا؟ آپ کا — دل میں رکھتے ہیں کہ اس کو چاہتے ہیں دل سے ہم
بیکسی میں اک انیس کنجِ تنہائی ہے دل — کرتے رہتے ہیں شبِ غم دل کی باتیں دل سے ہم
اشکِ بے جگہیں سے ہے دامن رشکِ دامانِ بہار — پھول برساتے ہیں اپنی چشمِ دریا دل سے ہم
اپنی آنکھیں پھوڑ لیں گے محفلِ اغیار میں
کس کا دل لائیں گے دیکھیں گے تجھے کس دل سے ہم
دل انہیں دے آئے جھگڑا مٹ گیا اچھے رہے — آئے دن کی رنجشوں سے روز کی کل کل سے ہم
سخت جانی تیرے ہاتھوں سخت شرمندہ ہوئے — تیغِ قاتل سے کٹے قاتل سے خود قاتل سے ہم
ہے محبت کے سفر میں اک مقامِ رشکِ خضر — زندگی پائی ہے گر اس کشمکشِ منزل سے ہم
دل سے پیاسا اتنا کہ دل وردِ زباں ہے تاجور
یہ بھی کہتے ہیں کہ عاجز آ گئے ہیں دل سے ہم

مخزن اکتوبر ۱۹۲۰ء

—— * * * ——

اُردو مرکز

اردو مرکز کا قیام اور اس عظیم ادارے کے اہتمام سے اُردو زبان کی نثر اور نظم کے نہایت قیمتی انتخاب کی اشاعت علامہ تاجور کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ بلاشبہ کسی غیر سرکاری ادارے نے اتنا بڑا کام کبھی انجام نہیں دیا۔ یہ ادارہ ادبی غنڈہ گردی اور بد دیانتی کی بھینٹ چڑھ گیا، مولانا پوری دلجمعی اور سکون کے ساتھ وہ کام انجام نہ دے سکے جو اُن کے پیشِ نظر تھا لیکن ہنگامی حالات میں بھی اس ادارے نے جو کتابیں شایع کیں وہ اردو زبان کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ اردو مرکز کے اغراض و مقاصد طریق کار اور حلقۂ اثر کی وضاحت کے لیے مولانا کے قلم سے نکلا ہوا وہ دیباچہ درج کیا جاتا ہے جو ان کتابوں میں شایع ہوا ہے۔

اُردو کی کم مائیگی اور اُس کی بے بضاعتی کی داستان اگرچہ اب ایک افسانۂ کہن بن گئی ہے تاہم بعض اربابِ علم و فن کے حلقوں میں اس کا اعادہ اب بھی اسی سنجیدگی و بلند آہنگی سے کیا جاتا ہے جس طرح اب سے پچیس تیس۳ قبل کیا جاتا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں کہ ممالک غیر کے انشا و ادب کی تابانیوں نے اُن کی نگاہیں خیرہ کر دی ہیں اور اُن کے نزدیک اردو ادب و شاعری عبارت ہے چند سطحی پُر مبالغہ و بے کیف مجموعۂ نظم و نثر سے۔ بلکہ اس کے علاوہ وہ بداہتہً یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اردو ادب و شاعری کا سب سے بڑا علمبردار بھی جب اُردو لٹریچر کی حمایت میں زبان و قلم کو جنبش دیتا ہے تو اسی سطحی نمونۂ نثر اور پست و پامال شعریت پر گرم ثنا نظر آتا ہے جسے مذاق عالیہ کی بارگاہ صرف بے توجہی و بے اعتنائی کا مستحق سمجھتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اُردو نظم و نثر کے بیشتر نمونے ہندوستانیوں کے زمانۂ انحطاط و تنزل کی پیداوار اور ہماری پستی و نکبت کے پس ماندہ آثار و یادگار ہیں اور اس طرح اُردو ادبیات کا تمام صالح و غیر صالح سرمایہ باہم خلط ملط ہو کر رطب و یابس کا ایک انبار ضخیم بن گیا ہے۔ ان حالات میں ایک طرف تو وہ بلند علمی طبقہ اس سے بددل ہو کر اُسے قطعاً ناقابلِ توجہ سمجھنے لگا دوسری طرف ایک جماعت ایسی ہے جو اپنی ملکی زبان اور وطنی انشا و ادب سے والہانہ جوش میں اس کی انتہائی حمایت پر آمادہ ہے لیکن زندگی کے دیگر مشاغل اور اُس کی شدید مصروفیتوں کے باعث اُسے اتنی فرصت نہیں کہ اس تمام ذخیرۂ خس و خاشاک سے کارآمد و جاندار حصّے کو الگ کر کے اردو ادب کی حقیقی قدر آشنا ہو سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج موافق و مخالف دونوں اُس کی قدر و قیمت کے اصلی اندازے سے محروم ہیں۔

اس وقت حالت یہ ہے کہ اُردو کو تہی مایہ اور بے بضاعت کہنا ایک طرح پر فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔ حتّٰی کہ یونیورسٹیوں ٹیکسٹ بک کمیٹیوں

اور کونسلوں وغیرہ میں بھی وقتاً فوقتاً اور موقع بے موقع اُس کی تہی دامنی اور بے بضاعتی کا غلغلہ بلند کیا جاتا ہے۔ مگر حقیقت آشنا اصحاب اس خیال سے کبھی متفق نہیں ہوتے۔ جن لوگوں نے اُردو کی فہرست ہائے کتب پر کبھی نظر ڈالی ہے اور لائبریریوں میں جا کر نادر الوجود قلمی و مطبوعہ نسخوں کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اردو زبان ایک بحر بیکراں ہے جس کا دامن تابدار موتیوں کا ایک بیش بہا ذخیرہ حاصل جلوہ زار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اردو ادبیات کا دامن رطب و یابس کے بدنما داغوں سے کلیتہً پاک نہیں لیکن یہ عیب دنیا کی اُن ترقی یافتہ زبانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ جو فی زمانہ علمی زبانیں کہلاتی ہیں۔ انگریزی میں پست و پامال لٹریچر کی اشاعت بڑی کثرت و سرعت سے ہو رہی ہے۔ تو انگریزی میں بھی چار آنے کے لکھنے والے مصنفین کی تعداد کسی طرح کم نہیں۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ اُن کی تصانیف بلا استثنا مبتذل اور سوقیانہ انداز کی ہوتی ہیں۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جہاں انگریزی لٹریچر کی فضیلت کے ثبوت میں ملٹن۔ شکسپیئر۔ شیلے۔ ورڈزورتھ۔ جانسن۔ میکالے اور ٹینیسن وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ وہاں اردو ادبیات کی محفل بھی میر و غالب۔ انیس اور دبیر۔ حسن اور نسیم۔ داغ اور حالی۔ آزاد اور نذیر احمد۔ سرشار اور شرر۔ سرسید اور شبلی۔ اکبر اور اقبال جیسی بلند پایہ شخصیتوں سے خالی نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اردو حکمران قوم کی زبان نہ ہونے کے باعث اس قدر دانی سے محروم ہے جو ہندوستان کے بیس کروڑ باشندوں میں تبادلۂ خیالات کے آسان ترین وسیلہ کی حیثیت سے اُس کا جائز حق ہونا چاہیے۔ مگر اُس کی بے بضاعتی کا رونا اس کی اور اُس کے اہل قلم کی ناقدری سے زیادہ ان مفروضہ اثرات پر مبنی ہے جو کسی چیز کی ناقدری اور کس مپرسی کے قدرتی عواقب سمجھے جاتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ اس کا محرک یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر اردو کو بے مایہ اور تہی دامن نہ کہا جائے گا۔ تو کہنے والے کی ہمہ دانی۔ وسعت مطالعہ بلکہ خوش مذاقی پر بھی حرف آئے گا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اردو نے اس کس مپرسی کی حالت میں بھی جملہ مراحل ارتقا کو حیرت آفرین سرعت سے طے کیا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ خداداد اہلیت اپنے اظہار کے اسباب خود مہیا کر لیتی ہے۔ یہ ناقابل انکار صداقت ہمیشہ کے لیے مستور نہیں رہ سکتی کہ رطب و یابس کے اس انبار اور خس و خاشاک کے اس ذخیرے میں جو آج کل اصطلاح عامہ میں اردو لٹریچر کا دوسرا نام ہے۔ اس قدر مسالہ موجود ہے کہ اگر اس کی طباعت کا انتظام مناسب اہتمام کے ساتھ کیا جاتے تو ممتاز سے ممتاز لائبریریوں کی زینت میں گرانبہا اضافہ ہو سکتا ہے۔ اردو مرکز کے سلسلے میں ہمیں اردو لٹریچر کے وسیع مطالعہ سے جو تجربہ ہوا اُس کی بنا پر علی رؤس الاشہاد ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو لٹریچر کے منتخبات سے یونیورسٹی کے تمام اعلیٰ مدارج کے لیے کورس تیار ہو سکتے ہیں۔

"خدمت زبان" اور "خدمت ادب" کی جو صدا تمام طول و عرض ہند میں گونجی ہوئی ہے اور ملک کے بہتر سے بہتر دل و دماغ اس کیلئے جس طرح وقف کار اور مصروف جد و جہد ہیں اس میں شک نہیں کہ وہ بہت اُمید افزا ہے مگر اُسی کے ساتھ" اس اظہار خیال سے بھی باز نہیں رہ سکتے کہ تعلیم و تربیت کے ابتدائی منازل سے لے کر اعلیٰ امتحانات علمی کے لیے جب تک اردو ادب کے ایسے منتخب نمونے (جو ہمارے پست دور زندگی کے زہر آگیں عناصر سے بالکلیہ پاک ہوں) کی ترویج و اشاعت کا انتظام نہ کیا جائے گا اور اس طرح جب تک ایک اعلیٰ اور صالح ذہنیت و صلاحیت نہ پیدا کی جائے گی اُس وقت تک " خدمت اُردو" کے سلسلے میں ہماری بڑی سے بڑی سعی بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ بار آور نہیں ہو سکتی چنانچہ ہم کامل یقین و وثوق کے ساتھ یہ خیال رکھتے ہیں کہ اردو اور اس کی ادبی خدمات کے ضمن میں سب سے ضروری کام یہ ہے کہ ایک ایسا سلسلۂ مجلدات تیار کیا جائے جسے حقیقی معنوں میں اپنا لٹریچر کہتے ہوئے ہم کوئی ندامت نہ محسوس کریں۔ اس قسم کے منتخب لٹریچر کی اشاعت سے صرف یہ کہ اُردو میں ایک مخصوص تابناک دور حیات کا آغاز ہوگا بلکہ اس سے ہماری آیندہ نسلیں ادبی گمراہیوں سے محفوظ رہ کر ایک اعلیٰ ذہنیت اور معقول صلاحیت بھی حاصل کر سکیں گی۔

"ایک اچھی لائبریری ایک ارزاں یونیورسٹی ہے"

یہ کسی یورپین مصنف کا قول ہے جس کی بلیغ معنویت اپنے اجمال وابہام میں بھی کسی مزید تفصیل و توضیح کی محتاج نہیں۔ اُردو مرکز کے ان مقاصد عالیہ میں جو اردو مخزن العلوم کی تدوین اور اسد و زبان کے دارالافتائی تنظیم پر مشتمل ہیں اردو ادب کے نادر و کارآمد حصے کا تحفظ بھی داخل ہے چنانچہ مذکورہ خیالات کی بنا پر اُس نے اپنے لائحہ عمل کی اوّلین دفعہ یہی رکھی ہے کہ اردو زبان نے اپنی موجودہ مدتِ حیات میں جو صالح اور جاندار ذخیرۂ ادب تیار کیا ہے اُسے سلسل مجلّدات میں ترتیب دے اور اس طرح اس یورپین مصنف کے مذکورۂ بالا قول میں خفیف سی ترمیم کر کے

"ایک اچھی یونیورسٹی ایک ارزاں لائبریری کی شکل میں"

ملک کے سامنے پیش کر دے۔

تجاویز اور "اسکیم بازی" خوش فکر دماغوں کا ایک "عملِ تعیش" ہے اصل سوال "ہو تو کیونکر ہو" کا ہے۔ اس لیے ہم نے سب سے پہلے ملک کے بعض مشاہیر سے اس باب میں استمزاج کیا۔ اردو مرکز کے نمایندگانِ خصوصی نے زحمتِ سفر برداشت کر کے بعض بزرگوں سے بالمشافہ گفتگو کی اور طریقِ انتخاب و طریقِ کار کے متعلق اُن سے نہایت مفید مشورے بھی حاصل کیے۔ اُن بزرگوں میں سے مندرجہ ذیل اصحاب کے اسمائے گرامی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں :

علامہ عبدالحلیم شرر مرحوم۔ علامہ صمادی۔ مولانا عبدالماجد بی اے مصنف فلسفہ جذبات و فلسفہ اجتماع۔ مرزا اعجاز حسین دہلوی بی۔ اے ایل ایل بی وکیل۔ مولانا سید غلام بھیک نیرنگ بی۔ اے وکیل۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی ایم۔ اے لکچرار مسلم یونیورسٹی و مدیر سہیل علی گڑھ۔ پروفیسر کشوری موہن مترا ایم۔ اے ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لنڈن) مولانا سید جالب دہلوی ایڈیٹر "ہمدم" لکھنؤ۔ ڈاکٹر شانتی سروپ ایم۔ ایس۔ سی۔ ڈی۔ ایس سی یونیورسٹی۔ میاں بشیر احمد بی۔ اے۔ آکسن بیرسٹر ایٹ لا۔ ایڈیٹر ہمایوں۔ خان بہادر ڈاکٹر سر میاں محمد شفیع بیرسٹر ایٹ لا کے سی۔ ایس آئی سی آئی۔ ای۔ ایل۔ ایل۔ ڈی۔ مولانا سید راشد الخیری دہلوی ایڈیٹر رسالہ عصمت دہلی۔ چودھری فتح دین ایم۔ اے ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز ملتان ڈویژن۔ مولانا سید ناصر نذیر فراق دہلوی۔ چودھری محمد حسین صاحب بی۔ اے۔ پی۔ ای۔ ایس۔ ڈی۔ آئی منٹگمری۔ شیخ ظہور الدین صاحب بی۔ اے پی۔ ای۔ ایس۔ ڈی۔ آئی۔ لائل پور۔ خان بہادر مولوی خورشید احمد صاحب بی۔ اے ریٹائرڈ ڈویژنل انسپکٹر راولپنڈی۔ راجہ فاضل محمد خان صاحب بی۔ اے پی۔ ای۔ ایس ڈپٹی انسپکٹر راولپنڈی ڈویژن چودھری غلام رسول صاحب شوق ایم۔ اے۔ پی۔ ای۔ ایس۔ ڈی۔ آئی ڈیرہ غازی خاں۔ خواجہ دل محمد صاحب ایم۔ اے۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لنڈن) پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور۔ مولانا وحیدالدین سلیم پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی۔ مولانا سالک ایڈیٹر انقلاب۔ مولانا حافظ احمد علی خان صاحب منصرم کتب خانہ ریاست رامپور۔ مولانا خلیقی دہلوی۔ حضرت ہوش بلگرامی ایڈیٹر ذخیرہ۔

اس کے علاوہ اور بہت سے خوش مذاق حضرات سے جو اردو ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں تبادلۂ خیالات کا موقع آتا رہا مگر مذکورہ اصحاب میں سے خصوصیت کے ساتھ جس نے اردو مرکز کے کاموں سے دلچسپی کا اظہار فرمایا وہ علامہ عبدالحلیم شرر کی ذات تھی۔ موصوف نے نہ یہ کہ طریقِ کار کے متعلق مشورے عنایت فرمائے بلکہ بعض صحبتوں میں اپنا گراں بہا وقت فراہمی مواد اور مشکلاتِ انتخاب کے حل کرنے میں بھی صرف فرمایا موصوف کا یہ وعدہ بھی تھا کہ آخر جنوری تک لاہور تشریف لا کر اور کچھ دنوں قیام فرما کر اردو مرکز کے کاموں میں اعانت بھی فرمائیں گے مگر افسوس مرحوم کی اچانک موت نے ان تمام حوصلوں کو بارآور ہونے نہیں دیا۔

یہ صحیح ہے کہ ہم نے اخبارات و رسائل میں اپنی ان تجاویز و عزائم کا کوئی شور نہیں مچایا اس لیے کہ ؎

"عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند"

صرف مخصوص اربابِ قلم کی خدمت میں ایک ایک مطبوعہ تحریر بھیج کر اُن سے "میٹر" (مواد) اور مفید مشوروں کی التجا کی تھی۔ اس تحریر کی نقل بجنسہٖ درجِ ذیل ہے۔

جناب محترم!

یہ امر جناب سے پوشیدہ نہیں کہ ملک کا بہی خواہ اور علم دوست طبقہ ایک مدت سے اُردو کو دُنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی سطح پر لانے کے لیے بیقرار ہے۔ اس حیثیت سے موقت الشیوع جراید و رسایل اور ملک کی چھوٹی بڑی علمی جماعتیں اور انجمنیں جو کچھ کر رہی ہیں ان کا کافی احترام رکھتے ہوتے ہمیں اس حقیقت کے اظہار کے بغیر چارہ کار نہیں کہ کام کی اہمیت اس تنگنائے فکر سے گذر کر مزید وسعت عمل کی محتاج ہے۔ ادارہ "اردو مرکز" (ملک کی واحد ادارہ اکاڈمی جو دنیائے ادب کے مشاہیر اہل قلم کی گرانقدر مجلس کی نگرانی میں ایک بڑے سرمایہ سے قایم کی گئی ہے) نے اس امر کو ملحوظ رکھ کر اپنے مجوزہ نظام عمل کے لیے حسب ذیل دفعات مقرر کیے ہیں:

(۱) اُردو کے اُس حصۂ ادب و شاعری کو (جو محفوظ رکھنے کے قابل ہے اور جو دراصل اُس کی آیندہ ترقیات کا اصلی ہیولی بھی ہے) جلد سے جلد انتخاب کے بعد مستقل مجلدات کی صورت میں ترتیب دینا۔

(۲) اُردو میں ایک مخزن العلوم (انسائیکلو پیڈیا) تیار کرنا۔

(۳) اُردو زبان کے فتوحات ادبیہ کا ایک منتخب مجموعہ سال بسال مجلدات کی شکل میں پیش کرتے رہنا۔

(۴) گرانقدر نایاب مطبوعہ و غیر مطبوعہ اردو کتابوں کی ترتیب و تہذیب اور حسب استطاعت ہر قسم کی علمی و ادبی اردو تصنیفات و تالیفات کی اشاعت۔

(۵) اردو مرکز کی مجلس مشاورت (جو درحقیقت اُردو زبان کے لیے ایک ادبی دارالافتا رہے) کے ذریعے علمی ضروریات کے مناسب جدید الفاظ کی اختراع اور متنازعہ فیہ امور ادبیہ کے متعلق ناطق فیصلہ۔

ان دفعات کی اوّلین شرط یہ ہے کہ نظم و نثر کے اس بہترین حصے کو جسے اردو ادب اپنی موجودہ مدت حیات میں فراہم کر سکا ہے ایک باقاعدہ و منتظم صورت میں ملک کے سامنے پیش کر دے۔ یہ مجموعہ جہاں ایک طرف اردو ادب و شاعری کا حاصل و عطر ہوگا وہیں یہ امر بھی مدِ نظر ہے کہ حتیٰ الامکان اس میں ایک حد خاص تک ترتیب تاریخی بھی ملحوظ رہے تاکہ ہر دور کے خصوصیات اور ادبی دماغ کے ارتقائی مدارج کا بھی سرسری طور پر اندازہ ہو سکے۔ اس التزام کے ساتھ ساتھ یہ اہتمام بھی پیش نظر ہے کہ شعرا اور اُدبا کی تصاویر اور اُن کے حالات سے بھی (جس قدر دستیاب و میسر ہو سکیں) ان مجلدات کی رونق و زینت میں اضافہ کیا جائے۔ ان بلند اور وسیع عزایم کی اہمیت اور ان کے مشکلات کا جناب خود ہی اندازہ فرما سکتے ہیں۔ اردو مرکز لاہور نے خدا کا نام لے کر اس کام کو شروع کر دیا ہے جسے ارباب ذوق کی مشہور قابل قدر جماعت نہایت سرعت سے انجام دے رہی ہے بلکہ اس کام کا ایک بڑا حصہ پریس میں بھی جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ ملک کے مشہور فضلا و ادیب بھی اپنے زرّیں مشوروں اور اعزازی خدمات سے اُردو مرکز کی اعانت فرما کر خدمت زبان کا غیر فانی ثبوت دے رہے ہیں۔ لیکن مشرقی اخلاق و ذہنیت کی ناقابل تردید عظمت یہ ہے کہ یہاں کے کاموں کی تمام مشکلات کو صرف سرمایہ اور مالیات ہی کے زور پر حل نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ ملک میں بحمداللہ ایسے غیور و عالی حوصلہ بزرگوں کی کمی نہیں جو ملک کے مفید کاموں کی اعانت و حوصلہ افزائی کو مادّی "سود و زیاں" سے آلودہ کرنا پسند نہیں کرتے اور صرف بے غرضانہ اعانت کو اپنی خدمات کا حقیقی نعم البدل تصور کرتے ہیں۔ نظر براں جناب سے بکمال ادب گذارش ہے کہ اپنی نظم و نثر کا ایک منتخب اور خوشخط مجموعہ مع اپنے حالات اور بلاک کے (اور اگر بلاک موجود نہ ہو تو تصویر) اردو مرکز انارکلی لاہور کے نام ارسال فرمائیں اسی کے ساتھ ہمارے کاموں کے متعلق اگر کوئی مفید مشورہ بھی عنایت فرمائیں گے تو اسے بھی نہایت شکریہ کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔ اردو نظم و نثر کی کوئی ایسی کارآمد تصنیف و تالیف جو اب تک کنج گمنامی میں پڑی ہوئی ہو اس کے منتخب حصے مع مصنف و مؤلف کے حالات کے

اگر دستیاب ہو سکیں تو وہ بھی براہِ عنایت ارسال کیے جائیں۔ اس قسم کی زرّیں امداد دینے والے حضرات کا اس تاریخی سلسلے میں شکریہ کے ساتھ اعتراف کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ کارکنانِ اردو مرکز ایسے تمام حضرات سے جنہوں نے اُردو ادب و شاعری کی کوئی خدمت انجام دی ہو یہ امید کرتے ہیں کہ وہ خود بھی اس نادر موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے اس لیے کہ ان کے حالات اور کارنامے اگر اردو ادب و شاعری کے اس مستقل اور مبسوط ریکارڈ اور مخزن میں نہ آئے تو یہ امر بڑی حد تک طرفین کے لیے قابلِ افسوس ہوگا

المُلتمس مہتمم اردو مرکز۔ انارکلی لاہور

چنانچہ اس درخواست پر اطرافِ ملک سے ہماری جس قدر حوصلہ افزائی کی گئی وہ ہماری امیدوں سے کہیں زیادہ تھی۔ انتہا یہ کہ بعض کرم فرماؤں نے تو اپنے مستقل کارنامہ ہائے علمی ہمیں انتخاب و طباعت کے لیے مرحمت فرما دیئے جن سے گو ہم بقدرِ ضرورت ہی متمتع ہو سکے تاہم اُن کی مخلصانہ اعانت کے تہ دل سے معترف و سپاس گذار ہیں :۔

اُردو ادب اور اُس کا سرمایۂ علمی

ابتدائی انتظامات مکمل ہو چکنے کے بعد ہم نے پانچ ہزار روپیہ کے صرف سے ایک لائبریری مرتب کی اس میں ہمیں جو دقتیں پیش آئیں وہ بہت صبر آزما تھیں۔ مروّجہ کتب کا حاصل کر لینا تو چنداں دشوار نہ تھا۔ کسی مطبع یا کتب خانہ کی فہرست اٹھائی اور اس میں سے جو کتابیں مفید نظر آئیں۔ ان کی قیمت منی آرڈر کے ذریعے ارسال کر دی۔ لیکن جو نادر الوجود اور عبیر الحصول نسخے ملک کے دُور افتادہ گوشوں میں قدیم مگر گمنام گھرانوں اور غیر معروف لائبریریوں کے اندر لالۂ صحرائی طرح اپنی جان نواز نکہت رائگاں کر رہے ہیں۔ ان کے مہیا کرنے میں صرفِ زر سے زیادہ تلاش و تحقیق کی ضرورت تھی بہر حال جہاں سے اور جس طرح جو کتابیں مل سکتی تھیں ہم نے اپنی لائبریری میں جمع کیں۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اردو ادب کی کل کائنات اتنی ہی نہیں اس کی گراں بہا متاع وہ علمی مضامین ہیں جو انتہائی تلاش و کاوش سے ملک کے سر برآوردہ اربابِ فکر کے قلم سے وقتاً فوقتاً نکلتے رہے ہیں اور جن کے حقیقی سرمایہ دار ہمارے ادبی رسائل ہیں۔ جو ایک مدّت سے غیر محسوس طور پر خدمتِ زبان کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔ ان رسائل میں مندرجۂ ذیل خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں :۔

مخزن۔ معارف علیگڑھ۔ معارف اعظم گڈھ۔ اُردو (دکن) الناظر لکھنؤ۔ زمانہ کانپور۔ اُردوئے معلّیٰ علی گڈھ۔ نگار بھوپال علی گڈھ میگزین؛ ذخیرہ حیدر آباد۔ دکن ریویو۔ ہمایوں۔ بہارستان۔ نیرنگ خیال۔ ہزار داستان۔ دلگداز۔ ادیب۔ الہلال۔ کہکشاں۔ العصر۔ نوید۔ نقاد۔ شمع آگرہ۔ خطیب دہلی؛ تمدّن۔ ہلی۔ کوکب گونڈہ۔ عالمگیر لاہور۔ شباب اُردو لاہور۔ نقیب بدایوں۔ دلکش مراد آباد۔ صوفی۔ المعلم (دکن) پیمانہ۔ نور جہاں۔ عبرت۔ زبان قوس و قزح۔ مرقع لکھنؤ۔ افادہ آگرہ۔ افادہ حیدر آباد۔ صلائے عام دہلی۔ کمال دہلی۔ زبان اُردو لاہور۔ ادیب اُردو لکھنؤ۔ نظارہ میرٹھ۔ نو بہار علیگڈھ وغیرہ؛

مذکورہ رسائل کی ادبی خدمات کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ آج تقریباً ہر شعبۂ علم کے متعلق ہم ایک معتدبہ و معقول مواد فراہم کر چکے ہیں اُن میں ہمیں ایسے مضامین بھی ملے جن میں اس حد تک اجتہاد و فکر و دقّتِ نظر سے کام لیا گیا ہے کہ ہم اُنہیں انکشافات و تحقیقات علمیہ کا درجہ دے سکتے ہیں۔ اخبارات اور رسائل پر بیشتر سرسری نظریں پڑتی ہیں اور کسی اچھے سے اچھے مضمون کو بھی دیکھ کر اردو ادب کی مجموعی حیثیت کا بالعموم اندازہ نہیں ہوتا لیکن ان تمام رسائل سے ہر موضوع اور ہر بحث کو اگر علیحدہ علیحدہ بالترتیب جمع کیا جائے تو معلوم ہو کہ اردو ادب کا آج کیا درجہ ہے اور وہ زبان جو محکومیت کے آغوش میں نشو و نما پا رہی ہے آج کس حد تک آزاد ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش چلنے کے لیے بیقرار ہے

چنانچہ کارکنانِ اُردو مرکز نے مستقل تالیفات و تصنیفات کے علاوہ مذکورہ رسائل کے گہرے مطالعہ و انتخاب کے بعد کئی لاکھ صفحات کا عطر کھینچ کر رکھ دیا ہے اور آج ہم اس امر کے اعلان کی جسارت رکھتے ہیں کہ تقریباً تمام شعبہ جات علم و ادب پر ہم نے ڈیڑھ سو مجلّدات تیار کر لیے ہیں

اور جہاں تک حالات دستیاب ہو سکیں گے ہم ان شاء اللہ بہ اقساط انہیں برابر شایع کرتے رہیں گے۔ ان مجلدات سے نہ صرف یہ کہ ملک میں ایک سنجیدہ و کارآمد لٹریچر کی اشاعت ہوگی بلکہ ایک ایسی مختصر سی لائبریری بھی بآسانی تیار ہو سکتی ہے جس سے عام مولفین و مصنفین بڑے بڑے ذخائر کی ورق گردانی سے بے نیاز ہو سکتے ہیں۔ آیندہ جس کسی مصنف کو کسی اہم مضمون تصنیف و تالیف کی ضرورت ہوگی وہ اُس تصنیف یا تالیف کے متعلق اردو مرکز کے منتخبات میں ایک ہی جگہ ضروری مواد فراہم پا کر لائبریریوں میں مہینوں کی تلاش و جستجو اور ضخیم کتابوں کی ورق گردانی کی زحمت سے بچ جائے گا
انتخاب نظم و نثر کے متعلق ملک کے سربرآوردہ ارباب فکر کے قیمتی مشورے اور خوش مذاق کارکنوں کا طریق کار اگرچہ کام کی عمدگی کی کافی ضمانت ہے تاہم شروع سے لے کر آخیر تک کمزور انسانوں ہی نے انجام دیا ہے اس لیے اسے "خطا و نسیان" سے کسی طرح مبرا نہیں کہا جا سکتا۔ ابتدائے کار سے لے کر اس وقت تک ہم نے ہر مشورے کا کافی احترام کیا ہے۔ اور چونکہ یہ کسی فرد واحد کا کام نہیں ہے اس لیے قدرتی طور سے بھی ضد و تعصب کی اس میں گنجایش نہیں۔ چنانچہ ہم کامل فراخدلی کے ساتھ یہ حوصلہ رکھتے ہیں کہ ان مجلدات کی طباعت و اشاعت کے بعد بھی موافق و مخالف دوست و دشمن کی کسی سمت سے جو معقول صدائے اصلاح اُٹھے گی اس کا کمال مسرت کے ساتھ خیر مقدم کیا جائے گا اور دوسرے ایڈیشن میں شکریہ کے ساتھ اس کی تصحیح و تلافی کر دی جائے گی۔

شعرا و مصنفین کی تصاویر اور ان کے حالات کی فراہمی میں بھی حتی الامکان ہم نے کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا مگر جو التزام و اہتمام ہمارے پیش نظر تھا وہ افسوس کہ خاطر خواہ انجام نہ پا سکا۔

گذشتہ شعرا و مصنفین میں سے بعضوں کے حالات اور اُن کی تصاویر اگر میسر نہ آ سکیں تو چنداں عجب نہیں ستم ظریفی تو یہ ہے کہ عصر موجودہ کے بعض نیاز مندوں کو بھی اپنے حالات و تصاویر دینے میں تامل و تساہل ہوا۔ خدانخواستہ اس لیے نہیں کہ "مجرم نگاہیں اُن پر پڑیں گی" بلکہ انکساری بے کیف فرسودگی اور "میں کس قابل ہوں" کی رسم کہن کا یہی تقاضا تھا۔ حالانکہ اس سے کہیں بہتر عذر "عذر تساہل" ہے۔ جو "شان بے نیازی" کا بھی حامل ہے اور "شایان ذات" بھی۔ تاہم اس باب میں ہماری کوششیں جس قدر بار آور ہو سکی ہیں وہ نذر ناظرین ہیں ؛

طباعت و اشاعت

اب ان مجلدات کی طباعت و اشاعت کا مسئلہ تھا جس میں خوش آیند تصورات کے بجائے سرمایہ مالی کی ضرورت تھی اس کے لیے ہم میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز لاہور کی فراخ حوصلگی کے رہین منت ہیں جنہوں نے ان مجلدات کی طباعت و اشاعت کی ذمہ داریاں لے کر اردو ادب کی ایک عظیم الشان خدمت کا تہیہ کیا ہے۔ ان مجلدات کی اشاعت پر اب تک اس فرم کا پچاس ہزار روپیہ صرف ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ڈیڑھ سو مجلدات اور زیر ترتیب ہیں جو وقتاً فوقتاً استعداد حالات کے مطابق شایع کیے جائیں گے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اور کس قدر روپیہ صرف کرنا پڑے گا۔ یو۔ پی میں منشی نولکشور آنجہانی کی وہ مساعی جمیلہ جو خدمت اردو کے متعلق ہیں اپنی مثال آپ ہیں، لیکن میسرز عطر چند کپور کی فرم کا یہ تہیہ بھی اپنے مقام پر اس قدر حوصلہ افزا و قابل ستائش ہے جو بھی شاید اردو کی تاریخ میں فقید النظیر ہو۔ ان کا یہ کارنامہ نہیں کہ تجارتی کاروبار کے ضمن میں ایک عظیم الشان اسپرٹ ہے بلکہ وہ ایک اولوالعزمانہ ملکی خدمت ہے جسے دراصل جریدۂ علم و ادب پر شہرت دوام کی مہر بن کر ثبت ہونا چاہیے ؛

اُردو مرکز کا اسٹاف

ہم نے ذوق جستجو کو رہبر بنا کر ملک کے ان منتخب اہل قلم و انشا پردازوں کی خدمات حاصل کی ہیں جن پر اردو دنیا بجا طور پر فخر کر سکتی ہے اس گراں قدر ادبی جماعت نے جس انہماک و شغف سے اردو مرکز کے مفوضہ فرائض کو سرانجام دیا اُس کا اعتراف نہ کرنا صد درجے کی ناانصافی ہوگی در حقیقت

اردو مرکز عبارت اسی جماعت سے ہے اخباری دنیا سے تعلق رکھنے والوں میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو ان حضرات کی قدر و منزلت سے واقف نہ ہو۔ ان کے اسمائے گرامی اس امر کی کافی شہادت ہیں کہ اردو مرکز ملک کے بہترین انشا پردازوں کی ایک قابل فخر جماعت ہے۔

فہرست کارکنانِ اردو مرکز

۱۔ حضرت اثر صہبائی مصنف نشاطِ روح
۲۔ سید عابد علی عابد بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ ایڈیٹر ہزار داستان
۳۔ شیخ محمد ضیاء الدین شمسی جرنلسٹ
۴۔ میاں تصدق حسین خالد ایم۔ اے
۵۔ مسٹر منوہر سہائے انور سہسوانی جرنلسٹ
۶۔ پنڈت میلا رام وفا ایڈیٹر سوراجیہ
۷۔ مولانا حامد علی خاں صاحب بی۔ اے (آنریری)
۸۔ حضرت فاخر ہریانوی بی۔ اے
۹۔ شیر علی خان صاحب سرخوش مصنف تذکرہ اعجاز سخن
۱۰۔ شیخ عبد اللطیف صاحب تپش بی۔ اے
۱۱۔ اصغر حسین خاں صاحب نظیر لدھیانوی
۱۲۔ حضرت جگر مراد آبادی
۱۳۔ مولانا گویا جہان آبادی
۱۴۔ مولانا سیماب اکبر آبادی ایڈیٹر پیمانہ
۱۵۔ شیخ محمد ہادی حسین قریشی ایم۔ اے
۱۶۔ سردار اودے سنگھ شائق بی۔ اے۔ ایل ایل بی
۱۷۔ مسٹر یوسف سلیم بی۔ اے۔

اردو مرکز کی مجلس مشاورت

اردو مرکز کے کاموں میں مسلسل طور پر مشورہ کی زحمت جن حضرات نے فرمائی۔ ان کی التفات بے پایاں کا اعتراف بھی ہم صدق دل سے کرتے ہیں۔ یہ محترم حضرات صرف یہی نہیں کہ اپنا وقت عزیز پابندی کے ساتھ اردو مرکز کے منتخبات پر ناقدانہ نظر ڈالنے پر صرف کرتے رہے بلکہ اردو مرکز کے معیار انتخاب قائم کرنے میں اپنے زریں مشوروں سے مسلسل طور پر ہماری امداد فرمائی۔ اردو مرکز کے خلاف للّٰہی بغض رکھنے والی سازشی جماعت کے حملوں کے لیے ان کی مقتدر شخصیتیں سدِ سکندری ثابت ہوئیں۔

اراکین مجلس مشاورت

آنریبل خان بہادر سر شیخ عبدالقادر بیرسٹرایٹ لا۔ ریونیو ممبر ایگزیکٹو کونسل پنجاب

خان بہادر شیخ نور الٰہی صاحب ایم۔ اے، آئی۔ ای۔ ایس، انسپکٹر آف ٹریننگ انسٹی ٹیوشن صوبہ پنجاب

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی (ادبی نقاد)

آخر میں ہم اس خدائے قادر و توانا کا شکر ادا کیے بغیر نہیں رہ سکتے جس نے نہا نخانۂ غیب سے ہمارے لیے یہ اسباب و وسائل فراہم کر دیے، اور اپنے لطف و کرم سے ہمیں بڑی بھی خدمت زبان کی توفیق عطا فرمائی۔ لیکن اُس کی عادت جاریہ یہ بھی ہے کہ وہ ہر اعلیٰ و صالح تحریک کے لیے مخالفین و مزاحمین کی بھی ایک جماعت تیار کر دیتا ہے، ورنہ پھر نہ تو کسی کو معزز و مخلصانہ خدمت کی قدر و قوت کا اندازہ ہو اور نہ اسے پوری طرح پھیلنے اور کامیاب ہونے کا موقع مل سکے۔

ہندوستان میں جہاں تعمیر کے مقابلے میں شوقِ تخریب اور بڑھانے کے عوض نیچے گھسیٹنے کا جذبہ نسبتاً زیادہ ہے، ہم اس سعادت سے کیونکر محروم رہ سکتے تھے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ اردو مرکز اپنی ناچیز خدمات کا کوئی عملی ثبوت پبلک میں پیش کرے، بعض حلقوں میں اس کے متعلق پیشتر ہی سے بدگمانیاں شروع ہو گئیں۔ غالب نے کہا تھا ؎

ندانم تا چہ برق فتنہ خواہد ریخت بر ہوشم
تصور کردہ ام بگستن بند نقابش را

یہاں بھی اردو مرکز اور اس کے کارناموں کا "گستن نقاب" تو ایک طرف محض اُس کے تصور ہی سے ایک تلاطم اضطراب پیدا ہو گیا اور گھبرا گھبرا کر ہمارے دوستوں کی نگاہیں اپنے اپنے ترکشوں پر پڑنے لگیں۔ چنانچہ اردو مرکز اور اُس کے اراکین کے متعلق پرائیویٹ صحبتوں کے علاوہ اخبارات و رسائل کے صفحات میں بھی مختلف رنگ اور مختلف عنوانوں سے تنقیص و تعریض کا شریفانہ عمل شروع ہو گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہماری طرف سے "اشتراکِ عمل" کی دعوت عام تھی باینہمہ بعض حلقوں میں اگر ایسی بے چینیاں موجود ہوں جن کی بنیاد میں ناگفتہ بہ جذبات کارفرما ہیں، تو شاید ہماری اور اُن کی متفقہ کوششیں بھی انہیں زائل نہیں کر سکتیں۔ بہرحال ہمیں اور ہمارے دوستوں کو اپنا اپنا کام کرتے رہنا چاہیے۔ انجام کار کا فیصلہ اُسی خدا پر ہے جس نے محسود کو حاسد پر، فراخ دلی کو تنگ نظری پر، تعمیر کو تخریب پر ہمیشہ فتح دی ہے اور ہمارا یہ ایمان ہے کہ وہ ہم لوگوں کے لیے اپنے اس لازوال قانون میں تبدیلی ہرگز نہ کرے گا۔

ہم اپنی طرف سے اطمینان دلاتے ہیں کہ جس خدا نے ہمارے لیے اسباب و وسائل مہیا کر کے ہمیں تھوڑے سے کام کی توفیق عطا فرمائی ہے، اُسی نے ہمیں وہ صبر و سکون بھی (جو ہر کام کرنے والے کے لیے ضروری ہے) مرحمت فرمایا ہے۔ ہم اپنی جانب سے کسی سے الجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اور اپنے کرم فرماؤں کی تعریض و نکتہ چینی سے بھی (خواہ وہ کسی رنگ میں کیوں نہ ہو) صرف اپنی اصلاح و فلاح کا فائدہ اٹھانا چاہیں گے اور بس ؏

بادہ گر خام شود پختہ کند شیشۂ ما

تاجور چیف ایڈیٹر

اردو مرکز لاہور

علامہ تاجور

میری صحافتی زندگی

مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آباد صوبجات متحدہ کے رہنے والے یوسف زئی پٹھان تھے۔ آپ کے اجداد احمد شاہ ابدالی کے ہمراہ افغانستان سے آکر نجیب آباد میں آباد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی۔ دیوبند سے فضیلت کی سند حاصل کرنے کے بعد لاہور آ گئے۔ جہاں پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات مولوی فاضل اور منشی فاضل پاس کیے۔ یہیں دیال سنگھ کالج میں اردو کے پروفیسر ہو گئے۔ پھر عمر بھر یہی خدمت انجام دیتے رہے۔ ۲۰ جنوری ۱۹۵۱ء کو لاہور ہی میں انتقال کیا۔
مولانا کو ابتدا ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ حضرت رسا رامپوری کی شاگردی اختیار کر کے نظم و نثر میں کمال حاصل کیا۔ کئی اخبار اور رسالے جاری کیے اور دنیائے ادب میں ہمیشہ ایک ہنگامہ برپا کیے رکھا۔ "میری صحافتی زندگی" مولانا تاجور مرحوم کا ایک قابل قدر مضمون ہے جس میں انہوں نے آپ بیتی کے رنگ میں اپنی ادبی اور صحافتی زندگی کی کشمکش پر روشنی ڈالی ہے ؏

۱۹۱۵ء — میری صحافتی زندگی کا آغاز تھا۔ یوں تو اس سے پیشتر بھی یعنی ۱۹۱۱ء میں رسالہ "نالۂ بلبل" لدھیانہ اور اس کے بعد "آفتاب اردو" اس کے بعد بھی غالباً ۱۹۱۴ء میں رسالہ "تاج الکلام" (نجیب آباد) کی ایڈیٹری کر چکا تھا۔ مگر یہ ابتدائی مشقیں "ریہرسل" کے طور پر تھیں میری صحافت کا اصل آغاز ۱۹۱۵ء ہی سے ہوتا ہے۔

مشہور و مرحوم رسالہ "مخزن" اس وقت دم توڑ رہا تھا۔ میر نثار علی شہرت دہلوی مرحوم اس کے ایڈیٹر تھے اور صورت واقعہ یہ تھی کہ بوڑھے ایڈیٹر سے پہلے بوڑھا "مخزن" سطح نمود سے گم ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ بالآخر انیسویں صدی کا شہرت بیسویں صدی کے تاجور کو عنان ادارت دے کر فضائے لامتناہی میں گم ہو گیا۔ میں اس وقت طالب علم تھا "مخزن" کی حیثیت میری نگاہ میں لندن ٹائمز سے کم نہ تھی۔

مخزن کی بدحالی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے نئے ایڈیٹر کی تنخواہ پانچ روپے اور خوراک تھی اور اس کا ہندو منیجر جو مقامی پوسٹ آفس کا پوسٹ ماسٹر بھی تھا دس روپے اور بعد کو پانچ روپے خشک پر منیجری کر رہا تھا۔ بہرحال ایڈیٹر پھر ایڈیٹر ہے پانچ روپے پاتا ہو یا پانچ سو روپے۔ دنیا کے ہر بڑے آدمی سے ہم سطح ہو کر ملاقات کرنے کی مسلمہ حیثیت کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ میں نے اس واقعیت کو

جدید تقرر سے بہت پہلے معلوم کر لیا تھا۔ مالک مخزن اس خیال میں تھا کہ مجھے بہت سستا ایڈیٹر نصیب ہو گیا ہے اور میں اس خمار میں مست کہ مخزن کی ادارت مفت نذر کے طور پر ہاتھ لگی غرضیکہ ہم دونوں ایڈیٹر و مالک "مخزن" اپنی اپنی غلط فہمیوں میں مبتلا اور مطمئن تھے۔

پانچ سال تک یہ سلسلہ جاری رہا اس مدت میں جو خاصی طویل تھی میں نے اپنی ایک دنیا پیدا کر لی تھی۔ مخزن بھی میرے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہا۔ میں اس کے بڑھاپے کو جوانی میں تو تبدیل نہ کر سکا۔ لیکن ؎

"جو آ کے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا"

کے مقولے کو مخزن کے حق میں میں نے غلط ثابت کر دیا۔

پانچ سال کے بعد مجھے "مخزن" سے کنارہ کش ہونا پڑا۔ اب میری شہرت اتنی وسعتوں میں پھیل چکی تھی کہ بمشکل ایک سال گذرا ہو گا کہ مجھے رسالہ "ہمایوں" کی ترتیب و تدوین کی ذمہ داریاں حاصل ہو گئیں۔ یہاں مجھے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ نہایت شریف الطبع اور وسیع نظر مالک کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔

ہمایوں کی ہر دلعزیزی اور قبولیتِ عام کے زیرِ سایہ اہلِ قلم کے التفاتِ عام کے سبب ہمایوں میں مجھے لکھنے کا موقع بہت کم ملا۔ ہاں جب کبھی میں نے ہمایوں میں کچھ لکھا میری تحریر محبت و احترام سے پڑھی گئی۔

پانچ سال تک ہمایوں میں کام کرنے کے بعد ہمایوں کی جدید ضرورتوں نے مجھے ہمایوں سے بھی رخصت کر دیا مگر اس انداز سے کہ میاں بشیر احمد بار ایٹ لاء[1] مالک رسالہ اور میں نے باہم مشورے سے ایک نئے ایڈیٹر کا انتخاب کیا ہمارے موجودہ اداروں میں اس حسنِ معاملہ کی مثال بہت کم مل سکتی ہے۔

ہمایوں کی پنج سالہ ادارت کے بعد میری ادبی شہرت ہندوستان گیر بن چکی تھی اس سے پہلے میں کسی پرچے کی ایڈیٹری کی تلاش کیا کرتا تھا اب ایڈیٹری میری تلاش میں رہنے لگی۔ ایک سال چند ماہ کے بعد وہ یادگار علم و فن رسالہ میں نے جاری کیا جس کا نام "ادبی دنیا" ہے۔

رسالہ "ادبی دنیا" اس سطوت و جلال کے ساتھ افقِ صحافت پر طلوع ہوا کہ آسمانِ ادب کے پرستاروں کے چراغ گل ہو گئے۔ اس بیان میں شاعری ہے نہ خود فراموشی وہ آنکھیں ابھی بے نور نہیں ہوئیں جنہوں نے ادبی دنیا کا عہدِ طلوع و دورِ بلندی دیکھا ہے۔ عمائدِ ملک نے اسے صحافت کے لیے نشانِ راہ تسلیم کیا۔ اس کی مانگ دنیا کے ہر اس منطقے میں تھی جہاں ہندوستانی پہنچ چکے ہیں۔ اس کی غیر ملکی ڈاک اتنی ہوتی تھی کہ دوسرے اردو ماہناموں کی مجموعی ڈاک بھی اس مقدار کو کبھی نہ پہنچی ہوگی۔

ادبی دنیا کے بعد جتنے اردو رسالے جاری ہوئے ان میں سے اکثر کے نام میں "دنیا" کا لفظ ضرور شامل ہوتا تھا۔ یہ علم و ادب کا صحافتی طوفان پانچ سال کے لگ بھگ علم و ادب کی بے کراں وسعتوں میں برپا رہا۔ اکثر معاصرین نے اپنے اپنے ظرف و حوصلے کے مطابق اس سیلاب کو روکنا چاہا مگر ان کی زمین گہری کھیتی یا سخت جانی انہیں اس طوفان سے بچا سکی ورنہ پانی تو ان کے سر سے گذر چکا تھا۔ اس دور میں پست فطرت معاصرین کی حاسدانہ بدحواسی کے ایسے ایسے انوکھے تماشے دیکھنے میں آئے کہ اکثر نگاہ تماشا حیرتوں میں ڈوب ڈوب گئی۔

میں پہلے کسی مضمون میں لکھ چکا ہوں کہ ہماری ادبی صحافتی لائنوں میں بدنسلی، بے نسلی وبائے عام کی صورت اختیار کیے ہوئے ہے۔ ادبی دنیا کے عہدِ عروج میں مجھے اس وبائے عام کو عریاں صورت میں دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے دیکھا کہ بعض معاصرین "ادبی دنیا" کے ہر تازہ نمبر کو دیکھ کر میرے اور "ادبی دنیا" کے خلاف ایک مجلس تبری منعقد کر کے اپنے حسد پیشہ ساتھیوں کے ساتھ ہر بیہ[2] گاتے ہیں زندگی کا سکون محسوس کرتے تھے۔ ان میں سے بعض

---

[1] میاں بشیر احمد سابق سفیر ترکیہ

[2] ہر بیہ بروزن مرثیہ نظم کی اس فحش صنف کا نام ہے جو تبرائی حضرت عمرؓ، ابوبکرؓ، عثمانؓ کی شان میں کہا کرتے ہیں یہ صنف شبیر لکھنوی کی ایجاد ہے۔ علیہ اللعنہ

حضرات اب بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ہمارا ایک تنخواہ دار جاسوس "ادبی دنیا" کے دفتر میں مستقل طور پر رہتا تھا، بہرحال "ادبی دنیا" کے جاہ و جلال نے ہر صحافتی پستی میں جان ڈال دی تھی لیکن میری انتظامی قابلیت اور علمِ انتظام پر زود اعتقادی کے سبب یہ پرچہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔

اس حادثے پر گوشۂ حسد و عناد میں طفلانہ خوشیاں منائی گئیں۔ عام سطح کی رسالچیوں میں اسے میری ادبی موت تصور کیا جانے لگا۔ وہ نادان اتنا نہ سمجھ سکے کہ احسان اللہ خان (میرا نام) پر تو موت ضرور طاری ہوئی لیکن قلمِ کارفطرتِ علامہ تاجور مرنے کے لیے پیدا نہیں ہوئے۔ ان کی الہامی فکر آسمان کے ہر الہام کی طرح غیر فانی اور جاودانی ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ مارچ ۱۹۳۳ء میں رسالہ "ادبی دنیا" چند احباب نما بدباطنوں کی سازشوں کے سر صدقے ہو گیا۔ مجھے اس کا بے حد قلق ہوا۔ مدت تک اس صدمے کے سبب اپنی زندگی میں ایک حبس محسوس کرتا رہا۔

رسالہ ادبی دنیا جن کم سواد لوگوں کے ہاتھوں میں گیا وہ علم و ادب کی لائنوں سے بارہ پتھر باہر کے لوگ تھے انہوں نے تیسرے درجے کے ادیبوں اور شاعروں کے بفوات کی اشاعت سے پرچے کے معیار کو کچل کر رکھ دیا۔ اس سے بھی قطع نظر میرے ان حسد شیوہ دشمنوں کی تبلیغ شروع کر دی جن کے ادبی بخارات فضائے علم و ادب کے حق میں ہوائے ناسازگار سے کم نہ تھے اور جو بدحواسی کے کارن ہمیشہ میری تخریب کے درپے رہے گو میں انہیں قابلِ اعتنا کیوں نہیں سمجھتا۔

رسالہ "ادبی دنیا" مارچ ۱۹۳۳ء میں میرے ہاتھ سے نکلا اور مئی ۱۹۳۵ء میں رسالہ شاہکار جاری کر دیا گیا۔ گویا دو سال کے لگ بھگ وقفۂ زندگی میں بسر کرنے کے بعد پھر نیا سفر شروع کر دیا۔ "شاہکار" بھی اسی آن بان سے نکلا جس سطوت و جلال سے ادبی دنیا طلوع ہوا تھا۔

ملک کے اہلِ نظر نے "شاہکار" کے آئینے میں "ادبی دنیا" کے عہدِ عروج کی طلعتوں کو دیکھا فضائے شعر و ادب اس جلوہ کار ادب سے جگمگا اٹھی۔ معیار طلب انشا پرداز دو سالہ تعطل سے ایک جھرجھری لے کر اٹھ بیٹھے۔ بے حوصلہ معاصرین بحرانی بخار میں مبتلا ہو کر بے ربط مائتی نثریں گانے لگے۔ ہر ایک کی اپنے ترکش پر نگاہیں پڑیں ذہن و قلم کی زبانیں آدابِ بیان بھول گئیں۔ شاہکار کے دفتر کا ہر راز بازارِ عناد و فساد میں منہ مانگی قیمت پانے لگا مختصر یہ کہ غیر طبعی موت مرنے کے علی الرغم ان کے شور و شیون کے زیرِ سایہ پرواز میں ترقی کر رہا تھا۔

یہاں مجھے اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ "ادبی دنیا" کا استقبال شش جہات ادب میں جس طوفان برپا کی صورت میں ہوا۔ شاہکار کو وہ جلالت نصیب نہ ہو سکی۔ اس کے وجوہ و اسباب کیا تھے؟ پہلا سبب تو یہ تھا کہ "ادبی دنیا" کے دفتر کی بے نظمی بلکہ بدنظمی کے پیشِ نگاہ پبلک میری انتظامی ناقابلیت کا اندازہ کر چکی تھی۔ ادب کے خریدار بدگمان ہو گئے تھے۔ ان کی بدگمانی کچھ بے جا نہ تھی۔ مجھے اس نقصِ طبیعت کا خود بھی اعتراف ہے کہ میں کسی کاروبار کے نظم و نسق کا اہل بالکل نہیں ہوں۔ نہ عملۂ انتظام کی نگرانی کر سکتا ہوں۔ میرا تو بس دماغ چلتا ہے یا قلم اور انتظام چلانے کے پیسے ان دونوں کی ضرورت نہیں۔ دراصل بات کیا ہے؟ یہ بھی بتا دوں بات یہ ہے کہ میری آنکھ میں مروت مجرمانہ حد تک ہے۔ میں اپنے کارکنوں کا سخت گیر کار فرما کبھی نہ بن سکا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ میں نے ہمیشہ اپنے ہر کارکن کو یہ احساس کرایا کہ اس میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں ہم دونوں مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ آخری بات یہ کہ اکثر اوقات دفتر کے کارکنوں سے متعلق میرا اندازِ احترام حدِ افراط تک پہنچتا رہا۔ میری یہی احترام کاری کاروبار کے حق میں تباہ کن ثابت ہوئی۔ آج ہندوستان کی حالت تو یہ ہے کہ کار فرما کی نرمی اس کی بے وقوفی اور کمزوری کے ہم معنی سمجھی جاتی ہے۔ اس غلام ملک[1] میں مزدور ایک دیانت دار مزدور کی حیثیت میں کار فرما کا ہم رتبہ دوست بن کر کام کرنے کو تیار نہیں۔

ہاں آپ زبان اور ہاتھ دونوں کو گرم کار رکھتے ہوئے ایک غلام سے خوب کام لے سکتے ہیں۔ مزدور کو دوست بنا کر آپ اسے بددیانت سازشی، کور نمک اور فرض ناشناس سب کچھ بنا سکتے ہیں۔ بس یہ تھی میری اصل کمزوری جس کے سبب میرے دفتر میں بدنظمی نے راہ پائی اور

---

[1] یہ مضمون برصغیر کی آزادی سے پہلے لکھا گیا تھا۔

میرا کاروبار زیر و زبر ہوتا رہا۔ اسی تجربے نے مجھے بتایا کہ ہندوستان میں مزدور تحریک بے مرادیوں سے ہم جانتے ہیں کہ آزاد ممالک کے مزدور اپنی ڈیوٹی بڑی دیانت داری سے انجام دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے حقوق طلبی کی کوئی تحریک رائیگاں نہیں جاتی۔ یہاں یہ بات نہیں۔ یہاں آپ پندرہ روپے کے مزدور پر جب تک پچاس روپے ماہانہ کا نگران نہ رکھیں گے وہ کام نہیں کرے گا۔ اور اگر ان دونوں کی آپ تمام اوقات میں خود نگرانی نہ کریں گے تو یہ آپس میں سازش کرکے کام کو تباہ کر دیں گے۔ آپ ان سے جتنی شرافت برتیں گے اسی نیت سے انہیں ہر وقت کینہ کاری پر آمادہ پائیں گے۔

میں نے اپنے مزدوروں (کارکنوں) سے نرمی برتی اور ان پر نگرانی کو حدود اوہام کے خلاف تصور کیا۔ بھلا میرا کاروبار کیونکر سرسبز ہو سکتا تھا؟ نہیں کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ میرے ہاں مزدور شکر گذار بن کر آیا اور کافر نعمت بن کر نکلا۔ ہاں ایک بات ضرور ہوئی، کہ جو کارکن ایک مرتبہ میرے پاس کام کر گیا پھر دنیا کے کسی مصرف کا نہ رہا۔ بس اس کے آگے آگے رزق رہا اور پیچھے پیچھے چیل۔ میرے پندرہ سال کے طویل مشاہدات میں سے کوئی ایک استثناء بھی تو نظر نہیں آتا۔ کم از کم میرے علم میں تو کوئی نہیں۔

جاؤ بے جا مروت کے ساتھ مجھ میں ایک بڑا نقص اور بھی ہے زود اعتمادی۔ اس کے کارن بھی زندگی میں بڑے بڑے نقصان اٹھائے۔ میرا ایک اور نقص بھی میری ناکامیوں کا سبب بنا۔ وہ یہ کہ مجھے حساب، حساب فہمی اور حساب بینی جیسے خشک مضامین سے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ اس معاملے میں سو فیصدی مسلمان ہوں۔ دفتر کے محاسب میری اس کمزوری کا فایدہ اٹھاتے رہے۔

یہ وجوہ تھے میری کاروباری ناکامی کے۔ ان کے ہوتے میرا کاروبار کسی پیغمبرانہ کرامت کے بغیر جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ نہ رہ سکا۔ نہ رہنا چاہیے تھا۔ ورنہ پبلک نے تو میرے کسی کاروباری اقدام کو مرحبا کہنے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ میرا یہ شکر گذارانہ اعتراف ہے کہ اہل نظر اور ادب دوست حضرات نے میری ہر ادبی خدمت کو نگاہ محبت سے دیکھا۔ رسالہ ادبی دنیا کے عہد عروج میں ہر ماہ اکتیس من کاغذ خریدا جاتا تھا۔ ادب کی تاریخ اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پبلک میرے پرچے کو مطالعے کی چیز خیال کرتی رہی۔ ظاہر ہے کہ اکتیس من کاغذ کا رسالہ چھاپ کر اس کی کاپیاں آسمان کے فرشتوں کو تو بانٹی نہیں جاتی تھیں۔ انسان ہی اسے خرید سکتے تھے۔ الحاصل "شاہکار" چھ سال تک میری ملکیت میں جاری رہا اور اس کے بعد قضائے کار تاریخ نے اپنے آپ کو دہرا لیا۔ میرے دفتری نظام کی ابتری اپنی روایات کو تازہ کرنے پر مصر ہوئی۔ یہ داستان درد بھی بڑی دراز ہے۔ مختصراً کچھ عرض کرتا ہوں۔

یہ سرزمین جہاں میں اپنی زندگی اجیرن بناتے ہوئے ہوں نوسربازوں کی سرزمین ہے۔ یہاں تعلیم کی ہمہ گیری کے سبب جرم کاری ایک مستقل سائنس بن چکی ہے۔ ہر فریب سائنٹیفک اصول پر کیا جاتا ہے یہاں کے تعلیم یافتہ جرم کاروں نے جرائم سے سادگی اور سادہ لوحی کا حسن چھین لیا ہے۔

ادبی دنیا اسی نوسربازی کے سر صدقے ہو گیا۔ "شاہکار" کے کارکن نے پانچ سال تک اسی فریب میں رکھا کہ پرچہ فایدہ پر چل رہا ہے۔ اور ہر سال مجھے ہزار بارہ سو روپے اپنی ذاتی آمدنی میں سے اس پر خرچ کرنا پڑا۔ بالآخر ایک عزیز دوست کی اپنی عقیدت نے یہ زحمت جس کا نام "شاہکار" ہے مجھ سے لے کر اپنے گلے مڑھ لی۔

"شاہکار" کو اپنے ہاتھ سے کھو کر قدرت قاہرہ کی مہربانی سے صلۂ زحمت کے طور پر مجھے ایک ایسا سرسبز باغ ملا ہے جس میں دن رات گھومتا ہوں اور باہر نکلنے کو کوئی راستہ نہیں پاتا۔ شاید اس میں کوئی دروازہ تھا ہی نہیں اور مجھے باغبان طلسم کار نے اس کی فصیل کی بلندیوں سے صحن چمن میں پھینک دیا تھا۔

شاہکار کا حشر بھی دل کے پرانے زخموں کو ہرا کرنے کا باعث بنا مگر،

انقلاب تعرّض مّا لا یتحمل غیرہ

(دل وہ صدمات بھی برداشت کرلیتا ہے جو کوئی برداشت نہیں کرسکتا) آخر رفتہ رفتہ یہ داغ دل بھی بے تمازت ہو گیا۔

"شاہکار" سے گو میرا مالکانہ تعلق نہ رہا لیکن اس کے موجودہ مالک سے روابط مہر و محبت بدستور ہیں۔ اس کا ہر نیا ایڈیٹر میں ہی تجویز کرتا ہوں، کاش مجھے یہ معاشی مشاغل اتنی فرصت دیں کہ میں صحیح معنوں میں اس کی نگرانی کے فرائض انجام دوں اور اس امر سے باخبر رہ سکوں کہ شاہکار میں کیا کچھ شایع ہو رہا ہے۔ اور مزید اصلاح و ترقی کی کس قدر گنجایش ہے۔ پچھلے دنوں اس کے کچھ پرچے دیکھنے کو ملے۔ ان میں سے ساحر لدھیانوی اور مخمور جالندھری کی شان میں تنقیدی انداز کے دو قصیدے پڑھ کر محسوس کیا کہ بازار فروشانہ تبلیغ کے یہ نمونے پرچے کی شان کے شایان نہیں۔ ساحر اور مخمور اپنی غلط نگاریوں میں پختہ ہو چکے ہیں۔ کسی اچھے پرچے میں ان کی خام مشقیوں کی اشاعت بھی موزوں نہیں چہ جائیکہ انہیں اپنے وقت کا "شیلے" اور "کیٹس" بنا کر رکھ دیا جائے۔ اور اس طرح ان غریبوں کو برخود غلط بنا کر ترقی کے دروازے ان پہ بند کر دیئے جائیں۔

مختصر یہ کہ "شاہکار" سے مجھے محبت ہے کہ سات سال تک اس نے میرا خونِ جگر پیا ہے۔ میں اسے بے اعتبار قلم فرسائیوں سے منزہ دیکھنا چاہتا ہوں۔

(بشکریہ "نقوش" لاہور)

"صنف غزل کے خلاف بعض بے رحم نقادوں نے ایک طوفان اٹھا رکھا ہے حالانکہ شاعری کی تمام اصناف میں صرف یہی صنف ایسی ہے جو شاعری کو موسیقیٔ بے سرود کا رتبہ بخشتی ہے۔ غزل کی دلکشی کا اندازہ اس امر واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ اس سے عناد رکھنے والے نقاد بھی جب نمائشِ عام سے الگ بیٹھ کر کچھ کہتے ہیں تو غزل ہی کہتے ہیں۔"

علامہ تاجور

دو قبریں

نتیجۂ فکر حضرت احسان دانش

(مولانا تاجور نجیب آبادی کے دو نوجوان لڑکوں کی بے وقت وفات پر)

یہ شام گورِ غریباں یہ رات کا آغاز
فضا میں ڈم دھند لکا ہے مائلِ پرواز

بچھی ہوئی ہے زمیں پر ردا اندھیرے کی
بہن رہی ہیں شعاعیں قبا اندھیرے کی

شفق کا رنگ غم انگیز بے قرار ہوا
الم فروش جنوں خیز سوگوار ہوا

سڑک پہ ابر کی صورت غبار گلّوں کا
مچل رہا ہے چھتوں پر دھواں محلّوں کا

خموشیوں میں پر افشاں صدا اذانوں کی
تھکن غریب پرندوں کو آشیانوں کی

زمین گنگ، فلک چپ، فضائیں آزردہ
پرانے خستہ مزاروں کی جھاڑیاں مُردہ

خموشیوں کے کھنڈروں کے نشان راہوں میں
مآلِ ہستی پہ آنسو نگاہوں میں

شفق ہے نزع میں پیڑوں کے سائے گہرے ہیں
نظر کی راہ میں تاریکیوں کے پہرے ہیں

خموش شمعیں ہیں ذرّوں کے روئے روشن کی
فسُردہ گھاس میں بوندیں ہیں کے روغن کی

ہے سایہ خاک سے لپٹا ہوا ببولوں کا
سیاہ رنگ کٹیلے کے زرد پھولوں کا

شرابِ نور سے خالی ہے آسماں کا ایاغ
کہیں کہیں نظر آتا ہے کوئی کوئی چراغ

ہیں محوِ خواب مزاروں میں صاحبانِ مزار
نہ جانے اور بھی کتنے ہیں بے نشان مزار

کسی کی قبر پہ ہے نصب مرمریں کتبہ
یہ حروف کا اندوہ آفریں کتبہ

کسی کی قبر پہ پژمردہ پھول روتے ہیں
کسی کی خاک سے کانٹے لپٹ کے سوتے ہیں

ہے کوئی نغمہ نواز اور کوئی شاعر ہے
کوئی ہے راہنما اور کوئی مسافر ہے

کوئی سخی، کوئی محتاج، پاسباں کوئی
امیرِ بحر کوئی، میرِ کارواں کوئی

کوئی گدا ہے، کوئی بادشاہِ ہفت اقلیم
کوئی نیاز نشاں، کوئی واجب التعظیم

کوئی حسین اور ایسا حسین جس کا جمال
خدا کے دل میں بھی پیدا کرے خدا کا خیال

یہاں ہیں غیرتِ سہراب و سام زیر و زبر
نہ جانے ٹھوکریں کھاتے ہیں کتنے کاسۂ سر

مگر یہ بزم ہے پابندِ فطرتِ خاموش
نہ اس میں نطق ہے ناطق نہ اس میں ہوش کو ہوش

غلام و خواجہ یہاں ایک صف میں شامل ہیں
یہاں کے ذرّوں میں آنکھیں ہیں خاک میں دل ہیں

اذخر ۔ خار دار پودا جو اکثر ویرانوں میں اُگتا ہے۔

گھٹا ہوا ہے یہاں دم کسی طرازی کا — چراغ گُل ہے حسینوں کی عشوہ سازی کا
یہاں ہیں فلسفیوں کی فراستیں عاری — یہاں کی گرد میں اُڑتا ہے زعمِ خودداری
یہاں غرورِ ندامت سے سر جھکاتا ہے — جنونِ عشق یہاں تھک کے بیٹھ جاتا ہے
یہاں کی دوب کے ریشوں میں رس ہے لاشوں کا — یہ اک ہجوم ہے سہمے ہوئے تماشوں کا
یہاں نہ ماؤں کو بچوں کی یاد آتی ہے — نہ کمسنوں کو یہاں تیرگی ڈراتی ہے
یہاں سکوت ہے بانگِ ہزار سے پیدا — یہ اک خزاں ہے جہاں کی بہار سے پیدا
ہیں تند و تیز بگولے یہاں کے ہرکارے — یہاں گھٹائیں بجاتی ہیں آ کے نقارے
عروسِ صبح نکلتی ہے بے نقاب یہاں — نظر کا فرش بچھاتا ہے آفتاب یہاں
یہاں چراغ دکھاتا ہے چاند راتوں کو — یہاں کے لوگ ہی جانیں یہاں کی باتوں کو
عجب ہے خاک نشینوں کی سلطنت کا نظام — یہاں فقیر نہیں کرتے بادشہ کو سلام

ہیں اشک تر مری آنکھوں میں کیا بہاروں پر
کھڑا ہوں دیر سے دو تازہ تر مزاروں پہ

کہ تاجور[1] کے جواں سال تاجدار ہیں یہ — خزاں نصیب جوانی کی یادگار ہیں یہ
یہ پھول اپنی لطافت کی داد پا نہ سکے — کھلے ضرور مگر کھل کے مسکرا نہ سکے
ہے سینہ چاک جدائی میں گلستاں ان کا — جگر کو تھام کے روتا ہے باغباں ان کا
کتابیں میز پہ جب ان کی دیکھ پاتی ہے — تو ماں الم کے سمندر میں ڈوب جاتی ہے
لباس ان کا ٹرنکوں سے جب نکلتا ہے — تو رنج و غم کا کلیجے پہ تیر چلتا ہے
قریب شام جو چھٹی کا وقت ہوتا ہے — غریب باپ جدائی میں خون روتا ہے
ہوا اکھڑتی ہے امید کے سفینے کی — مچلنے لگتی ہے سانسوں میں آنچ سینے کی
خموشیوں کو رلاتی ہیں ان کی تحریریں — نگاہ میں ہیں کفن پوشیوں کی تصویریں

مگر یہ سوئے ہیں ایسے کہ کچھ خبر ہی نہیں
خراب حال پہ ماں باپ کے نظر ہی نہیں

خموش، جیسے یہ ناراض ہو کے آئے ہیں — عدو سمجھ کے عزیزوں نے دل دکھائے ہیں
وہ باپ نام سے جو موت کے دہلتا تھا — ذرا سے ذکر پہ رُخ بات کا بدلتا تھا
نظر میں اس کی اب اچھی ہے موت جینے سے — وہ دل شکستہ ہے دنیا کے ہر قرینے سے

اگرچہ اس کو خبر ہے کہ ہستیٔ فانی
نہیں ہے کچھ بھی بجز آفت و پریشانی

مسرتوں کا نتیجہ ہے مبتلائے غم ہونا — غرض حیات سے ہے رہروِ عدم ہونا
طلوعِ صبح کی قسمت میں شام ہونا ہے — جو نام ہے اسے محرومِ نام ہونا ہے

[1] شمس العلماء مولانا تاجور نجیب آبادی

چمن کی پشت پہ ویرانیوں کا مسکن ہے — مآل صدر نشینی کا کنج مدفن ہے
نشاط جانی ہے تشویش بھر کے سینوں میں — نہاں ہیں اشک تبسم کی آستینوں میں
ہر اک بہار کا انجام ہے خزاں یابی — ہر اک عروج کے مقسوم میں ہے عشر تابی
خود موج بقا ہے بقا نہیں لیکن
فنا کا نام فنا ہے فنا نہیں لیکن
یہ مختصر سا خلاصہ ہے اس کہانی کا — بھرا ہے موت نے بہروپ زندگانی کا
تعینات کی توضیح میں اندھیرا ہے — یہ تیرا میرا، نہ تیرا ہے اور نہ میرا ہے
یہ سب درست مگر پھر بھی قلب انسانی
ہجوم رنج میں کرتا ہے اشک افشانی
رہے نہ صبر تو نالے چھلک ہی پڑتے ہیں
جگر کی چوٹ سے آنسو ٹپک ہی پڑتے ہیں

قطعہ

بن رہا ہے عشق ہی میرا ستم آموزِ دوست
یعنی میں اپنے لئے خود دام خود صیاد ہوں
میرا ہونا تہمتِ ہستی بنا میرے لئے
اپنی فطرت پر میں اک الزام بے بنیاد ہوں

(علامہ تاجور)

علامہ تاجور اپنے خطوط کے آئینے میں

کسی نقاد کا یہ نظریہ صد فی صد درست ہے۔ کہ خط ایسا آئینہ ہوتا ہے جس میں انسان کے حقیقی خد و خال نظر آتے ہیں۔ اس نوعیت نفسیاتی مطالعے کے علاوہ مشاہیر کے خطوط ادب و انشا کا نہایت قیمتی سرمایہ ہے۔ علامہ تاجور کے خطوط ان دوگونہ بلکہ سہ گونہ صفات کے حامل ہیں۔ ان خطوط میں ان کے دوستانہ تعلقات کی جھلکیوں کے علاوہ اُن کا ادب بھی معراج پر نظر آتا ہے۔ اس تنگیٔ داماں نے صرف چند خطوط ہی پیش کرنے کی اجازت دی ورنہ یہ پورا ذخیرہ مطالعے کے قابل ہے۔ خدا کرے ایسا وقت آئے۔ کہ مولانا کے تمام خطوط کتابی صورت میں پیش کئے جا سکیں۔

آغا شورش کاشمیری۔ ایڈیٹر چٹان کے نام،

۷۵۶

آغا شورش! پائندہ باد!

کل ایک خط لکھ چکا ہوں جس میں کانفرنس کے انعقاد کے مسئلے پر مسلسل کئی دن سے غور کر رہا ہوں اور تادمِ تحریر میری یہ رائے ہے کہ وقت بہت کم ہے اس وقت تک ضروری انتظامات ہم نہ کر سکیں گے۔ ادھر تم نے کاوش کو لکھا ہے کہ حریفانِ ستم رسیدہ ہم سے پہلے کانفرنس کرنا چاہتے ہیں معاملے کا یہ پہلو صرف یہ جیسا لگ رہا ہے۔ لاہور سے باہر کی دنیا ہمارے باہمی نفاق و انشقاق سے بے خبر ہے۔ اگر ہم نے اُن کے بعد پندرہ بیس روز کا وقفہ ڈال کر کانفرنس کی تو اوّل تو اُس کا انعقاد مضحکہ خیز بن جاتے گا دوسرے اتنی جلدی دوسری کانفرنس کبھی کامیاب نہ ہو سکے گی۔ اور درحقیقت یہ ناکامی قدرت کی جانب سے انتقام ہوگا تمہاری اُن مہاجمانہ احراری شورشوں کا جو تم نے سر ظفر اللہ خاں صاحب کے انتخاب صدارت کا بہانہ بنا کر اپنے حریفوں سے روا رکھیں۔ یہ نا بونوجوان! اگر ہمیں اردو زبان و ادب سے محبت ہے تو اس کا تقاضا تو یہ ہونا چاہیئے کہ اردو کی خدمت جہاں ہو رہی ہو جن ہاتھوں سے ہو رہی ہو ہم اپنا مخلصانہ تعاون پیش کریں۔

تم مجھے دیکھو انجمن ترقی اردو والے مولوی عبدالحق میری ذات سے للّٰہی بغض رکھتے ہیں۔ مجھے شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ظاہر ہے کہ یہ خطاب میری کسی سیاسی خدمت کا صلہ نہ تھا کہ میں سیاسیات اور سیاسیین سے منزلوں دور رہتا ہوں۔ اردو زبان کی تھوڑی بہت خدمات اس خطاب کا سبب بنیں۔ بہ حیثیت ایک رہنمائے زبان و ادب کے مولوی صاحب موصوف کا اس خطاب پر اظہارِ مسرت کرنا سب سے بڑھ کر ضروری تھا لیکن اُن کی کینہ پروری اُن کے احساسِ فرض پر غالب آگئی۔ انہوں نے اپنے پرچے میں خطاب سے متعلق ایک سطر بھی شائع کرنی ضروری نہ سمجھی۔

(نامکمل)

شاگردِ رشید چونی لال کاوش کے نام

۷۵۶

عزیز گرامی قدر کاوش!

ہزاروں دعائیں لاکھوں سلام۔ تمہارا خط ایسے وقت ملا کہ میں تم سے مایوس ہو چکا تھا۔ تمہارے لئے میرے دل میں طوفانِ محبت دماغ میں متعصبانہ

خیالات اور زبان پہ بے تحاشا گالیاں جاری تھیں۔ کاوش تمہارے مستقل طور پر گم ہو جانے سے دل میں ایک خلا سا محسوس کرتا ہوں۔ ۱۵ لاکھ کی آبادی کا یہ لاہور میرے لئے تو اجاڑ ہو رہا ہے۔ تم یاد آتے ہو، تمہارے بھائی یاد آتے ہیں۔ تمہاری والدہ یاد آتی ہیں۔ تمہاری دلہن اور تمہارے حسین بچے یاد آتے ہیں، تم سب وہاں اپنی زندگی کی مسرتوں سے کھیل رہے ہو مگر کمبخت! تمہارا ایک کشتی بھرا پورا خاندان اپنی یاد سے مجھے یہاں بے چین کئے ہوئے ہے۔ کیا ہم تم کبھی پھر بھی مل سکیں گے؟ امید نہیں پڑتی۔ کہ میری زندگی بہت تھوڑی سی رہ گئی ہے۔ مشرقی پنجاب کی قیامت ایک شاعر کے دل کے لئے پیام مرگ سے کم نہ تھی۔ میں نے یہ ہوش ربا تماشا اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا کہ دیکھنے کی تاب ہی نہ رکھتا تھا۔ سنا ضرور ہے، آہ بدنصیب لوگوں کی زبان سے یہ رام کہانی سنی ہے جن پر یہ بیتی، میرے پہلو میں کوئی فولاد کا ٹکڑا حرکت نہیں کر رہا تھا۔ دل تھا ایک شاعر کا دل، ایک ایسے غم نصیب انسان کا دل جو جوانوں کی موت سے بے کار ہو چکا ہے۔ مشرقی پنجاب کے ہوش ربا اور درد بھرے افسانوں نے دل پر گھن کی سی ضرب لگائی اور یہ آبگینہ پیاناچور ہو گیا۔ اب جینے کو جی رہا ہوں۔ مگر اصطلاحی زندگی جی رہا ہوں ”لطفِ زندگی“ —— ؟ یہ لفظ پڑھا ضرور ہے، کہیں کہیں دیکھا بھی ہے دور کھڑے ہو کر دیکھا ہے کمبخت میرے لئے تو خواب بے تعبیر ہی بنا رہا ہے۔ اچھا —— جس چیز سے کبھی واسطہ ہی نہیں پڑا اس کا ذکر ہی کیا؟ چھوڑو اس ذکر کو۔

جنوری ۱۹۴۷ء سے جون، ۴۸ء ملک خان بہادر ڈاکٹر محمد یوسف کے زیر علاج رہا۔ بیماری کیا تھی، فربہی —— مٹاپا۔ جسم کا دو سو انتیس ۲۲۹ پونڈ وزن کھینچنا پڑ رہا تھا۔ حکم ملا ”ویٹ (وزن) کم کیجئے“۔ ایک ہدایت نامہ ملا۔ کوئی راج کا ”ہدایت نامہ خاوند“ نہیں ڈاکٹر یوسف کا ہدایت نامہ۔ روٹی قطعاً بند ابلی سبزیاں، کچی سلاد اور دہی کا مقطر، نسوت پانی ”ایک ہفتے کی فاقہ کشی سے ۲۲ پونڈ وزن کم ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب یہ سن کر گھبراتے“ وزن کی کمی بہت زیادہ ہے میں اتنا نہیں چاہتا، زیادہ سے زیادہ ۶ پونڈ فی ہفتہ“ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ نتیجہ یہ کہ وزن گھٹتے گھٹتے ۱۷۱ پونڈ پر آ رہا۔ دوست احباب مبارک باد دے رہے تھے کہ ”اب آئے ہو آدمی کے جون میں“ لیکن ان عقلمندوں کو کیا پتہ؟ کہ آدمی کے جون میں رکھ کر قدرت کو ہماری زندگی ہی مطلوب نہیں —— اس نے ایک بھینسے کے جون میں جلانے کی حامی بھری تھی ہم نے ڈاکٹر یوسف کے ذریعے آدمی کے حدود میں جینا شروع کر دیا —— یہ زندگی خالقِ زندگی کو پسند نہ تھی۔ اٹھا کے پٹک دیا۔ اب —— اب تو زندوں میں نہ مردوں میں۔ زندگی اور موت دونوں کے ساتھ مذاق کر رہے تھے۔ ایک دن غلطی سے آئینے کا سامنا کر بیٹھے —— ہم ٹھہرے شاعرِ حسن کے پرستار بد صورتی اور بد صورتوں کو سزائے زندگی سمجھنے والے —— آئینے میں سامنے کے حریف پر نظر پڑتے ہی آپے سے باہر ہو گئے، جتنے لام کاف ڈکشنری کے یاد تھے رسم رونمائی میں مد مقابل کے سامنے گن کر رکھ دیئے۔ اچانک بے درد حافظے نے چٹکی لی —— کیا کر رہے ہو؟ ہوش کی لو! ماتھے کی گھنڈی اور من کی گرہ کھولو! سامنے علامہ تاجور کھڑے ہیں —— ایں —— ہیں! علامہ تاجور —— ؟ یہ ہیں وہ؟ —— نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتے —— یہ تو چچا وطنی کا کوئی منگلو حلوائی ہے جو ہر پسنجر ٹرین کی آمد پر پکا گانا شروع کر دیا کرتا ہے ”پوری حلوا گرم“

نہیں میاں! منگلو حلوائی کمبخت کوئی اور ہوگا۔ یہ تو سچ مچ علامہ تاجور ہیں۔ جبر جبری فاقہ کشی کے دباؤ سے یہ کر رہ گئے ہیں۔ آج کل موت سے کبڈی کھیل رہے ہیں۔ بس پالا ہارنے ہی کو ہیں۔ صبح کے اخبارات ذرا توجہ سے دیکھتے رہو۔ معاملہ صبح شام ہی کا ہے استغفر اللہ۔ دل و دماغ کی صورت قلم بھی بے قابو ہے —— ہاں تو کاوش! تمہیں خط لکھ رہا تھا۔ بھئی کابل سے پشاور۔ پشاور سے لاہور اور لاہور سے اتنی لمبی زقند لگائی کہ کلکتے جا پڑے بھلے آدمی کلکتہ آدمیوں کے رہنے کی جگہ نہیں۔

مَلک یوسف العزیز ڈپٹی ڈائرکٹر پبلک ریلیشنز کے نام!

۵۵

صدر بازار۔ راج ہوٹل۔ ڈلہوزی

مکرمی یوسف العزیز سلمہ رب آمین۔

سلام مسنون۔ چار مضامین ارسالِ خدمت ہیں۔ زندگی بے کیف گزر رہی ہے، ستمبر کو روانگی کا ارادہ تھا مگر رات کی دھواں دھار بارش سے

آج بہت پر بہار کا کوئی ٹکڑا ہم آ پڑا۔ اللہ تعالےٰ رحم فرماتے ڈلہوزی زنداں بن رہا ہے۔ دیکھئے اس قید بے میعاد سے رہائی بھی ملتی ہے یا نہیں!

آپ نئی لاہور کی دلچسپیوں کو "خوانِ نعیما" بنا کر لوٹ رہے ہوں گے اور ہم۔! ہماری کچھ نہ پوچھئے بس جی رہے ہیں۔ اصطلاحی طور پر ہمیں زندوں میں شمار کر لیجیئے۔ جیلا یہ بھی کوئی جینے میں جینا ہے۔ لاہور سے دور، لاہور والوں سے دور۔ جینا آپ کا، آپ کے خوبصورت اور بدصورت ہم جلیسوں کا سردار فوجا سنگھ وغیرہ کا۔ ہمارا کیا جینا، کچھ نہیں۔ اپنے دفتر کے زندوں کی فہرست بناؤ تو مسٹر ودہرا کو سرِ عنوان لکھنا، پھر پنڈت زتشی کو اُن کے بعد جواں نما دیرینہ سال غیر معروف جرنلسٹ کو۔ اور اخیر میں دفتر کے فرعونِ بے مصر کا نام لکھ ڈالنا۔ یہ گیدن زندگی بھی جینے کی طرح جی رہا ہے۔ حالانکہ زندگی اور موت دونوں کے لائق نہیں۔

مُردوں کی فہرست تیار کرنی ہو تو اپنے اکاؤنٹنٹ کا نام جلی قلم سے لکھنا۔ باقی رجسٹر مضامین والے شیخ صاحب سے پوچھ لینا کہ آپ کس فہرست میں درج ہونا پسند کرتے ہیں! میر صاحب قبلہ کو زندگی اور موت کے "اعراف" کی حیثیت سے درج کرنا۔ ہاں ایک اور ضروری بات۔ مسٹر ودہرا کا سینہ چیر کر دیکھنا کہ اُن کا دل بھی اتنا ہی خوبصورت ہے جتنا چہرہ ہے یا دل کا حسن چہرے نے جذب کر لیا ہے۔ رہے تم! تمہارے دل سے میں روشناس ہوں تمہارا دل اور میلا رام وفا کا چہرہ دونوں ایک ہی سکھتڑا آرٹسٹ کے شاہکار ہیں۔

نئے اور نو وارد ملیچے کو دعا

نیاز مند

تاجور۔

<u>بنام سید انور کرمانی صدر مجلس اردو لدھیانہ</u>

۷۸۶

کلیر ماؤنٹ۔ بیلون

ڈلہوزی

سید الاُدباء حضرت انور کرمانی

سلام مسنون۔ دونوں نظموں کا شکریہ۔ سلسلۂ التفات جاری رکھیئے! شاہکار زیر تحریر نمبر آپ کے ملفوظات سے خالی ہے کہ دونوں نظمیں پچھلے دو نمبروں میں تقسیم ہو گئیں۔ مکرمی شیخ محمد رفیق صاحب قبلہ سے بھی ماہنامے کے لئے پانچ سات غزلیں حاصل کر لیجیئے۔ اُن کی جناب میں تقاضا کرتے ہوئے حجاب سا محسوس کرتا ہوں۔

یادش بخیر وہ بڑی خوبیوں کے انسان ہیں۔ قدماء کی مجلس میں شریک کیئے جائیں تو معلوم ہوتا ہے میر تقی کے ہمعصر ہیں۔ فنی معلومات کے ماہر، آدابِ فن کے پرستار، آدابِ مجلس پر سختی سے کاربند۔

نئی روشنی کی صحبت میں شامل ہوں تو زندگی اور دنیا کے متعلق تازہ ترین اور مکمل ترین اطلاعات کے صحیح صحیح "محافظ"۔ انگریزی زبان و ادب سے پوری طرح باخبر۔ جدید شاعری اور ترقی پسند مصنفین و اُدباء کے ادبی کارناموں کے بلند نظر نقاد، ہندوستان کے فارسی شعرا میں ممتاز۔ سیاسیات حاضرہ کے مبصر۔ اس جامعیت اور فنی قابلیت کے لوگ ہمارے دائرۂ تعارف میں انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ دراصل حضرت رفیق مولینا سید مقبول احمد صمدانی کی مجلس علم و فضل میں شرکت کا حق رکھتے ہیں۔ یہ دونوں حضرات جدید و قدیم تہذیب کے حامل اور مشرقی خصوصیات کے نمونے ہیں۔ بس ایسے جامع الصفات حضرات کی بے حد قدر کرتا ہوں۔ شیخ صاحب کی زندگی تو بفضلہ بے خطرہ نظر آتی ہے مگر خائف ہوں کہ مولینا صمدانی کی شمعِ حیات جھلملا رہی ہے۔ علم و ادب کا واسطہ! انہیں زندہ رکھو، مرنے نہ دو، کہ ان کے چراغِ زندگی کے ساتھ محفلِ علم و ادب بھی بے فروغ ہو جائے گی۔

آپ نے مجلسِ اردو کے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ بھئی میں اب ان ادبی ہنگاموں سے وحشت زدہ رہتا ہوں۔ یوں بھی ہماری مجالس سخن تبلیغِ نو کی بجائے تخریبِ فن کا باعث بن رہی ہیں، ہمارا ادب نام نہاد ترقی پسندی سے مغلوب و مجروح ہو کر فحاشی اور دہریت کے

راستے پر پڑ چکا ہے۔ ہماری آزاد شاعری ہر قسم کے آداب شاعری سے آزاد ہو رہی ہے۔ اس فن شریف پر بے نسل و بد نسل تُک بندوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ طوائف، بیکلہ اور عصمت باختہ دوشیزائیں فن شعر و شاعری کا موضوع بن گئی ہیں۔ اسکول سے بھاگے ہوئے آوارہ خیال نوجوان اپنی خام مشقیوں غلط نگاریوں، خیال و فکر کی پستیوں کے زیر تصرّف شعر و ادب کو تباہ کر رہے ہیں۔ شاعری اب دماغ کی بجائے گلے سے متعلق ہو رہی ہے۔

اس ناسازگار ماحول میں اہل فکر و نظر کے لئے کوئی جاذبیت باقی نہیں رہی۔ ہمیں اب مرنے کے لئے آزاد کر دو۔ کہ جینے میں کچھ مزہ نہیں رہا۔ کیسا جلسہ اور کس کا مشاعرہ نام نہ لیجئے! کہ اس ذکر سے خلجان ہوتا ہے۔

آپ نوجوان ہیں۔ مرفہ الحال ہیں، ذہین و فطین ہیں بلند نظر ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کا کلام ملکوتی تقدّس کا حامل ہے۔ اپنی جوانی کا ہمت سے کام لیجئے اور ادب و شعر کی اس معمورۂ جہل و معصیت ظلمت زار فضا میں ہدایت کی شمع روشن کیجئے! اور مجھ جیسے منکر ماحول کو دل سے بھلا دیجئے!

"رسم است کہ مالکان تحریر
آزاد کنند بندۂ پیر"

والسلام
خیر طلب تاجور

<u>سردار ادے سنگھ شائق کے نام</u>

۷۸۶

لاہور

۲۴-۴-۴۵

محبی سردار صاحب!

تسلیم نیاز۔ خط کا تشکریہ۔ آپ کا جی نہیں بھرا؟ کہ پھر ہنگامہ بپا رہے۔ میں زندہ اور تندرست رہ سکا تو ضرور حاضر ہوں گا۔ اور اگر سب سے بڑے مشاعرے کی دعوت نہ پا سکا تو اپنے ہنگامے میں اظہار افسوس اور رفتہ داروں سے ہمدردی کا ریزولیوشن ضرور پاس کرا دیجئے گا۔ طبیعت کچھ دنوں سے غمگین رہتی ہے۔ ساحل حیات آوازیں دے رہا ہے۔ کبھی کبھی ادھر بڑھتا ہوا بھی نظر آتا ہے۔ منجدھار کی کشاکش مجھے بھی پسند نہیں ناخدا گم ہے، کشتی ہچکولے کھا رہی ہے۔ دیکھنا چاہیئے انہیں کیا منظور ہے؟ دوستوں کی جدائی کا خیال ہے ورنہ زندگی تو بے مزہ بن چکی ہے۔

نسیم۔ اُس کی والدہ۔ اُس کا بھائی اور ملازم۔ یہ سب امرتسر کی گاڑی آنے سے پہلے اسٹیشن پہنچ گئے تھے اور لائل پور کی گاڑی کو بار بار تلاش کرتے رہے۔ حافظ عبداللہ ایم ایل اے اسی گاڑی سے جا رہے تھے۔ نسیم کور غالباً نہ اُس گاڑی سے اُتری اور نہ دوسری گاڑی سے لائل پور کو سوار ہوئی۔ والسلام

نیاز مند تاجور

(۲)

ڈیوِن شائر۔ مندھور بازار پوسٹ آفس ۷۸۶ مورخہ ۱۲ ستمبر ۴۴ء

مسوری

محبی سردار صاحب! نیاز شوق

میں تین جولائی سے مسوری ہوں۔ امید ہے کہ آپ بہمہ وجوہ بہ صحت، و مسرت وقت بسر کر رہے ہوں گے۔ میری غیر موجودگی میں اہل لاہور ایک عظیم الشان ہنگامہ آل انڈیا اردو کانفرنس کے نام سے منعقد کرنے کی تجویز منظور کر بیٹھے ہیں اور مجھے صدر مجلس استقبالیہ بنا دیا ہے۔ مجلس اردو پنجاب کے زیر اہتمام یہ کانفرنس نومبر کے پہلے یا دوسرے ہفتے میں تین دن تک جاری رہے گی۔ غالباً جسٹس سر عبدالرحمان اس کا افتتاح کریں گے۔ اور کانفرنس کی چند نشستوں کے صدر (۱) آنریبل سردار عبدالرب نشتر وزیر سرحد (۲) مولانا حسرت موہانی (۳) ڈاکٹر ذاکر حسین خاں جامعہ ملیہ (۴) مولانا مظہر علی اظہر احرار رہنما (۵) راجہ نریندر ناتھ یا سر بھٹناگر (۶) زیر تجویز۔

آخری دن شب کو آل انڈیا مشاعرہ مولانا ظفر علی خاں کی زیر صدارت ہوگا۔ میرا اجلاس کا ایک سیکریٹری ہوگا۔ ایک اجلاس کے سیکریٹری آپ مقرر ہوتے ہیں۔ بہت بڑا پنڈال بنے گا۔ ادبی لٹریچر کی نمائش ہوگی اور غالباً چوتھے دن اردو شاعرات نسوانی مشاعرہ کریں گی جس میں انعامات بھی تقسیم ہوں گے۔ اخراجات کا اندازہ سات ہزار روپیہ لگایا گیا ہے۔ میں اپنا مقررہ پروگرام منسوخ کر کے ۲۵ ستمبر تک لاہور پہنچ رہا ہوں۔ نسوانی مشاعرے میں عزیزہ نسیم کور بھی نظم پڑھے گی۔

آپ کے پاس مجلس انتظامیہ سے باقاعدہ دعوت نامہ پہنچے گا اور غالباً ایک مختصر سا وفد بھی۔ اطلاعاً عرض ہے۔

زمیندار، ادا کار، پارس اور دوسرے اخبارات میں نوٹ شایع ہو چکے ہیں اور عنقریب مسلسل تبلیغ تمام اخبارات کے ذریعے کی جائے گی منتظمین کے حوصلے بہت بلند ہیں اور وہ اس کانفرنس کو موجودہ عہد کی تاریخی یادگار بنانے کے لئے مساعی ہیں۔

میرے بال بچے بخیریت ہیں۔ وہ ۲۵ ستمبر کو رام پور جا رہے ہیں اور وہاں سے غالباً ۱۰ اکتوبر کو لاہور روانہ ہوں گے۔ آپ کہاں ہیں۔ کہاں کہاں رہے؟ لاہور کب آئیں گے؟ عزیزہ نسیم کور و اندرجیت سنگھ کو دعا اور پیار۔ نسیم چچا و چچی اور نسیم کور کی نانی صاحبہ کو سلام اور بہن نسیم کور کو ست سری اکال کہتی ہے۔ سردار بہادر سردار سرون سنگھ کی خدمت میں واہگورو کا خالصہ۔

نیازکار
تاجور

(۳)

۱۱ نومبر ۱۹۴۴ء بیدے

دیال سنگھ کالج لاہور

محبّی سردار صاحب!

نیاز، خط ملا۔ بار بار لائل پور جانے کا دل میں ولولہ اٹھتا ہے مگر ہر بار یہ طوفان زندگی کی چٹانوں سے ٹکرا کر بیٹھ جاتا ہے۔ مسوری میں بھی جی نہ لگا۔ آپ کو اس لئے زحمت نہ دی کہ لائل پور سے دہرہ دون تک کا کرایہ ایک کنبے کا بہت زیادہ پڑ جاتا ہے اور مسوری مہنگی ثابت ہوتی ہے۔ ۲۶ ستمبر کو مسوری سے واپس ہوا اور اب تک یہیں ہوں سو اتفاق یہ کہ آپ کو بھی اس درمیان میں لاہور آنے کی مہلت نہ مل سکی۔ جہلم کالج کے مشاعرے کی صدارت کے لیے ایک وفد آیا ہوا تھا۔ بصد التجا معذرت کر دی۔ لیکن پشاور والے کسی صورت راضی نہ ہوئے۔ وہاں ۸ نومبر کو جانا ہی پڑے گا۔ آپ بڑے دن کی چھٹیوں میں لائل پور رہیں گے یا فرید کوٹ؟ عزیزہ نسیم کور میرا خیال ہے اس تعطیل میں لائل پور یا فرید کوٹ جائے گی۔ خدائے تعالیٰ اُسے امتحان میں باعزت کامیابی عطا کرے۔ آمین۔ عزیزہ نسیم کور ایف اے، بی اے لاہور ہی کرے گی۔ اُس کے لئے سب سے اچھا کمرہ میرے گھر میں ریزرو ہوگا۔

نسیم[1] گزشتہ ڈیڑھ سال سے پڑھ ہی نہ سکی۔ چھوٹے بھائی کی پرورش اسی کو کرنی پڑی۔ اس کے اب تک گھر کا کام کاج اور باورچی خانہ سپرد رہا پرسوں باورچی دیس سے واپس آیا ہے تو اُس کی خلاصی ہوئی ہے۔ وہ تو شاید ہی امتحان میں کامیاب ہو۔ بہرحال وہ بضد ہے کہ امتحان میں ضرور بیٹھوں گی کوئی حساب پڑھانے والا نہیں ملتا۔ چھ ماہ وہ اسکول نہ جا سکی۔ حاضریاں اُس کی گھٹتی رہیں۔ یہ کمی پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ نسیم کی ماں اب بفضلہ تعالیٰ تندرست ہے۔ سردار سرون سنگھ یاد آتے ہیں بیچارے میری طرح بوڑھے ہو گئے ہوں گے۔ اُن کو ست سری اکال عرض کرتا ہوں۔ بچے سلام کہتے ہیں

نیازمند
تاجور

---

[1] علامہ کی صاحبزادی صاحبہ

(۴)

۷۸۶

غالباً آخری خط

محبّی سردار صاحب!

آج خان بہادر ڈاکٹر محمد یوسف نے میرا معائنہ کیا یہ میرے ۲۵ سال سے معالج چلے آتے ہیں۔ ان کے اندازِ گفتار سے میں واقف ہوں۔ آج ان کی مرموز گفتگو سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ ؎

"گھر گھر جس کا چرچا ہے وہ میرے گھر بھی آئے گا"

"آئے گا" کیا معنی۔ آرہا ہے۔ پہنچنے کو ہے، دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ "ہائی بلڈ پریشر" کے سلسلے میں دل جواب دے رہا ہے۔ قسمت کی شکایت کیا تقدیر یہی تھی کہ دوستوں سے ملنے کی حسرت کو توشۂ سفر بنا کر حدودِ زندگی سے گزر جاؤں۔

اچھا دوستو! تم نے اپنے حدود کو میرے لئے دیوارِ راہ بنا دیا۔ لیکن وقت کو تم سے ضد ہے وقت مجھے میرے اور تمہارے حدود سے بے نیاز کر کے بے حدود بنا رہا ہے۔

حامداً و مصلیاً

ڈاکٹر محمد یوسف کے نام

۲۵ نسبت روڈ

دیال سنگھ پبلک لائبریری لاہور

۹-۷-۱۹۴۹

محترم قبلہ جناب ڈاکٹر صاحب!

سلام مسنون: بحمد اللہ تعالیٰ مجوزہ نسخہ مفید ثابت ہوا ہے۔ گزشتہ دس دن کی مدت میں دل کا دورہ نہیں پڑا اسی لئے وہ "گولی" کھانے کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔ اجابت باقاعدہ ہو رہی ہے۔ بازوؤں کے پٹھوں میں ہلکی ہلکی کھچاوٹ بہت کم ہوتی ہے۔ وہ بھی کبھی کبھی۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد کبھی کبھی دورے کی ہلکی ہلکی علامات شروع ہوتی ہیں تو میں "گولی" کھانے کی بجائے کھڑا ہو جاتا ہوں تو دورے کی شروعات خود ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ بھوک بفضلہ تعالیٰ خوب لگتی ہے۔ نیند بھی خوب آتی ہے۔ کیا صبح کے وقت فرلانگ دو فرلانگ چہل قدمی کر سکتا ہوں؟ یہ دوا کب تک جاری رہے گی؟

والسلام

نیاز مند تاجور

لالہ نانک چند ناز ایڈیٹر پربھات لاہور کے نام

صدر بازار ڈلہوزی ۱۹ اگست ۱۹۴۲ء

۷۸۶

پیارے ناز نیاز مند کا سلام لو!

میں ۱۸ جولائی سے ڈلہوزی میں مقیم ہوں۔ یہاں مجھے مہتہ امرناتھ ایچ وی سی ڈپٹی کمشنر لاہور کی نوازش کاریوں سے زندگی کی تمام راحتیں میسر ہیں۔ میں مع اہل وعیال انہیں کا مہمان ہوں۔ مہتہ صاحب ایک صاحب علم وفضل انسان ہیں۔ فارسی ادب اور شاعری میں کافی دستگاہ رکھتے ہیں؛ بے حد غیر متعصب یعنی صحیح معنی میں انسان ہیں۔ "پربھات" پڑھتا ہوں اور آپ کی رنگین اور نشتریں تحریروں سے لطف اٹھاتا ہوں میرا خیال ہے کہ "پربھات" کی اشاعت دوسرے ہندو اخباروں کی سطح پر آگئی ہے۔ اور قبولیت کے لمبے لمبے ہمدرس ہاتھ اسے ملک کے گوشے گوشے میں پہنچا رہے ہیں "پرتاپ" کی ضمانت کا افسوس ہے۔ مہاشہ کرشن کے قلم نگارش میں اگرچہ میری ملت کے لئے زہر ہلاہل کے سوا اور کچھ نہیں ہے مگر

یہ اُن کی کاروباری پالیسی ہے۔ مجھے اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔ بہرحال یوں روزنامہ "پرتاپ" اپنی زندگی کا حق پیدا کر چکا ہے۔ اسے بند نہیں ہونا چاہیئے۔ میں تو مدتوں اس مغالطے میں رہا کہ مہاشہ کرشن کانگرسی ہی نہیں بلکہ شاید کسی نہ کسی کانگریس کمیٹی کے افسر مجاز بھی ہوں گے! اگرچہ ان کے شذرات پڑھ کر بعض اوقات حیرت ضرور ہوتی تھی۔ کہ کانگریسی ہوتے ہوئے کانگریس کی نام نہاد مسلم نوازیوں کی داستانیں بیان کرتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی کیا بلکہ اکثر ہندو سبھا کے نام کے بھجن بھی الاپتے رہتے ہیں۔ لیکن آج "پربھات" میں "پرتاپ" کی منقولہ عبارت پڑھ کر یہ راز منصۂ رسوائی پر آیا۔ کہ حضرت باہمہ وجوہ اخبار نویس ہیں۔ دوسرے اخباروں کے ایڈیٹر بھی لکھتے ہیں مگر آپ اس سیاسی خلفشار میں جس جرأت و بے باکی سے لکھ رہے ہیں قابلِ صد تحسین ہے کہ

"آپ تو پھر آپ ہی ہیں آپ کی کیا بات ہے"

مگر میں مسلسل دیکھ رہا ہوں کہ مسٹر جناح کے لئے آپ کا قلم بہت زہر چکانی کر رہا ہے۔ آپ کو علم ہونا چاہیئے کہ بہت سے مسلمان بھی "پربھات" کو خرید کر پڑھتے ہیں۔ ان میں سے ایک میں بھی ہوں۔ اخبار نویس کے لئے ہر قوم کے لیڈر کی حیثیت کا احترام ضروری ہے۔ آپ فرمائیں گے کہ مسلم پریس جہاتما گاندھی پر سب و شتم کی بوچھاڑ کر رہا ہے۔ اگر صحیح بھی ہو تو بہرحال نیکی کی نقل کرنی چاہیئے۔ برائی کی مشتاقانہ نقل بہرصورت ناروا ہے۔ پھر ایک اور بات کو بھی نظر انداز نہ کیا کیجئے کہ مسلم پریس کی تلخ نگاری اونچے درجے کی اور ادیبانہ ہوتی ہے۔ اور آپ لوگ تو اس کا انتقام لیتے ہوئے اس قدر وارفتہ ہو جاتے ہیں کہ اندیشہ ہو جاتا ہے کہ اب ننگے ہوئے۔

آپ ایک اونچے درجے کے شاعر ہیں۔ ادیب ہیں اور اگر اخبار نویسی آپ کو کولھو کا بیل نہ بنائے رکھے تو اردو ادب کے لئے بڑے کام کی چیز ہیں۔ آپ کو گالیوں کی فلاسفی پر ہفتہ دو ہفتہ غور و فکر کر کے اونچے درجے کی، ادیبانہ گالیوں کا ایک ذخیرہ تیار کر لینا چاہیئے تاکہ یہ انتقامی جنگ بے لطف نہ ہو جائے۔

جب سے یہاں قدم رکھا ہے۔ مانسون کی طوفان کاریوں نے زندگی سے بیزار کر رکھا ہے۔ دن رات بارش، صبح و شام بارش۔ ادھر سڑک پر پہاڑ آ پڑا۔ پہلے کو نو میل تک راستہ خراب ہے۔ اب کہا جاتا ہے کہ ۲۲ میل سڑک پر پہاڑ سجدہ کر رہا ہے۔ لوگ پریشان، اشیائے خوردنی گراں، سڑک کے سبب نہ جانے کی اجازت کی بھی گنجائش نہیں۔ مجھی پر کیا منحصر ہے کم سے کم دو ہزار آدمی پابرکاب بیٹھے ہیں۔ مگر ناحکومت نے مارشل لا جاری کر رکھا ہے۔ مانسون ٹریفک جانسن بنی ہوئی ہے۔ کسی کو حدودِ ڈلہوزی سے باہر جانے کا پرمٹ ہی نہیں دیتی۔ میں مسلسل جاگیری کے سبب بیمار پڑ گیا ہوں۔ ڈاکٹر فقیر چند جو ڈلہوزی کے ڈاکٹر یوسف ہیں۔ ان کے زیرِ علاج ہوں۔ مگر دیکھتا ہوں کہ فرشتۂ موت میرے متعلق نہیں کوئی اشارہ کر گیا ہے۔ وہ بار بار یہی فرماتے ہیں کہ "مولینا صاحب! آپ ڈلہوزی سے نہ جائیے۔ یا نہیں چاہتا کہ آپ کو یہاں سے جانے دیا جائے"۔ مجھے تو شبہ سا ہو چلا ہے کہ ان کی نیت بدل رہی ہے اور مجھے مستقل طور پر یہیں رکھنا چاہتے ہیں۔ مگر سوچتا ہوں کہ ڈلہوزی کی ذلیل فضا میں جینے کی طرح مرنا بھی ٹھیک نہیں۔ بے زندگی سرزمین جینے کی خوشی نہ موت کا ماتم۔ بھلا بے ہنگامہ موت بھی کوئی موت ہوتی ہے؟ البتہ ایک شرط پر یہاں مرنے کا ایثار بھی گوارا کر سکتا ہوں کہ میرے ساتھ ڈلہوزی کی ساری آبادی مرنے پر تیار ہو جائے۔ "مرگِ انبوہ جشنے دارد"۔ ایک صاحب نے بتایا کہ ڈلہوزی کی گذشتہ بست و پنجسالہ تاریخ میں جولائی میں زیادہ سے زیادہ ۴۲ انچ بارش ہوئی ہے اور اس بار جولائی میں ۳۸ انچ اور نصف اگست تک غالباً ۴۵ انچ بارش ہو چکی ہے۔ خیریت گزری کہ میرے ساتھ پنڈت میلارام وفا نہ آئے ورنہ ہم دونوں کی برکت اس مرتبہ مانسون کو طوفانِ نوح بنا دیتی۔ آپ کسی صورت انہیں یہاں بھیج دیں۔ کیونکہ میں ڈلہوزی اور ڈلہوزی والوں سے انتقام لینا چاہتا ہوں۔

یہاں ایک فلک بوس بلندی "بکروٹہ" کہلاتی ہے۔ سات ہزار فٹ کی اونچائی پر تو ڈلہوزی آباد ہے اور بکروٹہ ڈلہوزی کے صدر مقام سے شاعر کے تخیل کی برابر بلند واقع ہوا ہے۔ یہاں بہشتی لوگ مقیم ہیں کیونکہ صدر بازار کے پست سار کے مقابلے میں بکروٹہ ایک بہشتِ منظر

مقام سمجھا جاتا ہے۔ اس رفیع المدرجات آبادی کی شان میں نثری قصائد سنتے سنتے اب یہ ارمان تو فنا ہو چکا ہے کہ کاش ہم بھی اس بہشت کی سیر کرتے۔ البتہ یہ حسد ضرور پیدا ہو گیا ہے کہ وہ بہشت بریں کثرت یاراں سے اڑاڑا دھم ہو کر سربسجود ہو جائے اور انحطاط و عروج کی تاریخ یہ کہتی ہوئی اپنے آپ کو دہرانے لگے کہ ؎

کتنے مفلس ہو گئے کتنے تونگر ہو گئے — خاک میں جب مل گئے دونوں برابر ہو گئے

یہاں پھلوں میں پھل ایک ذلیل قسم کا سیب ہوتا ہے۔ یہ سیب دوبار لاہور کے لئے خرید سے جا چکے ہیں مگر ڈلہوزی کو ضد ہے کہ میری سرزمین سے آپ حسرتوں کی خاک کے سوا اور کچھ نہ لے جا سکیں گے۔ راہ گریز سے مایوس ہو کر گھر کے بچوں کو اذن عام دینا پڑا کہ اس سرخ و سپید انبار کو ہدیۂ منت دنداں بنا ڈالو مبادا تمہاری حسرتیں بھی ہمارے ارمانوں کی ہم قسمت ہو جائیں۔ اب بچے سیب کی جگہ بھی سیب کھا رہے ہیں اور کھانے کی بجائے بھی سیب۔ ہمارے بقیۂ نشتر چند رعشہ دار دانت مشہور ماہر امراض دنداں ڈاکٹر اسے جلال الدین کے عشق کی امانت بن چکے ہیں۔ اس امانت میں خیانت ہم کرنا چاہیں بھی تو نہیں کر سکتے۔ لاہور میں پہنچ کر یہ امانت اصلی مالک کے سپرد کر دینے کا خیال ہے۔

ڈلہوزی میں مانسون سے دوسرے درجے پر سکون زندگی اور اخبار نظر آتا ہے۔ یہاں نہ کانگریسی خلفشار نہ حکومتی گیر و دار۔ خاموشی گورستان کی سی خاموشی ہر پستی و بلندی پر فرماں روا ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ لاہور کے ہنگامہ پرستوں کے حق میں یہ ڈل فضا کس درجہ ناسازگار ہو گی۔

جنگ کی رفتار پر آپ کے بیباکانہ تبصرات اخبار کی زندگی میں طوفانی رنگ پیدا کر رہے ہیں۔ زندگی میں یہ پہلا موقعہ ملا ہے کہ آپ کا دل کھول کر اور کان فرما بھی اور پربھات کے صفحات روز بروز اس حقیقت کا اعلان کر رہے ہیں کہ آپ گوسوامی گنیش دت کی قدر ناشناسی کے گلہ گزار ہیں حالانکہ ان کی شکر گزاری آپ کا فرض ہے۔ قرآن شریف کی ایک آیت کا ترجمہ ملاحظہ طلب ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ "بہت سی ایسی باتیں ہیں جنہیں تم اپنے لئے ناپسند کرتے ہو اور حقیقت یہ ہے کہ وہ تمہاری بہبود کا سبب بنتی رہتی ہیں"۔ دیکھ لیجئے وہ لوگ بینہ قدر ناشناسی کے مرتکب نہ ہوتے تو آپ کو یہ آزاد زندگی اور آزادانہ کارکردگی کا سنہری موقعہ کبھی نصیب نہ ہوتا۔ صد ہزار تحسین کا مستحق ہے وہ صاحب نظر جس کی بصیرت نے آپ کی قابلیتوں کو عریاں دیکھ پایا۔ اور اپنی ہنر نوازی سے کام لے کر آپ کے لئے ایک میدان عمل نصیب کر دیا۔ جس میں آپ یکسوئی اور وہ گیا ہے کی بندشوں سے آزاد ہو کر اپنی گوناگوں اہلیتوں کو بروئے کار لا رہے ہیں۔ اخبار "پربھات" کا ہر نمبر اس دعوٰی کی تصدیق میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ یاد کریں بیس سال کے اس دردناک ماضی کو جب کہ سرمایہ دار آقا محنت و مشقت کے تاوان دستے میں آپ کی جفا پذیر زندگی کو کھینچتی رہی اور تشکر کریں اس زریں حال کا کہ آج آپ اپنی گزشتہ محرومیوں کی تلافی کر رہے ہیں اور آپ کے فرائض پر آپ کے سوا کوئی نگران نہیں۔ یہ سچ ہے کہ صحافتی مزاحیہ نگاری میں "گورکھا" کے بعد کوئی دوسرا گورکھا پیدا نہ ہو سکا۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ سرزمین شورہ زار نہیں ہے۔ "نیپالی" کا وہ مزاحیہ شذرہ جو اس نے رائے بہادر مہر چند کھنہ پر سپرد قلم و قرطاس کیا۔ میری رائے کا شاہد عادل ہے۔ "نیپالی" جب اس شذرے کو قلمبند کر رہا تھا تو یقیناً اس کے پیش نگاہ مزاحیہ نگاری کا یہ بنیادی اصول تھا کہ "مزاحیہ نگاری کا بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے تیز راستہ پھکڑ بازی اور دل آزاری کے عین درمیان میں کو ہو کر گزرتا ہے"۔

اس شذرے میں نہ تو پھکڑ پن کا شائبہ تھا۔ نہ دل آزاری کا عنصر، یہی وجہ ہے کہ خود رائے بہادر مہر چند نے بھی اپنے متعلق اس مزاح کو بہت پسند کیا۔ راقم الحروف نے اپنے دوست پنڈت میلارام وفا پر متعدد ظریفانہ نوٹ لکھے ہیں، مگر ایسا کوئی فقرہ بھی ان میں نہ تھا جس سے وفا کی دل آزاری کا پہلو نکلے یا جو پھکڑ بازی کی حدود میں شامل ہو گیا ہو۔ اپنے متعلق میرے ہر مزاحیہ نوٹ کو پڑھ کر خود وفا صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ "میں اس نوٹ کو پڑھ کر دیر تک ہنستا رہا"۔ اس گذارش کا مقصد یہ ہے کہ نیپالی کو بعض دوسرے اخباروں کے مزاحیہ نگاروں کی

پیروی کرتے ہوئے عوام کی پسندیدگی کا خیال مطلق نہ کرنا چاہئے اور یہ جان کر کچھ لکھنا چاہئے کہ اس نوٹ پر تنقیدی نگاہیں بھی پڑیں گی۔ یاد رکھئے کہ پسندیدگیٔ خواص ہی عوام کے لئے سند بنا کرتی ہے۔ ہر مزاحیہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ اپنے زیر مزاح اشخاص کی مجلسی حیثیت کو کبھی نظر انداز نہ کرے۔ اب آپ سمجھ ہوگئے ہوں گے کہ مسٹر جناح، سر سکندر حیات، سر گوکل چند نارنگ اور دیگر عمائد پر مزاحیہ نوٹ لکھتے ہوئے آپ کی ذمہ داری کتنی بڑھ جاتی ہے۔ ایسے بلند پایہ حضرات پر کچھ لکھنے سے پیشتر مزاحیہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی سطح سے بلند ہو کر ایک نہایت بلند مقام سے لکھنا شروع کرے۔ مزاحیہ نگاری درحقیقت ایک تنقیدی مسکراہٹ کا نام ہے۔ اور آپ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ قانون سازی کے بعد سب سے زیادہ مزاحیہ نگاری کے لئے محتاط زبان و اندازِ بیان اختیار کرنا ضروری ہے۔ یہ سطور نیپالی کے اندازِ نگارش سے متعلق تھیں۔

آپ سے بھی ایک گزارش ہے اور اس یقین کے ساتھ اسے پیش کر رہا ہوں کہ آپ اس ایثار کو کبھی منظور نہیں کریں گے کیونکہ ساری اخباری برادری میں کوئی بھی اس راہِ مستقیم پر بلا روی اختیار کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتا۔ وہ گزارش یہ ہے کہ ہندو مسلم فسادات کو مقامی حدود سے تجاوز نہ کرنے دیجئے۔ یعنی اگر ملتان میں بالفرض دو ہندو مسلمان آپس میں لڑ پڑتے ہیں تو اس چپقلش کو آل انڈیا نہ بنایا جائے۔ اس سے دوسرے مقامات کے ہندو مسلمانوں کو ملتان کے خونی ڈرامے کو دہرانے کی ترغیب ختم ہو جائیگی جو سیاستدان اخبار نویس ہندوستان کی تقسیم کے نام سے چراغ پا ہو جاتے ہیں۔ ان کا فرض بالخصوص یہ بن جاتا ہے کہ وہ مقامی فسادات کو ہندو مسلم سوال کے رنگ میں پیش کر کے ملک کو ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا بنانے سے انتہائی طور پر اجتناب کریں۔

"پیسہ حیات" میں ہندو مسلم اتحاد کی ایک بلند پایہ نظم شائع ہوئی تھی۔ اس انداز کی نظمیں اگر شائع ہوتی رہیں تو اشاعت کو پر پرواز لگ جائیں گے۔ خوش بختی سے حاجی لق لق کا مزاحیہ معاون بھی آپ کو حاصل ہے اسے جاری رکھئے۔ ان گورکھا دہلی ریڈیو میں مفت کی تنخواہ پا رہا ہے اسے بحیثیت ایک مزاحیہ نگار مرنے سے بچائیے۔ اب اس کے پاس دماغ کے ساتھ وقت بھی ہے۔ حد نیاز! نیاز کا دیرینہ

تاجور

۴۸۶

حفیظ اللہ خاں لیکچرر لا کالج لاہور کے نام

تم احراری نہ ہوتے تو عقلمند ہوتے، احراریت نے مجھ کو مجھ سے تمہیں بے نیاز بنا دیا ہے۔ سیدھا سادھا خط تھا خدا جانے تم نے اسے کن ٹیڑھی ترچھی نگاہوں سے پڑھا۔

اچھا بھئی! ایک بوری باسمتی کے بیان کردہ چاول، بیس سیر شکر اور بھائی گھی خاص الخاص۔ میرے عزیز عنقریب حاضر خدمت ہوں گے۔ والسلام تاجور

۴۸۷

۱۹۵۰ — ۱ — ۱۴

خانِ دوران! سلام۔ بھئی گھی کی ضرورت ہے۔ میرے غائبانہ دوست کو توجہ دلاؤ! باسمتی کے اچھے چاولوں کی ایک بوری کی بابت تم نے انتظام کر رکھا ہوگا۔ عنقریب میرے عزیز مسٹر نذیر صدیقی اسسٹنٹ انسپکٹر تمہارے پاس پہنچنے والے ہیں۔ باقی خیریت ہے۔ رقم بھی لکھ دیں تاکہ بھیج دی جائے۔ گھی والے دوست کی خدمت میں میرا سلام پہنچاؤ۔ والسلام

خیر طلب تاجور

۷۸۶

اپنے صاحبزادے ارشد اللہ خاں کے نام

عزیز محمد ! دعا۔ یہاں سب اچھے اور تم سب کی خیریت چاہتے ہیں۔ مدت سے تمہارا کوئی خط نہیں ملا۔ یہاں جھگڑے بدستور ہیں اور اب باؤنڈری کمیشن کے ہونے والے فیصلے کے اعلان پر بہت زیادہ گڑبڑ کا اندیشہ ہے۔ خدائے تعالیٰ رحم فرمائے آمین۔ اب صدیق صاحب سے پوچھ کر یہ لکھو کہ تم کب آؤ گے ان کے باقی دو پرچوں کا امتحان کس مہینے اور کس تاریخ ہوگا؟ تم عید پٹھان کوٹ کرو گے یا لاہور۔ لاہور ہم سے پوچھے بغیر نہ آنا۔ مسعود کا پتہ۔ مسٹر مسعود خلف الرشید مولانا اختر علی خاں صاحب، دفتر اخبار روزنامہ زمیندار۔ لاہور ——— مسعود کو سیدھا سادھا خط بھیجنا بدتمیزی کی کوئی بات نہ لکھنا۔ صدیق صاحب سلام۔ چنی اور پپو کا بھی سلام۔ صدیق صاحب کے والد اور چچا اور شاکر صاحب کو سلام پہنچے۔ والسلام

دعاگو تاجور

۷۸۶

لاہور۔ فتح محمد روڈ
۲۶-۶-۴۷

عزیزم عرشی۔ دعا۔ جب سے تم گئے ہو۔ تم نے اپنی خیریت نہیں لکھی، بڑا فکر ہے۔ یہاں کے حالات بہت ہی خراب ہیں۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ آمین۔ دیکھو بھائی۔ وہاں تم امتحان کی تیاری کرنے گئے ہو۔ انگریزی اور حساب کی ساری خامیاں جی لگا کر دور کرلو اور ٹائم ٹیبل بنا کر اس کے مطابق ہسٹری اور جغرافیے کو بھی یاد کرلو۔ انگریزی اور حساب لکھنے کی مشق زیادہ کرو تب کام چلے گا۔ دیکھنا بیٹے صدیق صاحب یا ان کے گھر والوں کو تمہاری طرف سے کوئی شکایت پیدا نہ ہو۔ تم بڑی ذمہ داری سے وہاں رہنا صدیق صاحب تمہارے استاد ہیں۔ ان کا ادب بڑا ضروری ہے

یہاں ڈاک کا انتظام بہت خراب ہو رہا ہے۔ سب تمہیں دعا کہتے ہیں۔ ہفتے میں دوبار اپنی خیریت سے اطلاع دیتے رہو۔ تمہیں دو جولائی کو خرچ بھیجا جائے گا۔ صدیق صاحب کے والد اور چچا کی خدمت میں میرا سلام کہو۔ صدیق صاحب اور شاکر صاحب کو سلام۔ تاجور

۷۸۶

اپنے صاحبزادے اسد اللہ خاں کے نام !

عزیزم اسد اللہ خاں۔ دعا۔ میں تمہیں یہ نہ لکھ سکا کہ تم عرشی اور نسیم تینوں طالب علم ہو اور طالبعلموں کو ریلوے ٹکٹ میں رعایت دیتی ہے۔ اگر اسٹیشن ماسٹر رام پور سے کہلوا دو تو تم تینوں کے ٹکٹ میں قریب قریب ایک ٹکٹ کی رعایت ہو جائے گی اور دیکھو راستے میں عرشی یا تم اسٹیشنوں پر بالکل نہ اترنا۔ اس سے خطرہ ہے جگہ بھی چھنوا بیٹھو گے۔ بس شام پڑتے ہی دروازے کے اندر کی چٹخنی لگا لینا۔ زنانہ ڈبے میں بیٹھنا اور رلڑنا جھگڑنا مت۔ دوسرے مسافروں کو اس سے تکلیف ہوتی ہے۔ نجیب آباد مت اترنا۔ نہیں ٹکٹ بیکار ہو جائیں گے۔ کل رشید کی ماں آگئی ہے۔ بہو کو بھی ساتھ لائی ہے۔ باقی خیریت ہے۔ سب کو سلام تاجور

۷۸۶

برخوردار اسد اللہ خاں۔ بعافیت باشد۔ آمین۔ کئی دن سے تمہارا خط نہیں پہنچا۔ ظفر علی خاں بھائی نے جو کارڈ بھیجا اس سے مجھے کچھ پتہ نہ چل سکا۔ تم لوگ اب تک کیوں رکے ہوئے ہو۔ سلیمان خان بھائی کہاں ہیں۔ حصار سے لوٹے یا حمانی جان نے ان کے

پاؤں میں بیڑی ڈال دی ہے۔ ظفر علی خاں بھائی کو معلوم ہوتا ہے۔ تم لوگوں نے مفت میں پریشان کیا۔ آخر تم کب تک آنے کا ارادہ رکھتے ہو۔ ریلوے والوں سے اگر ۵ ۲ اکتوبر کو سیٹیں ریزرو کی ہیں تو اب تمہارے ۲۵ کو نہ آنے کے بعد پھر سیٹیں ریزرو ہونی مشکل معلوم ہوتی ہیں۔ دیکھو جو سیٹیں ریزرو کرائے بغیر چل پڑے تو بہت پچھتاؤ گے۔ رات بھر کا سفر ہے۔ چھوٹا بچہ ساتھ ہے۔ ممکن ہے تم نے کوئی انتظام کر لیا ہو۔ یہاں سب خیریت ہے۔ تم لوگوں کی پڑھائی کا حرج ہو چکا ہے۔ خاص طور پر نسیم کی پڑھائی تو آئی گئی ہوگئی۔ رام پور جانے میں روپیہ الگ برباد ہوا۔ تکلیف علیحدہ ہوئی اور پڑھائی کا خرچ جدا ہوا۔ وہاں جا کر عملاً تمہیں کیا ملا۔ باقی حالات بدستور ہیں۔ بواپسی اپنے آنے یا نہ آنے کی اطلاع دو تاکہ فکر دور ہو۔ فقط والسلام۔ سب کو سلام و دعا   تاجور

۴۸۶

لاہور۔ ۱۲ اکتوبر ۴۴ء

چینی! دعا۔ تمہیں دو سرا منی آرڈر مل گیا ہوگا۔ دیکھو۔ تمہیں چار ٹکٹوں کی تین سیٹیں ملیں گی۔ تمہارے دو آدھے ٹکٹوں کی ایک سیٹ ہوگی۔ اپنی سیٹوں پر اپنے بستر کر لینا۔ شام ہونے تک تو سیکنڈ کلاس میں دوسرے مسافر بھی بیٹھ سکتے ہیں۔ شام ہوتے ہی دروازوں کی اندر کی کنڈی جو نیچے ہوتی ہے بند کر لینا۔ اگر تمہارے ڈبے میں کوئی سیٹ خالی پڑی ہو تو زنانہ مسافر کو آنے دو ورنہ نہیں۔ تم سب زنانہ ڈبے میں بیٹھنا اور ڈبے کو دیکھ لینا۔ اگر اس پر لاہور لکھا ہو تو بیٹھنا۔ ایسا نہ ہو دیرہ دون یا کالکا والے ڈبے میں بیٹھ جاؤ۔ اور وہ کٹ جائے اور دیکھو اب تم نجیب آباد نہیں اتر سکتے ورنہ ٹکٹ ضائع ہو جائیں گے۔ اب درمیان میں اترنے کا قاعدہ نہیں رہا۔ اگر تمہیں کوئی مسافر راستے میں تکلیف دے یا تمہاری سیٹوں پر شام کے بعد قبضہ کرنے لگے۔ اور تم نہ چاہو تو ٹرین کے گارڈ سے شکایت کرنا وہ ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسٹیشنوں پر اتر کر پلیٹ فارم پر گھومنا برا ہوتا ہے۔ اور کھڑکی سے منہ باہر نہ نکالنا آنکھ میں کوئلہ پڑ جاتا ہے۔ جہاں صبح ہو۔ ریلوے ہوٹل کے بیرول سے دو حصے کی چائے لے کر پینا۔ ہر حصے کی قیمت دس آنے ہوتی ہے۔ غرض سفر میں پیسے کا خیال نہ کرنا۔ ذوالفقار بھائی لاہور بھرتی ہونے آرہے ہیں شاید تمہیں اسٹیشن پر ملیں۔ انہیں نجیب آباد کارڈ لکھ دینا کہ ہم فلاں دن فلاں گاڑی سے لاہور جا رہے ہیں۔ اور مجھے دو دن پہلے تاریخ اور گاڑی کی اطلاع دینا۔ فقط والسلام۔ سلیمان خان لاہور آنا چاہیں تو لے آنا۔ والسلام۔   تاجور

بنام محمد عبداللہ قریشی

"شاہکار" لاہور

۱۸ نومبر ۱۹۳۶ء

محترمی۔ سلام مسنون

ہجوم[1] مصائب کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں آپ کی خلوص و ہمدردی میں ڈوبی ہوئی آواز درد آشنا نے میری بے کسی کو بڑا سہارا دیا۔ دل سے سپاس گذار ہوں۔   حد نیاز   غمگین تاجور

---

[1] مولانا تاجور نجیب آبادی کے دو صاحبزادے رضوان اور عرفان ۱۷ اکتوبر اور ۲۷ اکتوبر ۱۹۳۶ کو یکے بعد دیگرے انتقال کر گئے۔ یہ پے در پے صدمات مولانا کے لئے ناقابل برداشت تھے۔ یہاں تک کہ مولانا دوسرے بچے کے جنازے میں بھی شریک نہ ہو سکے۔ اس کے بعد ان میں وہ شگفتگی اور زندہ دلی پھر نہ دیکھی گئی جو ان کی طبیعت کا خاصہ تھی۔   (محمد عبداللہ قریشی)

علّامہ تاجور ادیب اور نقاد کی حیثیت سے

وسعتِ بیان اور زورِ کلام کے اعتبار سے اردو زبان اور اردو شاعری کو سرمایہ دار بنانے میں جن باکمال شعراء نے نمایاں حصہ لیا۔ ان میں میر محمد تقی میرؔ اور مرزا رفیع سوداؔ کا نام بہت ممتاز ہے۔ یہ سچ تو یہ ہے کہ اردو شاعری کو صحیح معنوں میں شاعری کہلانے کا فخر زیادہ تر ان ہی دونوں بزرگوں کی بدولت نصیب ہوا۔ ان سے پہلے اردو شاعری زیادہ تر غزلوں اور کچھ حد تک مثنویوں پر مشتمل تھی۔ انہوں نے قصیدہ، سلام، مرثیہ، رباعی، مخمس، مسدس، مستزاد وغیرہ اکثر اصنافِ سخن میں قادر الکلامی کے جوہر دکھائے اور اپنے جانشینوں کے لئے طبع آزمائی کی نئی نئی شاہراہیں کھول دیں۔

بقول صاحب "شعر الہند" قدما کے اس دور میں اگرچہ ایک درجے کے متعدد اساتذہ موجود تھے۔ لیکن ان میں صرف میرؔ و مرزاؔ حریف و مقابل تسلیم کئے گئے اور ان کی شاعری کا موازنہ و مقابلہ بھی اردو شاعری کی تاریخ کا ایک لازمی جزو ہو گیا۔ صاحب شعر الہند نے اس بارے میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان دونوں بزرگوں میں اختلاف کب اور کہاں شروع ہوا اور وہ حریفانہ حیثیت سے کب میدان میں اترے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے دونوں کے چند اشعار بھی درج کئے ہیں۔ جن سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ پہلے ان میں باہم بڑا اتحاد و ارتباط تھا اور بعد میں ایک دوسرے پر حریفانہ چوٹیں شروع ہو گئیں۔ لیکن میرے نزدیک مختلف شعراء کے کلام کو موازنہ و مقابلہ کا مضمون بنانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ان کے ذاتی یا معاصرانہ تعلقات میں کشیدگی کے ثبوت تلاش کئے جائیں۔ اہلِ کمال کی باہمی دوستی یا مخالفت اور چیز ہے اور ان کے کمال کا تقابل اور چیز۔ موازنۂ اشعار دماغی تفریح کے علاوہ مذاقِ شعر کی صحیح تربیت کا بھی ایک عمدہ ذریعہ ہے اور یہی وہ فائدہ ہے جس کے پیشِ نظر میں نے یہ سلسلہ شروع کیا ہے۔

میر اور مرزا کا موازنہ کرنے سے پیشتر دونوں استادوں کی افتادِ طبع کا فرق بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ صاحب "آبِ حیات" نے میر کی جو تصویر کھینچی ہے اس کا ماحصل یہ ہے:۔

> "عادات و اطوار نہایت سنجیدہ اور متین اور صلاحیت اور پرہیزگاری نے اسے عظمت دی تھی۔ ساتھ اس کے قناعت اور غیرت حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اطاعت تو درکنار نوکری کے نام کی بھی برداشت نہ رکھتے تھے۔ لیکن زمانہ جس کی حکومت سے کوئی سر نہیں رکھ سکتا۔ اس کا قانون بالکل اس کے خلاف ہے نتیجہ یہ کہ فاقے کرتے تھے، دکھ بھرتے تھے اور اپنی بد دماغی کے سائے میں دنیا اور اہلِ دنیا سے بیزار گھر میں بیٹھے رہتے تھے۔ اپنے سرمایۂ فصاحت کو دولتِ لازوال سمجھ کر امیر غریب کسی کی پروا نہ کرتے تھے بے نیازی اور بے پروائی کے ساتھ دنیا کی مصیبتیں جھیلیں اور جو اپنی آن بان تھی اسے لئے دنیا سے چلے گئے اور جس گردن کو خدا نے بلند کیا تھا سید صاحب خدا کے ہاں لے گئے۔ چندہ روزہ عیش یا مفلسی کے دکھ سے اسے دنیا کے نااہلوں کے سامنے ہرگز نہ جھکایا۔"

صاحب "آب حیات" نے متعدد ایسے واقعات بھی درج کئے ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر صاحب کی بے دماغی حد انتہا تک پہنچی ہوئی تھی[1]۔ بادشاہ کی سواری سامنے آئی تو سب لوگ تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے مگر یہ اسی طرح بیٹھے رہے۔ شہر کے عمائد و اراکین جمع ہو کر ان کی خدمت میں گئے اور اشعار کی فرمائش کی تو صاف کہہ دیا کہ میرے اشعار آپ کی سمجھ میں نہیں آنے کے۔ گورنر جنرل یا انگریزی حکومت کا کوئی اور جلیل القدر عہدہ دار لکھنؤ آیا اور اس تقریب پر میر صاحب

---

[1] ان میں کئی واقعات زیبِ داستان ہو چکے ہیں۔ منہ۔

کو بلایا جاتا تو یہ ہمیشہ پہلو تہی کرتے اور کہتے کہ "مجھ سے جو کوئی ملتا ہے گویا مجھ فقیر کے خاندان کے خیال سے یا میرے کلام کے سبب ملتا ہے۔ صاحب کو خاندان سے غرض نہیں، میرا کلام سمجھتے نہیں، البتہ کچھ انعام دیں گے۔ ایسی ملاقات سے ذلت کے سوا کیا حاصل" اور تو اور کسی کو اصلاح دینا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ میر قمر الدین منت، مرزا سعادت یار خاں رنگین اور شیخ امام بخش ناسخ جو بعد کو مسلم الثبوت استاد ہوئے۔ ان کو بھی شاگردی میں قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ بڑی مصیبت یہ تھی کہ ان کا انکار معذرت آمیز تو کجا معمولی پیرائے میں بھی نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اس سے سخت دل شکنی اور دل آزاری کا پہلو نکلتا تھا۔ کسی سے کہہ دیتے تھے کہ "اردو خاص دلی کی زبان ہے آپ اس میں تکلیف نہ کیجیے۔ اپنی فارسی وارسی کہہ لیا کیجیے۔" اور کسی کو یہ ارشاد ہوتا کہ آپ کی طبیعت اس فن کے مناسب نہیں۔ یہ آپ کو نہیں آنے کا خواہ مخواہ میری اور اپنی اوقات ضائع کرنی کیا ضرور ہے۔"

ایک دن نواب آصف الدولہ فرماں روائے اودھ نے بلا بھیجا جب یہ محل میں پہنچے تو دیکھا کہ نواب حوض کے کنارے چھڑی کے ساتھ مچھلیوں سے کھیل رہے ہیں۔ میر صاحب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اشعار کی فرمائش کی۔ میر صاحب نے غزل سنانی شروع کی۔ نواب سنتے جاتے تھے اور چھڑی کے ساتھ مچھلیوں سے بھی کھیلتے جاتے تھے۔ میر صاحب کو نواب کی یہ حرکت ناگوار گزری۔ چنانچہ تین چار شعر پڑھ کر غزل جیب میں ڈالی اور گھر چلے آئے۔ پھر نواب صاحب کے پاس جانا چھوڑ دیا۔

ظاہر ہے کہ جس شخص کی نازک مزاجی اور بے دماغی کا یہ عالم ہو۔ اس کی طبیعت کو شوخی اور شگفتگی سے کیا علاقہ ہو سکتا ہے۔ مرزا رفیع سودا بھی کچھ کم غیور نہیں تھے۔ چنانچہ "آب حیات" میں لکھا ہے:

"ان کے کلام کا شہرہ جب نواب شجاع الدولہ نے لکھنؤ میں سنا تو کمال اشتیاق سے "برادر من، مشفق مہربان من" لکھ کر خط مع زادِ راہ لکھ کر بھیجا اور طلب کیا۔ انہیں دلی چھوڑنا گوارا نہ ہوا۔ جواب میں فقط اس رباعی پر حسن معذرت کو ختم کیا:

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک؟ آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک؟

حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے؟ بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک؟

کئی برس کے بعد وہ (دلی کے) قدر دان مر گئے۔ زمانے بدل گئے۔ سودا بہت گھبرائے۔ ۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ پہنچے۔ نواب شجاع الدولہ کی ملازمت حاصل کی۔ وہ بہت اعزاز سے ملے اور ان کے آنے پر کمال خورسندی ظاہر کی۔ لیکن یا تو بے تکلفی سے یا طنز سے اتنا کہا کہ مرزا وہ رباعی تمہاری اب تک میرے دل پر نقش ہے۔ اور اس کو مکرر پڑھا۔ انہیں اپنے حال پر ایسا رنج ہوا۔ اور پاس وضعداری پھر دربار نہ گئے۔"

لیکن جہاں مرزا کی غیرت وضع داری تک محدود تھی وہاں میر کی حمیت نازک مزاجی اور بے دماغی کی آخری حد تک پہنچ چکی تھی۔ مرزا غیور اور باحمیت ہونے کے ساتھ ہی زندہ دل اور شگفتہ مزاج بھی تھے۔ مگر میر صاحب کے دل کی کلی کبھی نہ کھلتی تھی۔ مرزا دنیا اور دنیا کی نعمتوں کا لطف اٹھاتے تھے۔ میر صاحب دنیا میں رہتے تھے۔ مگر دنیا والوں سے بے نیاز ہو کر اور ان کی یہ بے نیازی بیزاری کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ مرزا دنیا کو ناموافق دیکھتے تھے تو دنیا والوں سے الجھ پڑتے تھے۔ میر صاحب نفرت کی ایک نگاہ ڈالتے تھے اور منہ پھیر لیتے تھے۔

میر و مرزا میں ایک اور فرق یہ تھا کہ میر صاحب عشق کے زخم خوردہ تھے۔ "ان کے والد بہت بڑے درویش تھے۔ میر صاحب کو ان کی تلقین بھی ہمیشہ درویشانہ اور صوفیانہ رنگ میں ہوتی تھی اور اس میں وہ خاص کر عشق اختیار کرنے کی تاکید فرماتے تھے۔ "بیٹا عشق اختیار کرو کہ عشق ہی کا اس کار خانہ (دنیا) پر تسلط ہے۔ اگر عشق نہ ہوتا تو یہ تمام نظام درہم برہم ہو جاتا۔ بے عشق کی زندگی وبال ہے اور عشق میں دل کھونا اصل کمال ہے۔ عالم میں جو کچھ ہے وہ عشق ہی کا ظہور ہے۔ ایسے پھول کے بلبل تو جو بہ سدا بہار ہو" جس بچے کے کان میں دن رات یہی آوازیں پڑتی رہیں وہ ناممکن ہے کہ سن شعور کو پہنچنے سے پہلے ہی تیر عشق کا گھائل نہ ہو جائے۔ اس کے مقابلے میں سودا کو عشق سے اتنا ہی تعلق تھا۔ جتنا ایک وکیل کو اپنے موکل کے مقدمے سے ہوتا ہے۔

ہندوستان کی تاریخ کا وہ عہد جس میں میر و مرزا نے زندگی کا سفر طے کیا نہایت تاریک تھا۔ سلطنت مغلیہ جاں کنی کی حالت میں تھی۔ طوائف الملوکی سے حکومت کی بنیادیں متزلزل ہو رہی تھیں۔ روہیلوں کی تاخت و تاراج اور مرہٹوں کی لوٹ مار کے باعث اطمینان قلب اور سکون خاطر عنقا ہو گیا تھا۔ انگریزوں کا اقتدار روز بروز بڑھتا جاتا تھا اور اسی رفتار سے ہندوستانی حکمران اس حالت کے قریب پہنچتے جاتے تھے۔ جو ایک بے ملک اور بے اختیار نواب کی ہوتی ہے۔ اس حالت کا الگ الگ جو اثر میر اور مرزا پر پڑا اس کا نقشہ افسر میرٹھی نے ذیل کے الفاظ میں کھینچا ہے:

"حساس اور گداختہ دل میر ان مصائب و آلام کو دیکھ دیکھ کر بے اختیار روتے ہیں اور رلاتے ہیں۔ سودا اپنے دل پر میر سے زیادہ قابو رکھتے ہیں لیکن صرف اس حد تک کہ ان کی آنکھوں سے اشک جاری نہیں ہوتے بلکہ ان کے دل کا درد زہر خند میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے لوگوں کی حالت پر ہنستے ہیں مگر ان کی طعن آمیز نظروں اور ان کے متبسم ہونٹوں کے پیچھے ایک درد بھرا دل نظر آتا ہے جو اپنے اردگرد کے حالات پر آنسو بہا رہا ہے۔"

اس فرق سے جو دونوں استادوں کی افتاد طبع میں واقع ہوا تھا ان کی شاعری بھی متاثر نظر آتی ہے۔ سودا کی نظر وسیع ہے۔ وہ دنیا اور دنیا کی چیزوں کو شوق اور تحقیق کی نظروں سے دیکھتے ہیں اس لئے ان کے کلام میں خارجی مضامین کی کثرت پائی جاتی ہے۔ جوش بیان اور بلند پروازی ان کی ممتاز خصوصیات ہیں۔ میر صرف اپنی دنیا میں رہتے ہیں۔ انہیں نہ فقط دربار داری و امرا کی ملاقات سے نفرت ہے، بلکہ وہ اپنے اردگرد کی چیزوں کو دیکھنے کے لئے بھی نظر اٹھانے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ اس لئے ان کا کلام داخلی مضامین سے لبریز ہے۔ سوز و گداز اور سادگی و سلاست نے اس میں قیامت کی تاثیر پیدا کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قصیدوں کی وہ شان نہیں جو غزلوں اور مثنویوں کی ہے۔ قصیدہ کے لوازمات ہیں شکوہ الفاظ اور بلندی مضامین۔ یہ چیزیں میر کے یہاں بہت کم ہیں۔ اس کے علاوہ طبعی قناعت اور دنیا سے بیزاری کے باعث وہ امرا کی مداحی سے بے نیاز تھے اور صلہ کی امید پر یا اتراہ شکریہ کسی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانا ان کی فطرت کے منافی تھا۔

میر اور سودا کے متعلق عام طور پر جو رائے ظاہر کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ قصیدے میں میر کو سودا سے اور مثنوی میں سودا کو میر سے کوئی نسبت نہیں۔ میں ان دونوں کے قصیدوں اور مثنویوں کو دیکھ کر اس رائے پر پہنچا ہوں کہ قصیدے میں سودا کو میر پر تفوق ہے اور مثنوی میں میر، سودا سے بازی لے گئے ہیں۔ یہ تفوق اور برتری "کوئی نسبت نہیں" کی حد تک نہیں پہنچی۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس کا تفاوت باہمی تفوق میں حائل ہے۔ میں قصائد اور مثنویوں کو موازنہ کا موضوع نہیں بناتا اور صرف غزلوں کے مقابلہ پر اکتفا کرتا ہوں کہ اس صنف میں دونوں استاد اپنی اپنی جگہ صاحب طرز ہیں۔ بعض نقادوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ قصیدہ میں سودا میر سے اور غزل میں میر سودا سے برتر ہیں اور سودا کی غزل سست ہوتی ہے اور میر کا قصیدہ سست ہوتا ہے لیکن مولانا سید علی حیدر نظم طباطبائی نے دیوان غالب کی شرح میں اس خیال کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ بات حد تحقیق سے دور ہے۔ سودا کی غزلیں بھی ہرگز سست نہیں۔ البتہ میر سے انہوں نے غزلیں کم کہی ہیں اور قصائد بہت کہے ہیں۔" نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ جو بلند پایہ سخن سنج ہونے کے ساتھ ہی اعلےٰ درجہ کے سخن فہم بھی تھے اپنے تذکرۂ گلشن بے خار میں سودا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "عوام میں جو یہ مشہور ہے کہ ان کا قصیدہ غزل سے بہتر ہوتا ہے میرے نزدیک ایک مہمل بات ہے۔ میرے خیال میں ان کی غزل قصیدہ سے بہتر ہوتی ہے اور قصیدہ غزل سے بہتر ہوتا ہے۔"

آزاد نے تذکرہ "آب حیات" میں پونے تین شاعروں والا جو قصہ بیان کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سودا کے کمال کا اعتراف میر صاحب کو بھی تھا۔ اس قصہ کے مطابق لکھنؤ میں کسی نے میر صاحب سے پوچھا کہ حضرت آج کل شاعر کون کون سے ہیں؟ میر صاحب نے جواب دیا کہ ایک سودا اور ایک یہ خاکسار پھر کچھ تامل کے بعد کہا آدھے خواجہ میر درد اور سوز کو بڑی مشکل سے پاؤ شاعر تسلیم کرنے کے بعد فرما دیا کہ اس طرح پونے تین شاعر ہوتے ہیں۔ میر صاحب کا ایک شعر بھی ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ سودا کو بحیثیت شاعر کس قدر احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔

ؔ اس واقعہ کی تردید ہو چکی ہے۔ منہ

گیا ہو میر دیوانہ رہا سودا سو مستانہ ؎ نہ ہو کیوں ریختہ بے شورش و کیفیت و معنی

ظاہر ہے کہ میر صاحب صرف قصیدہ کی بنا پر جس سے ان کو ازلی رغبت ہی نہیں تھی، اس حد تک سودا کے معترف نہیں ہو سکتے تھے۔

البتہ جیسا کہ میں بتا آیا ہوں طبیعت کی افتاد کے فرق کی وجہ سے دونوں کی راہیں الگ الگ تھیں۔ سودا شیخ سعدی کی طرح ہمہ گیر اور کثیر المذاق تھے، بقول آزاد مصنف آب حیات "وہ طبیعت ہمہ رنگ، ذہن براق اور زبان مشاق رکھتے تھے۔ توسن فکر ان کا منہ زور گھوڑے کی طرح جس طرف جاتا تھا رک نہ سکتا تھا۔ کوئی بحر اور کوئی قافیہ ان کے ہاتھ آئے، تغزل کی خصوصیت نہیں رہتی تھی جس برجستہ مضمون میں بندھ جائے باندھ لیتے تھے۔ بے شک ان کی غزلوں میں بھی اکثر شعر چستی اور درستی میں قصیدہ کا رنگ دکھاتے ہیں"۔ میر کے اشعار بقول مولوی عبدالحق "سوز و گداز اور درد کی تصویریں ہیں، زبان سے نکلتے ہی دل میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں، جس طرح بعض اوقات سمندر کی سطح دیکھنے میں معمولی اور بے شور و شر نظر آتی ہے لیکن اس کے نیچے ہزاروں لہریں موجزن ہوتی اور ایک تھلبلی مچائے رکھتی ہیں، اسی طرح میر صاحب کے اشعار کے الفاظ ملائم، دھیمے، سلیس اور سادہ ہوتے ہیں لیکن ان کی تہہ میں غضب کا جوش یاد چھپا ہوتا ہے" (مقدمہ انتخاب کلام میر)

حکیم قدرت اللہ اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مرزا محمد رفیع غزل میں میر کو نہیں پہنچتے۔ لیکن حق یہ ہے کہ ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

مرزا ایک دریا ہے بے کراں اور میر ایک نہر ہے عظیم الشان، میر معلومات قواعد میں مرزا سے بڑھے ہوئے ہیں اور مرزا قوت شاعری میں میر پر فضیلت رکھتے ہیں لیکن میر و مرزا کے باب میں سب سے زیادہ صحیح محاکمہ خواجہ باسط کا ہے۔

خواجہ باسط لکھنؤ کے ایک خدارسیدہ درویش تھے۔ ان کے دو مریدوں میں میر اور مرزا کے کلام پر تکرار ہو پڑی جس کا فیصلہ کرانے کے لئے وہ ان کے پاس آئے۔ انہوں نے فرمایا کہ دونوں صاحب کمال ہیں مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام آہ ہے اور مرزا صاحب کا کلام واہ ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے ذیل کے دو شعر پڑھے ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

سودا کے جو بالیں پہ ہوا شور قیامت خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

میر صاحب کا انداز بیان بقول مولوی عبدالحق "درد سے لبریز ہے اور لفظ لفظ سے حسرت و یاس ٹپکتی ہے اردو کیا مشکل سے کسی زبان میں اس پائے کا اور ایسا درد انگیز شعر ملے گا۔ ایک دوسری بات اس شعر میں قابل غور یہ ہے کہ جو شخص دوسروں کو غل نہ کرنے اور آہستہ بولنے کی ہدایت کر رہا ہے۔ وہ بھی بیمار کے پاس بیٹھا ہے اور اس پر بھی لازم ہے کہ یہ بات آہستہ سے کہے اس لئے یہ ضرور ہے کہ لفظ ایسے چھوٹے سلیس اور دھیمے ہوں کہ دھیمی سے دھیمی آواز میں بھی ادا ہو سکیں۔ اب اس شعر کو دیکھئے کہ لفظ تو کیا ایک حرف بھی ایسا نہیں جو کرخت ہو اور ہونٹوں کے ذرا سے اشارے سے ادا نہ ہو سکتا ہو" (مقدمہ انتخاب کلام میر)

سودا کے شعر میں وہ درد و سوز اور حسرت و یاس نہیں جس نے میر کے شعر کو نشتر بنا دیا ہے۔ میر کے شعر کا مضمون داخلی ہے سودا کے شعر کا خارجی۔ میر نے اپنے شعر کی بنیاد آپ بیتی پر رکھی ہے۔ سودا نے قیامت کے روز برپا ہونے والے ہنگامہ شور و شر سے مضمون پیدا کیا ہے۔ پہلا شعر آمد کی بہترین مثال ہے اور شاعر کے وہبی ذوق کا پتہ دیتا ہے دوسرا شعر آورد کا نہایت عمدہ نمونہ ہے اور شاعر کے اکتسابی کمال کی روشن دلیل "خدام ادب" کے ٹکڑے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سونے والا بڑا صاحب شکوہ ہے۔

مگر اس بحث سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ سودا کا دیوان اس قسم کے اشعار سے خالی ہے۔ سوز و گداز اور درد میں ڈوبے ہوئے اشعار ان کے یہاں بھی موجود ہیں، جن کو بجا طور پر میر کے بہتر نشتروں کے مقابلہ میں سودا کے بہتر خنجر کہا جاتا ہے۔ مثلاً ؎

عشق سے تو نہیں ہوں میں واقف دل کو شعلہ سا کچھ لپٹتا ہے

غنچہ سنتے تو سمٹے ممکن ہے — دل جو بکھرے تو کب سمٹتا ہے
مت پوچھ یہ کمالات کبھی کیو نکر تجھ بغیر — اس گفتگو سے فائدہ پیارے گزر گئی
دیکھتا ہوں میں تری بزم میں ہر ایک کا منہ — طلبِ رحم کی نظروں سے گنہگار کی طرح
اے لالہ گو فلک نے دیئے تجھ کو چار داغ — چھاتی مری سراہ کہ اک دل ہزار داغ
عاشق کی بھی کٹتی ہیں کیا خوب طرح راتیں — دو چار گھڑی رونا دو چار گھڑی باتیں
نگر ہو آباد جس کے دل کا نہ پوچھ اس سے تو دکھ ہمارا — یہ درد دشتِ اس زمیں سے ٹک جو لٹتے دیکھے تو یار اپنا

لیکن ایسے اشعار جہاں میر کے کلام میں کثرت سے ہیں، وہاں سودا کے دیوان میں خال خال نظر آتے ہیں اور پھر انصاف کی بات یہ ہے کہ میر کے نشتروں کی سی نقش کاری میں جو لطف آتا ہے وہ سودا کے ان خنجروں کی کاٹ میں نہیں۔ میر کی سلاست و سادگی کے مقابلہ میں شوکت و تکلف کی شان جو کلامِ سودا کی امتیازی خصوصیت ہے ان اشعار میں بھی برابر نظر آ رہی ہے۔ مگر اسی شوکت و تکلف سے یہ حقیقت بھی عریاں ہو جاتی ہے کہ جس دل سے یہ شعر نکلے ہیں وہ میر کے دل کی طرح عشق کا زخم خوردہ اور ایسا افسردہ نہیں جس کو شگفتہ کرنے سے دنیا بھر کی دلچسپیاں قاصر ہیں۔

میر اور مرزا کے کلام کا سرسری مطالعہ کرنے سے بھی ایک سخن فہم فوراً یہ نتیجہ نکال لیتا ہے کہ رطب و یابس اور ابتذال دونوں کے یہاں موجود ہے۔ مگر مرزا کے یہاں کم ہے اور میر کے یہاں بہت زیادہ۔ چنانچہ مفتی صدر الدین آزردہ کی رائے میر کے کلام کی نسبت یہ ہے کہ ان کے پست اشعار نہایت پست ہوتے ہیں اور بلند اشعار نہایت بلند اور اس میں شک نہیں کہ ان کی اکثر غزلوں میں جو رطب و یابس کا ڈھیر ہیں ایک آدھ شعر ایسا نکل آتا ہے، کہ پڑھنے والا دل پکڑ کے رہ جاتا ہے۔ مرزا کے کلام میں پست اشعار کم ہیں۔ مگر جو بلند ہیں ان میں بہت کم ایسے ہیں جن کو میر کے بلند اشعار کے مقابلہ میں رکھا جا سکے بالفاظ دیگر درمیانہ درجہ کے اشعار کی کثرت کے اعتبار سے مرزا کو میر پر اور خاص اشعار کی تعداد کے لحاظ سے میر کو مرزا پر برتری حاصل ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میر کی ہر غزل ایک آدھ شعر کو چھوڑ کر ابتذال اور رطب و یابس کا پلندہ ہے ان کے کلیات کا انتخاب اگر انتہائی حسن مذاق کی روشنی میں بھی کیا جائے تو سو، سوا سو صفحہ کے مرصع اشعار کا ایک نادر مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔ ان غزلوں میں سے جو قریب قریب اوّل سے لے کر آخر تک مرصع ہیں، چند بطور نمونہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں ؎

آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر یار دیکھنا — عاشق کا اپنے آخری دیدار دیکھنا
کیسا چمن کہ ہم سے اسیروں کو منع ہے — چاکِ قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا
آنکھیں چرائیو نہ ٹک ابرِ بہار سے — میری طرف بھی دیدۂ خونبار دیکھنا
ہونا نہ چار چشم دل اس ظلم پیشہ سے — ہشیار زینہار۔ خبردار دیکھنا
صیاد دل ہے داغِ جدائی سے رشکِ باغ — تجھ کو بھی ہو نصیب یہ گلزار دیکھنا
گر زمزمہ یہی ہے کوئی دن تو ہم صفیر — اس فصل ہی میں ہم کو گرفتار دیکھنا

اس خوش نگہ کے عشق سے پرہیز کیجو میر
جاتا ہے لے کے جی ہی یہ آزار دیکھنا

ہم ہی مجروح - ماجرا ہے یہ — وہ نمک چھڑکے ہے مزا ہے یہ
آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم — اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ
بود آدم نمودِ شبنم ہے — ایک دو دم میں پھر ہوا ہے یہ

شکر اس کی جفا کا ہو نہ سکا　　دل سے اپنے ہمیں گلا ہے یہ
شور سے اپنے حشر ہے پر وہ　　یوں نہیں جانتا کہ کیا ہے یہ
بس ہوا ناز ہو چکا اغماض　　ہر گھڑی ہم سے کیا ادا ہے یہ

میر کو کیوں نہ مغتنم جانیں
اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

فقیرانہ آئے صدا کر چلے　　میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم　　سو اس عہد کو اب وفا کر چلے
شفا اپنی تقدیر ہی میں نہ تھی　　کہ مقدور تک تو دوا کر چلے
وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے　　ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے
کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ　　سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے
بہت آرزو تھی گلی کی تری　　سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے
دکھائی دیئے یوں کہ بے خود کیا　　ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے

کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میر
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

میر اور سودا کے دو ہم معنی اشعار جو بقول خواجہ باسط دونوں استادوں کی افتادِ طبع کے آئینہ دار ہیں ان کا موازنہ میں اوپر کر چکا ہوں ذیل میں ان کے چند اور ہم معنی اشعار درج کر کے یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ ایک ہی پانی دریا بن کر کیا زور دکھاتا ہے اور نہر کی شکل میں اس کی کیا شان ہوتی ہے ؎

میر　　ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا　　دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
سودا　　چمن میں صبح جو اس جنگجو کا نام لیا　　صبا نے تیغ کا موجِ رواں سے کام لیا

میر نے حسب معمول سادہ الفاظ اور سلیس اندازِ زبان میں واردات قلبی کو اس طرح ادا کیا ہے کہ سننے والے پر رقت کا عالم طاری ہو جاتا ہے ان کا یہ شعر قلیل الفاظ میں کثیر معانی کا ایک تڑپتا ہوا نمونہ ہے۔ پہلے مصرع سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معشوق کی مسلسل بے رخی اور بے اعتنائی سے عاشق ہمیشہ کے لئے مایوس ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ اب معشوق کا نام بھی اس کی زبان پر نہیں آتا۔ لیکن اس کی محبت کا زخم بدستور اس کے دل میں موجود ہے، اس لئے جب اس کے سامنے کوئی اور شخص اس کا نام لے دیتا ہے تو اس زخم میں ٹیس پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے عاشق کی جو حالت ہوتی ہے۔ اس کی ہو بہو تصویر دوسرے مصرع میں میر صاحب نے کھینچ دی ہے۔ "دل ستم زدہ" کا ٹکڑا دیکھنے میں دو تین لفظوں کا ایک عام مرکب ہے۔ مگر میر کے غم نگار قلم کی بدولت اس سے شعر میں ایسا درد بھر گیا ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ تھام تھام کی تکرار سے عاشق کی بے حالی اور بے بسی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

سودا نے ابہام یعنی رعایت لفظی کی بنیادوں پر بلاغت کی عمارت کھڑی کی ہے موجِ رواں سے تیغ کا کام لے کر چمن کو میدان قتال و جدال بنا دیا اور وہ بھی اتنی سی بات پر کہ شامت زدہ عاشق اپنے جنگ جو یعنی معشوق کا نام لے بیٹھا ہے۔ سودا کی شاعری کا ناقابل انکار کمال ہے البتہ تاثیر اور معانی کی کثرت جو میر کے شعر میں ہے۔ سودا کے شعر کو نصیب نہیں ہوئی ؎

میر　　گلہ میں جس سے کروں تیری بیوفائی کا　　جہاں میں نام نہ لے پھر وہ آشنائی کا
سودا　　گلہ لکھوں میں اگر تیری بے وفائی کا　　لہو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا

اس مضمون کے ادا کرنے میں بھی میر صاحب سودا سے بازی لے گئے ہیں۔ سودا نے آشنائی کا سفینہ بنا کر جو لہروں میں غرق کیا ہے تو اس سے شعر میں زور بیان کے علاوہ صنعت کا لطف بھی پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن یہ لطف اتنا دیرپا نہیں جتنا میر کے شعر کا سوز و گداز ہے۔ میر نے سیدھے سادے مگر نہایت موثر طریقے سے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ معشوق کی بے وفائی سے دل کو جو رنج ہوتا ہے۔ احساس کی جان پر جو صدمے گزرتے ہیں۔ وہ ساری دنیا کے لئے درس عبرت کا حکم رکھتے ہیں اور جو شخص یہ اندوہناک اور یاس انگیز ماجرا سنتا ہے وہ محبت کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتا ہے۔ سودا نے دوسرے مصرع میں لہو کا لفظ استعمال کر کے شعر کو درد انگیز بنانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود سننے یا پڑھنے والے پر اس کا یہی اثر ہوتا ہے کہ اس کی زبان سے مثلاً واہ نکل جاتی ہے اور بس۔ میر کا شعر سن کر انسان کے دل سے ایک آہ نکلتی ہے جس کا اعادہ تنہائی کے لمحات میں بھی متعدد بار ہوتا ہے ؎

میر — یاد آئی کسی کی چال ہمیں ۔۔۔ ہم نشیں! ہم چلے سنبھال ہمیں
سودا — کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا ۔۔۔ ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

ہم مضمون اشعار میں بے شبہ سودا کے شعر کا دوسرا مصرع خاص تیور رکھتا ہے۔ مگر پہلے مصرع میں "کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا" "مجھے یاد آئی" یا آرہی ہے کی بجائے "مجھے یاد ہے" ضرورت وزن کی بدنما مثال ہے۔ پھر یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ سودا کی نظر سے فارسی کا یہ مشہور شعر نہیں گزرا ؎

بوئے یار من ازیں سست وفا می آید ۔۔۔ گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

پھر اگر یہ شعر نظر سے گزرا ہے تو سودا کے مصرع ثانی کے تیور بگڑ جاتے ہیں۔ کیونکہ "گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم" "ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں" سے بڑھا ہوا نہیں تو کم بھی نہیں ہے۔ سرقہ و ترجمہ دونوں عیبوں سے سودا کے مصرع کو پاک کرنا ضروری ہے تو فارسی مصرع کو "الفضل للمتقدم" کے تفوق سے تو محروم نہیں کر سکتے۔

سودا نے چشم کو مصرع ثانی میں ساغر بنا کر فن تشبیہہ کی زیادہ پابندی کی ہے۔ بخلاف میر کے مصرع ثانی کے اس کی تشبیہہ گول مول ہے اور تشبیہہ کا ابہام زیادہ پر لطف ہو گیا ہے "ہم چلے سنبھال ہمیں" اس فقرے کے تیور بھی دیدنی ہیں اور پھر میر کا شعر سرقہ یا ترجمے کے شبہ سے بالاتر ہے۔ سودا کے شعر میں اس کی خصوصیت شکوہ الفاظ و بیان موجود ہے اور میر کی سلاست و سادگی اس کے شعر میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

(۲)

پچھلے مضمون کے آخر میں میر و سودا کے چند ہم معنی اشعار کا موازنہ کیا گیا تھا ذیل میں اسی قبیل کے تین چار مزید اشعار کا موازنہ کرتا ہوں۔ تاکہ ناظرین پر زیادہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ دونوں استادوں کی طبیعت ایک ہی مضمون پر کس کس انداز سے جولانیاں دکھاتی ہے ؎

میر — ایک محروم چلے میر ہمیں دنیا سے ۔۔۔ ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ
سودا — سودا جہاں میں آئے کوئی کچھ نہ لے گیا ۔۔۔ جاتا ہوں ایک میں دل پر آرزو لئے

میر کے شعر میں سادگی ہے اور سودا کا شعر بلیغ ہے۔ کسی استاد کا شعر ہے ؎

نہیں ہے مجھ میں برائی کچھ اور اس کے سوا ۔۔۔ کہ میں برا ہوں رقیبوں کی چشم بد بیں میں

اس شعر کا پہلا مصرع پڑھنے کے بعد خیال ہوتا ہے کہ اب شاعر اپنی کوئی برائی بیان کرے گا۔ چنانچہ وہ دوسرے مصرع میں اپنی برائی بیان کرتا ہے لیکن ذرا غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت میں یہ کوئی برائی نہیں بلکہ بڑی حد تک خوبی ہے۔ کیونکہ رقیب اور خاص کر بد بیں رقیب کو اپنے حریف کی خوبی بھی برائی ہی نظر آتی ہے۔ سودا نے بھی بظاہر یہ کہا ہے کہ جہاں اور لوگ دنیا سے خالی ہاتھ گئے ہیں وہاں میں آرزوؤں سے بھرا ہوا دل اپنے ساتھ لئے جا رہا ہوں۔ لیکن بغور دیکھنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کہنے والے کی محرومی و ناکامی ان لوگوں کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ ہے جو دنیا سے

کچھ نہیں سے گئے۔ کیونکہ اس کی کوئی آرزو پوری نہیں ہوئی۔ تاہم میر صاحب کے شعر میں سوز و گداز زیادہ ہے اور بیان کی سادگی نے سوز و گداز کو اور بھی نمایاں کر دیا ہے ؎

میر — رات ساری تو کٹی سنتے پریشاں گوئی ۔ میر جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

سودا — سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات ۔ اب آئی سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

میر کا شعر حسب معمول درد سے لبریز ہے اور ایک ایسے شخص کے افکار کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ جس نے دنیا کی نعمتوں کا بہرہ بہت کم پایا ہے۔ سودا کا شعر بھی اسی مضمون کا ہے۔ لیکن جہاں میر کے شعر سے مسکینی ٹپکتی ہے وہاں سودا کے شعر میں طمطراق کا رنگ ہے۔ دوسرے مصرع کے آخری ٹکڑے "ٹک تو کہیں مر بھی" نے شعر میں شوخی پیدا کر دی ہے۔ الفاظ کی برجستگی بھی سودا کے شعر میں زیادہ ہے۔ مگر میر کے شعر میں سلاست اور سادگی نے سوز پیدا کر دیا ہے۔ "کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو" اس ٹکڑے سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر جی نے اپنی بے دماغی کے باوجود سننے والے کو اپنا ہمدرد بنا لیا ہے مگر سودا کے خلاف ان کی شوخی طبع کے باوجود بیزاری کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس سلسلہ میں سودا کا یہ شعر بھی قابل غور ہے ؎

ہوتی نہیں ہے صبح نہ آتی ہے مجھ کو نیند ۔ جس کو پکارتا ہوں وہ کہتا ہے مر کہیں

جب بے چینی اور اضطراب کی وجہ سے انسان کو نیند نہیں آتی۔ یہ شعر اُس وقت کی حالت کا بڑا صحیح نقشہ ہے۔ اسی مضمون پر سودا کا ایک اور شعر بھی ہے ؎

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر ۔ اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانے میں

اس شعر سے بھی قصۂ غم سننے والے کی بیزاری کا اظہار ہوتا ہے۔ بیزاری کا احساس میر صاحب کے مخاطب میں بھی موجود ہے چنانچہ جب وہ یہ کہہ کر کہ

رات ساری تو کٹی سنتے پریشاں گوئی

یہ مشورہ دیتا ہے کہ ع

میر جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

تو اس میں اس کی یہ خواہش بھی مفہوم ہے کہ اب مجھے سو جانے دیجئے لیکن اسے میر صاحب سے جو ہمدردی ہو گئی ہے اس کی وجہ سے یہ ان کی دلجوئی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور ویسا کرخت لہجہ اختیار نہیں کرتا جیسا سودا کے مخاطب نے کیا ہے ؎

میر — کفر کچھ چاہیئے اسلام کی رونق کے لئے ۔ حسن زنّار ہے تسبیح سلیمانی کا

سودا — ہو اجب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی ۔ نہ ٹوٹے شیخ سے زنّار تسبیح سلیمانی

ان دونوں شعروں سے مذہبی رواداری کی تعلیم ملتی ہے۔ سودا کے شعر میں قصیدے کا انداز ہے۔ میر کے شعر میں غزل کا رنگ نسبتاً زیادہ ہے اس لئے اثر کے لحاظ سے یہ شعر بڑھا ہوا ہے۔

میر — مت رنج کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد ۔ دل ڈھائے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا

سودا — کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ ۔ یہ قصر دل نہیں جو بنایا نہ جائے گا

اس مضمون کو بھی شعر کا جامہ پہنا کر دونوں بزرگوں نے مذہبی رواداری کی تلقین کی ہے۔ میر کا شعر بندش کے لحاظ سے سست معلوم ہوتا ہے پہلا مصرع اس عہد کی زبان کے اعتبار سے بھی بے عیب نہیں۔ سودا کے پہلے مصرع میں بھی حرف شرط "اگر" کی بجائے "اگرچہ" کا استعمال قواعد زبان کی رو سے ناقص ہے۔ تاہم اس نقص سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو شعر کی بندش بہت چست ہے اور اس میں زور بھی زیادہ ہے۔ میر صاحب نے تو یہ کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ دل کو ڈھا کر یعنی کسی کا دل دکھا کر یا زیادہ صاف الفاظ میں کسی مندر کو مسمار کر کے مسجد بنانا ثواب اور بہادری کا کام نہیں۔ مگر سودا اس سے بہت آگے

چلے گئے ہیں اور اپنے مخاطب کو تنبیہ کرتے ہیں کہ اگر مسجد ٹوٹ جائے تو دوبارہ بنائی جا سکتی ہے لیکن اگر دل گر جائے یا ٹوٹ جائے تو اس کو دوبارہ بنانا ناممکن ہے۔

میرؔ ؎ ہم طورِ عشق سے تو واقف نہیں ہوں لیکن ' سینے میں جیسے کوئی دل ملا کرے ہے
سوداؔ ؎ عشق سے تو نہیں ہوں میں واقف دل کو شعلہ سا کچھ لپٹتا ہے

میرؔ کا عشق درد پیدا کرنے والا ہے۔ ایسا درد جو کبھی فرو نہیں ہوتا بلکہ لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جاتا ہے۔ دوسرے مصرعے کا آخری ٹکڑا "ملا کرے ہے" یہی ظاہر کرتا ہے کہ عشق کی خلش کاری ایک ایسا فعل ہے جو ہر وقت جاری رہتا ہے۔ سوداؔ کے عشق میں جلا دینے کی خاصیت ہے۔ شعلے کا لپٹنا ایک ایسا منظر ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عشق کی آگ کتنی تیز ہے۔ پہلے مصرعوں میں دونوں استادوں نے عشق سے ناواقفیت کا اظہار کیا ہے لیکن دوسرے مصرعوں میں ایسی پتہ کی بات کہی ہے کہ کوئی واقف بھی کیا کہے گا۔ جہاں تک فوری اثر کا تعلق ہے، سوداؔ کا شعر میرؔ کے شعر پر فائق ہے۔ لیکن تاثیر کی دیرپائی کے لحاظ سے میرؔ کا شعر بہت بڑھا ہوا ہے "سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے" طورِ عشق کی اچھوتی تشریح ہے اور نہایت صحیح۔ عشق کے شعلہ کا آتش ہو کر دل کو لپٹنا بھی اچھی تشبیہ ہے مگر بہت عام اور ندرت سے خالی یہاں شیفتہؔ کا ایک شعر یاد آگیا ؎

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہؔ اِک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

ندرت بیان کے لحاظ سے یہ شعر سوداؔ کے شعر سے افضل ہے۔ حالیؔ مرحوم نے عشق کی توضیح ذیل کے مصرع میں کی ہے: ع

خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جانا

حالیؔ کا اندازِ بیان بھی ندرتِ کلام کا عمدہ نمونہ ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ بڑی حد تک میرؔ کے قریب پہنچ گئے ہیں۔

جیسا کہ عام تذکرہ نویسوں نے کیا ہے میں نے بھی دونوں استادوں کے مندرجہ بالا اشعار اگرچہ اس خیال سے منتخب کئے ہیں کہ یہ ہم مضمون ہیں لابتہ جہاں تذکرہ نویس حضرات نے ان اشعار کو یکجا درج کر دینے پر اکتفا کیا ہے اور ان کے متعلق رائے قائم کرنے کا کام قارئین پر چھوڑ دیا ہے وہاں میں نے اپنی رائے اور اپنے خیال کے مطابق ان کا موازنہ و مقابلہ کر کے دکھایا ہے، تاہم ان میں کئی اشعار ہم مضمون ہونے کے علاوہ ہم طرح بلکہ ہم طرح ہونے کے ساتھ ہی ہم قافیہ بھی ہیں اور چونکہ ہمعصر حریفوں کے کمالِ فن کا موازنہ زیادہ صحیح طور پر ان کے ہم طرح کلام ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے ذیل میں چند ایسی غزلیں درج کی جاتی ہیں جو انہوں نے ایک ہی زمین میں کہی ہیں ؎

میرؔ

اے رنگِ بے ثباتی یہ گلستاں بنایا ۱ بلبل نے کیا سمجھ کر یاں آشیانہ بنایا
اُڑتی ہے خاک یارب شام و سحر جہاں میں ۲ کس کے غبارِ دل سے یہ خاکداں بنایا
اِک رنگ پہ نہ رہنا یاں کا عجب نہیں ہے ۳ کیا کیا نہ رنگ لائے تب یہ جہاں بنایا
آئینے میں کہاں ہے ایسی صفا کہے تو ۴ جبہوں سے راستوں کے وہ آستاں بنایا
سرگشتہ ایسی کس کی ہاتھ آ گئی تھی مٹی ۵ جوں چرخ زن قضا نے یہ آسماں بنایا
نقشِ قدم سے اس کے گلشن کی طرح ڈالی ۶ گرد رہ اُس کی سے کر سروِ رواں بنایا
ہونے پہ جمع اپنے پھولا بہت تھا لیکن ۷ کیا غنچہ تنگ آیا جب وہ دہاں بنایا
اُس صحن پر یہ وسعت اللہ رے تیری صنعت ۸ معمار نے قضا کے دل کیا مکاں بنایا
دل تنگ ادھر نہ آیا ادھر سے کچھ نہ پایا ۹ کہنے کو ترک سے کر اک سوانگ یاں بنایا

دریوزہ کرتے گذری گلیوں میں عمر اپنی ۱۰ درویش کب ہوئے ہم تکیہ کہاں بنایا
۱۱ وہ تو مٹا گیا تھا تربت بھی میرجی کی
دو چار اینٹیں رکھ کر ہیں یہ نشاں بنایا

سودا

کرتا ہوں میر جب سے باغ جہاں بنایا ۱ کیا جانے گل خدا نے تجھ سا کہاں بنایا
اک نام تو سنا ہے دیکھا نہیں کسو نے ۲ حق نے نشان عنقا تیرا وہاں بنایا
جتنے ہیں خوبرویاں سب داستاں ہیں لیکن ۳ اللہ نے تجھی کو اک داستاں بنایا
جنس دوم کو اول بزاز کھولتا ہے ۴ یوسف سے تو جہاں میں تجھ کو گراں بنایا
صدقے میں تیرے یارب ہم سوکھ کر کے پیدا ۵ گلنے کا آپ کے تیئں اک پاسباں بنایا
دیر و حرم کو دیکھا اللہ ری فضولی ۶ یہ کیا ضرور تھا جب دل کا مکاں بنایا
ترمت پکار اُس کو اے باغباں کہ ہم نے ۷ نزدیک آتش گل آپ آشیاں بنایا
عالم کے قمری آسا ہے طوق بندگی کا ۸ قامت کو تیرے جب سے سرو رواں بنایا
۹ - اکثر نشاں بنے ہیں عالم میں نام خاطر
تو نے سخن کو سودا اپنا نشاں بنایا

میر کی غزل میں اشعار کی تعداد سودا کی غزل سے زیادہ ہے لیکن ہمواری کے اعتبار سے سودا کی غزل بڑھی ہوئی ہے۔ میر صاحب کی غزل کے پہلے دسویں اور گیارھویں شعر کو چھوڑ کر باقی سب شعر معیار سے گرے ہوئے ہیں۔ سودا کی غزل کے بھی سارے اشعار بلند نہیں لیکن اس میں اول سے آخر تک ہمواری اور یک رنگی پائی جاتی ہے۔ صرف پانچواں شعر ضرورت سے زیادہ کمزور ہے۔ ہم قافیہ اشعار میں سے "سرو رواں" والے قافیہ کا شعر سودا کا بہتر ہے "مکاں" کا قافیہ بھی سودا نے اچھا باندھا ہے۔ "مکاں" کا قافیہ باندھنے میں دونوں استاد قریب قریب برابر رہے ہیں "آشیاں" کے قافیے میں میر کا شعر سودا سے بڑھا ہوا ہے میر صاحب کے مصرع

بلبل نے کیا سمجھ کر یاں آشیاں بنایا

میں سوز و گداز کی جو آگ ہے وہ سودا کے مصرع

نزدیک آتش گل آپ آشیاں بنایا

میں نہیں۔ "کہاں" کے قافیہ میں بھی میر صاحب سودا سے بڑھ گئے ہیں۔ میر صاحب کہتے ہیں ؎

دریوزہ کرتے گذری گلیوں میں عمر اپنی درویش کب ہوئے ہم تکیہ کہاں بنایا

یعنی درویشی اس کا نام نہیں کہ انسان گلیوں میں بھیک مانگتا پھرے۔ بلکہ درویش کی شان یہ ہے کہ وہ دنیا سے کنارہ کش ہو کر ایک جگہ بیٹھ جائے۔ توکل کی کیسی لاجواب تصویر ہے اور اس میں لفظ تکیہ کتنا معنی خیز ہے۔ تاثیر بیان نے اس پر اور غضب ڈھا دیا ہے۔ سودا کا شعر ؎

کرتا ہوں میر جب سے باغ جہاں بنایا کیا جانے گل خدا نے تجھ سا کہاں بنایا

صاف ہے اور اس میں انداز بیان کی بہت بھی ایک حد تک جھلک رہی ہے۔ مگر میر کے شعر سے اسے کوئی نسبت نہیں اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ میں نے باغ جہاں کی سیر بہت کی ہے مگر دوست جیسا خوبصورت پھول کہیں نظر نہیں آیا۔ نشاں کا قافیہ بھی میر صاحب نے مرا تب [illegible]

ساتھ باندھا ہے میر صاحب فرماتے ہیں ؎

وہ تو مٹا گیا تھا تربت بھی میر جی کی　　دو چار اینٹیں رکھ کر میں یہ نشاں بنایا

مطلب یہ ہے کہ میر صاحب کے محبوب نے تو میر صاحب کو مٹا ہی دیا تھا مگر ان کی قبر بھی پامال کردی۔ اب جو اس قبر کا نشان موجود ہے وہ میں نے دو چار اینٹیں رکھ کر بنا دیا ہے۔ محبوب کی عاشق آزاری اور عاشق کی کس مپرسی حد انتہا کو پہنچ گئی ہے اس کے مقابلے میں سودا کا شعر ؎

اکثر نشاں بنے ہیں عالم میں نام خاطر　　تو نے سخن کو سودا اپنا نشاں بنایا

معمولی سے بھی بہت کم معلوم ہوتا ہے اور اس میں انداز بیان کی بھی کوئی جدت نہیں۔ دیگر ؎

میر

چھٹتا ہی نہیں ہو جسے آزار محبت　۱　مایوس ہوں میں بھی کہ ہوں بیمار محبت

امکاں نہیں جیتے جی ہو اس قید سے آزاد　۲　مر جائے تبھی چھوٹے گرفتار محبت

تقصیر نہ خوباں کی نہ جلاد کا کچھ جرم　۳　تھا دشمن جانی مرا اقرار محبت

ہر جنس کے خواہاں ملے بازار جہاں میں　۴　لیکن نہ ملا کوئی خریدار محبت

اس راز کو رکھ جی ہی میں تا جی نہ بچے تیرا　۵　زنہار جو کرتا ہو تو اظہار محبت

ہر نقش قدم پر ترے سر بیچے ہیں عاشق　۶　ٹک سیر تو کر آج تو بازار محبت

کچھ مست ہیں ہم دیدۂ پرخون جگر سے　۷　آیا ہے یہی ساغر سرشار محبت

بیکار نہ رہ عشق میں رونے سے تو ہرگز　۸　یہ گریہ ہی ہے آب رخ کار محبت

۹　مجھ سا ہی ہو مجنوں بھی یہ کب مانے ہے عاقل
ہر سر نہیں اے میر سزاوار محبت

سودا

آتی ہے کسے واقف اسرار محبت　۱　پوچھیں نہ خدائی کو پرستار محبت

آتش ہے تری گرمیٔ بازار محبت　۲　کیا لے گا بجز داغ خریدار محبت

کیوں جی کو نہ مارا غم دوری نے ترے آہ　۳　کس منہ سے کروں گا میں پھر اظہار محبت

کرتے ہیں اسیر قفس دام بھی فریاد　۴　لے سکتے نہیں سانس گرفتار محبت

کیونکر نہ کرا ہے بھلا وہ ناصح بیہودہ　۵　جس دل میں کھٹکتا ہو پڑا خار محبت

دعوٰی مری صحت پہ مسیحا کو غلط ہے　۶　بچتے ہی نہ دیکھا کوئی بیمار محبت

رہے نہ اس شکل میں قاتل کی ہمارے　۷　کیا سہج ہیں آسان کی دشوار محبت

ہر جرم کو ہے عفو ترے عہد میں ظالم　۸　گردن زدنی ہے سو گنہگار محبت

باتوں سے کچھ ایسی نہیں تیرا گلہ منظور　۹　شکوے سے مزا دیتی ہے گفتار محبت

ٹک سادہ دلی پر تو مری رحم کر اے یار　۱۰　ہوں تجھ سے ستمگر سے طلبگار محبت

رونق ہے مرے حال پہ ہے مہرئ افلاک ١١ جس روز کیا تجھ سے میں اقرار محبت
ہر خار سے الجھا ہے مرا دامن پروانہ ١٢ ہوں رشتۂ بپا بلبل گلزار محبت
دل مرحلی خط کو نہ دے اس شوخ کے سودا ١٣ لگاوے گا اس آئینے کو زنگار محبت

سودا کی غزل میر صاحب سے طویل بھی ہے اور بحیثیت مجموعی بہتر بھی۔ اگرچہ پہلا شعر غیر واضح ہے پانچواں شعر آورد کا ہے، ساتویں شعر کی بندش سست اور پیچیدہ ہے اور آخری شعر میں ابتذال کی جھلک نمایاں ہے مگر باقی تمام شعر زبان کی روانی اور بیان کی شگفتگی کے عمدہ نمونے ہیں۔ میر صاحب کے اکثر اشعار سست ہیں۔ ہم قافیہ اشعار میں سے سودا کا شعر ؎

رونق تھی مرے حال پہ ہے مہرئ افلاک جس روز کیا تجھ سے میں اقرار محبت

میر صاحب کے شعر ؎

تقصیر نہ خوباں کی نہ جلاد کا کچھ جرم تھا دشمن جانی مرا اقرار محبت

سے کیا بلحاظ ندرت خیال و انداز بیان اور کیا بہ اعتبار شستگی زبان و تاثیر کلام بمراتب بلند ہے اور میر کے شعر ؎

اس راز کو رکھ جی ہی میں تا جی نہ بچے تیرا زنہار جو کرتا ہو تو اظہار محبت

کو بجائے خود بہت اچھا ہونے کے باوجود سودا کے شعر ؎

کیوں مجھ کو نہ مارا ہجر دوری نے ترے آہ کس منہ سے کروں گا میں پھر اظہار محبت

سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ اگرچہ میر کے مخصوص نشتروں کا سا سوز و گداز اس میں نہیں لیکن اس کو بجا طور پہ سودا کے تیز ترین خنجروں میں شمار کیا جا سکتا ہے سودا کا شعر ؎

کرتے ہیں اسیر قفس دوام بھی فریاد لے سکتے نہیں سانس گرفتار محبت

گرفتار محبت کی بے بسی و ابتلا کی سچی تصویر ہے مگر میر صاحب کے شعر ؎

امکاں نہیں جو جیتے جی اس قید سے آزاد مر جائے تو چھوٹے گرفتار محبت

میں محبت کی گرفت ہلاکت آفرینی کی حد تک سخت ہے اور خلش کاری کے اعتبار سے بھی یہ شعر اگر واقعی نشتر نہیں تو نشتر نما ضرور ہے۔ خریدار کے قافیہ میں میر کا شعر ؎ ہر جنس کے خواہاں ملے بازار جہاں میں لیکن نہ ملا کوئی خریدار محبت

معمولی ہے اس کے مقابلے میں سودا کا شعر ؎

آتش ہے تری گرمئ بازار محبت کیا لے گا بجز داغ خریدار محبت

زور بیان اور گرمئ کلام کا حامل ہے لیکن اگر بازار کو قافیہ قرار دے کر میر صاحب کا شعر ؎

ہر نقش قدم پر ترے سر بیچے ہیں عاشق ٹک سیر تو کر آج تو بازار محبت

اس کے مقابلے میں رکھا جائے تو فیصلہ دینے میں کسی قدر تامل کرنا پڑتا ہے گو یہ تسلیم کئے بغیر پھر بھی نہیں بنتی کہ زور بیان سودا ہی کے شعر کا حصہ ہے سودا کا شعر ؎

ٹک سادہ دلی پر تو مری رحم کر اے یار ہوں تجھ سے ستمگر سے طلبگار محبت

لاجواب ہے۔ میر صاحب نے یہ قافیہ نہیں باندھا۔ متاخرین میں مرزا قربان علی بیگ سالک نے ایک شعر اسی مضمون کا کہا ہے اور خوب کہا ہے ؎

مری اس سادگی پہ رحم کھانا کہ تجھ سے آرزوئے دل بیاں کی

اس میں شک نہیں کہ اس شعر میں ابہام نے جس پر ہزاروں وضاحتیں نثار ہیں، سودا کے شعر کی نسبت زیادہ لطف پیدا ہوگیا ہے۔ مگر چونکہ "نقاش نقش ثانی بہتر کشد اول" ایک قدرتی بات ہے۔ اس لئے اولیت کا سہرا جو ایسے امور میں زیادہ قابلِ فخر ہوتا ہے سودا ہی کے سر ہے۔

بیمار کے قافیہ میں میر صاحب سودا سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ میر صاحب کا شعر ہے ؎

چھٹتا ہی نہیں ہو جسے آزارِ محبت   مایوس ہوں میں بھی کہ ہوں بیمارِ محبت

اس شعر میں بیان کی ندرت بھی ہے اور زبان کی روانی بھی۔ تحیّر نے اس میں سوز پیدا کر رکھا ہے میر صاحب کے مخصوص رنگ کا شعر بنا دیا ہے اور اس میں تو کس کو کلام ہو سکتا ہے کہ جہاں میر صاحب اپنے مخصوص رنگ کا ایسا شعر کہہ جاتے ہیں جو ہر پہلو سے مکمل ہو وہاں سودا کیا کسی کو بھی اپنے نزدیک نہیں آنے دیتے۔ اس کے مقابلے میں سودا کا شعر ؎

دعویٰ مری صحت پہ مسیحا کو غلط ہے   بچتے ہی نہ دیکھا کوئی بیمارِ محبت

بالکل معمولی ہے۔ ندرتِ بیان سے تو یہ شعر عاری ہے ہی۔ زورِ کلام اور شوکتِ الفاظ بھی جو سودا کی امتیازی خصوصیت ہے اس میں موجود نہیں۔ میر صاحب کا شعر ؎

مجھ سا ہی ہو مجنوں بھی یک بانے بے عقل   ہر سر نہیں اے میر سزاوارِ محبت

قابلِ داد ہے۔ سودا نے یہ قافیہ باندھا ہی نہیں۔ اس لئے اسے شاملِ موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے دکھایا ہے کہ جہاں میر صاحب کی غزلوں میں زیادہ تر اشعار بھرتی کے ہوتے ہیں وہاں سودا کی غزلوں میں ہمواری اور یک رنگی عام طور پر پائی جاتی ہے۔ تاہم سودا کے خاص اشعار میر کے خاص اشعار کو نہیں پہنچتے۔ لیکن میں نے میر کی چند ایسی غزلیں بھی سالم کی سالم نقل کی ہیں جو سراپا مرصع ہیں اور جن کا جواب سودا کے سارے کلیات میں نظر نہیں آتا۔ ان غزلوں میں جو پہلے نقل کر آیا ہوں۔ ذیل کی ایک غزل بھی ہے ؎

آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر یار دیکھنا ۱ عاشق کا اپنے آخری دیدار دیکھنا
کیسا چمن کہ ہم سے اسیروں کو منع ہے ۲ چاکِ قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا
آنکھیں چرائیو نہ کہیں ابرِ بہار سے ۳ میری طرف بھی دیدۂ خونبار دیکھنا
ہونا نہ چار چشم دل اس ظلم پیشہ سے ۴ ہوشیار زینہار خبردار دیکھنا
صیاد دل ہے داغ جدائی سے رشکِ باغ ۵ تجھ کو بھی ہو نصیب یہ گلزار دیکھنا
گو زمزمہ ہی ہے کوئی دن تو ہم صفیر ۶ اس فصل ہی میں ہم کو گرفتار دیکھنا
بلبل ہمارے گل پہ نہ گستاخ کر نظر ۷ ہو جائے گا گلے کا کہیں ہار دیکھنا
شاید ہماری خاک سے کچھ ہو بھی اے نسیم ۸ غربال کر کے کوچۂ دلدار دیکھنا
اے ہم سفر نہ آبلے کو پہنچے چشمِ تر ۹ لاگا ہے میرے پاؤں میں آ خار دیکھنا
۱۰ اس خوش نگہ کے عشق سے پرہیز کیجو میر
جاتا ہے لے کے جی ہی یہ آزار دیکھنا

اسی زمین میں سودا کی غزل یہ ہے ؎

بے وجہ آئینہ نہیں ہر بار دیکھنا ۱ کوئی دم کو ڈھونڈتے ہی یہ گلزار دیکھنا

نرگس کی طرح خاک سے میری اگے ہے چشم ۲ ٹک آن کے یہ حسرت دیدار دیکھنا
کھینچے تو تیغ ہے حرمِ دل کے صید پر ۳ اے عشق پر بھلا تو مجھے مار دیکھنا
ہے نقش جان دیدہ ترا پر یہی ہے دکھ ۴ جی جائے یار ہے مجھے ہر بار دیکھنا
اے طفلِ اشک ہے فلکِ ہشتمیں پہ عرش ۵ آگے قدم نہ رکھیو تو زنہار دیکھنا
پوچھے خدا سبب جو مرے اشتیاق کا ۶ میری زباں سے ہو یہی اظہار دیکھنا
ہر نقشِ پا پہ تڑپے ہے یاں ہر ایک دل ۷ ٹک واسطے خدا کے یہ رفتار دیکھنا
نے حرف و نے حکایت و نے شعر و نے سخن ق ۸ نے سیر باغ و نے گل و گلزار دیکھنا
خاموش اپنے کلبۂ احزاں میں روز و شب ۹ تنہا پڑے ہوئے در و دیوار دیکھنا
یا جا کے اس گلی کو جہاں تھا ترا گزار ۱۰ لے صبح تا بہ شام کئی بار دیکھنا
تسکینِ دل نہ اس میں بھی پائی تو بہرِ شغل ۱۱ پڑھنا یہ شعر گر کبھو اشعار دیکھنا

۱۲۔ کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں روزِ ہجر کو
پر جو خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا

اس زمین میں گلزار کا قافیہ میر صاحب کا حصہ ہو گیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

صیاد دل ہے داغ جدائی سے رشکِ باغ   تجھ کو بھی ہو نصیب یہ گلزار دیکھنا

کتنا پاکیزہ شعر ہے اور یار کو جو دعا دی ہے کس قدر آتش ریز ہے۔ اس کے مقابلے میں سودا کا شعر ؎

بے وجہ آئینہ نہیں ہر بار دیکھنا   کوئی دم کو پھولتے ہی یہ گلزار دیکھنا

بالکل پھیکا ہے۔ اسی غزل میں سودا نے ایک قطعہ بھی نظم کیا ہے اس میں ایک شعر آیا ہے ؎

نے حرف و نے حکایت و نے شعر و نے سخن   نے سیر باغ و نے گل و گلزار دیکھنا

گلزار میں بھی سودا، میر سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ دیوار کا قافیہ بھی میر صاحب نے بڑی ندرت کے ساتھ باندھا ہے ؎

کیسا چمن کہ ہم سے اسیروں کو منع ہے   چاکِ قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا

یاس و حسرت کی کیسی پُر سوز تصویر ہے! چاکِ قفس نے شعر کی شان کو اور بھی دوبالا کر دیا ہے۔ سودا کا شعر ؎

خاموش اپنے کلبۂ احزاں میں روز و شب   تنہا پڑے ہوئے در و دیوار دیکھنا

بھی بڑا تحسر آمیز ہے۔ لیکن یہ اسی قطعہ کا ایک شعر ہونے کی وجہ سے بجائے خود مکمل نہیں۔

زنہار کا قافیہ سودا نے اس طرح باندھا ہے ؎

اے طفلِ اشک ہے فلکِ ہشتمیں پہ عرش   آگے قدم نہ رکھیو تو زنہار دیکھنا

میر صاحب نے یہ قافیہ براہِ راست تو نہیں باندھا، تاہم ضمناً یہ بندھ گیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

ہوتا نہ چار چشم دلِ اس ظلم پیشہ سے   ہشیار زینہار خبردار دیکھنا

دوسرا مصرعہ دو لخت ہے اور اس سے شعر میں بہت زور پیدا ہو گیا ہے۔ دیدار کے قافیہ میں میر کا شعر ہے ؎

آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر یار دیکھنا   عاشق کا اپنے آخری دیدار دیکھنا

سوداؔ لکھتے ہیں ؎

نرگس کی طرح خاک سے میری اُگے ہے چشم ٹک آن کے یہ حسرتِ دیدار دیکھنا

میرؔ کے شعر میں حسرت و درد اور سوز و گداز سب کچھ ہے۔ الفاظ بچے تلے آئے ہیں۔ سوداؔ تشبیہات کے گورکھ دھندے میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔ حسرتِ دیدار کی رعایت سے نرگس اور چشم لے آنا کوئی شاعرانہ معرکہ نہیں اور نہ اسے شانِ استادی کی دلیل کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

خونبار کا قافیہ بھی میرؔ صاحب نے اپنے مخصوص انداز سے باندھا ہے ؎

آنکھیں چرائیو نہ ٹک ابرِ بہار سے میری طرف بھی دیدۂ خونبار دیکھنا

آنکھوں کو روئے جاتے کی تلقین کتنے مؤثر پیرائے میں کی گئی ہے! سوداؔ نے یہ قافیہ بالکل نہیں باندھا۔ میرؔ صاحب کا ایک اور شعر بھی جس کا ہم قافیہ شعر سوداؔ کی غزل میں موجود نہیں، بہت خوب ہے جس پر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

گر زمزمہ یہی ہے کوئی دن تو ہم صفیر اس فصل ہی میں ہم کو گرفتار دیکھنا

"اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی" کی کیسی دردناک اور دردانگیز تصریح ہے۔ متاخرین میں سے کسی استاد کا شعر ہے ؎

مائل زمزمہ اے بلبلِ خوش لہجہ نہ ہو تو گرفتار ہوئی اپنی صدا کے باعث

لیکن نقشِ ثانی ہونے کے باوجود یہ شعر میرؔ صاحب کی گرد کو بھی نہیں پہنچا۔

مختصر یہ کہ سوداؔ کی قادر البیانی ناقابلِ انکار ہے۔ اس کا کلام شکوہ انداز و شوکتِ الفاظ کا بہترین نمونہ ہے اور اس لئے اس کی غزل اور قصیدے کے درمیان حدِ امتیاز حد درجہ لطیف ہے کہ ہر نظر کو دکھائی نہیں دے سکتی۔ لیکن وہ شاعری جس میں داخلی عنصر کی بہتات ہو اور اس بنا پر ایک خاموش طغیانی اپنے اندر رکھتی ہو میرؔ کی شاعری ہے۔

سوداؔ کی قادر البیانی نے اس کے کلام کو ابتذال سے بچایا ہے۔ اور میرؔ کے ہاں یہ جنس انبار کی صورت میں موجود ہے۔ لیکن میرؔ کے کلام میں کوکین کا سا غیر محسوس نشہ ہے کہ پڑھنے والے کے دل و دماغ پر نامعلوم طریقے سے چھا جاتا ہے اور کہیں نہیں تو اس کی روح مضطربانہ طور پر رقص کرنے لگتی ہے۔ حسرت موہانی کی زبان میں جذبہ انصاف پر چیخ اٹھتا ہے کہ ؎

گزرے بہت استاد مگر رنگِ اثر میں بے مثل ہے حسرتؔ سخنِ میرؔ ابھی تک

میرؔ سوداؔ دردؔ

(۳)

اس سلسلے کے پچھلے دو نمبروں میں میرؔ اور سوداؔ کا جو موازنہ کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ زورِ بیان، شکوہ الفاظ اور چستیٔ تراکیب کے اعتبار سے سوداؔ کو میرؔ پر اور تاثیرِ کلام اور سوز و گداز کے لحاظ سے میرؔ کو سوداؔ پر برتری حاصل ہے۔ مجموعی حیثیت سے سوداؔ کا کلام ہموار اور ابتذال سے پاک ہے اور میرؔ کے کلام میں جابجا ناہمواری اور ابتذال کی کثرت ہے۔ لیکن میرؔ کے خاص اشعار کا پایہ سوداؔ کے خاص اشعار سے بمراتب بلند ہے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس حیثیت سے سوداؔ کو میرؔ سے کوئی نسبت نہیں تاہم اس سے بھی انکار ناممکن ہے کہ داخلی مضامین نظم کرنے کا جو فطری ملکہ میرؔ کی طبیعت میں ودیعت ہوا تھا۔ اس سے سوداؔ اگر بالکل نہیں تو بہت حد تک محروم ہی تھے۔ اس کمی کو پورا کرنے میں انہیں اپنی قادر الکلامی سے بڑی مدد ملی لیکن بمصداق ؏ ۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

میر کی دردمندی اور درد انگیزی تیر ہی کا حصہ رہی زمانے کی قدردانی نے سودا کو ملک الشعرا بنا دیا۔ مگر خدائے سخن کا مرتبہ میر ہی کو حاصل ہوا۔

بہرحال بعض نقادوں کا جو یہ خیال ہے کہ اردو شاعری کے ہر دور میں ایک غیر فطری شاعر ایک فطری شاعر کا حریف و مد مقابل بنایا جاتا رہا ہے۔ مثلاً مصحفی کا انشا۔ آتش کا ناسخ۔ غالب کا ذوق اور داغ کا امیر۔ وہ میر و سودا کی حالت میں قابلِ اطلاق نہیں۔ اردو زبان کے یہ دونوں مقتدر محسن وہبی شاعر تھے اور دونوں کی شاعری فطری ہے۔ فرق جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ صرف افتادِ طبع کا ہے۔ سودا شوخی اور ظرافت کا مجسمہ ہیں۔ میر زار نالی اور خستگی کی تصویر ہیں۔ ان دونوں کے بین بین خواجہ میر درد کا مقام ہے جن کا تعارف اس مضمون کی موجودہ قسط کے عنوان میں کرایا جاتا ہے

خواجہ صاحب سودا کے برعکس دنیا میں اُلجھے ہوئے نہیں تھے۔ بلکہ ایک متوکل کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن جہاں انہوں نے دنیا کو ترک کر رکھا تھا۔ وہاں میر کے برعکس وہ دنیا سے بیزار نہیں تھے اور نہ اہلِ دنیا کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انتالیس برس کی عمر سے سجادہ فقر پر قناعت کا تکیہ لگا کر بیٹھے تھے اور عقیدت مندوں کو معرفت کی تعلیم دیتے تھے۔ زیادہ وقت عبادتِ الٰہی میں صرف کرتے تھے اور جو اس سے بچ رہتا تھا اس میں شعر گوئی اور تصنیف علمی کا شغل فرماتے تھے۔ فقر و قناعت کا یہ عالم تھا کہ بقول مولوی عبدالباری آسی "انقلاب کے تیز و تند جھونکوں نے دلی کے ذرہ ذرہ کو ہلا یا۔ زمانہ کو زیر و زبر کیا۔ قیامت کبریٰ قائم کی۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے مستقل مزاج دلی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ دن دہاڑے قتل و غارت اور ڈاکہ زنی کی وارداتیں ہونے لگیں۔ سودا، میر، سوز، مصحفی، جرأت، حسرت، انشا غرضیکہ بڑے بڑے مشاہیر جن کے دم سے دلی دلی تھی۔ چھاتی پر سل کا پتھر رکھ کر اپنے وطن مالوف کو خیر باد کہہ کر در و دیوار کو حسرت آلود نگاہوں سے دیکھتے اور یہ

رخصت اے اہلِ وطن اب تو سفر کرتے ہیں

کا دلگداز نوحۂ فراق پڑھتے ہوئے دلی سے نکل بلاد شرقیہ میں پہنچ گئے۔ مگر اس بندۂ خدا کے بوریائے بے ریا کو جنبش بھی نہ ہوئی۔ استقلال کا قدم جیسا جا تھا جما رہا۔ بزرگوں کے بچھائے ہوئے سجادہ پر اسی طرح بیٹھے رہے اور خوف و ہراس سے ماتھے پر شکن نہ پڑی۔ خودداری کا یہ رنگ تھا کہ عمر گذر گئی اردو، ہندی، فارسی، عربی سب ہی زبانوں میں شاعری کی مگر ایک قصیدہ بھی کسی کی مدح میں نہ کہا۔ ساتھ ہی ساتھ نیک دلی کا بھی یہ انداز تھا کہ بخلاف اپنے معاصرین کے کبھی کسی کی ہجو سے اپنے قلم و زبان کو آلودہ نہیں کیا" (مقدمہ دیوان خواجہ میر درد)

میر اور سودا دونوں کی نگاہوں میں خواجہ صاحب کی بڑی عظمت تھی۔ میر صاحب اپنے تذکرہ "نکات الشعراء" میں لکھتے ہیں۔

مجلس ریختہ جو بندہ کے مکان پر ہر مہینے کی پندرھویں تاریخ کو منعقد ہوتی ہے انہی بزرگ (خواجہ میر درد) کی ذات سے ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے یہ مجلس انہی کے مکان پر ہوتی تھی۔ مگر روزگار بے مدار کی گردش سے درہم برہم ہو گئی۔ چونکہ آپ کو اس حقیر سے دلی اخلاص ہے اس لئے فرمایا کہ اگر تم مجمع کو اپنے مکان پر مقرر کر لو تو بہتر ہو۔ میں نے اس اخلاص مشفقانہ کے پیشِ نظر عمل کیا۔ خدا ان کو قیامت تک سلامت رکھے"

اسی تذکرہ میں خواجہ صاحب کی شاعری پر اظہار کرتے ہوئے میر صاحب فرماتے ہیں،

"ان کی زبانِ گفتگو گرہ کشائے زلفِ مشامِ مدعا ہے۔ اُن کے قلم سے جو مصرع صفحۂ کاغذ پر آ جاتا ہے وہ کاکلِ صبح سے زیادہ خوشنما ہوتا ہے۔ اُن کی طبع سخن پرداز چمنستانِ انداز کا سرو رواں ہے۔ کبھی پائے تلاش (شاعری) کے کوچہ میں قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ ان کے چمن شعر کا ہر لفظ رنگین بجائے خود چمن ہوتا ہے۔ ان کے خیال کی گلچینی کرنے والے جھولیاں بھر بھر کر گلِ معنیٰ سے جاتے ہیں وہ ریختہ کے ایک زور آور شاعر ہیں۔ فارسی شعر بھی کہتے ہیں مگر زیادہ تر رباعی"

سودا کی عقیدت اُن کے ساتھ کس حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے حضرت آسی نے مقدمہ دیوان خواجہ میر درد میں ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ جو آسی صاحب کے الفاظ ہی میں نقل کیا جاتا ہے۔

"لکھنؤ سے ایک شخص دلّی جانے کا ارادہ کرتا ہے اور چلتے وقت مرزا رفیع سوداؔ سے کہتا ہے کہ مرزا صاحب دلّی جاتا ہوں، کوئی کام ہو یا کوئی پیام ہو تو ارشاد فرمائیے، سوداؔ کہتے ہیں، بھائی میرا دلّی میں کون ہے۔ ہاں کبھی خواجہ میر دردؔ کی طرف جا نکلو تو سلام کہہ دینا۔ اللہ اللہ کیا عظمت ہے۔ دلّی سا شہر اور پھر بھی سوداؔ کو دردؔ کے سوا کوئی قابل خطاب نظر نہیں آتا۔"

اپنی ایک غزل کے مقطع میں بھی سوداؔ نے خواجہ صاحب کا اعتراف کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

سوداؔ بدل کے قافیہ تو اس غزل کو لکھ　　　اے بے ادب تو دردؔ سے بس دربدر نہ ہو

ایک اور غزل میں سوداؔ نے خواجہ صاحب کے ایک مصرع کی تضمین بھی کی ہے ؎

میں کیا کہوں کہ کون ہوں سوداؔ بقول دردؔ　　　جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

میر حسن جن کی "مثنوی بے نظیر" کا جواب اردو شاعری آج تک پیش نہیں کر سکی۔ اپنے تذکرۂ شعرا میں خواجہ صاحب کے متعلق لکھتے ہیں :

"خواجہ میر المتخلص بہ دردؔ آسمان سخن کے آفتاب ہیں۔ فارسی اور ہندی کے شاعر ہیں۔ بنہیں نہیں یہ کہنا اُن کی توہین میں داخل ہے۔ شعر گوئی اُن کے مرتبے سے بہت نیچے ہے۔ اُن کا دیوان اگرچہ مختصر ہے لیکن کلام حافظؔ کی طرح سراپا انتخاب ہے۔"

صاحب "آب حیات" نے میرؔ کا ایک قول نقل کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میرؔ صاحب بھی دردؔ کو آدھا شاعر مانتے تھے۔ اس قول کے نقل کرنے سے آزادؔ مرحوم کو خواجہ صاحب کی تحقیر نہیں، بلکہ اُن کے کمالِ شاعری کی سند پیش کرنی مقصود تھی۔ تاہم قیاس کہتا ہے کہ مولانا آزادؔ نے محض زیب داستان کی خاطر اس کو صحیح تسلیم کر لیا ہے۔ ورنہ اس کی اصلیت کچھ نہ تھی۔ میرؔ بیزار بد دماغ سہی لیکن دردؔ جیسے خدا رسیدہ بزرگ اور باکمال سخن طراز کی شان میں وہ ایسے الفاظ استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ اگر خواجہ صاحب اُن کے نزدیک آدھے شاعر ہوتے۔ تو وہ اپنے تذکرہ نکات الشعراء میں ان کے متعلق وہ الفاظ حوالہ قلم نہ کرتے۔ جو اوپر نقل کئے گئے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ خواجہ صاحب اپنے دَور کے بڑے بلند پایہ شاعر تھے اور اس دَور کے شعراء میں میرؔ و سوداؔ کے سوا اور کوئی ان کا حریف کمال نہیں تھا۔ اُن کے کلام میں ہمواری و یکسانیت کی جو شان نظر آتی ہے۔ وہ میرؔ اور سوداؔ کے یہاں موجود نہیں۔ مگر اس ہمواری اور یکسانیت کی بنا پر حضرت آسیؔ نے جو یہ فتویٰ صادر فرمایا ہے کہ خواجہ میر دردؔ کے برابر کوئی شاعر سرزمین ہند میں پیدا نہیں ہوا۔ اس سے مجھے اختلاف ہے۔ اردو کے نقادوں میں یہ عیب بہت عام ہے کہ وہ اپنے ممدوح کی تعریف کے جوش میں مبالغے کی حدیں توڑ دیتے ہیں اور غلو کی حدود سے بھی پرے نکل جاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت آسیؔ نے مقدمہ دیوان خواجہ میر دردؔ میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "دردؔ کے یہاں جو تاثیر و تاثر اور نشتریت ہے۔ وہ میرؔ کے یہاں ہرگز نہیں ہے" اور اس دعوے کی تائید میں صاحب کشف الحقائق مولوی امداد امام اثرؔ کی رائے بھی پیش کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس دعوے کی حیثیت دعوائے بے دلیل سے زیادہ نہیں۔ دردؔ کے کمال سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا، لیکن میرؔ پھر میرؔ ہے اور نشتریت میں تو اس کا مقابلہ کسی کے بھی بس کی بات نہیں۔

کلام کی ہمواری اور یکسانیت کے معاملے میں بھی اس امر کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ خواجہ صاحب کا کلام بہت مختصر ہے، اول تو غزلوں کی تعداد بہت کم ہے، پھر اکثر غزلیں صرف چھ چھ سات سات اشعار کی ہیں اور خاصی تعداد ایسی غزلوں کی بھی ہے، جن میں اشعار کی تعداد پانچ سے بھی کم ہے۔ ان کے دیوان میں ایسی غزلیں دو چار سے زیادہ نہیں۔ جو آٹھ نو سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہوں، اس حالت میں اگر خواجہ صاحب کے یہاں ہمواری اور یکسانیت سوداؔ کی نسبت زیادہ ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ البتہ اس سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کا مذاق نہایت سلجھا ہوا تھا اور اُن کی طبع سلیم کمزور شعر کو گوارا نہیں کرتی تھی۔ تاہم اُن کا کلام پستی اور ابتذال سے بالکل خالی نہیں تھا، مثلاً ؎

غرور حسن کم ہوتا نہیں کچھ خط کے آنے سے　　　کہ یہ سب مور چے پہ بھی سلیمان جاہ ہوتے ہیں

میں کہاں اور خیالِ بوسہ کہاں　　　منہ سے منہ یوں بھڑا دیا کس نے

تو جو کہتا عبث ہے کسی بات کے لئے   میں آگیا ہوں صرف ملاقات کے لئے
ہم جانتے ہیں درد آ اندھیرے ہی رات کو   تو لگ رہا ہے کوچے میں جس گھات کے لئے

کہیں کہیں قواعد فن کی پابندی کا خیال بھی خواجہ صاحب سے نظر انداز ہو جاتا ہے مثلاً ؎

ہستی ہے جب تک ہم ہیں اسی اضطراب میں   جوں موج آ پھنسے ہیں عجب پیچ و تاب میں
غافل جہاں کی دید کو مفتِ نظر سمجھ   پھر دیکھنا نہیں ہے اس عالم کو خواب میں

پہلے شعر کے پہلے مصرع میں "تک" کا ک اور دوسرے شعر کے دوسرے مصرع میں "عالم" کا ع تقطیع سے گرتا ہے۔ یا ؎

نہ اٹھو درد اپنے بستر سے طمع کر ہرگز   جو کچھ غیب سے آئے سو تم البتہ دے بیٹھے

پہلے مصرع میں طمع کو بوزن شمع باندھا گیا ہے جو صحیح نہیں۔ مگر ان مثالوں سے جو دیوان درد میں خال خال ملتی ہیں، خواجہ صاحب کے کمال کی نفی نہیں ہو سکتی۔ ذیل میں اُن کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ میر و سودا کے عہد کی بزم ادب کے ایک مقتدر اور قابل فخر رکن تھے ؎

اکسیر پہ مہوّس اتنا نہ ناز کرنا   بہتر ہے کیمیا سے دل کا گداز کرنا

جان سے ہو گئے بدن خالی   جس طرف تُو نے بھر نظر دیکھا
اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی   ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

اب دل کو سنبھالنا ہے مشکل   اگلے دنوں کچھ سنبھل گیا تھا

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا   برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا
یگانہ ہے تو آہ بیگانگی میں   کوئی دوسرا اور ایسا نہ دیکھا

یہ چاہتی ہے تو تپشِ دل کہ بعد مرگ   کنجِ مزار میں بھی نہ میں آرمیدہ ہوں
اے درد جا چکا ہے مرا کام ضبط سے   میں غمزدہ تو قطرۂ اشک چکیدہ ہوں

تو مجھ سے نہ رکھ غبار جی میں   آئے بھی اگر ہزار جی میں
یوں پاس بٹھا جسے تو چاہے   پر جائے نہ دیکھ یار جی میں

جو کچھ کہ ہم نے کی ہے تمنا ملی مگر   یہ آرزو رہی ہے کہ کچھ آرزو نہ ہو

اہل فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے   لوحِ مزار بھی مری چھاتی پہ سنگ ہے

کوئی بھی دوا اپنے تئیں راس نہیں ہے   جز وصل سو ملنے کی کوئی آس نہیں ہے
وہ اشک نکلتا ہے مری آنکھ سے جس کا   ہر قطرہ کم از پارۂ الماس نہیں ہے

خوابِ عدم سے جاگے تھے ہم تیرے واسطے   آخر کو جاگ جاگ کے ناچار سو گئے

سلطنت پر نہیں ہے کچھ موقوف   جس کے ہاتھ آئے جام سو جم ہے

جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی   ایک بھی اُس سے ملاقات نہ ہونے پائی

ہوا جو کچھ کہ ہونا تھا کہیں کیا جی کو رو بیٹھے
بس اب اک ساتھ ہم دونوں جہاں سے ہاتھ دھو بیٹھے

پھر کچھ منتخب اشعار ہی پر موقوف نہیں۔ دیوان میں ایسی غزلیں بھی کثرت سے مل سکتی ہیں جو سرتاپا مرصع ہیں۔ ملاحظہ کیجیے ؎

جان پہ کھیلا ہوں میں میرا جگر دیکھنا　　جی نہ رہے یا رہے مجھ کو اُدھر دیکھنا
گرچہ وہ خورشید رو مت ہے مرے سامنے　　تو بھی میسر نہیں بھر کے نظر دیکھنا
سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک　　اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا
مثل شرر تنگ چشم ہستیٔ بے بود ہے　　دیکھ نہ سکنا اسے ٹک بھی جدھر دیکھنا

نالۂ دل کا اثر دیکھ لیا دردؔ بس
جی میں نہ رہ جائے یہ آہ بھی کر دیکھنا

قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا　　پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا
رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور　　شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا
ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن　　میں جو پہنچا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا
پرورش غم کی ترے یاں تئیں تو کی دیکھا　　کوئی بھی داغ تھا سینے میں کہ ناسور نہ تھا

دردؔ کے ملنے سے اے یار برا کیوں مانا
اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں　　دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں
مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں　　ہم آئینے کے سامنے جب آ کے ہو کریں
تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو　　دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
سر تا قدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم　　پر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں
ہر چند آئینہ ہوں پر اتنا ہوں ناقبول　　منہ پھیر لے وہ جس کے مجھے روبرو کریں

اپنی ہے یہ صلاح کہ سب زاہدانِ شہر
اے دردؔ آ کے بیعتِ دستِ سبو کریں

ان نے کیا تھا یاد مجھے بھول کر کہیں　　پاتا نہیں ہوں تب سے میں اپنی خبر کہیں
آجاتے ایسے جینے سے اپنا تو جی بتنگ　　جیتا رہے گا کب تلک اے خضر مر کہیں
پھرتی رہی تڑپتی ہی عالم میں جابجا　　دیکھا نہ میری آہ نے روئے اثر کہیں
مدت تلک جہاں میں ہنستے پھرا کیے　　جی میں ہے خوب رو لیے اب بیٹھ کر کہیں

ظالم جفا جو چاہے سو کر مجھ پہ تو ولے
پچھتائے پھر تو آپ ہی ایسا نہ کر کہیں

ہے غلط گر گمان میں کچھ ہے　　تجھ سوا بھی جہان میں کچھ ہے
دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے　　آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے
ان دنوں کچھ عجب ہے مرا حال　　دیکھتا کچھ ہوں دھیان میں کچھ ہے

اور بھی چاہیئے سو کہیئے اگر   دلِ نا مہربان میں کچھ ہے
دردؔ جو تو کرے ہے جی کا زیان
فائدہ اس زیان میں کچھ ہے!

پہلو میں دلِ تپاں نہیں ہے   ہر چند کہ یاں ہے یاں نہیں ہے
عالم ہو قدیم خواہ حادث   جس دم نہیں ہم جہاں نہیں ہے
ڈھونڈھے ہے تجھے تمام عالم   ہر چند کہ تو کہاں نہیں ہے
جوں شمع نہ رازِ دل کہوں گا   ایسی بھی مری زباں نہیں ہے
فریاد کہ دردؔ جب تلک میں   تیار ہوں کارواں نہیں ہے

ان اشعار کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ دردؔ کے کلام میں سوداؔ کی روانی اور قادر الکلامی بھی ہے اور میرؔ کی دلسوزی اور نشتریت بھی۔ لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ سوداؔ کو جو کمال اپنے رنگ میں اور میرؔ کو جو مرتبہ اپنے انداز میں حاصل ہے وہ دردؔ کو نصیب نہیں بلکہ اگر فرداً فرداً دیکھا جائے تو بھی میرؔ کی خصوصیات میں سوداؔ صرف میرؔ سے اور سوداؔ کی خصوصیات میں میرؔ صرف سوداؔ سے دوسرے درجہ پر ہیں۔ دردؔ سے دونوں کا رتبہ دونوں قسم کی خصوصیات میں بلند ہے۔ البتہ جہاں تک کلام میں معرفت کی چاشنی کا تعلق ہے دردؔ اپنے ان دونوں معاصرین سے اونچے نظر آتے ہیں اور یہ بھی ایک وجہ ہے اس بات کی کہ ابتذال و رکاکت کا جو عیب سوداؔ میں اور سوداؔ سے بہت زیادہ میرؔ میں نظر آتا ہے، اس سے دردؔ کا کلام تقریباً پاک ہے۔

اب تینوں استادوں کی چند ہم طرح غزلوں کا موازنہ کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین کو ان کی تقابلی حیثیت کے متعلق زیادہ صحیح طور پر رائے قائم کرنے میں آسانی ہو سکے

میرؔ

گزرے بنائے چرخ سے نالہ پگاہ کا   خانہ خراب ہو جیو اس دل کی چاہ کا
آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر دیکھتا نہیں   مرتا ہوں میں تو ہائے رے صرفہ نگاہ کا
صد خانماں خراب ہیں ہر ہر قدم پہ دفن   کشتہ ہوں یار میں تو ترے گھر کی راہ کا
یک قطرہ خون ہو کے پلک سے ٹپک پڑا   قصہ یہ کچھ ہوا دلِ غفراں پناہ کا
تلوار مارنا تو انہیں کھیل ہے ولے   جاتا رہے نہ جی ہی کسو بے گناہ کا
بدنام و خوار و زار و نزار و شکستہ حال   احوال کچھ نہ پوچھئے اس روسیاہ کا
ظالم زمیں سے لوٹتا دامن اٹھا کے چل   ہوگا کمیں میں ہاتھ کسو دادخواہ کا
اے تاجِ شہ نہ سر کو فرو لاؤں ترے پاس   ہے معتقد فقیر نمد کی کلاہ کا
بیمار تو نہ ہووے جیے جب تلک کہ میرؔ   سونے نہ دے گا شور تری آہ آہ کا

سوداؔ

چھٹتا ضرور مکھ پہ ہے زلفِ سیاہ کا   روشن بغیر شام نہ چہرہ ہو ماہ کا
جل کر تو اے پتنگ گرا پائے شمع پر   ہوں داغ عذر دیکھ کے تیرے گناہ کا
جوں باد اس چمن میں پھرا میں تمام عمر   شرمندہ پا نہیں مرا برگِ گیاہ کا

نامہ سچ چشم ترکِ بتاں کیوں نہ ہو یہ دل غارت کرے ہے ملک کو فرقہ سیاہ کا
اے آہ شعلہ بار ترا کیا کہوں اثر رہنے دیئے نہ کوہ ترے آگے کاہ کا
حاضر ہے تیرے سامنے سودا اگر اس کو قتل مجرم یہ سب طرح سے ہے ہر یک نگاہ کا

درد

اندازہ وہ ہی سمجھے مرے دل کی آہ کا زخمی جو ہو چکا ہو کسی کی نگاہ کا
زاہد کو ہم نے دیکھ لیا جوں نگیں بعکس روشن ہوا ہے نام تو اس روسیاہ کا
ہر چند فسق میں تو ہزاروں ہیں لذتیں لیکن عجیب مزا ہے فقط دل کی چاہ کا
لے کر ازل سے تا بہ ابد ایک آن ہے گر درمیاں حساب نہ ہو سال و ماہ کا
رحمت قدم نہ رکھنے کرے گر تری ادھر یا رب ہے کون پھر تو ہمارے گناہ کا
دل اس مژہ سے رکھیو نہ تو چشم دیکھ اے بے خبر بُرا ہے یہ فرقہ سیاہ کا
شاہ و گدا سے اپنے تئیں کچھ نہیں تئیں تاج کی ہوس نہ ارادہ کلاہ کا
سو بار دیکھیں میں نے تری بے وفائیاں تس پر بھی بت غرور ہے دل میں نباہ کا
اے درد چھوڑتا ہی نہیں مجھ کو جذب عشق کچھ کہر باسے بس نہ چلے برگِ کاہ کا

سودا کے مطلع کی بنیاد خارجی مضمون پر ہے۔ فن کے لحاظ سے یہ رعایت لفظی کا پلندہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح شام کی سیاہی یعنی تاریکی چاند کو روشن کر دیتی ہے، اسی طرح رخ دلدار کو موثر کرنے کے لئے بھی ضروری ہے کہ زلفِ سیاہ اس پر بکھر جائے میر اور درد کے مطلعوں کا مضمون داخلی ہے۔ میر کا مطلع ان کے ایسے اشعار میں تو داخل نہیں، جن کو سن کر انسان کلیجہ پکڑ کے بیٹھ جاتا ہے تاہم اچھا خاصہ درد انگیز ہے۔ درد کا مطلع درد انگیزی میں میر کے برابر ہے۔ اور زبان کی صفائی اور بیان کی روانی میں اس سے کسی قدر بڑھا ہوا لیکن جہاں تک نگاہ کا قافیہ باندھنے کا تعلق ہے۔ میر کا شعر ؎

آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر دیکھتا نہیں مرتا ہوں میں تو ہائے اسے صرفہ نگاہ کا

زار نالی کی ایک نہایت رقت انگیز تصویر ہے۔ سودا کا شعر ؎

حاضر ہے تیرے سامنے سودا اگر اس کو قتل مجرم یہ سب طرح سے ہے ہر یک نگاہ کا

درد کے مقابلے میں پست ہے اور میر کے مقابلے میں پست تر۔ اگر چاہ کو قافیہ قرار دے لیا جائے۔ تو درد کے شعر ؎

ہر چند فسق میں تو ہزاروں ہیں لذتیں لیکن عجیب مزا ہے فقط دل کی چاہ کا

سے میر کا مطلع ؎

گذرے بنائے چرخ سے نالہ پگاہ کا خانہ خراب ہو جیو اس دل کی چاہ کا

بلند ہے۔ درد کا مقصد خالص عشق کی برتری واضح کرنا ہے۔ لیکن پہلے مصرع میں ہوس پرستی کا ذکر ایسے مولویانہ طریقہ سے ہوا ہے کہ شعر کی جاذبیت قائم نہیں رہی۔ سودا نے چاہ کا قافیہ باندھا ہی نہیں۔

کلاہ کا قافیہ بھی سودا کی غزل میں موجود نہیں۔ میر کا شعر ؎

اے تاج شہ نہ سر کو فرو لاؤں تیرے پاس ہے معتقد فقیر نمد کی کلاہ کا

میریت کا نمونہ تو نہیں۔ تاہم خودداری اور استغنا کا وقار آموز سبق اپنے اندر رکھتا ہے اور میر کی عملی زندگی کا صحیح آئینہ دار ہے۔ میر نے پریشان روزگاری کی صعوبتیں اٹھائیں اور انتہائی تنگ دستی کی مصیبتیں برداشت کیں۔ مگر آسمان کے نمرہ کا سر بڑے سے بڑا انعام لینے کی خاطر بھی کسی کے سامنے خم نہ ہوا۔ درد کا شعر ؂

شاہ و گدا سے اپنے تئیں کام کچھ نہیں ۔۔۔ نے تاج کی ہوس نہ ارادہ کلاہ کا

ترک دنیا کی زیادہ مکمل تصویر ہے اور اس میں معرفت کی انتہائی منزل دکھائی گئی ہے۔ مگر جہاں تک شان خودداری کا تعلق ہے۔ میر صاحب کا شعر بہت بڑھا ہوا ہے۔ روسیاہ کے قافیے میں میر کا شعر ؂

بدنام و خوار و زار و نزار و شکستہ حال ۔۔۔ احوال کچھ نہ پوچھیے اس روسیاہ کا

معمولی اشعار میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ لیکن درد کے شعر ؂

زاہد کو ہم نے دیکھ لیا جوں نگیں بعکس ۔۔۔ روشن ہوا ہے نام تو اس روسیاہ کا

سے کہ صرف رعایت لفظی کا گورکھ دھندا ہے۔ کیا بلحاظ تاثیر اور کیا باعتبار روانی کلام بلند ہے۔ سودا نے یہ قافیہ بھی نہیں باندھا۔

گناہ کا قافیہ تینوں استادوں نے باندھا ہے۔ اس میں میر کا شعر ؂

تلوار مارنا تو انہیں کھیل ہے ولے ۔۔۔ جاتا رہے نہ جی ہی کسی بے گناہ کا

معمولی سے بھی کسی قدر پست ہے۔ سودا کا شعر ؂

جل کر تو اے پتنگ گرا ہائے شمع پہ ۔۔۔ ہوں داغ عذر دیکھ کے تیرے گناہ کا

رشک سرفروشی کے جذبے کی لاجواب تصویر ہے۔ درد کا شعر ؂

ہمت قدم نہ کرے گر تری ادھر ۔۔۔ یارب ہے کون پھر تو ہمارے گناہ کا

معرفت کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ مگر سودا کے شعر سے کسی قدر بلند ہے

سیاہ کا قافیہ درد اور سودا نے باندھا ہے۔ میر صاحب نے نہیں باندھا لیکن سودا یا درد کے شعر میں بھی کوئی خاص بات رعایت لفظی کے سوا نہیں۔ نباہ کا قافیہ نہ میر نے باندھا ہے نہ سودا نے۔ درد کی غزل میں یہ قافیہ موجود ہے۔ لیکن بالکل معمولی طریقے سے بندھا ہے۔ سال و ماہ کا قافیہ بھی تنہا درد نے باندھا ہے۔

سودا کی غزل میں گیاہ اور کاہ کے قافیے آئے ہیں جو میر یا درد کی غزلوں میں نہیں۔ لیکن یہ بھی معمولی طریقے ہی سے بندھے ہیں۔

میر صاحب کی غزل کے قافیے جو سودا اور درد کی غزلوں میں موجود نہیں، راہ، پناہ اور داد خواہ ہیں۔ ان میں سے راہ کے قافیے کا شعر ؂

صد خانماں خراب ہیں ہر ہر قدم پہ دفن ۔۔۔ کشتہ ہوں یار میں تو ترے گھر کی راہ کا

رشک کا پہلو اپنے اندر رکھتا ہے اور اس کے تیور بھی خوب ہیں۔ لیکن اس کا شمار میر صاحب کے معمولی اشعار ہی میں ہو سکتا ہے۔ داد خواہ والے قافیے کا شعر بھی ؂

ظالم زمیں سے لوٹتا دامن اٹھا کے چل ۔۔۔ ہوگا کمیں میں ہاتھ کسی داد خواہ کا

معمولی ہے۔ لیکن پناہ کے قافیے کا شعر ؂

یک قطرہ خون ہو کے پلک سے ٹپک پڑا ۔۔۔ قصہ یہ کچھ ہوا دل غفراں پناہ کا

سوز و گداز کے ایک طوفان کا حامل ہے اور میر صاحب کے نشتروں میں شمار ہونے کے قابل۔

میر

کل شبِ ہجراں تھی لب پر نالہ بیمارانہ تھا
شام سے لے صبح تک بالیں پہ سر یکجا نہ تھا

شہرۂ عالم اسے یُمنِ محبت نے کیا
ورنہ مجنوں ایک خاک افتادۂ ویرانہ تھا

منزل اس مہ کی رہا جو مدتوں اے ہم نشیں
اب وہ دل گویا کہ اک مدت کا ماتم خانہ تھا

اک نگاہِ آشنا کو بھی وفا کرتا نہیں
وا ہوئیں مژگاں کہ سبزہ سبزۂ بیگانہ تھا

روز و شب گزرے ہیں پیچ و تاب میں رہتے مجھے
اے دلِ صد چاک کس کی زلف کا تو شانہ تھا

یاد آیا ہے کہ اپنے روز و شب کی جائے باش
یا در ویرانہ یا بیاباں یا در میخانہ تھا

جس کو دیکھا ہم نے اس وحشت کدے میں دہر کے
یا سڑی یا خبطی یا مجنوں تھا یا دیوانہ تھا

بعد خوں ریزی کے مدت بے حنا رنگیں رہا
ہاتھ اس کا جو مرے لوہو میں گستاخانہ تھا

غیر کے کہنے سے مارا آ کے ہم کو بے گناہ
یہ نہ سمجھا وہ کہ واقع میں بھی کچھ تھا یا نہ تھا

صبح ہوتے وہ بنا گوش آج یاد آیا مجھے
جو گرا دامن پہ آنسو گوہرِ یک دانہ تھا

شب فروغِ بزم کا باعث ہوا تھا حسنِ دوست
شمع کا جلوہ غبارِ دیدۂ پروانہ تھا

رات اس کی چشمِ میگوں خواب میں دیکھی تھی میں
صبح سونے سے اٹھا تو سامنے پیمانہ تھا

رحم کچھ پیدا کیا شاید کہ اس بے رحم نے
گوش اس کا شب ادھر تا آخرِ افسانہ تھا

میر بھی کیا مست طافح تھا شرابِ عشق کا
لب پہ عاشق کے ہمیشہ نعرۂ مستانہ تھا

سودا

عشق کی خلقت سے آگے میں ترا دیوانہ تھا
سنگ میں آتش تھی جب تو شمع میں پروانہ تھا

جزو و کل میں فرق اتنا ہی فقط ہے اعتقاد
ورنہ جس خرمن کو دیکھا فی الحقیقت دانہ تھا

بر سرِ لطف و عنایت ہم پہ جب آیا فلک
سر پہ جو تیرِ بلا بیٹھا سو وہ پر خانہ تھا

شب کی مجلس بیچ وہ غارت گرِ سر خانہ تھا
تھے جو باہم آشنا ایک ایک سے بیگانہ تھا

جینے دینے کی نہیں یاد اس زمانے کی کہ جب
نالہ اپنا وقتِ شب اس کے لیے [illegible] تھا

کل تو مست اس کیفیت سے تھا کہ آئی دیر سے
بھر نظر جو مدرسہ دیکھا سو وہ میخانہ تھا

اٹھ چلا اہلِ آبادی سے دل آیا ہے تنگ
اے خوشا وقتے کہ تنہا ہم تھے اور ویرانہ تھا

اس چمن میں جب تلک ہم نشۂ مستی میں تھے
عمر کا اپنی پر از خونِ جگر پیمانہ تھا

اتفاقاً بزمِ رنداں میں ہوا وارد جو شیخ
پنجہ اس کا دمبدم داڑھی کا اس کی شانہ تھا

اک برہمن زادہ کل کہتا تھا یوں مل مل کے ہاتھ
ہم میں اور سودا میں یارو کس قدر یارانہ تھا

چشمِ اہلِ قبلہ میں آج ان نے کی جا سر جا
حیف ایسا شخص جو خاکِ درِ بتخانہ تھا

درد

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بتخانہ تھا
ہم سبھی مہمان تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا   خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
حیف کہتے ہیں ہوا گلزار تاراجِ خزاں   آشنا اپنا بھی واں اک سبزۂ بیگانہ تھا
ہو گیا مہماں سرائے کثرتِ موہوم آہ   وہ دلِ خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا
بھول جا خوش رہ عبث وے سابقے مت یاد کر
دردؔ یہ مذکور کیا ہے آشنا تھا یا نہ تھا

میرؔ کی غزل میں چودہ شعر ہیں لیکن ان میں سے صرف چھ شعر یعنی پہلا۔ دوسرا۔ چوتھا۔ نواں۔ گیارھواں اور تیرھواں قابلِ اعتنا ہیں۔ سوداؔ کے گیارہ شعروں میں سے بھی صرف چھ یعنی پہلا۔ چوتھا۔ پانچواں۔ ساتواں۔ آٹھواں اور نواں لائقِ توجہ ہیں۔ دردؔ کی غزل حسبِ معمول مختصر ہے اور سب کے سب اشعار نسبتاً عمدہ ہیں۔ پہلا شعر معرفت کے رنگ میں ہے۔ مگر بالکل معمولی۔ دوسرا شعر ؎

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا   خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

بالخصوص اس کا دوسرا مصرع ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور واقعیت کے اس قدر قریب ہے کہ بڑی کثرت سے روزمرہ کے استعمال میں آتا ہے۔ اس کی زبان ایسی ہے کہ آج ڈیڑھ سو سال کی طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی پرانی نہیں معلوم ہوتی۔ اس قافیے میں میرؔ کا شعر ؎

رحم کچھ پیدا کیا شاید کہ اس بے رحم نے   گوش اس کا شب ادھر تا آخر افسانہ تھا

بھی خوب ہے مگر اس میں ہمیشہ زندہ رہنے کی صلاحیت نہیں جو دردؔ کے شعر میں ہے۔ سوداؔ کا شعر ؎

جیسے دینے کی تمہیں یاد اس زمانے کی کہ جب   نالہ اپنا وقتِ شب اس کے لئے افسانہ تھا

میرؔ کے شعر سے بھی آنکھ چراتا ہے۔

بیگانہ کے قافیے میں بھی دردؔ کا شعر ؎

حیف کہتے ہیں ہوا گلزار تاراجِ خزاں   آشنا اپنا بھی واں اک سبزۂ بیگانہ تھا

شہرتِ عام کے دربار سے بقائے دوام کا تمغہ حاصل کر چکا ہے۔ میرؔ کا شعر ؎

اک نگاہِ آشنا کو بھی وفا کرتا نہیں   وا ہوئیں مژگاں کہ سبزہ سبزۂ بیگانہ تھا

دنیا کی بیگانگی اور بے ثباتی کی بولتی ہوئی تصویر ہے اور اس میں سوز و گداز اور تحیر کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ مگر اس کو کیا کہیئے کہ حسنِ قبول دردؔ ہی کے شعر کو نصیب ہوا۔ سوداؔ کا شعر ؎

شب کی مجلس بیچ وہ غارت گرِ ہر خانہ تھا   تھے جو باہم آشنا ایک ایک سے بیگانہ تھا

حسن کی رشک آفرینی اور افتراق انگیزی کا نہایت صحیح نقشہ پیش کرتا ہے لیکن دردؔ کے شعر سے لگا نہیں کھاتا۔ البتہ میرؔ کے شعر کا ہم پلہ ہے۔

دردؔ کا شعر ؎

ہو گیا مہماں سرائے کثرتِ موہوم آہ   وہ دلِ خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا

بہت خوب ہے اور اہلِ حال کو وجد میں لانے کی تاثیر اپنے اندر رکھتا ہے۔ میرؔ اور سوداؔ نے بھی اس قافیے میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن دردؔ کا مقابلہ وہ نہیں کر سکے۔ یہاں تک کہ ان کے یہ شعر فیاضانہ انتخاب کی کسوٹی پر بھی پورے نہیں اترتے۔

دردؔ کا مقطع ؎

بھول جا خوش رہ عبث وے سابقے مت یاد کر   دردؔ یہ مذکور کیا ہے آشنا تھا یا نہ تھا

میر کے کسی شعر کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا۔ تاہم ایام ناکامرانی کا ذکر اس میں جس انداز سے کیا گیا ہے۔ وہ اہلِ دل کو تڑپا دینے کے لئے کافی ہے۔ اسی قافیہ میں میر کا شعر ہے

غیر کے کہنے سے مارا آکے ہم کو بے گناہ　　　　یہ نہ سمجھا وہ کہ واقع میں بھی کچھ تھا یا نہ تھا

بھی خوب ہے اور اس کے تیور بھی گرم ہیں۔ لیکن درد کی سی متانت اس میں موجود نہیں۔ سودا کی غزل اس قافیہ کے شعر سے خالی ہے۔
میر نے دو قافیے ایسے باندھے ہیں۔ جو نہ سودا کی غزل میں ہیں نہ درد کی غزل میں۔ یہ دونوں قافیے مطلع میں آگئے ہیں ؎

کل شبِ ہجراں تھی لب پہ نالہ بیمارانہ تھا　　　　صبح سے لے شام تک بالیں پہ سر یکبارانہ تھا

یہ شعر نہیں۔ بیتابیٔ فرقت کی تڑپتی ہوئی تصویر ہے۔ عاشق مہجور کی بے بسی اور بے حالی کا ایسا دردناک اور درد انگیز اظہار میر ہی کا حصہ ہو سکتا ہے۔ پروانہ کا قافیہ میر اور سودا کی غزل میں ہے۔ درد کی غزل میں نہیں۔ میر کا شعر یہ ہے ؎

شب فروغِ بزم کا باعث ہوا تھا حسنِ دوست　　　　شمع کا جلوہ غبارِ دیدۂ پروانہ تھا

حسن دوست کی انجمن افروزی سے کیسی نازک خیال پیدا کی گئی ہے۔ رخسارِ محبوب کی درخشانی کے مقابلے میں جلوۂ شمع کو دیدۂ پروانہ کا غبار بنا دینا میر صاحب کے کمال شاعری کی روشن دلیل ہے۔ سودا کا شعر ہے

عشق کی غفلت سے آگے ہیں ترا دیوانہ ہوا　　　　ساتھ میں آتش تھی جب تو شمع میں پروانہ تھا

بجائے خود پست نہیں۔ لیکن شعر میر کے مقابلے میں بہت پست نظر آتا ہے۔ سودا کے دو صاف شعر جن کے ہم قافیہ اشعار سے میر اور درد کی غزلیں خالی ہیں حسب ذیل ہیں ؎

اختلاطِ اہلِ آبادی سے دل آیا ہے تنگ　　　　اے خوشا وہ وقت کہ تنہا ہم تھے اور ویرانہ تھا

اس چمن میں جب تلک ہم نشۂ مستی میں تھے　　　　عمر کا اپنی پیمانہ خونِ جگر پیمانہ تھا

پہلا شعر عاشق کی وحشت پسندی کا آئینہ ہے۔ پیرایۂ بیان میں ندرت بھی ہے۔ مگر شعر معمولی ہے اور دوسرا معمولی سے بھی کسی قدر پست۔
سودا کا ایک اور شعر ہے

اتفاقاً بزمِ رنداں میں ہوا وارد جو شیخ　　　　پنجہ اس کا دیدۂ داڑھی کا اس کی شانہ تھا

بہت بلند نہیں تاہم رندانہ شوخی کی ایک مثال ہے۔ رندوں کے ہاتھوں شیخ صاحب کی داڑھی سے جو سلوک ہوا۔ اس کی تصویر اس شعر کو پڑھ کر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں میر کا شعر ہے

روز و شب گذرے ہے پیچ و تاب میں رہتے تجھے　　　　اے دلِ صد چاک کس کی زلف کا تو شانہ تھا

بانکل بے۔ وقعت تو نہیں۔ لیکن بے کیف ضرور ہے۔ دیگر ؛

میر

برقع کو اٹھا چہرے سے وہ بت اگر آوے　　　　اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے
اے ناقۂ لیلیٰ دو قدم راہ غلط کر　　　　مجنوں زخود رفتہ کبھو راہ پر آوے
ٹک بعد مرے میرے طرفداروں کنے تو　　　　کوئی بھیجو ظالم کہ تسلی تو کر آوے
کیا ظرف ہے گردونِ تنک حوصلہ کا جو　　　　آشوبِ فغاں نیم سحر سے بر آوے
ممکن نہیں آرام دے بیتابی جگر کی　　　　جب تک نہ پلک پر کوئی ٹکڑا نظر آوے

مت ممتحن باغ ہو اے غیرت گلزار — گل کیا کہ جسے آگے ترے بات کر آوے
کھلنے میں ترے منہ کے کلی پھاڑے گریباں — ہلنے میں ترے ہونٹوں کے گل برگ تر آوے
کہتے ہیں ترے کوچے سے میر آنے کہے ہے — جب جانیے وہ ناکس اب اپنے گھر آوے

ہے جی میں غزل در غزل اے طبع یہ کہیے
شاید کہ نظیری کے بھی عہدے سے بر آوے

جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے — اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے
تلوار کا بھی مارا خدا رکھے ہے ظالم — یہ تو ہو کوئی گور غریباں میں در آوے
میخانہ وہ منظر ہے کہ ہر صبح جہاں شیخ — دیوار پہ خورشید کا مستی سے سر آوے
کیا جانیں وہ مرغان گرفتار چمن کو — جن تک کہ بصد ناز نسیم سحر آوے
تو صبح قدم رنجہ کرے ٹک تو ہے ورنہ — کس واسطے عاشق کی شب غم بسر آوے
ہر سو سر تسلیم رکھے صید حرم ہیں — وہ صید فگن تیغ بکف تا کدھر آوے
دیواروں سے سر مارتے پھرنے کا گیا وقت — اب تو ہی مگر آپ کبھو در سے در آوے
واعظ نہیں کیفیت میخانہ سے آگاہ — یک جرعہ بدل ورنہ یہ مندیل دھر آوے
صناع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی — ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے
اے وہ کہ تو بیٹھا ہے سر راہ پہ زنہار — کہیو جو کبھو میر بلاکش ادھر آوے

مت دشتِ محبت میں قدم رکھ کہ خضر کو
ہر گام پہ اس رہ میں سفر سے حذر آوے

سودا

صورت نہیں اس مہر کی پہچان اگر آوے — ہر ذرّے میں کچھ اور جھمکتا نظر آوے
مجھ چشم سے اب اشک نہیں آنے کا ناصح — آوے بھی غم دل سے تو لخت جگر آوے
میں منتظر اس وہم سے رہتا ہوں شب و روز — آیا جو نہ وہ شام تلک تا سحر آوے
پھرتا ہوں ترے واسطے میں دربدر اے یار — تجھ سے نہ ہوا یہ کہ کبھو میرے گھر آوے
گویا دلِ عاشق بھی ہے یہ فیل سرمست — رکتا نہیں روکے سے کسو کے جدھر آوے
کہہ کہہ کے دکھ اپنا میں کیا مغز کو خالی — اتنا نہ ہوا بس کہ تری چشم بھر آوے

کوچے میں رقیب اس کے ترے ہاتھ سے سودا
ایسا نہیں دیکھا ہے کہ بارِ دگر آوے

درد

گر باغ میں خنداں وہ مرا لب شکر آوے — گل سامنے واں سے منہ ڈھانپ کر آوے
قاصد سے کبھو پھر خبر ایدھر ہی کوئی جائے — یاں بے خبری آ لگی جب تک خبر آوے

لوٹے ہے ترے گنج شہیداں کو عزیزی — جی دینے کو ظالم کوئی کس بات پر آوے
تا ہو کو چھاؤ یوں بجز و ہیں یہ رنداں — آنا ہے تو خود داری کو گھر ہی میں دھر آوے
کہتے ہیں کہ یک دست تری تیغ چلی ہے — تب جانے کہ جب یک دو قدم چل کے ادھر آوے
جوں خواب ہے وابستہ بغفلت یہ تماشا — کھل جائے اگر آنکھ تو پھر کیا نظر آوے
اے طبع رواں تیری مدد ہووے تو شاید — اس بحر میں ہم سے بھی کوئی شعر تر آوے

مطلق بھی نہیں درد اضافت سے مبرا
عہدے سے تعقید کے کوئی کیونکر بر آوے

نظر کے قافیہ میں میر کا شعر بہت بلند ہے ۔ حسن کی تخیر آفرینی جس پیرایہ میں بیان کی گئی ہے وہ بلاشبہ قابل داد ہے اس کے مقابلے میں سودا کا شعر ہے

صورت نہیں اس مہر کی پہچان اگر آوے — ہر ذرے میں چھاؤ رتجھ کا نظر آوے

حسن کی حیرت زائی کے علاوہ تصوف کا پہلو بھی لئے ہوئے ہے ۔ لیکن میر کے شعر کی سی بے ساختگی اور اسلوب بیان اس میں نہیں ۔ درد کا شعر ہے

جوں خواب ہے وابستہ بغفلت یہ تماشا — کھل جائے اگر آنکھ تو پھر کیا نظر آئے

تصوف کے رنگ میں بہت خوب ہے انداز بیان بھی بڑا پر زور ہے ۔ لیکن میر کے شعر سے پست ہے ۔ البتہ سودا کے مقابلے میں قابل ترجیح ہے اسی قافیے میں میر کا ایک اور شعر ہے

ممکن نہیں آرام دے بیتابی جگر کی — جب تک نہ پلک پر کوئی لختا نظر آئے

بھی ہے مگر بالکل معمولی اور نظر انداز کر دینے کے قابل ۔

میر کا دوسرا مطلع ہے

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے — اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

محبوب کی سنگدلی اور عاشق کی مایوسی مگر اس کے باوجود محبوب کے لئے عاشق کا اشتیاق اور اشتیاق کی وجہ سے ہر وقت کا ابتلا یہ سب چیزیں اس شعر کو پڑھتے ہی محرومی، مجبوری اور بیچارگی کی تصویر بن کر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے ۔ اور دل میں انتہا درجہ کی رقت پیدا ہو جاتی ہے ۔ درد نے جگر کا قافیہ باندھا ہی نہیں ۔ سودا نے باندھا ہے ۔ لیکن وہ میر کی سی شعریت شعر میں پیدا نہیں کر سکے ۔ ملاحظہ ہو ہے

نے چشم سے اب اشک نہیں آنے کا ناصح — آوے بھی غم دل سے تو لخت جگر آوے

میر کے پہلے مصرع کے قافیہ میں سودا کا شعر ہے

کہہ کہہ کے دکھ اپنا میں کیا مغز کو خالی — اتنا نہ ہوا سن کے تری چشم بھر آوے

خوب ہے ۔ اور خالی کرنا کے مقابلہ میں بھر آنا سے صنعت تضاد کا لطف بھی پیدا ہو گیا ہے ۔ مگر اس میں تاثیر اتنی نہیں جتنی میر کے شعر میں ہے ۔

بر کے قافیہ میں درد کا شعر ہے

مطلق بھی نہیں درد اضافت سے مبرا — عہدے سے تعقید کے کوئی کیونکر بر آوے

اصطلاحات کا گورکھ دھندا ہے اور اس لئے اثر سے خالی ہے تاہم میر کے شعر ہے

کیا ظرف ہے گردون تنک حوصلہ کا جو — آشوب فغاں کے مرے عہدے سے بر آوے

سے اچھا ہے ۔ زبان اور اسلوب بیان کے لحاظ سے بھی میر صاحب کا شعر چھپتا ہے ۔ سودا کی غزل میں یہ قافیہ آیا ہی نہیں ۔

پر کے قافیے میں بھی درد کا شعر ہے

لوٹے ہے ترے گنج شہیداں کو طریبی   جی دینے کو ظالم کوئی کس بات پہ آوے

تیسرے شعر ہے

اے ناقۂ لیلیٰ دو قدم راہ غلط کر   مجنونِ زخود رفتہ کبھی راہ پہ آوے

سے اچھا ہے۔ مگر بقولِ داغ ہے

حقیقت میں جو تم دنیا سے اچھے   حقیقت میں مگر دنیا ہی کیا ہے

بجائے خود کچھ بھی نہیں۔ سودا کی غزل اس قافیے سے بھی خالی ہے۔ زر کا قافیہ بھی سودا سے رہ گیا ہے۔ مگر اس میں میر کا شعر ہے

کھلنے میں ترے منہ کے کلی پھاڑے گریباں   ہلنے میں ترے ہونٹوں کے گل برگ تر آوے

اور درد کا شعر ہے

اے طبع رواں تیری مدد ہووے تو شاید   اس بحر میں ہم سے بھی کوئی شعرِ تر آوے

دونوں معمولی ہیں اور ان سے اردو شاعری میں کوئی قیمتی اضافہ نہیں ہوا۔

جو لوگ تن آسانی کی زندگی بسر کرنے کے باعث ستم زدوں کی مصیبت کا احساس نہیں کر سکتے۔ ان پر میر صاحب کا شعر ہے

کیا جانیں وہ مرغانِ گرفتارِ چمن کو   جن تک کہ بصد ناز نسیم سحر آوے

خوب چسپاں ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ میر صاحب کو فارسی کے مشہور شعر ہے

تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ مے دانی   طپیدنِ دلِ مرغانِ رشتہ بر پا را

کا علم نہیں تھا۔ سودا کا شعر ہے

میں منتظر اس وہم سے رہتا ہوں شب و روز   آیا جو نہ وہ شام تلک تا سحر آوے

طبعزاد ہے۔ لیکن اس میں نہ زورِ بیان ہے نہ ندرتِ کلام۔ درد کی غزل میں اس قافیے کا کوئی شعر نہیں۔

گھر کے قافیے میں میر کا مقطع ہے

کہتے ہیں ترے کوچے سے میر آنے کہے ہے   جب جانیے وہ خانہ خراب اپنے گھر آوے

وحشت مآبی اور خانماں خرابی کا صحیح نقشہ ہے "آ نکلے ہے" کی بجائے "آنے کہے ہے" کچھ عجیب سی زبان ہے، لیکن میر کے زمانے میں جائز تھی،

سودا کا شعر ہے

پھرتا ہوں ترے واسطے میں دربدر اے یار   تجھ سے نہ ہوا یہ کہ کبھو میرے گھر آوے

عاشق کے مضطربانہ اشتیاق اور محبوب کے سنگدلانہ تغافل کی سچی تصویر ہے۔ شعر کی بندش بھی اچھی ہے۔ بہرحال اس قافیے میں میر اور سودا برابر نظر آتے ہیں۔ درد سے یہ قافیہ رہ گیا ہے۔

محبوب کے ہاتھوں جاں بحق ہونے میں عشاق کو جو لطف آتا ہے۔ میر کا شعر ہے

ہر سو سرِ تسلیم رکھے صیدِ حرم ہیں   وہ صید فگن تیغ بکف تا کدھر آوے

اس "تا کدھر" کی کیفیت کا حامل ہے، "تا" بمعنی "شاید" یا نہ معلوم اب متروک ہے۔ مگر جس ڈھنگ سے میر نے اسے باندھا ہے۔ وہ بہت پیارا معلوم ہوتا ہے۔ سودا اور درد دونوں کی غزلوں میں یہ قافیہ موجود نہیں۔

ہنر کا قافیہ بھی سودا اور درد نے نہیں باندھا میر نے اس قافیے میں زمانہ کی ناقدری کا شکوہ کیا ہے اور بڑے موثر پیرایہ میں کیا ہے ملاحظہ کیجئے ؎

صنائع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی　　ہے عیب بڑا اُس میں جسے کچھ ہنر آئے

سودا اور درد نے یہ قافیہ بھی نہیں باندھا۔

ایک اور قافیہ جو سودا اور درد نے نہیں باندھا۔ حذر کا ہے۔ اس میں میر کا شعر ؎

مت دشت محبت میں قدم رکھ کر خضر کو　　ہر گام پہ اس رہ میں سفر سے حذر آوے

معمولی ہے۔ اور کسی نمایاں خوبی کا حامل نہیں۔

بہر حال میر صاحب کے یہ شعر تو شعر ہیں باقی سب ان کا تبرک ہیں۔ اس لئے ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ جو قافئے میر اور درد نے نہیں باندھے۔ ان میں سے ایک میں سودا کا شعر ؎

گویا دل عاشق بھی ہے یہ فیل مسیت　　رکتا نہیں روکے سے کسو کے جدھر آئے

خیال خود بہت اچھا ہے اور زور بیان جو سودا کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ مگر یہ قصیدے کا شعر ہے، غزل میں جگہ پانے کے قابل نہیں۔ اسی طرح ؎

کوچے میں رقیب اس کے ترے ہاتھ سے سودا　　ایسا نہیں دیکھا ہے کہ بار دگر آئے

گو قصیدے کا شعر نہیں، مگر اس کے پڑھنے یا سننے سے پٹے بازی کا جو وحشیانہ منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے غزل بھی اس کو برداشت نہیں کر سکتی۔ البتہ یہ سودا کی عام افتاد طبع کا آئینہ دار ضرور ہے۔

درد کے اشعار جن کے ہم قافیہ شعر سودا اور میر کی غزلوں میں موجود نہیں، ان میں سے درد کا مطلع ؎

گر باغ میں خنداں وہ مرا لب شکر آوے　　گل سامنے داماں سے منہ ڈھانپ کر آوے

بالکل معمولی ہے دوسرا شعر ؎

قاصد سے کہو پھر خبر ادھر ہی کو لے جائے　　یاں بے خبری آگئی جب تک خبر آوے

تصوف کے رنگ میں ہے۔ مگر انداز بیان میں کوئی خاص جدت نہیں۔ اسی طرح ؎

زاہد کو جتا یہ کہیو بخود ہیں یہ رنداں　　آنا ہے تو خود وا ہی کو بس گھر پہ دھر آئے

رندانہ شوخی تو اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن اثر اور ندرت سے خالی ہے۔

اس موازنے سے ناظرین کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اگر تینوں باکمال معاصرین کے کلام کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا جائے۔ تو مجموعی حیثیت سے پہلا درجہ میر کا ہے۔ دوسرا سودا اور تیسرا درد کا۔ میر اور سودا کو درد پر اس لئے بھی فضیلت ہے کہ درد کا کلام عشق حقیقی پر مبنی ہے اور میر اور سودا کا عشق مجازی پر ــــ ظاہر ہے کہ کلام کا بلند اور ابتذال سے پاک ہونا جتنا آسان عشق حقیقی میں ہے اتنا عشق مجازی میں نہیں۔ اس لئے اگر میر اور سودا کا کلام درد سے بلند ہے تو یہ ان کے باکمال تر ہونے کی مزید دلیل ہے ؎

عربوں کا نقد شعری

نقد کے معنی ہیں پرکھنا اور کھرا کھوٹا الگ کرنا۔ روپے پیسے ہیں کھرا کھوٹا جانچنے کو نقد درہم اور اشعار میں اچھے بُرے کی تمیز کو نقد شعر کہتے ہیں۔ لیکن فنِ نقد کی حیثیت دوسرے علوم وفنون کے مقابلے میں ایک محافظ اور نگہبان کی ہے کیونکہ اسی کی بدولت دوسرے فنون خرافات ... مطلب یا عیب سے محفوظ رہتے ہیں اور اسی کا خوف اہلِ کمال کو صرف اچھی چیز پیش کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اسی طرح ناقد بھی اہلِ علم کو گمراہی سے بچانے والا اور سیدھے راستے پر چلنے کے لئے مجبور کرنے والا محافظ اور رہنما سمجھا جاتا ہے۔ مگر ہر فن کے ناقد کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس فن میں پوری مہارت رکھتا ہو۔ اور اس کے رموز و نکات سے خود مصنف سے کہیں زیادہ واقف ہو۔ اس کے ساتھ ہی نقد کے مختلف اسلوب میں بھی کامل دستگاہ رکھتا ہو اور ہر موقعہ کے مناسب ایسے طرز پر تبصرہ کر سکتا ہو کہ مصنف پر اس کا اثر پڑے اور وہ اپنی کمزوری ترک کرنے پر مجبور ہو جائے۔

زمانۂ اسلام سے پہلے عرب میں شاعروں کی کمی نہ تھی مگر ناقد مفقود تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاہلیت کی شاعری سے اخلاق عنقا ہو گیا، سخاوت اور شجاعت کی خوبیاں اگر کچھ باقی بھی رہ گئی تھیں تو ان پر بد اخلاقی اور فحش نگاری کے پردے پڑ چکے تھے۔ کوئی نہیں تھا کہ ان کی بدکلامی پر ... اور شاعروں کی بے جا خرچ ہونے والی قوتِ فکر کو قوم کی فلاح و بہبود کی طرف مائل کر سکے۔ ظہورِ اسلام کے بعد جب ... شاعروں کی سب سے ... خداوند تعالیٰ کی طرف سے کی گئی اور اس آیت کے نزول کے ساتھ نقد کی بنیاد پڑی۔ والشعراء یتبعہم الغاوون۔ الم تر انہم فی کل واد یہیمون۔ "شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ (اچھے بُرے کی تمیز کئے بغیر) ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔"

اس آیت کریمہ کے نازل ہونے کے بعد ہی ہر کام نقدِ شعر کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور برے اشعار کی مذمت اور اچھے اشعار کی مناسب تعریف سے شعر و شاعری سے بد اخلاقی کے عناصر کو تقریباً فنا کر دیا۔ اسلامی علوم و فنون کے ساتھ شاعری بھی ترقی کرنے لگی اور پہلی صدی ہجری کی ... اس کی ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ شعر کے محاسن اور عیوب کو ... کی صورت میں جمع کر دیا جائے ... شاعر بھی ... اور ناقدوں کے لئے بھی ... ہو جائے۔ اس خیال کے ماتحت علماء نے ... بہت سی کتابیں لکھیں جن کے رواج پانے کے بعد نقد کے علاوہ شعر گوئی میں ان سے مدد لی جانے لگی۔ اور اب تو ساری شعر و شاعری کا دار و مدار انہی کے مقرر کردہ اصولوں اور قواعد پر ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ فن ظہورِ اسلام سے پہلے بھی موجود تھا۔ اس کے ثبوت میں بعض روایتیں بھی بیان کی جاتی ہیں جو چند اں قابلِ اعتبار نہیں ... مثلاً اس فن کی کتابوں میں درج ہے ... نقد و تبصرہ کا ایک واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ نابغہ ذبیانی (ایک جاہلی شاعر) نے حسان رضی اللہ عنہ سے ان کا یہ شعر سنا

لنا الجفنات الغر یلمعن فی الضحیٰ ... واسیافنا یقطرن من نجدة دما

(ہماری شرافت کی نشانی) ہمارے ... بڑی بڑی چمکدار پلیٹیں ہیں جو آفتاب کی روشنی میں چمکا کرتی ہیں اور (ہماری شجاعت کی علامت) ہماری تلواریں ہیں جن سے خون ٹپکتا رہتا ہے۔

تو کہا کہ اگر تم الغُرّ (روشن) کی بجائے البیض (سفید) اور الضحیٰ (چاشت) کی بجائے الدجیٰ (تاریک رات) کہتے تو زیادہ بہتر ہوتا کیونکہ دن کو تو ہر چیز چمکتی ہے تمہاری پلیٹیں چمکیں تو کون سا بڑا کمال ہوا۔ اسی طرح یقطرن کی جگہ یجرین کہنا چاہئے تھا۔ تلوار سے قطرہ قطرہ خون ٹپکنا کون سی بڑی بات ہے۔ شجاعت تو جب معلوم ہو کہ اُس سے خون کی دھاریں نکلے

قدامہ بن جعفر اپنی کتاب "نقد الشعر" میں نابغہ کی تردید میں لکھتے ہیں کہ الضحیٰ کی جگہ الدجیٰ کو بہتر بتانا اور یہ کہنا کہ دن کو ہر چیز چمکتی ہے واقعے اور

مشابہت کے سراسر خلاف ہے۔ دن کو تو صرف وہی چیز چمکتی ہے جو بیحد صاف اور اتنی چمکدار ہو کہ آفتاب کی روشنی اور چمک میں نمایاں ہو سکے۔ رات کو البتہ معمولی چمک والی چیزیں جگمگانے لگتی ہیں۔ چاند ستارے چراغ، آگ اور درندوں کی آنکھیں وغیرہ آفتاب کی روشنی میں اپنی معمولی چمک کی وجہ سے خیرہ ہو جاتی ہیں۔ مگر سورج ڈوبتے ہی روشن نظر آنے لگتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ روشن آفتاب کے مقابلے میں چمکنا کیا کمال ہے۔ جا سکتا ہے۔ نہ کہ رات کی تاریکی میں۔ تمام اسی طرح نابغہ کا یہ کہنا کہ یُقطرن کی بجائے یجرین بہتر ہوتا محاورے کے خلاف ہے۔ کسی کی شجاعت اور بہادری بیان کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں کہ سَیفُہٗ یَقطُرُ دَمًا۔ (اس کی تلوار سے خون ٹپکتا رہتا ہے) اگر حسانؓ یقطرن کی بجائے یجرین فرماتے تو یہ شعر محاورے سے خارج ہو جاتا۔

قدامہ نے نابغہ کے نقد پر جتنا اچھا نقد کیا ہے اس میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا مگر یہاں تو روایت ہی سرے سے من گھڑت معلوم ہوتی ہے۔ ایسے لفظی جھگڑے اُس زمانے کی پیداوار ہیں جب اگلوں کی فصاحت و بلاغت کا دور ختم ہو چکا تھا۔ اور معانی تو الگ رہے پچھلے الفاظ تک میں غلطیاں کرنے لگے تھے، اسی شعر کے متعلق بعض دوسرے راویوں کی روایت سے ہمارے خیال کی اور بھی تائید ہوتی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ نابغہ نے یہ شعر سن کر حضرت حسانؓ سے یہ بھی کہا تم نے الجفنات اور اسیاف کہہ کر اپنی پلکوں اور اپنی تلواروں کی تعداد گھٹائی ہے۔ گویا نابغہ کو سو سال بعد پیدا ہونے والے نحویوں کا اختلاف معلوم تھا۔ اور سیبویہ (ایک مشہور نحوی کا نام) کے مذہب کو ترجیح دے کر اس نے فیصلہ کر دیا تھا کہ جمع[1] مونث سالم جمع کثرۃ نہیں جمع قلت ہے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کو ابن مالک کی الفیہ کا یہ شعر بھی یاد تھا ؎

اَفعِلَۃٌ اَفْعُلٌ ثُمَّ فِعْلَۃٌ ثُمَّتَ اَفْعَالٌ جُمُوعُ قِلَّۃٍ

(یہ سارے وزن جمع قلت کے لئے خاص ہیں)

واقعہ یہ ہے کہ نابغہ کے مرکھپ جانے کے سینکڑوں سال بعد نحویوں میں اختلاف پیدا ہوا اور بعضوں نے حضرت حسانؓ کے شعر کے لفظ جفنات سے جمع مونث سالم کو جمع کثرت ثابت کرنا چاہا تو بعض ان کے مخالف نابغہ کے تنقیدی حکایت گھڑ کر جمع مونث سالم کو اسی شعر اور اسی لفظ سے جمع قلت ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ کیا نابغہ جیسا بڑا شاعر ان وزنوں سے اس قدر آشنا تھا؟ یا کیا حضرت حسانؓ کو اس کی خبر نہیں تھی؟ یہ سب کچھ نہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ حکایت بھی نحویوں اور لغویوں کے سینکڑوں جھوٹوں میں سے ایک معمولی سا جھوٹ ہے۔ ورنہ کہاں نابغہ کا زمانہ اور کہاں ایسی لفظی گرفتیں! شروع سے عہد عباسی کی ابتدا تک عربوں کی فصاحت و بلاغت اپنے اصلی رنگ میں قائم تھی اور اس سے پہلے ایسے لفظی نقد کی ضرورت ہی نہیں پڑ سکتی تھی۔ یہ تو جب اسلام کا دائرہ وسیع ہونے لگا اور عجمیوں کے میل ملاپ سے عربوں کی فطری سادگی اور بدوی فصاحت و بلاغت میں فرق آنے لگا تو لفظوں اور وزنوں کی گرفت کرنے والے ناقد بھی پیدا ہو گئے۔ دورِ جاہلیت میں تو نقد و تبصرہ کا نام و نشان بھی نہ تھا ابتدائے اسلام میں اس کی طرف توجہ بھی کی گئی تو صرف معنوی حیثیت سے۔ اور اس وقت ضرورت بھی صرف اسی کی تھی۔

اسی قسم کی ایک اور جھوٹی روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قول اِنَّکُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ حَصَبُ جَہَنَّمَ (تم اور جن چیزوں کو تم پوجتے ہو وہ دوزخ کا ایندھن ہیں) نازل ہوا اور مشرکین نے سنا تو ایک نے دربارِ نبوت میں حاضر ہو کر بطور اعتراض دریافت کیا، کہ حضرت عیسیٰؑ کو عیسائیوں کے بعض فرقے پوجتے ہیں۔ تو کیا وہ بھی دوزخ کا ایندھن ہیں؟ حضورؐ نے جواب دیا کہ "تم اپنی قوم کی زبان سے کس قدر ناواقف ہو کیا تمہیں معلوم

---

[1] جمع مونث سالم اس جمع کو کہتے ہیں جو مفرد پر الف اور ت بڑھا کر بنائی جائے اور جمع کثرۃ وہ جمع ہے جس میں ایک ہی قسم کی دس یا اس سے زیادہ چیزیں شامل ہو سکیں۔ جمع قلت اسے کہتے ہیں جو دس سے کم پر بولی جائے۔ جمع مونث سالم کے متعلق بعض نحویوں کا خیال ہے کہ جمع قلت ہے اور بعض اسے جمع کثرۃ سمجھتے ہیں۔

[2] حضرت حسانؓ کے شعر کا لفظ اسیاف اسی وزن پر ہے اور یہ وزن ابن مالک کے نزدیک الفیہ کے اس شعر کے دوسرے وزنوں کی طرح جمع قلت کے لئے ہے مگر ان کے نزدیک جمع مونث سالم قلت کے لئے نہیں ہے اور سیبویہ کے لئے نزدیک اسیاف (افعال) کا وزن جمع قلت کے لئے نہیں آتا۔ مگر نابغہ نے گویا آدھی سیبویہ کی پیروی کی۔ اور آدھی ابن مالک کی۔ اور حضرت حسانؓ کے شعر پر اعتراض جڑ دیا۔ چہ خوش!

نہیں کہ "مَا" غیر ذوی العقول (عقل والوں کے سوا) کے لئے آتا ہے۔

اس روایت کو گھڑنے والا بھی کتنا احمق اور کیسا جاہل تھا۔ کاش وہ اس افترا سے پہلے خدا تعالیٰ کے قول سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الاَرضِ (خدا کی پاکی بیان کی ان تمام چیزوں نے جو آسمان میں ہیں اور ان تمام چیزوں نے جو زمین میں ہیں) پر غور کر لیتا۔ اس میں تو "ما" غیر ذوی العقول کے ضمن میں ذوی العقول (عقل والوں) کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ کیا معترض کو جو عرب کے فصحا میں سے تھا، اپنی زبان کے ایسے مشہور اور بار بار آنے والے لفظ کا محلِ استعمال معلوم نہ تھا۔ یا کیا رسول اکرم صلعم جو تمام فصیحوں کے فصیح تھے، نعوذ باللہ منشاءِ وحی سے ناآشنا تھے۔ کاش انہیں معلوم ہوتا کہ صحیح روایتوں کی بنا پر تو اس اعتراض کا جواب خود وحی سے یہ نازل ہوا تھا۔ اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰی اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ جن لوگوں کے حق میں ہماری طرف سے پہلے ہی بلند درجے (یا بھلائیاں) مقرر ہو چکے ہیں وہ یقینی طور پر دوزخ سے دور رکھے جائیں گے۔

تحویوں، لغویوں اور خود غرض راویوں کی اس قسم کی بیسیوں من گھڑت روایتیں مشہور رہیں۔ مگر ان میں سے اکثر اتنی سطحی ہیں اور جھوٹ ایسے بھونڈے پن سے بولا گیا ہے کہ ناقد اُس زمانے کی ادبی اور لغوی ترقی کے مدارج اور اس وقت کے افکار و خیالات سے معمولی سی واقفیت بھی رکھتا ہو تو بڑی آسانی سے سچ اور جھوٹ میں تمیز کر سکتا ہے۔ ہماری نظر سے تو ظہورِ اسلام سے قبل کی نقدِ شعری کے متعلق یا اس کے ضمن میں جتنی روایتیں گزری ہیں سب تقریباً اسی طرح لغو اور نحویوں یا لغویوں کی خانہ ساز معلوم ہوتی ہیں۔ اور ان کے ناقدانہ مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں، کہ ایامِ جاہلیت میں عرب میں فنِ نقد کا سرے سے وجود ہی نہ تھا۔ مسلمانوں کے ہاتھوں اس کی بنیاد پڑی اور انہی کے ہاتھوں یہ پروان چڑھا۔ مگر اسلام کے ابتدائی ایام میں جبکہ قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت نے ہر شاعر و غیر شاعر کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا تھا۔ انسانی کلام کی طرف چنداں توجہ نہیں کی گئی بلکہ جب مسلمان کلامِ الٰہی پہ اچھی طرح حاوی ہو گئے اور مخالفینِ اسلام کی مدافعت اور غزوات سے بھی ایک حد تک فرصت مل گئی تو کلامِ الٰہی کی روشنی میں عربی شاعروں کے دیوانوں کی چھان بین اور ان پر نقد و تبصرہ کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور سو سال کے اندر اندر عہدِ عباسی کے ابتدائی دور میں یہ فن اپنی ترقی کے آخری زینے تک پہنچ گیا۔ اس کے بعد جیسے جیسے عربوں میں عجمی تمدن و تہذیب کا دخل ہوتا گیا۔ ان کی زبان بھی عجمیت سے متاثر ہونے لگی۔ صرف یہی نہیں کہ عربی کے عجمی شاعروں کی زبان خراب تھی بلکہ ان کے اثر سے خاص عربوں میں بھی پہلی سی وہ فصاحت و بلاغت اور ان کی امتیازی سادگی باقی نہ رہی۔ اور اس طرح لفظی اور بلاغتی غلطیوں کی وجہ سے زیادہ تر لفظی حیثیت ہی سے نقد و تبصرہ ہونے لگا۔ اور صحابہ کرام رضی یا تابعین نے اس فن کے ذریعے سے شعر و شاعری میں اخلاقیات داخل کرنا اور اشعار سے اصلاحِ قوم کا جو کام لینا شروع کیا تھا اس کا سلسلہ تقریباً بند ہو گیا۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی حقیقی معنوں میں عربوں کے سیدھے سادے معنوی نقد کا دور ختم ہو گیا۔

آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ شعر سے ایک طرف سلطنتیں پلٹ جاتی ہیں تو دوسری طرف اس سے ذہنیتیں بدل جاتی ہیں۔ اور بسا اوقات تو اس کا نشہ اتنا زبردست ہوتا ہے کہ بادۂ کہن سے بھی اتنی کیفیت نہیں حاصل ہو سکتی۔ شعر کے اس جادو بھرے اثر سے عرب مدتوں سے واقف تھے۔ صحبتِ نبوی صلعم کی تربیت کے بعد انہوں نے اس کو گمراہی اور کذب و افترا کی نشر و اشاعت کا ذریعہ اور بغض و عداوت کا باعث رہنے دینے کے بجائے لوگوں کے دلوں میں حسنِ اخلاق اور حق و صداقت کا بیج بونے کا ذریعہ بنا لیا اور اس طرح جو قوت "دارۂ جلجل" جیسی شرمناک صحبتوں کے شرمناک واقعات کے ذکر کرنے میں صرف ہوتی تھی وہ حکمت اور فلسفۂ الٰہی اور درسِ اخلاق کے نظم کرنے میں خرچ ہونے لگی۔ سوقِ عکاظ اور دوسرے میلوں کے مشاعرے، سوقیانہ شاعری کے بلند بانگ مقابلے، عریاں نگاری اور بے حیائی کے مظاہرے سے بند ہو گئے۔ شاعروں اور ان کے راویوں سے جو ترانے پہلے مختلف قبیلوں میں آتشِ فساد مشتعل کر دیا کرتے تھے، ان کا جو تغزل پہلے کنواروں اور کنواریوں کے جذباتِ شہوانی میں ہیجان برپا کر دیتا تھا۔ وہی اب ان کو اخلاق و مروت کا درس دینے لگا۔ اسی سے اب ان کے کینہ بھرے سینوں میں خلوص و محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ پہلے شاعروں کو اپنی زبردستی کی محبوبہ کو آفتاب کی روشنی میں اس کی سہیلیوں کے سامنے ننگا کر کے اس کے حسنِ مجوب کی ایک ایک کیفیت ٹیلے پر کھڑے ہو کر بھرے میلے کے سامنے بیان کرنے پر جو داد ملا کرتی تھی اب وہ کلمۂ حق اور فلسفۂ الٰہی کی تفسیر پہ ملنے لگی۔ جب داد دینے والے اور نقد و تبصرہ کرنے والے ہی بدل جائیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ شاعر نہ بدل جائیں گے۔

ان کی تکمیل تو دراصل ناقدوں اور داد دینے والوں ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اگر اُن کا ذوق نکھرا ہوا ہو تو غیر ممکن ہے کہ اُن کے عہد میں کوئی بدمذاق یا مخرب شاعر پنپ سکے۔
حضرت عمرؓ نے ایک بار بنی غطفان کے وفد سے گفتگو فرماتے ہوئے پوچھا کہ یہ شعر کس نے کہا ہے:۔

حَلَفْتُ فَلَمْ أَتْرُكْ لِنَفْسِكَ رِيبَةً	وَلَيْسَ وَرَاءَ اللهِ لِلْمَرْءِ مَذْهَبُ

"میں نے تو خدا کی قسم کھالی اور تمہارے لئے شک کی گنجائش چھوڑی ہی نہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ آدمی کے لئے اللہ کے سوا اور کسی طرف جانے کا راستہ ہی نہیں ہے"
ارکانِ وفد نے جواب دیا کہ یہ شعر نابغہ ذبیانی کا ہے۔ پھر آپ نے دریافت کیا کہ اور یہ کس نے کہا ہے:۔

أَتَيْتُكَ عَارِياً خَلَقاً ثِيَابِي	عَلَى وَجَلٍ تَظُنُّ بِيَ الظُّنُونُ
فَأَلْفَيْتُ الْأَمَانَةَ لَمْ تَخُنْهَا	كَذَلِكَ كَانَ نُوحٌ لَا يَخُونُ

"میں پھٹے پرانے کپڑوں میں بے سروسامانی کی حالت میں ڈرتا ڈرتا تمہارے پاس پہنچا۔ (میری بدحالی کی وجہ سے) میرے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں کی جا رہی تھیں۔ (اور تم میری امانت کو دبا لیتے تو نہ میں خود وصول کر سکتا تھا اور نہ دوسرے اس میں میری امداد کر سکتے تھے۔ مگر) میں نے اپنی امانت جوں کی توں پائی اور تم نے اس میں ذرا بھی خیانت نہیں کی۔ حضرت نوحؑ بھی اسی طرح کسی کی امانت میں خیانت نہیں کیا کرتے تھے۔
انہوں نے جواب دیا کہ یہ اشعار بھی نابغہ ہی کے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ تمہارے شاعروں میں سب سے بڑا شاعر ہے (هُوَ أَشْعَرُ شُعَرَائِكُمْ)
کسی شاعر کو دوسرے شاعروں کے مقابلے میں فضیلت دینا بھی دراصل نقدِ شعر ہی میں داخل ہے کیونکہ اس کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ اس کے اشعار دوسروں کے اشعار سے اچھے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے اسی نقد سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ابتدائے اسلام میں نقدِ شعری کا معیار کیا تھا اور کس قسم کے اشعار پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اور اصحابِ نظر ایسے اشعار کی کتنی داد دیتے تھے جن میں کسبِ فضائل اور ترکِ رذائل کے لئے برانگیختہ کیا گیا ہو۔
اس قسم کی اخلاقی شاعری سے مسلمانوں کی دلچسپی اس لئے اور بھی بڑھ گئی تھی کہ بعض اوقات شاعروں کی بروقت فکر قوم اور رہنمایانِ قوم کو بڑی بڑی غلطیوں اور نقصانوں سے بچا لیتی تھی۔ حضرت عمرؓ طبیعت، فقاہت اور سیاست میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے مگر بسا اوقات وہ بھی شاعروں کی یاد دہانی اور شعر کے اثر سے متاثر ہو جایا کرتے تھے۔ مالک بن انسؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں عمّالِ حکومت کے پاس بے انتہا دولت جمع ہو گئی تھی۔ رعایا کو یہ بات بُری معلوم ہوئی اور ایک شاعر نے دربارِ خلافت میں یہ اشعار لکھ بھیجے:۔

نَحُجُّ إِذَا حَجُّوا وَنَغْزُو إِذَا غَزَوْا	فَأَنَّى لَهُمْ وَفْرٌ وَلَسْنَا بِذِي وَفْرِ
إِذَا التَّاجِرُ الْهِنْدِيُّ جَاءَ بِفَأْرَةٍ	مِنَ الْمِسْكِ رَاحَتْ فِي مَفَارِقِهِمْ تَجْرِي
فَدُونَكَ مَالَ اللهِ حَيْثُ وَجَدْتَهُ	سَيَرْضَوْنَ إِنْ شَاطَرْتَهُمْ مِنْكَ بِالشَّطْرِ

"وہ (عمّالِ حکومت) حج کرتے ہیں تو ہم بھی حج کو جاتے ہیں۔ وہ جنگ میں شریک ہوتے ہیں تو ہم بھی شریک ہوتے ہیں (احکامِ اسلام پر عمل کرنے میں ہم اور وہ برابر ہیں) مگر ان کے پاس مال و دولت بہت زیادہ ہو گئی ہے اور ہم غریب کے غریب ہی ہیں۔ ہندوستانی تاجر مشک نافہ لے کر پہنچ جاتا ہے تو ان کی مانگیں مشک ہی مشک سے بسی رہتی ہیں۔ اللہ کا مال آپ کو جہاں بھی ملے اس پر قبضہ کر لیں اگر آپ اپنے عاملوں کی دولت تقسیم کر کے نصف خود (بیت المال کیلئے) لے لیں تو رعایا کی خوشی کا باعث ہوگا:
حضرت عمرؓ نے یہ اشعار سن کر زبانی داد تو نہیں دی مگر اس پر عملی نقد یوں کیا کہ شاعر کی آرزو کے مطابق تمام وابستگانِ خلافت کی نصف دولت بیت المال میں منتقل کر لی۔
حضرت علیؓ ذیل کے شعر کو بے حد پسند فرمایا کرتے تھے اور میدانِ کارزار میں جاتے وقت اکثر پڑھا کرتے تھے:۔

أَيَّ يَوْمَيَّ مِنَ الْمَوْتِ أَفِرّْ	يَوْمَ لَا يُقْدَرُ أَمْ يَوْمَ قُدِرْ
يَوْمَ لَا يُقْدَرُ لَا أَرْهَبُهُ	وَمِنَ الْمَقْدُورِ لَا يُنْجِي الْحَذَرْ

"موت سے بچنے کے لئے کس دن سے بھاگ سکتا ہوں جس روز اجل مقرر نہیں اس دن سے یا جس روز مقرر ہے اس سے؟
تقدیر میں جس دن مرنا نہیں ہے اس دن کا مجھے خوف ہی نہیں اور جس دن مقدر ہے اس روز میرا خوف اور میرا کترانا موت سے مجھے بچا ہی نہیں سکتا۔"

سوانحی خاکے

سرسیّد احمد خاں

۱۸۵۷ء کا سال ہندوستان اور ہندوستانیوں کے لئے بہت نامبارک سال تھا کہ غلط افواہوں کی بنیاد پر ایک مقامی شورش بڑھتے بڑھتے ایک تاریخی ہنگامے میں تبدیل ہو گئی برطانوی عہد کی لکھی ہوئی ہندوستانی تاریخیں اس شورش کو "غدر ۱۸۵۷ء" کے نام سے یاد کرتی ہیں۔ لیکن یہ "غدر" تھا یا "انقلاب" جو نام بھی اس کا رکھیئے۔ اپنے نتیجے کے لحاظ سے تمام ملک اور خاص طور پر ہندی مسلمانوں کے لئے بڑا ہولناک ثابت ہوا مدتوں تک بلکہ بعض خاندان جزوی طور پر آج تک بھی اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔

سرسید کی کوششیں اُس وقت بروئے کار نہ آتیں تو ہندوستان کے عوام اور خصوصاً ہندی مسلمان اپنی قومی زندگی کے قدرتی حقوق سے سالہا سال کے لئے محروم کر دیئے جاتے۔

سرسید جو دہلی کے ایک معزز خاندان کے رکن تھے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ شہنشاہ اکبر کے عہدِ حکومت میں ہرات سے نقل وطن کر کے ہندوستان آئے تھے۔ عہد بہ عہد کے مغلیہ درباروں میں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوتی رہی۔ سرسید کے دادا سید محمد ہادی فارسی کے نامور شاعر تھے۔ ان کے والد محمد تقی تیراندازی کے فن میں یکتائے زمانہ تھے۔ اور مغل شہزادوں کو تیر اندازی کے فن کی تعلیم دینے پر مقرر تھے۔

۱۸۳۶ء میں سید محمد تقی نے سید الاخبار کے نام سے اردو کا ایک اخبار دہلی سے جاری کیا۔ اسی زمانے میں شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کے والد مرزا محمد باقر "دہلی اخبار" نامی شائع کرتے تھے۔ شمالی ہند میں اُردو زبان کا پہلا اخبار سید الاخبار تھا۔

سید احمد (سرسید) نے ۱۸ برس کی عمر میں عربی و فارسی کی مروجہ تعلیم ختم کر لی تھی، وہ اپنے ہمعصروں کے مقابلے میں غیر معمولی طور پر ذہین و فطین سمجھے جاتے تھے والد کی موت کے سبب کم عمری ہی میں سرکاری ملازمت پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ ان کی پہلی ملازمت ۱۸۳۹ء میں نائب منشی کی حیثیت میں آگرہ میں شروع ہوئی اپنی غیر معمولی محنت و ذہانت کی وجہ سے دو ہی سال میں منصف کے عہدے پر ترقی پائی۔ ۱۸۴۲ء میں فتح پور سیکری میں تبدیل ہوئے۔ اور اسی سال بہادر شاہ شاہ دہلی کے دربار سے انہیں "جوادالدولہ عارف" کا خطاب ملا۔ ۱۸۵۷ء میں روہیلکھنڈ کے ضلع بجنور میں سینئر سب جج کے طور پر کام کر رہے تھے کہ غدر ہو گیا۔

یہیں سے ان کی زندگی کے کارناموں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہاں ایک ضروری بات جو بحث کا اصل محور ہے۔ سمجھ لینی چاہیئے اسے سمجھ لینے کے بعد مضمون پڑھنے والے صحیح رائے قائم کر سکیں گے۔

بات یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کی آزاد سیاسی فضا میں سانس لینے والے آج سے ۸۸ سال پہلے کی ہندوستانی سیاست کو جب تک ۸۸ سال پیشتر کے سیاسی معیار سے نہ پرکھیں گے۔ سرسید کے متعلق صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے۔ خیال کیجئے کہ کانگریس ہنگامۂ غدر سے ۲۵ سال بعد قائم ہوئی ہے اُس کے پہلے چند سال کے سالانہ صدارتی ایڈریس پڑھنے سے۔ اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ اس وقت انگریز حکام سے اظہار وفاداری ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ اس سچائی کی روشنی میں دیکھیئے۔ کہ کانگریس سے بھی چوتھائی صدی پہلے حکام اور حکومت کو خوش رکھنے کی کیا کچھ تدبیریں نہ کی جاتی ہوں گی۔ سرسید سمجھ چکے تھے کہ بدنصیبی سے ہندوستان غلام بن چکا ہے۔ اب بدیسی حکومت سے تعاون کئے بغیر چارہ کار نہیں۔ بنگال اور بہت سے دوسرے علاقے انگریزی اور جدید مغربی علوم پڑھ

چھوڑ کر سالہا سال پہلے سے حکومت کے ساتھ تعاون کرکے زندگی کی جدوجہد میں باقی ہندوستان سے آگے بڑھ چکے ہیں۔ اب اگر ہندوستان کے علمائے اسلام کے فتووں کے خوف سے ہندوستانی مسلمان نئی زبانیں اور نئے علوم سے بچتے ہی رہے تو اسلامی ہندوستان بہت پیچھے رہ جائے گا۔

یہ تھی سرسید کی پالیسی اور اس پر وہ دیانت داری سے گامزن رہے۔ آج ہر انصاف پسند آدمی یہ اقرار کرتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں عام تعلیمی، مجلسی اور سیاسی بیداری سرسید ہی کی لگاتار کوششوں کا نتیجہ ہے۔

ہنگامۂ غدر میں سرسید نے امن قائم کرنے کے لئے ہاں نثاری کے انداز میں کوشش کی۔ کئی انگریزوں کی جانیں بچائیں بہت سے شورش پسندوں کو بدامنی پھیلانے سے روکا۔

یہ تاریخی شورش دب جانے کے بعد بھی عام طور پر دیر تک جاری رہی۔ اور ہندوستان سے لے کر انگلستان تک غدر کا سارا الزام ہندوستانی مسلمانوں پر تھوپ دیا گیا۔ سرسید نے اس سلسلے میں ایک کتاب "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر اس کی سینکڑوں کا پیاں انگلستان کی پارلیمنٹ کے ممبروں میں تقسیم کرائیں۔ اس کتاب میں ہندوستانی بغاوت کے مسئلے پر پوری روشنی ڈالی گئی تھی۔ اور بتایا گیا تھا کہ ہندوستان میں حکومت کے ناعاقبت اندیش حکام کی غلط پالیسی کے سبب اس شورش نے سر ابھارا تھا۔

"اسباب بغاوت ہند" کے مطالعے کا یہ اثر ہوا کہ ہندوستان کے تمام لیڈروں نے متفقہ طور پر بغاوت کا ذمہ دار ہندوستان کے برطانوی حکام کے طریق کار کو ٹھیرایا۔

سرسید کی یہ گراں مایہ خدمت ایسی نہیں کہ ہمارے اہل ملک خصوصاً ہندوستانی مسلمان اسے دل سے بھلا دیں۔

ہنگامۂ غدر کے بعد سے اپنی زندگی کے خاتمے تک مرحوم کا سارا وقت ملک و ملت کی بے غرض خدمت میں بسر ہوا۔

ان کی سیاسی، اصلاحی، صحافتی، ادبی، علمی، تصنیفی، مجلسی اور ملکی خدمات کی تفصیل شمس العلماء مولانا حالی نے بڑے سائز کے ایک ہزار صفحات میں پھیلائی ہیں۔ "حیات جاوید" اسی تفصیل کا کتابی نام ہے۔

آج اردو زبان جو ملک کی دو سو پچاس زبانوں میں سب سے زیادہ سرمایہ دار کہلاتی ہے، سرسید اور ان کے جانشینوں ہی کی لگاتار کوششوں نے اسے اس بلند رتبے تک پہنچایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سرسید کی دوربین نگاہ پچاس سال آئندہ کے حالات و انقلابات کو دیکھتی تھی۔ انہوں نے "سائنٹیفک سوسائٹی" کے نام سے جو ایک تصنیفی ادارہ آج سے ۷۰ سال پہلے قائم کیا تھا وہ آج تک اردو مصنفین کے لئے نشانِ راہ کا کام دے رہا ہے۔ ۱۸۷۰ء میں انہوں نے "تہذیب الاخلاق" نامی ماہانہ پرچہ جاری کیا۔ اس کے ذریعے ایک نئے انداز تحریر کو ملک سے روشناس کرایا۔ اسی انداز پر عام اردو نگار آج مقالہ نگاری کر رہے ہیں۔

انہوں نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے جو ہفتہ وار اخبار جاری کیا تھا اور جو آج تک اپنے خاص رنگ میں جاری ہے۔ درحقیقت اردو اخبار نویسی کا مذاق ملک میں اسی اخبار کے ذریعے عام ہوا۔ ان کی معرکۃ الآرا اردو تصنیفات آج ۷۰ سال بعد اس پائے کی ہیں کہ ان کے بغیر ملک کی کوئی لائبریری مکمل نہیں کہی جاسکتی۔

۱۸۷۵ء میں انہوں نے مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اشاعت کے لئے ایک چھوٹے سے اسکول کی بنیاد رکھی۔ جو ترقی کرتے کرتے ان کی زندگی ہی میں ایک عظیم الشان کالج تک ترقی کر گیا۔ اور آج شمالی ہندوستان کی سب سے بڑی اقامتی یونیورسٹی کی صورت میں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے نام سے مشہور ہے۔ ہندوستان بھر میں علی گڑھ کے تعلیم یافتہ مسلمانوں نے ہر عہد میں ملک و ملت کی رہنمائی کا فرض ادا کیا ہے۔ اور آج بھی وہ زندگی کے ہر شعبے اور مجلسی و ملکی ترقی کے ہر رنگ میں اہلِ ملک کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ ہندوستان اور خصوصاً اسلامی ہند میں سرسید ہی کی روشن کی ہوئی شمع کی روشنی پھیل رہی ہے

سرسید اُن چند خوش نصیب لیڈروں میں سے ایک ہیں جنہیں اپنے ساتھ کام کرنے والے ساتھی بھی ایسے ملے جن میں ہر ایک اپنے اپنے انداز میں یکتائے زمانہ تھا۔ ان سب کی امتیازی خوبیاں سرسید میں قدرت نے جمع کر دی تھیں۔

نواب محسن الملک۔ نواب وقار الملک۔ ڈاکٹر نذیر احمد۔ پروفیسر ذکاء اللہ۔ مولانا شبلی۔ مولانا حالی۔ مرزا سمیع اللہ بیگ وغیرہ۔

ان حضرات میں ہر شخص اُردو زبان کا محسن اور اردو ادب کا سرپرست معمار خیال کیا جاتا ہے چونکہ اس علم و ادب کی شمع فروزاں خود سرسید تھے۔ اسی لیئے اس عہد میں اردو تصنیفات سے جو ادبی دور بنتا ہے۔ اسے تاریخ ادب میں "سرسید اردو اسکول" کا نام دیا جاتا ہے۔

مولانا حالی نے سرسید کی سوانح عمری "حیات جاوید" میں سرسید مرحوم کو بجا طور پر "فادر آف اردو" کا خطاب دیا ہے۔

سرسید نے ہندوستانی قوموں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔ ان کی ساری زندگی میں ہندو مسلمان اجتماعی صورت میں کبھی ایک دوسرے سے نہیں ٹکرائے۔

انھوں نے ایک عظیم الشان جلسے میں ہندو مسلم اتحاد پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

"ہندوستان کے چہرے پر ہندو مسلمان دو آنکھیں ہیں۔ ان دونوں آنکھوں کا نقطۂ نگاہ ایک ہونا چاہیئے"

شعر کہنے کیلئے

- ★ سب سے پہلی شرط استعدادِ شعری ہے
- ★ دُوسری شرط جس زبان میں شعر کہے اس پر عبُور
- ★ تیسری شرط الفاظ و تراکیب کا ذوقِ انتخاب و مذاقِ اختراع
- ★ چوتھی شرط کسی ماہرِ فن استاد کی نکاتِ فن پر رہنمائی و اصلاح
- ★ پانچویں مستند اساتذہ کے کلام پر مستقیدانہ نظر۔"

علامہ تاجور

خواجہ حالی پانی پتی

نام و خاندان : نام خواجہ الطاف حسین، حالی تخلص، شمس العلماء خطاب۔ خواجہ حالی کے والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت عبداللہ انصاری سے ملتا ہے۔

پیدائش اور وفات : ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔

مختصر حالات : خواجہ حالی پانی پت محلہ انصاریاں میں پیدا ہوئے۔ نو سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ سترہ سال کی عمر میں بڑی بہن کے اصرار سے شادی کرنے پر مجبور کئے گئے۔ ۱۸۵۶ء میں حصار کے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں پہلی ملازمت کی۔ ۱۸۵۷ء میں ہنگامۂ غدر کے سبب یہ ملازمت چھوٹ گئی۔ ۱۸۶۳ء سے ۱۸۷۱ء گویا آٹھ سال تک جہانگیر آباد میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے بچوں کے اتالیق رہے۔

اس کے بعد منشی پیارے لال آشوب دہلوی میر منشی لفٹننٹ گورنر پنجاب کی سفارش سے گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب (لاہور) میں مترجمہ کتابوں کی اردو عبارت درست کرنے کی خدمت کے سلسلے میں ملازم ہو گئے۔ یہاں سے پھر اینگلو عربک سکول دہلی میں عربی زبان کے مدرس ہو کر دہلی چلے گئے۔ ۱۸۸۷ء میں سرسید کی سفارش پر نواب سر آسمان جاہ مدار المہام (وزیر اعظم) حیدر آباد نے ریاست حیدر آباد سے ۷۵ روپے ماہانہ خواجہ حالی کا وظیفہ مقرر فرما دیا۔ جو بعد کو ترقی دے کر سو روپیہ کر دیا گیا۔ اس وظیفے کے حاصل کرنے کے بعد حالی نے مدرسی سے استعفےٰ دے کر اپنے وطن میں سکونت اختیار کر لی۔ اور زندگی بھر وہیں رہے۔

۱۹۰۴ء میں انہیں گورنمنٹ سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں میں حالی کی نظم سننے کے لئے دور دور سے اہل شوق شریک ہوا کرتے تھے ۱۹۰۷ء میں اس کانفرنس کے اجلاس کراچی کے حالی صدر بنائے گئے۔ ۱۹۱۴ء میں پانی پت میں انتقال فرمایا۔

ان کی وفات پر سارے ملک میں ماتم ہوا۔ حالی میموریل ہائی سکول پانی پت ان کی یادگار میں جاری ہوا جو آج تک جاری ہے۔ ان کی ولادت کو سو سال ہو گئے گزشتہ سال ان کی صد سالہ برسی ملک میں جگہ جگہ منائی گئی۔ خود پانی پت میں ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال کی صدارت میں ان کی صد سالہ برسی کی تقریب پر ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ جس میں ملک کے مشہور ادیب شریک ہوئے۔ سر اقبال نے بھی اس جلسے میں شریک ہو کر حالی پر نظم پڑھی۔ اسی جلسے میں نواب صاحب بھوپال نے میموریل ہائی سکول کو بیس ہزار روپیہ بطور امداد عنایت فرمایا۔

حالی کی تعلیم : ابتدا میں قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر فارسی کی چند کتابیں اپنے وقت کے مشہور قابل اساتذہ سے پڑھیں۔ پھر عربی شروع کی عربی علوم کی تکمیل دہلی جا کر کی۔

حالی کے ادبی ذوق کی تربیت : حالی کے ادبی ذوق کی تربیت زیادہ تر ۔

(۱) نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے فیض صحبت کی ممنون ہے۔ نواب شیفتہ بہت بلند پایہ ادیب۔ اردو و فارسی کے شاعر اور قابل قدر نقاد تھے۔ ان کے فیض صحبت سے حالی نے اپنے ادبی ذوق کو ترقی دی۔

(۲) حالی نے مرزا غالب سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ غالب کی رہنمائی سے حالی کے ذوق شعری میں امتیاز پیدا ہو گیا۔ ان کی پہلی ہی غزل دیکھ کر مرزا غالب نے فرمایا کہ،

"تم شاعری نہ کرو گے تو اپنے اوپر ظلم کرو گے"

(۳) گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب میں حالی کے سپرد یہ خدمت تھی کہ ـــــــ ـــــ ـــــ ـــــ بک ڈپو میں جو انگریزی علم و ادب و تنقید کی کتابیں اردو میں ترجمہ کی جاتی تھیں، خواجہ حالی ترجمے کی زبان کو درست کیا کرتے تھے۔ اس ذریعہ سے حالی کو مغربی مصنفین و ادبا کے خیالات اور جدید اصول تنقید سے واقفیت پیدا ہوئی اور ان کا ادبی مذاق مشرق و مغرب کے ادبیات کی خوبیوں سے بہرہ اندوز ہوا۔

(۴) سرسید کی معیت بھی حالی کے ذوق ادبی کو بلند کرنے کا باعث بنی۔

سرسید نے انہیں ہدایت کی کہ حسن و عشق کی داستانیں تو بہت کچھ کہہ چکے۔ اب قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی طرف توجہ کرو۔ چنانچہ حالی نے سرسید ہی کے حکم کی تعمیل میں اپنی مشہور بسیط نظم "مد و جزر اسلام"، جو مسدس میں ہونے کی وجہ سے مسدس حالی کے نام سے مشہور ہے لکھی۔ سرسید ہی کے ایما سے رسالہ تہذیب الاخلاق میں اصلاحی، مذہبی، اخلاقی، مضامین لکھتے رہے۔

(۵) ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے زیر انتظام اور کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب کے زیر پرستی، مولانا آزاد دہلوی کی تجویز سے جدید قسم کے مشاعرے کی بنیاد رکھی گئی۔ اور خواجہ حالی کی جادو بیانیوں نے انہیں فروغ دیا۔ اس کے بعد سے حالی نے قدیم رنگ کی عشقیہ شاعری کو ترک کر دیا اور اس وقت سے آخیر دم تک جدید رنگ کی مسلسل نظمیں کہتے رہے۔

جدید اردو شاعری کا یہ سکول جو ان نئے انداز کے مشاعروں سے ۱۸۷۴ء میں شروع ہوا، درحقیقت قدیم رنگ کی غزلیات کا خاتمہ اور نیچرل نظموں کی مسلسل نظموں کا آغاز اسی سے ہوا۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو اردو شاعری کو فرسودہ خیالات کا سرمایہ دار خیال کر کے اس سے بیزار ہو چکا تھا۔ اس طرف دلفریب نوجوان جدید شاعروں نے اُسے اردو شاعری کی جانب متوجہ کر لیا۔ آزاد اگرچہ اس جدید شاعری کے سکول کا پہلا بانی ہے اور اس حیثیت سے اردو شاعری اس کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ لیکن چونکہ قدرت نے اُسے اقلیم نثر کی شہنشاہی کے لئے چن لیا تھا۔ اُس نے اپنی شاعرانہ جولانیوں کو بھی نثر ہی کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اردو نظم اُس کے دائرہ نصیب سے باہر رہی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ شاعر نہ تھے۔ بلکہ یہ مراد ہے کہ اس درجے کے شاعر نہ تھے کہ ان کی شاعری کسی مفید تحریک کو فروغ دے سکے۔ یہ کمی حالی کی جادو بیانیوں سے پوری ہوئی۔ حالی کی شاعری یا ساحری نے اس جدید سکول کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ جدید ہندوستان کے گوشے گوشے میں اُسے ہر دلعزیز بنا دیا۔

ان شاعروں سے پہلے اردو شاعری عموماً عشق کی نازو نیاز، حسن کی قصیدہ خوانی اور امراء کی خوشامد تک محدود تھی۔ جدید طرز کے ان مشاعروں نے اس کے لئے ایک وسیع میدان مہیا کر دیا اور اب نیچرل، اخلاقی، اصلاحی، ملکی، ملی، تاریخی اور سیاسی نظمیں اردو میں رواج پانے لگیں۔ مولینا حالی نے ہر صنف نظم پر طبع آزمائی کر کے تمام اصناف نظم کو مقبول عام بنا دیا۔

اس حقیقت کے پیش نظر یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولینا حالی جدید اردو شاعری کے کامیاب بانی تھے۔

حالی کی جدید شاعری اگرچہ مطالب و خیالات کی رو سے جدید تھی۔ لیکن اس کا انداز بیان قدیم ہی رہا۔

بیسویں صدی کے آغاز نے جب کہ ترقی یافتہ مغربی شعرا کے خیالات مغربی ادبیات کے ترجموں کے ذریعے عام ہو گئے۔ اردو شاعری میں نئے نئے اسالیب نگارش کا اضافہ کر کے اُسے اُس کی قدیم طرز ادا سے بالکل جدا کر دیا۔ اب قدیم اور جدید اردو شاعری بالکل دو جدا اور ایک دوسری سے ممتاز صورت میں نظر آنے لگیں۔

(۶) غدر کے بعد مسلمانوں کی قومی پستی کے دردناک مناظر کا بھی حالی کے ذوق شاعری پر کچھ کم اثر نہیں پڑا۔

(۷) آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں کی شرکت اور اُن میں مسلمانوں کی قومی ترقی کے متعلق رہنمایانِ قوم سے تبادلۂ خیالات سے بھی حالی کا ذوقِ ادب و شاعری بہت کچھ متاثر ہوا۔

مختصر یہ کہ حالی کے مذاقِ شاعری و ذوقِ ادبی کی تربیت اور نشوونما مندرجہ بالا حالات اور اساتذہ کے زیرِ سایہ ہوئی

حالی کے تصنیفی کارنامے :- خواجہ حالی نے نثر میں حسبِ ذیل کتابیں تصنیف کی ہیں :-

(۱) حیاتِ سعدی : ایشیا اور ایران کے سب سے بڑے فارسی مصنف اور شاعر شیخ سعدی شیرازی کی سیرت پر اُردو میں مولانا حالی کی حیاتِ سعدی سے بہتر کوئی کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔

حیاتِ سعدی میں شیخ سعدی کی سوانح عمری، ان کے متعدد سفروں کے حالات۔ ان کا [illegible] نظرِ تنقید ان کی مشہورِ عالم گلستان اور بوستان پر تبصرہ ان کی تصانیف کا اُن کے معاصرین کی تصانیف سے مقابلہ اور اُن کی نثر و نظم کا اُن کے ہم عصروں کی نظم و نثر سے موازنہ کیا گیا ہے۔ یہ معرکۃ الآرا کتاب حالی کو ایک بے مثل سیرت نگار بے نظیر نقاد اور عالی جاہ مصنف کا درجہ دیتی ہے۔

(۲) حیاتِ جاوید : حالی کی قابلِ قدر تصنیف "حیاتِ جاوید" ہے اس کی ضخامت ایک ہزار صفحات کے قریب ہے۔ سرسید کی زندگی کے ہر قابلِ ذکر پہلو کا اس میں بیان ہے اور سرسید کی ملکی، ملی، مذہبی، اصلاحی، علمی، ادبی، تعلیمی، سیاسی خدمات مکمل تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں درحقیقت سرسید بڑے خوش نصیب تھے کہ اُن کی سیرت حالی جیسے بلند مرتبہ سیرۃ نگار نے لکھی۔ اور اپنی سحر نگاری سے سرسید کو زندہ جاوید بنا دیا۔

(۳) یادگارِ غالب : اپنے استاد مرزا غالب سے حالی کو محبت نہیں عشق تھا۔ حالی نے غالب کی وفات پر جو دردناک مرثیہ لکھا ہے۔ اُس کے ہر شعر سے حالی کا عشق ٹپکا پڑتا ہے۔ یادگارِ غالب میں خواجہ حالی نے مرزا غالب کے حالات، ان کے لطائف و ظرائف، ان کی نظم و نثر کے خصوصیات اُن کے درجۂ شاعری و ادب اور اُن کی فارسی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔

ان کے علاوہ تریاقِ مسموم، طبقات الارض، مجالس النساء، اور کچھ علمی، تنقیدی اور مذہبی مضامین بھی حالی کی تصنیف و تالیف میں شامل ہیں۔ لیکن مندرجہ بالا تین کتابیں حالی کے تین تصنیفی شاہکار ہیں۔ جن سے خواجہ حالی کی تصنیفی و تنقیدی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

حالی کی شاعری : خواجہ حالی کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) قدیم شاعری : اس میں قدیم رنگ کی غزلیات، رباعیات، کچھ قصیدے وغیرہ شامل ہیں۔

(۲) جدید شاعری : اس میں جدید طرز کی نیچرل، قومی، اخلاقی، اصلاحی مسلسل نظمیں اور قطعات ہیں۔

دیوانِ حالی، (مرتبہ ۱۸۹۳ء) قدیم غزلیات اور جدید طرز کی نظموں کا پہلا حصہ ہے۔ جو حالی نے اپنی زندگی ہی میں ترتیب دیا تھا۔

مسدسِ حالی : سرسید کے ایماء پر مدّ و جزرِ اسلام کے نام سے یہ طویل و بسیط نظم کہی گئی۔ یہ نظم مسدسِ حالی کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں قومِ مسلم کو اس کے شاندار ماضی، بدنما حال اور تاریک مستقبل سے روشناس کیا ہے۔ مسلمان کیا تھے، کیا ہو گئے اور اگر اسی بدروش پر قائم رہے تو ان کا انجام کیا ہوگا۔ یہ موضوع ہے اس یادگارِ زمانہ نظم کا۔

اس نظم کو لکھے ہوئے نصف صدی سے زیادہ مدت گزر گئی ہے۔ مگر اس انداز اعجاز سے لکھی گئی تھی کہ آج نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی جب کہ اُردو شاعری خاک سے اُٹھ کر افلاک سے ہمسری کر رہی ہے، اس نظم کے پایہ کی کوئی اردو نظم نہیں کہی گئی۔

مسدسِ حالی، جوش، اصلیت، سادگی اور اعلیٰ شاعرانہ مصوری کے اعتبار سے اس قدر مؤثر ہو گئی ہے۔ کہ آج بھی مسلمانوں کی قومی مجالس میں جب پڑھی جاتی ہے تو اہلِ جلسہ اشکبار ہو جاتے ہیں۔ حالی نے اس نظم کی مطبوعہ کاپی جب سرسید کے پاس علی گڑھ بھیجی تو سرسید نے اسے پڑھ کر کتاب کی رسید بھیجتے ہوئے مولانا حالی کو لکھا کہ :

"خدا قیامت میں جب مجھ سے پوچھے گا کہ تو نے دنیا میں کون سا نیک کام کیا تو کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں"۔
سرسید جیسے بلند فطرت انشا پرداز اور رفیع القدر نقاد کی یہ قابل ناز رائے حالی کی شاعرانہ عظمت کی شاہد ناطق کہی جاسکتی ہے ۔

مسدس حالی میں اگرچہ مسلمانوں کے ذریں ماضی، بدترین حال اور وحشت انگیز مستقبل کی ساحرانہ مصوری کی گئی ہے اور اس کی تحریر کا مقصد ملت مسلمہ کو خواب غفلت سے بیدار کرنا تھا لیکن ہندوستان کی ہر قوم چونکہ مسلمانوں کی طرح بے خبر، حال سے غیر متاثر اور مستقبل سے نڈر حیثیت میں زندگی بسر کر رہی ہے، اس لئے ہندوستان کی تمام اقوام نے اپنی ناگفتہ بہ حالت کا نقشہ مسدس حالی کے آئینے میں دیکھ کر مسدس حالی کو اپنی ضرورت تصور کیا اور اس ملک کی ہر ہر قوم نے اپنی اپنی زبان میں اس کا منظوم ترجمہ کرنا ضروری سمجھا۔

اس کے علاوہ غیر ملکی مستشرقین نے انگریزی اور فرانسیسی میں بھی اس کا ترجمہ کر لیا۔ جاپانی زبان میں بھی مسدس حالی کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ آنریبل سر شہاب الدین صدر مجلس قانون ساز پنجاب نے پنجابی زبان میں اس مسدس کو منظوم سانچے میں ڈھالا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ "مد و جزر اسلام" حالی کا غیر فانی شاہکار ہے اور اسی کی بدولت حالی خواجہ الطاف حسین سے حالی بنے۔ مسدس حالی ۱۸۷۹ء میں اشاعت پذیر ہوئی ۔

نظم حالی : دیوان حالی کی اشاعت کے بعد خواجہ حالی نے جو نظمیں کہیں ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین بی۔ اے نے ان کو مرتب کر کے نظم حالی کے نام سے شائع کیا۔ ان نظموں کا انداز نگارش دیوان حالی کی جدید طرز کی نظموں ہی کا سا ہے ۔

حالی کی شاعرانہ خصوصیات : (۱) حالی کی قدیم شاعری جو زیادہ تر غزلیات پر مشتمل ہے۔ جذبات کی پاکیزگی، الفاظ کی موزونیت، انداز بیان کی طرفگی اور ندرت، تغزل کی رنگینی، خیال کی نفاست و متانت، قواعد فن کی رعایت، مشق تحریر کی پختگی میں معاصرانہ تفوق اور استادانہ امتیاز کی حامل ہے ۔

اس کے اشعار مطالب کی پیچیدگی، خیالات کی ژولیدگی، زبان کی تعقید اور گنجلک بیان کے اغلاق و اشکال، ابتذال، عریانی، ہوس آرائی اور چھچھورپن سے یکسر پاک ہوتے ہیں :

(۲) حالی کی جدید شاعری چونکہ عشق و محبت کی چاشنی نہیں رکھتی اس لئے رنگ تغزل قدرتاً پھیکا ہے اور بعض نظمیں تو جواب مضمون کی طرح ذوقی سماعت کے لئے بار ہو گئی ہیں۔ واعظانہ ترغیب و ترہیب، ناصحانہ انداز تخاطب، پیشوایانہ اوامر و نواہی نے جدید طرز کی اکثر نظموں کو تعلیمی اور نصابی کتب میں درج کرنے کے قابل بنا دیا ہے۔ البتہ مسدس "مد و جزر اسلام" حالی کی ایک شاعرانہ کرامت ہے۔ حد درجہ مؤثر، دل گیر اور پر جوش ہے۔ اور جدید رنگ کی کئی مثنویاں بھی داخلی و خارجی عناصر کے اعتبار سے معیاری درجے کی ہیں ۔

حالی کی نثر : قانون کی زبان سب سے زیادہ احتیاط کی طلب گار ہوتی ہے۔ کیونکہ قانون سے لوگوں کی موت و زندگی اور حقوق باہمی کا فیصلہ متعلق ہوتا ہے۔ اس لئے قانون کی زبان فصاحت و بلاغت اور شاعرانہ لطافتوں کی متحمل نہیں ہوتی ۔

قانون کے بعد تنقید اور پھر تاریخ کی زبان بڑی احتیاط چاہتی ہے۔ کسی کے کمال فن اور شخصیت پر تنقیدی نظر ڈالنا بڑی ذمہ داری اور احتیاط کا کام ہے۔ بے جا ستائش اور ناروا مذمت، تنقید اور تاریخ کو ساقط الاعتبار بنا دیتی ہے ۔

خواجہ حالی کی تنقید نگاری اور تاریخ نویسی کی زبان بہت ہی محتاط ہے۔ وہ کسی کے محاسن و نقائص بیان کرتے ہوئے اس طرح دامن بچا کر گزر جاتے ہیں کہ پڑھنے والا یہ محسوس ہی نہیں کر سکتا کہ نقاد ان محاسن و معائب سے خود بھی متاثر ہوا ہے یا نہیں، یہیں سے حالی، آزاد و شبلی سے ممتاز ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ آزاد کسی کے نقائص بھی اس لہجے میں بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو مغالطہ ہو جاتا ہے کہ وہ تعریف کر رہے ہیں یا تعریف کے پردے میں تنقیص بخلاف علامہ شبلی کے کہ وہ اظہار محاسن و شمار معائب میں تنقید کے حدود کا خیال نہیں رکھ سکتے۔ کسی کے محاسن بیان کرتے ہیں تو اپنے تاثر اور شمار معائب

میں اپنی بیزاری کو چھپا نہیں سکتے۔ حالیؔ کا انداز تنقید و بیان تاریخ ایک محتاط نقاد اور ایک مستند مورخ کی طرز کا ہوتا ہے۔ اسی طرح سیرت نگار آزاد بھی ہیں اور شبلی بھی لیکن اُردو ادب کی سیرت نگاری صرف حالیؔ کا حصہ تھی۔ وہ تنقید نگاری میں جس درجے کی محتاط زبان استعمال کرتے ہیں۔ سیرت نویسی میں بھی اُسی درجے کی احتیاط اور اس کے ساتھ انداز نگارش میں دلچسپی بھی پیدا کر دیتے ہیں۔

اگرچہ حالیؔ کا انداز بیان نہ آزاد کی طرح سہل الممتنع ہے نہ شبلی کی طرح بلند و پر زور کہ یہ دونوں اپنے اپنے رنگ میں بے نظیر ہیں۔ مگر تنقید و تاریخ کو جس محتاط زبان و معتدل انداز بیان کی ضرورت ہے وہ زبان و بیان آزاد کو میسر نہ شبلی کو نصیب۔ یہ امتیاز خاص صرف خواجہ حالی کو حاصل ہے۔

حالیؔ کی "حیات سعدی" اور "یادگار غالب" کے تنقیدی حصے کا مقابلہ آزاد کی "آب حیات" اور شبلی کی "شعر العجم" کے تنقیدی حصوں سے کیا جائے تو مندرجہ بالا موازنے کی صداقت روشن ہو جاتی ہے۔

حالیؔ کی نثر نگاری کی دوسری خصوصیت جو اُسے شبلیؔ اور آزاد سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ حالیؔ کے طرز نگارش کی بنیاد عموماً استدلال و عقلیت پر ہوتی ہے اور شبلی اور آزاد استدلال کی بجائے اکثر جذبات کی آمیزش سے کام لیتے ہیں۔ حالیؔ اپنے قاری کو اپنی قوتِ استدلال سے ساتھ ساتھ ہمنوا بناتا چلا جاتا ہے۔ اور آزادؔ و شبلیؔ اُس کے جذبات سے اپیل کر کے اُسے ہم رائے بنانے کی سعی کرتے ہیں۔

حالیؔ کے انداز تحریر کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی بے مثل ذہانت اور انتقال ذہنی سے مدعے کی بات سے بات پیدا کرنے پر قدرت تام رکھتے ہیں۔ اسی لیے وہ کسی تصنیفی موضوع کے متعلق تھوڑے سے معلومات سے بھی کام نکال کر اُس موضوع پر ایک مستند اور حاوی تصنیف تیار کر کے رکھ دیتے ہیں۔ بخلاف شبلیؔ کے کہ وہ جب تک کسی موضوع تصنیف سے متعلق تمام مسالہ اور مواد فراہم نہ ہو۔ اُس پر قلم اٹھانے کے عادی نہیں اور آزادؔ اگرچہ فراہمی مواد کی فکر نہیں کرتے۔ لیکن ان کی کوئی تصنیف کسی موضوع پر آخری تصنیف قرار نہیں دی جا سکتی۔

"بات یہ ہے۔ کہ اچھے شعر کے لیے تین باتوں کی اصولی طور پر ضرورت ہوتی ہے،

—تخیل — جدت بیان — اور ترنم—

ان میں سے پہلی دو خوبیاں وہبی ہیں۔ کہ فطرۃً کسی شاعر میں موجود ہوتی ہیں۔ حاصل نہیں کی جا سکتیں۔ ترنم البتہ کسبی چیز ہے۔ کہ کثرتِ مشق سے حاصل ہوا کرتا ہے۔

شعر بے تخیل ہو تو وہ پیکر بے روح ہے۔ شعر میں تخیل کی رنگینی تو ہو مگر اسلوب بیان سپٹ ہو تو تخیل بھی برباد— دونوں خوبیاں ہوں مگر شعر کے ادا اور اُس کی ترتیب ترنم و تنغم سے عاری ہو تو پہلی دونوں خوبیاں بھی بیکار ہو جاتی ہیں۔"

علامہ تاجور

اُردو زبان

اُردو زبان جغرافیائی حیثیت سے پنجاب اور دکن کے احسانات سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ پنجاب نے اپنے اخبارات، رسائل، تصانیف، اور تعلیمی مسائل کے ذریعے اسے جہانگیری بخشی اور دکن کی طویل الذیل توجہات کرم کے صدقے میں اعلیٰ علوم و فنون اُردو بولنے لگے۔

یوں تو دلی اور لکھنؤ کے ساتھ کبھی عظیم آباد بلکہ مرشد آباد کی اردو بھی ٹکسالی خیال کی جاتی تھی لیکن زمانے کے حادثات نے مرشد آباد کو "کلکتہ" اور عظیم آباد کو بہت حد تک اُردو ٹکسال کی حیثیت سے ختم کر دیا ہے کے دلی اور لکھنؤ رہ گئے تھے سو گزشتہ انقلابات کے سیلاب میں یہ بھی بہہ چکے ہیں حتیٰ کہ ہماری سنے اب ان مرکزوں کو بھی اُردو زبان کا مدفن بنانے کی ٹھان لی ہے۔

اُردو کا دکنی مرکز نئی صدی سے اس کی تربیت کر رہا تھا بالخصوص وہاں موجودہ صدی کے گزشتہ تیس سال کی سازگار فضا نے اسے برِ عظیم ہند کی مروجہ ڈھائی سو زبانوں میں علمی و تعلیمی پہلو سے اول اور اکمل ہونے کی عزت بخش دی تھی لیکن بدنصیبی سے چشمِ بد بیں اس کی اٹھان دیکھ نہ سکی اور آج اُس جاہ و بابل میں اُردو کے سوا "ہزار منہ ہیں ہزار باتیں"

دلی اور لکھنؤ وہ ایسے لسانی مرکز تھے جن کی طرف ہندوستان بھر کے اُردو ادیبوں اور شاعروں کی نگاہیں لگی رہتی تھیں۔ ہمارا پنجاب دلی سے قریب ہونے کے سبب اُردو الفاظ کی تذکیر و تانیث، محاورات کے محلِ استعمال، الفاظ کے تلفظ اور املاء میں زیادہ تر دہلی کا پیرو بنا رہا۔ اس سے قطع نظر ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ رستخیز نے بعض اساتذۂ شعر و ادب کو دلی سے دیس نکالا دیا تو پنجاب اُن کے لئے آغوشِ وطن بن گیا اور اس طرح اُنہیں اس قدر شناس خطے کی ادبی و لسانی خدمت کا موقع ملا۔ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد، خواجہ حالی اور ربوری سیف الحق ادیب جیسے مشاہیرِ علم و ادب کا نام اس سلسلے میں لیا جا سکتا ہے ان ہی حضرات کے پنجابی شاگرد اور جانشین تھے جن کی ادب طرازیوں نے پنجاب کے دارالسلطنت لاہور کو اُردو زبان و ادب کا سب سے بڑا مرکز بنا دیا اور بالآخر اسی خطۂ پاک سے وہ انقلاب نما شاعر اور الہام بیان حکیم اُٹھا جس نے اسلامیانِ ہند کے سامنے دنیا کی سب سے بڑی آزاد اسلامی مملکت پاکستان کو ایک زندہ حقیقت کی صورت میں پیش کیا۔

خوش قسمتی سے اُردو زبان کو سارے پاکستان کی سرکاری زبان تسلیم کر لیا گیا ہے۔ گویا اب یہ ایک آزاد ملک کی زبان کی حیثیت میں آگے قدم بڑھائے گی۔ پاکستان بھر کے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسی کے نام کا سکہ چلے گا، سرکاری دفاتر پہ اسی کی حکمرانی ہو گی، آئندہ اچھی اُردو لکھنا اور صحیح و فصیح اُردو بولنا سب کے لئے طغرائے امتیاز بنے گا۔ غلط اور غیر فصیح اُردو لکھنے اور بولنے والے اپنی اس کوتاہی پہ ہر مانی میں حجاب محسوس کریں گے۔ نجی اور سرکاری دفاتر میں اُردو دانوں کی مانگ بڑھے گی، غلط گفتار اور غلط نگار لوگ آئندہ معاشی دقتیں محسوس کریں گے۔ مختصر یہ کہ گزشتہ دو صدی کی غیر ملکی حکومت میں انگریزی کو جو اہمیت حاصل رہی ہے وہی اقتدار پاکستانی زبان (اُردو) کو حاصل ہو جائے گا۔

ایک برطانوی مدبر سر جان مورے نے اپنے ہم وطنوں کی ایک جماعت کو خطاب کرتے ہوئے کبھی کہا تھا کہ،
"کروڑوں برطانوی افراد کو رشتۂ مودت میں منسلک کرنے والی ہماری قومی زبان (انگلش) ہے۔ انگلش کی ترقی اور اصلاح و تربیت کے سوال کو ہم کسی اہم سے اہم قومی مسئلے سے دوسرے درجے پر نہیں رکھ سکتے۔"

سر جان مورے کی یہ حقیقت بیانی صرف برطانوی قوم اور انگلش زبان کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دنیا کی ہر قوم اور اس کی قومی زبان کے لئے لازم

ہے۔ اس سچائی کا اعتراف ہم اسی صورت میں کر سکتے ہیں کہ پاکستان میں رہنے والے اپنی مشترکہ پاکستانی زبان (اُردو) سے دلی لگاؤ پیدا کریں، اپنی گھریلو زندگی میں اسے یاد رکھیں، مجلسی تقریبات میں اسے اظہارِ خیال کا واحد ذریعہ بنائیں، خود صحیح اُردو بولیں اور دوسروں کو صحیح اُردو بولنے کی ترغیب دیں اپنی قومی زبان سے بے اعتنائی برتنا اُسے غلط بولنا یا اس کی تصحیح اور درستی کو غیر ضروری خیال کرنا کسی ایسے آدمی کے شایان نہیں جو دل سے محبت رکھتا ہو، بہت تاریک ہے۔

ہمارے صوبے (مغربی پنجاب) میں صحیح اُردو بولنے والوں کی کمی نہیں۔ البتہ غلط زبان بولنے والے صحیح بولنے کی ضرورت کا احساس بہت کم رکھتے ہیں ہم کچھ لکھتے ہوئے تو بالعموم یہ احتیاط کر لیتے ہیں کہ ہماری تحریر خالص اُردو ہو لیکن بات چیت میں ہمیں یہ خیال نہیں رہتا کہ ہم پنجابی میں بات کر رہے ہیں، یا اُردو میں یا انگلش جیسی زبان میں؟ بالخصوص ہمارے طلباء اور تعلیمی درسگاہوں، کچہریوں، دفاتر میں کام کرنے والے حضرات تو باتوں باتوں میں مختلف بولیوں کی ملاوٹ سے گفتگو کا عجائب گھر بنا ڈالتے ہیں۔

ان کی بول چال کی زبان، عام طور پر پنجابی، اردو اور انگریزی، ان تین زبانوں کا معجون مرکب بن کر رہ جاتی ہے۔ آپ جب کسی زبان میں بولتے ہیں تو اس زبان کا آپ پر حق ہو جاتا ہے کہ مقدور بھر اس زبان کو صحیح بولیں۔ مجبوری کی بات اور ہے۔ مگر بے ضرورت اور بے توجہی سے کسی زبان کو غلط طور پہ استعمال کرنا اس کی حق تلفی کرنے کے برابر ہے۔ خصوصاً اپنی ملکی زبان کے ساتھ یہ برتاؤ تو کسی صورت میں بھی مناسب نہیں۔ یہاں عربی ادب کی تاریخ کے ایک واقعے کا بیان نامناسب نہ ہوگا۔

کسی غیر عرب نے اپنے آپ کو عرب زاد بتا کر کسی عرب خاتون سے نکاح کر لیا تھا۔ ایک رات کو سوتے وقت شوہر نے بیوی سے کہا۔ "اقتلی السراج" (چراغ بجھا دو) یہ فقرہ عربی محاورے کی رو سے غلط تھا۔ عرب خاتون اپنی ملکی زبان کی اس غلطی کو برداشت نہ کر سکی اور بےساختہ اس کی زبان سے نکل گیا "اصبح لیل" (اے رات صبح میں تبدیل ہو جا) اور صبح ہونے پر اس نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد ملک کے لوگ اپنے ملک کے ساتھ اس کی زبان سے بھی کس درجہ اُنس و محبت رکھتے ہیں۔ ایک سچے پاکستانی کی حیثیت میں ہمارا بھی یہ فرض ہے کہ اپنی زبان کو اُردو کے غلط الفاظ سے پاک رکھیں۔

ذیل میں کچھ الفاظ و محاورات نقل کیے جاتے ہیں جن کی تذکیر و تانیث اور محلِ استعمال میں احتیاط نہیں کی جاتی۔

کئی اردو میں یہ لفظ "جمع قلت" کے لیے آتا ہے۔ اس کا اہم معنی لفظ "چند" ہے۔ لیکن اکثر لوگ "کئی" کو "اکثر" یا "بہت" کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ میری ناقص رائے میں یہ استعمال صحیح نہیں مثلاً،

"مشاعرے میں بہت سے شاعروں نے اپنا کلام پڑھا مگر وقت کی تنگی کے سبب کئی رہ گئے" (یعنی کچھ پڑھنے سے رہ گئے)

اس فقرے میں لفظ "کئی" اپنے صحیح معنوں میں استعمال ہوا ہے لیکن جب لفظ "کئی" کو "اکثر" یا "بہت" کی جگہ یعنی "جمع کثرت" کے لیے بولا جائے تو یہ موزوں نہ ہوگا۔

نہ ہی عموماً کہا جاتا ہے کہ،

"جلسے میں نہ ہی زید نظر پڑا نہ ہی خالد"۔

محتاط حضرات کو چھوڑ کر جن کی تعداد بہت کم ہے، عموماً اس غلطی میں ہندوستان اور پاکستان میں بہت سے اُردو بولنے اور لکھنے والے مبتلا ہیں پھر مصیبت یہ ہے کہ یہ غلطی خاص و عام کی زبانوں پر طاری ہونے کے باوجود اس لائق بھی نہیں کہ اسے غلط العام فصیح کے تحت جائز گردان لیا جائے کیوں؟

اس کیوں کے جواب میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ ذوقِ سلامت اسے قبول نہیں کرتا۔ "نہ ہی" میں "نہ" اور "ہی" کے درمیان کوئی لفظ داخل کر کے اسے درست کر لینا چاہیے مثلاً،

"جلسے میں زید ہی نظر پڑا نہ خالد ہی دکھائی دیا"

"لَوٹنا اور لُوٹنا" واپس ہونا کے معنوں میں "لَوٹنا" ہے۔ یعنی لام پر زبر (ل) ہے۔ اور خاک پر لُوٹنا، کانٹوں پر لُوٹنا، انگاروں پر لُوٹنا، ان میں جو "لُوٹنا" ہے اس کے لام پر ہلکا پیش (و یا ضمہ مجہول اد) ہے۔ لیکن اکثر لوگ "خاک پر لُوٹنا" کی جگہ بھی "لَوٹنا" ہی بولتے ہیں حالانکہ ان دونوں مصدروں کے معنی باہم مختلف ہیں۔

قابو کرلینا۔ کسی کو قابو میں کرلینا یا قبضہ کرلینا، یا کسی پر قابو پالینا، ان کی جگہ زیادہ تر قابو کرلینا، بولا جاتا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ اسے صحیح بنانے کے لئے "قابو" اور "کرلینا" کے درمیان "میں" کا لفظ بڑھا لینا چاہیئے۔

بمعہ۔ اُردو زبان کا لفظ نہیں ہے۔ اِسے بامعنی بنانا ہو تو اس کے شروع سے "ب" اُڑا دیجیے۔ مثلاً وہ ہمارے پاس مع ساز و سامان کے پہنچا"

"قلم" اکثر لوگ قلم کو مونث استعمال کرتے ہیں۔ "قلم گم ہوگئی" "قلم ٹوٹ گئی" "قلم لکھتی نہیں" یہ غلط فقرے عام طور پر سنے جاتے ہیں۔ اس کی اصلاح ضروری ہے۔ قلم کا لفظ اردو زبان میں مونث نہیں مذکر ہے۔

درد کے لفظ کو بھی یہی اُفتاد پیش آئی ہے کہ ستلج پار کرتے ہی مذکر سے مؤنث بن گیا۔ ریاض خیرآبادی مرحوم کا شعر ہے کہ ؎

ذرا سے درد نے ڈھائی ہیں آفتیں کیا کیا ۔۔۔۔ پٹک دیا ہے زمین پر اُٹھا اُٹھا کے مجھے

اخباریں۔ اُردو زبان میں "اخبار" کا لفظ مذکر ہے اور اس کی جمع اخبارات ہے۔ جمع بھی مذکر ہے لیکن عام طور پر بولا جاتا ہے "اخبار آتی ہے" "اخباریں بک رہی" یہ درست نہیں۔ اُردو زبان میں اخبار پڑھا جاتا ہے۔ پڑھی نہیں جاتی۔ اور بازاروں میں اخباریں نہیں بکا کرتیں۔ اخبارات بکتے ہیں۔

اگر تو۔ اگر تو میرا وہاں جانا ہوا تو آپ کا پیغام اُن تک ضرور پہنچادوں گا۔

ہمارے ہاں ہر جملۂ شرطیہ کو اس "اگر تو" کی مصیبت کا ضرور سامنا کرنا پڑتا ہے پنجابی زبان کے حرفِ شرط "جے تو" کا اردو میں صرف "اگر" ہے نہ کہ "اگر تو" یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ اردو زبان میں "اگر تو" کوئی لفظ نہیں ہے۔ اُردو کا حرفِ شرط "اگر" ہے نہ کہ "اگر تو"۔

"ضروری فنی پابندیوں سے انحراف و بغاوت تو دماغی اختلال ہے
اور غیر ضروری پابندیوں پہ اصرار قدامت پرستی۔ کوئی فطری شاعر اگر
بے قافیہ نظم کہتا ہے تو اسے قافیہ آرائی پر مجبور کرنا فن کے ارتقاء کے
مخالفت ہے۔ مقررہ بحور کے علاوہ کسی دوسری زبان کی شاعری کا
کوئی خوشگوار وزن اردو میں استعمال کرتا ہے اور اسے نبھا سکتا ہے
تو اس کی یہ جدت بدعت نہ کہلائے گی۔"

علامہ تاجور

مشاعرہ

دیوبند ضلع سہارنپور میں جناب بابو محمد اسماعیل صاحب قریشی رئیس اعظم دیوبند نے اپنے صاحبزادے کی شادی کی تقریب میں ۱۸، اپریل کو ایک عظیم الشان مشاعرہ قائم کیا۔ تین یوم پیشتر مجھے بھی بہت اصرار کے باعث لاہور سے سفر کرنا پڑا۔ بیرونجات سے مراد آباد۔ رام پور۔ میرٹھ۔ مظفر نگر سہارنپور۔ دہلی۔ رُڑکی۔ کاکوری۔ ناگپور کے شعراء تشریف لائے تھے۔ اسٹیشن پر مولانا غریب سہارنپوری و مولانا دبیر رُڑکوی مہمانوں کا استقبال کرتے۔ تمام سواریوں کا معقول انتظام تھا۔ بابو صاحب نے کرایہ آمد و رفت وجملہ سامان مہمان نوازی کو نہایت فراخ دلی سے اپنے ذمے لیا تھا۔

بابو صاحب ماشاء اللہ ایک سخن فہم ہونے کے علاوہ نہایت اچھے شاعر بھی ہیں۔ اسی لیے انہوں نے محفل رقص و سرود میں سینکڑوں روپیہ برباد کرنے کی بجائے طبعی دلچسپی کی وجہ سے اعلیٰ پیمانے پر یہ مشاعرہ قائم کرکے اپنے فرزند کی شادی کی یادگار قائم کر دی۔ مصرع طرح ع

ناتوانی نے مجھے نقشِ کفِ پا کر دیا

(قافیہ) کیا، بپا وغیرہ

تجویز ہوا تھا۔ مشاعرہ صبح سے شروع ہو کر شام تک رہا۔ بابو صاحب بانئ مشاعرہ چونکہ مولانا غریب سہارنپوری سے فخرِ تلمذ رکھتے ہیں۔ اس لیے آخیر مشاعرے میں انہوں نے ایک بیش قیمت دستار مولانا موصوف کے سر پہ بندھوا کر حق شاگردی ادا کیا۔ اس دستار بندی پر بہت چہ میگوئیاں ہوئیں کیونکہ ضلع سہارنپور کے مسلم الثبوت استاد حضرت وحشی دیوبندی مشاعرے میں شریک تھے اس لیے اہلِ دیوبند کو یہ بات ناگوار گزری لیکن بابو صاحب نے بعد کو تصریح کر دی کہ مولانا غریب میرے استاد ہیں۔ میں نے یہ شاگردانہ خدمت ادا کی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مولانا غریب کی غزل سب سے زیادہ مرصع اور اس دستار کی مستحق ہے۔

اس مشاعرے میں مولانا غریب سے نیاز حاصل کرکے طبیعت نہایت خوش ہوئی۔ آپ عربی و فارسی میں نہایت اچھی استعداد رکھتے ہیں۔ فارسی میں بھی سخن سنجی کرتے ہیں اور اردو شاعری میں تو سہارنپور میں آپ کا جواب نہیں ہے باوجود ان تمام قابلیتوں کے خوش خلقی و منکسر المزاجی یہ دو جوہر مزید قیمتی سے انہیں ایسے عطا ہوئے ہیں کہ اس امتیاز میں کم از کم طبقۂ شعراء میں تو کوئی ان کا حریف نہیں ہے۔

مولانا دبیر رُڑکوی سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ آپ بھی نہایت قابل اور فن شعر میں اچھی مہارت رکھتے ہیں۔ حضرت ظہیر دہلوی مرحوم کے ان جانشینوں میں سے ہیں جن کا نام مرحوم خود تجویز فرما گئے ہیں۔ آپ کا اسم گرامی یہی ہے۔ آپ کا کلام سادگی اور حسن بندش کا اعلیٰ نمونہ ہے اور اس پیرانہ سالی میں چونچلے کے شعر تو ایسے کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ منچلے شوخ طبیعت شاعر ہیں۔

مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا رئیس سہارنپور و مختار عدالت کی غزل بھی خوب رنگ لائی۔ آپ کے کلام میں علمیت کا رنگ غالب رہتا ہے سہارنپور میں آپ کا دم بھی غنیمت ہے۔ افسوس ہے کہ آپ کے کلام کا نمونہ ہم ہدیۂ ناظرین نہیں کر سکتے کیونکہ مرزا صاحب موصوف نے غزل پڑھ کر غزل دینے سے انکار کیا۔ خدا جانے اس میں کیا مصلحت تھی۔

مرزا طاہر بیگ صاحب طاہر مراد آبادی بھی شریک مشاعرہ تھے۔ مجھے یہ معلوم کرکے حیرت ہوئی کہ آپ کے شاگردوں کی تعداد بجائے مراد آباد کے

خود مرگروہ سہارنپور میں غیر متنازع ہے حالانکہ آپ کا قیام مراد آباد میں رہتا ہے اور یہ تمام گروہ ہر وقت شعروں کے اکھاڑے میں کودنے کو تیار رہتا ہے۔ دیوبند کے پندرہ روزہ مشاعرے میں آکر ان کے شاگردوں نے مرزا صاحب کے مقابلے کے لیے ایک عام چیلنج دیا تھا جس کی وجہ سے طوفان بے تمیزی برپا ہوا لیکن مشاعرے میں مرزا صاحب سے ملاقات کر کے معلوم ہوا کہ آپ نہایت صلح کل و مرنجان مرنج شخص ہیں آپ کی غزل بھی خوب رنگ لائی۔

حکیم غلام مصطفےٰ صاحب حکیم سہارنپوری کا کلام سن کر بھی مسرت حاصل ہوئی۔ آپ نے غزل سے پہلے ایک رباعی بھی سنائی جسے سن کر سب سامعین نے یہ رائے قائم کرلی تھی کہ آپ کے مقابلے پر کسی کا رنگ نہ جمے گا مگر غزل کے ساتھ وہ رباعی آپ نے عنایت نہیں فرمائی جو حیرت اور شبہ کی بات لوگوں کے نزدیک ہے حالانکہ میرا یہ خیال نہیں ہے۔

مولوی مصطفےٰ حسن صاحب فریاد کاکوروی حضرت محسن کاکوروی کے پوتے بھی شریک مشاعرہ تھے۔ آپ کی غزل نے بھی اک سماں باندھ دیا۔ امید ہے کہ مولوی صاحب موصوف اپنے جد امجد کا نام روشن کریں گے۔

مولوی امیر حسن صاحب امیر سہارنپوری نے مرصع نعت پڑھی جس کے ہر ہر شعر پر وجد کے سبب سامعین جھوم جھوم جاتے تھے۔

جناب بابو صاحب بانی مشاعرہ نے ایک لاجواب سہرا سنایا پھر طرحی غزل پڑھی جس کا ہر ہر شعر دل آویز تھا۔ افسوس ہے کہ وہ غزل مجھے مل نہ سکی کتابی صورت میں جو یہ مشاعرہ نہایت اعلیٰ چھاپنے پر شایع ہوگا انشاءاللہ اس میں یہ غزل بھی مندرج ہوگی۔

اخیر میں حضرت وحشی دیوبندی نے بہت طویل غزل سنائی۔ سنا ہے کہ اس مصرع پر انھوں نے دو سو گیارہ شعر کہے تھے۔ حضرت وحشی ایک نہایت کامل الاستعداد ذکی الفطرۃ انسان ہیں۔ امیر و داغ کے ہمعصروں میں ہیں۔ ان کی بلند پروازی فلک ہفتم سے مضمون لاتی ہے۔ ایسا ذہین و نکتہ رس شاعر میری نظر سے اب تک نہیں گذرا۔ سنگلاخ سے سنگلاخ زمین میں شاعری کے کمال دکھانا اور بلا کسی زحمت کے انہی کا کام ہے۔ بعض اہل کمال کنج گمنامی میں ہونے کی وجہ سے دنیا کی قدردانیوں سے محروم رہتے ہیں لیکن ان کی قابلیت موازنہ کرنے کے بعد ہر اہل کمال سے بیش قیمت ٹھہرتی ہے۔ انہی لوگوں میں حضرت وحشی دیوبندی کی بھی وقیع شخصیت شمار ہو سکتی ہے مگر آپ کی غزل جو رنگ لائی اس کی تصویر وسعت تحریر میں نہیں آسکتی۔

اب ہم چند منتخب غزلیات میں سے ہر غزل کے منتخب اشعار ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ اس مشاعرے میں داد کی تقسیم تین قسم پر کی گئی۔ بعض لوگوں نے تو طرز ادا و تصویر بیان پر داد حاصل کی۔ بعض حضرات کو اس وجہ سے داد ملی کہ ان کا نام ان کا وقار سفارشی تھا۔ بعض حضرات کو ان کی رنگینی بیانی، بلند پروازی اور محنت و جگر کاوی کی داد ملی۔

تاجور نجیب آبادی۔ جعفری باغ لاہور۔

نمونہ انتخاب

عالی جناب بابو محمد اسماعیل صاحب فراغ میر مشاعرہ مدرس اعظم دیوبند۔

آپ کی غزل کا انتخاب ہمیں ایک مکرم کے ذریعے بعد میں وصول ہوا مگر حضرت انتخاب کنندہ نے انتخاب میں بخل سے کام لیا ورنہ آپ کی غزل مرصع غزل تھی۔ ؎

نیر اسلام نے گھر گھر اجالا کر دیا   دور کفر و شرک و بدعت کا اندھیرا کر دیا
اس کی نیرنگی نے اچھا ڈھنگ پیدا کر دیا   حسن گل کو دے دیا بلبل کو شیدا کر دیا
درد کی لذت سے مل جاتا تھا کچھ دل کو مزہ   چارہ گر نے مار ہی ڈالا کہ اچھا کر دیا

جناب بابو محمد حنیف صاحب حنیف سب اوورسیر ناگپور۔ ؎

تھا چمن گلزار کل تک آج صحرا کر دیا   اے خزاں تو نے سکھا کر گل کو کانٹا کر دیا

چاند سورج سے نہیں کم جلوۂ محبوب بھی ۔۔۔ جس اندھیرے گھر میں یہ آیا اجالا کر دیا

جناب مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا رئیس سہارنپور مختار عدالت

آپ کی غزل کا انتخاب ہمیں مضمون لکھنے کے بعد وصول ہوا۔ آپ کی غزل میں بہت سے اچھے شعر تھے۔

بات ہے ان کی کہ مارا اور زندہ کر دیا ۔۔۔ کھیل ہے ان کا کہ چھو نکا اور ٹھنڈا کر دیا

تھا مشیت میں کہ ہر معلول ہو علت کے ساتھ ۔۔۔ درد کو قدرت نے دل کے ساتھ پیدا کر دیا

جناب مولوی مصطفےٰ احسن صاحب نجیب کا کوروی :-

آپ خنجر سے بجھائی پیاس میری وقت ذبح ۔۔۔ ہائے قاتل نے مجھے پانی بھی ترسا کر دیا

تھا ترے عشاق کو تیرے دہن میں اختلاف ۔۔۔ تو نے پیماں توڑ کر یہ حل معما کر دیا

ان کے قدموں پر میں گر پڑتا کہاں میری مجال ۔۔۔ اضطراب نے مری گر پڑ کر اتنا کر دیا

جناب حکیم غلام مصطفےٰ صاحب حکیم سہارنپوری :-

اب نہیں ہمت ملیں ہم تم سے یا اہلِ وطن ۔۔۔ خاک غربت نے لباسِ زیست میلا کر دیا

اے نگاہِ چشمِ قاتل تو نے پھر چرکے دیئے ۔۔۔ پھر ہمارا دل وقفِ صد زخمِ تمنا کر دیا

ہائے کیا حالت ہے یہ من تو شدم تو من شدی ۔۔۔ انتہائے عشق نے مجنوں کو لیلیٰ کر دیا

خاک کا عاشق کی جب آیا وہ خورشید جمال ۔۔۔ شوقِ نظارہ نے ہر ذرے کو موسیٰ کر دیا

جناب مولوی امیر حسن صاحب امیر سہارنپوری نعت گو :-

آپ نے قدموں سے بت خانے کو کعبہ کر دیا ۔۔۔ خاک پر رکھ کر قدم اس کو مصلیٰ کر دیا

ہاتھ میں تھی آپ کے گویا عنانِ زندگی ۔۔۔ جس طرف ڈالی نظر مُردوں کو زندہ کر دیا

حضرت موسیٰ دم نظارہ غش کھا کر گرے ۔۔۔ طور پر کیا تم نے اظہارِ تجلیٰ کر دیا

رشک کرتے ہیں فرشتے دیکھ کر شانِ بلالؓ ۔۔۔ آپ کے الطاف نے بندے کو مولا کر دیا

جناب منشی عبدالخالق صاحب ذہین نجیب آبادی :-

جاں بلب تھا میں نے مانا تم نے اچھا کر دیا ۔۔۔ تم مسیحا ہو تو پھر یہ کیا اچنبھا کر دیا

دل میں رہتی ہے ہمارے رات دن تصویرِ دوست ۔۔۔ ہم نے اس کعبے کو بت سے کلیسا کر دیا

جناب منشی ریاض الحسن صاحب ریاض دیوبندی تلمیذ و خلف الرشید حضرت وصفی دیوبندی :-

بخت اعدا سے مری قسمت کا بدلا کر دیا ۔۔۔ کاتبِ تقدیر نے کیا اس کے دھوکا کر دیا

میں فدا ہوں تم پہ تم شیدا ہو اپنے عکس پر ۔۔۔ آئینے نے تم کو مجھ سا مجھ کو تم سا کر دیا

ان کے دل میں ان کے کہنے سے کدورت آ گئی ۔۔۔ دشمنوں نے چشمۂ الفت کو گدلا کر دیا

جناب حکیم ولی محمد صاحب ولی سہارنپوری تلمیذ حضرت طاہر :-

کام حسن و عشق نے کیا خوب پیدا کر دیا ۔۔۔ مجھ کو لاثانی بنایا تم کو یکتا کر دیا

چھوڑ کر چلتے ہوئے ہوش و خرد و صبر و قرار ۔۔۔ دشتِ غربت میں مجھے سب نے اکیلا کر دیا

اے دل مضطر تجھے اب تو تسلی ہو گئی — دے دیا سر کاٹ کر لے ہم نے جھگڑا کر دیا

جناب مرزا طاہر بیگ صاحب طاہر، مراد آبادی

آپ نے اس خوبی سے غزل پڑھی کہ اگر تصویر بیان و طرز ادا پر دستار بندی کا انحصار ہوتا تو لازماً کہ مرزا صاحب کے سر پر دستار باندھنے میں حضار میں سے کوئی شخص انکار نہ کرتا۔ ؎

عاشقی میں حسن معشوقی ہویدا کر دیا — بڑھ کے جوش عشق نے مجنوں کو لیلیٰ کر دیا
نقد دل کو یاد کر کے تھام لیتا ہوں جگر — ہائے کیسا حال وقت تاز بیجا کر دیا
لے کے دل اب جان بھی مجھ سے طلب کرتے تھے — تم تو کچھ اترا گئے بس جاؤ کہنا کر دیا
کیا ملا تجھ کو جو تو نے چھو کے اے باد صبا — رنگ ان کے عارض گلگوں کا میلا کر دیا

جناب مولانا دبیر رڑکوی یادگار حضرت ظہیر دہلوی ؎

وعدہ کر کے بھی نہ آئے تم نے یہ کیا کر دیا — دل کے ٹکڑے کر دیئے خون تمنا کر دیا
سرو ہی پر منحصر ہے کچھ نہ کچھ شمشاد پر — آپ نے تاڑا جسے اس کو ہی سیدھا کر دیا
ہاں تمہاری آنے دل کی رنجش کیا کہوں — زندگی برباد کر دی موت جینا کر دیا
ہنستے ہنستے ہو گئے ہیں تو گرفتار ہم — ایک مدت ہو گئی موقوف رونا کر دیا
مدعی کے گرم فقرے اور سر محفل چپ خموش — آپ ہی تھے جو مرے غصے کو ٹھنڈا کر دیا
راہ سے وہ کیا پھریں جو قول سے پھر جائیں — کر دیا جب ہم نے رخ سوئے کلیسا کر دیا

جناب مولانا غریب سہارنپوری

آپ نے ایک نعت سنائی جس پر خاطر خواہ داد ملی۔ پھر طرحی غزل سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔ دونوں نمونے ملاحظہ ہوں۔

نعت

یہ مزا عشق رسول اللہ نے پیدا کر دیا — درد دل کو میوۂ نخل تمنا کر دیا
ان کا کیا کہنا جو زندوں کو ہوئے حضرت سے فیض — ان کی جاں بخشی نے مردوں کو مسیحا کر دیا
پاؤں رکھنے سے محمد کے ہوئی سب خاک پاک — کل زمیں کو حق تعالیٰ نے مصلیٰ کر دیا
میں نے جب تحریر کی تعریف چشم پاک کی — حق نے اس پر صاد مازاغ البصر کا کر دیا

غزل

بند میری فکر نے کوزے میں دریا کر دیا — ختم سب اک مصرع قد میں سراپا کر دیا
آج تک سب بے لطف گزری تھی ہماری زندگی — شاد باش اے عشق دل میں درد پیدا کر دیا
ہو گئے پامال لاکھوں کے دم رفتار سر — دو قدم تم کیا چلے اک حشر برپا کر دیا
کاہ کی صورت اڑا پھرتا ہوں اب چاروں طرف — ناتوانی نے مجھے گویا توانا کر دیا
کیوں نہ چھڑکا مار کر خنجر جراحت پر نمک — تو نے اے قاتل مزا زخموں کا پھیکا کر دیا

امیر الشعراء حضرت وحشی دیوبندی ؎

رنگِ پاں نے سرخ لعلِ روح افزا کر دیا — کیا غضب ہے خضر نے خونِ مسیحا کر دیا
میں کھٹکتا ہوں بتوں کی چشمِ خواب آلود میں — میری قسمت نے مجھے سونے کا کانٹا کر دیا
حشر پر تھا وعدۂ دیدار اب کیا عذر ہے — ہم نے نالوں سے شبِ غم حشر برپا کر دیا
دل میں بھی آکر مرے ڈالی گئی رخ پر نقاب — تو نے اے پردہ نشیں پردے میں پردا کر دیا
نزع میں بھی تھا ہمیں تزئینِ جاناں کا خیال — رشتۂ جاں جن میں آنکھوں کا ڈورا کر دیا
دل سے باہر جب وہ نکلے دل کے ارماں نکل کر — حسرتیں بولیں کہ آؤ ہم نے پردا کر دیا
موتیوں میں وقت زینت مانگ اس کی چھپ گئی — یار نے ملکِ عدم کا بند رستا کر دیا
تھی نہ تابِ تابِ عارض بند آنکھیں ہو گئیں — اس نے اپنے دیکھنے والوں کو اندھا کر دیا

تراب ملا قدام خاک بسر تاجور عفی عنہ نجیب آبادی ؎

اک نظر میں غیر سے بے حس کو شیدا کر دیا — تو نے پتھر میں بھی ظالم درد پیدا کر دیا
یار کے حسنِ شرابی سے ہی دل مدہوش تھا — نیم خواب آنکھوں نے سونے پر سہاگا کر دیا
ان کو نفرت مجھ سے مجھ کو دل سے ان کو درد سے — شکوۂ باہم نے باہم رنج پیدا کر دیا
میاں سے باہر جو نکلی وہ عروسِ تیغِ ناز — زخمِ دامن دار نے مقتل میں پردا کر دیا
آئے مقتل میں جو وہ کشتوں کے پشتے لگ گئے — تیغ ہنستے چڑھ گئی تھی حشر برپا کر دیا
مرنے والا جان سے جاتا رہا جن کے لیے — ان کو رسوائی کا رونا ہے کہ رسوا کر دیا
کہہ رہی ہے کچھ مسیحا سے نگاہِ واپسیں — چپ لگی مجھ کو تو میں نے اس کو گویا کر دیا
تیغ کیا تھی کل وہ اس برقِ بلا کے ہاتھ میں — ایک بجلی تھی جدھر چمکی صفایا کر دیا
اللہ اللہ کر کے اس نے رخ سے الٹی تھی نقاب — ایک تابِ حسنِ جاناں تو نے پردا کر دیا

ان کی بزمِ ناز میں جا کر پشیمانی ہوئی
چشمِ پرنم نے بھری محفل میں رسوا کر دیا

مخزن جون ۱۹۱۵ء

علامہ تاجور کی شخصیت اور شاعری

(صفحہ ۸۷ سے آگے)

سبب ہر ایک مجھ سے پوچھتا ہے میرے رونے کا
الٰہی! ساری دنیا کو میں کیونکر رازداں کر لوں
وہ میری داستانِ سوزِ غم مجھ سے اگر سن لیں
انہیں بھی تاجور! اپنی طرح آتش بیاں کر لوں

اُن کی ایک غزل میں ہر مصرعہ نہایت دلچسپ ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ ایک شعر ذہن میں رہ گیا ہے ؎

قسمت کا دھنی ہوں کہ ملے آپ، وگرنہ
آپ آپ ہیں، میں میں ہوں، کہاں آپ، کہاں میں

یہ ساری غزل اسی انداز کی ہے۔ افسوس کہ باقی اشعار حافظے سے نکل گئے۔
ایک اور غزل کے تین شعر ملاحظہ ہوں: ؎

حیف! وہ الم نصیب، جس کا درد تُو نہ ہو
اُف وہ دردِ زندگی، جس کی تُو دوا نہیں
دوست یا عزیز ہیں خود فریبیوں کے نام
آج آپ کے سوا، کوئی آپ کا نہیں
بیوفا! خدا سے ڈر، طعنۂ وفا نہ دے
تاجور میں اور عیب کچھ ہوں، بے وفا نہیں

دو شعر اور سنئے!

مجھی پر پڑ رہی ہے ساری محفل میں نظر اُن کی
یہ دلداری "حسابِ دوستاں در دل" نہ بن جائے
ترے انوار سے ہے نبضِ ہستی میں تڑپ پیدا
کہیں سارا نظامِ کائنات اِک دل نہ بن جائے

اُن کے حسبِ ذیل اشعار میں کتنا جرأت پیغام "موجود ہے: ؎

نہ طوافِ کعبہ کا عزم کر، نہ جبیں کو نذرِ صنم بنا
ترا دل ہے دیر و حرم اسی کو حریفِ دیر و حرم بنا
یہ ہے انتقامِ ستمگری کہ ستم پذیر نہ بن کبھی
جو مٹے تو پیکرِ پائمال کو یادگارِ ستم بنا

تری قوم ہے تری آبرو، اسی آبرو کو تلاش کر
کبھی "تو" سے "آپ" بھی ہو جائے گا پہلے "میں" کو تو "ہم" بنا

ترے دل کا جام سفال، جام جہاں نما ہے ترے لئے
اسے اپنا ساغر جم سمجھ، اسے اپنا ساغر جم بنا

مٹے دیر و کعبہ کی کشمکش، یہی شیخ کعبہ تو کام کر
کہ صنم کدے کے پجاریوں کو شریک بزم حرم بنا

تاجور کی ایک غزل اقبال کے اس مصرعے پر کہی گئی تھی کہ
ع بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

چند شعر سنیئے اور سر دھنیئے:

محبت میں تو بس اُس وقت ہوتا ہے اثر پیدا
کہ دل میں رہتے رہتے درد کرے دل میں گھر پیدا

بہار آنے کو ہے، بادِ جنوں انگیز چلتی ہے
جنوں اُچھلے گا، ہر سر میں ہُوا سودائے سر پیدا

محبت میں محبت کی خلش یہ رنگ لائے گی
کہ ارماں کی بجائے دل میں ہوں گے نیشتر پیدا

تجھے کیا قدر ہو گی دردمندانِ محبت کی
ارے بیدرد! پہلے اپنے دل میں درد کر پیدا

تاجور کی غزلوں کے کچھ اشعار اور سنیئے: ــ

مجھ میں، عدو میں دوستی بوالہوسی کا فرق ہے
میری محبت اور تھی، غیر کا پیار اور تھا

شکوۂ دردِ ہجر تو بات کوئی نئی نہ تھی
میری طرف سے آپ کے دل میں غبار اور تھا

غیر سے کہہ رہے ہیں وہ سُن کے کلام تاجور
اُس کی تو بات کیا ہے وہ سحر نگار اور تھا

★

کچھ سُن کے ہائے آج بھی بہکا دیا مجھے
محشر میں دے گئے وہ فریب وفا مجھے

ایسا ہوا ہوں گم طلب کوئے یار میں
میں رہنما کو ڈھونڈتا ہوں، رہنما مجھے

روزِ ازل جسے جو مناسب تھا وہ ملا
ارمان دل کو، جان کو صدمے دیا مجھے
رُسوائے خلق کرکے ستم تم ہوئے کریں؟
ہر ایک کہہ رہا ہے تمہیں بے وفا مجھے؟

★

کیسی نیرنگی عجائب خانۂ عالم میں ہے
کوئی سرشارِ مسرّت ہے، کوئی ماتم میں ہے
عکس تیرے حسن کا، اے زینت آرائے بہارا
گل میں ہے، گلشن میں ہے سبزے میں ہے شبنم میں ہے
وہ ہمارے ہو رہیں سارا زمانہ چھوڑ کر
تاجور! کہئے تو کیا سرخاب کا پر ہم میں ہے

★

وجہِ بربادیِ دل عشقِ فسوں ساز نہ ہو
صاحبِ خانہ کہیں، خانہ برانداز نہ ہو
ضبطِ فریاد سے ہو جائیں نہ آنکھیں پُر نم
پردہ داری ہی کہیں پردہ درِ راز نہ ہو
صدرِ محفل نہ ہو تو ہی کہیں اُس محفل میں
بزمِ محشر بھی تری انجمنِ ناز نہ ہو
ہوک سی اُٹھنے لگی دل میں، خدا خیر کرے
جس کا انجام نہیں، یہ وہی آغاز نہ ہو
تاجور! ترکِ محبت کی قسم ٹوٹ نہ جائے
وہ فسوں ساز، کج انداز، در انداز نہ ہو

تاجور کے بعض شعروں میں رفعتِ خیال کی بڑی عمدہ مثالیں ملتی ہیں:

حشر میں بیتابیوں سے دل کی اِک چکّر میں ہوں
مجھ میں محشر ہے، خدا جانے کہ میں محشر میں ہوں
گھر سے لائی دشت میں مجھ کو مری دیوانگی
گھر سے ہوں باہر مگر میں پھر بھی اپنے گھر میں ہوں
کشتۂ لب ہوں، کسی کے دل میں ہے میری جگہ
لعل ہوں اے تاجور! میں بھی مگر پتھر میں ہوں

آخر میں ایک اور غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

★

اب تو جینے کی تمنا دلِ مضطر میں نہیں
وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تیرے مقدر میں نہیں

محفلِ حشر بھی سونی نظر آتی ہے مجھے
ڈھونڈتی ہیں جسے نظریں وہی محشر میں نہیں

سنگدل! تجھ پہ محبت کا اثر ہو کیونکر
دل میں احساس ہوا کرتا ہے پتھر میں نہیں

تاجور! شعر ترے سن کے تڑپ جاتا ہوں
کاٹ جو تیری زباں میں ہے وہ خنجر میں نہیں

اِن مختلف مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تاجور کے اکثر اشعار "از دل خیزد بر دل ریزد" کے مصداق ہیں۔

یہ تاجور مرحوم کی غزلوں کے چند نمونے تھے۔ اُنہوں نے نظمیں غزلوں سے زیادہ کہی ہیں اور حقیقت میں وہ نظم ہی کے شاعر تھے۔ اُن کی بعض نظمیں تاریخی حیثیت کی حامل ہیں اور نہایت ضروری موضوعات سے متعلق ہیں۔

اُن کی ایک نظم "نذرِ عقیدت" کے نام سے چھپ چکی ہے، جو حضورِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت ہے۔ یہ نظم اپنے تاثر کے اعتبار سے از حد رقت آمیز ہے اور اس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شاعر کی محبت اور عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اُن کی دیگر مشہور نظموں میں مقبرہ جہانگیر، مقبرۂ نور جہاں، ساقی نامہ، نوائے غم، برسات، شراب خانہ خراب، شہید توحید، صبح، ابشور پانشا وغیرہ مشہور ہیں۔

اِن میں سے آخری نظم میں اُنہوں نے ہندی کے الفاظ کثرت سے استعمال کئے ہیں، جن سے اُن کی ہندی دانی کا ثبوت ملتا ہے۔

تاجور مرحوم کو دنیائے شاعری میں جو مقام حاصل ہے، اُس کا احساس اُنہیں زندگی میں خود بھی تھا اور کیوں نہ ہوتا کہ انہوں نے علم و ادب کی خدمت میں تقریباً نصف صدی گذار دی تھی۔

وہ اپنی نظم "ساقی نامہ" کے آخر میں کہتے ہیں اور بجا کہتے ہیں کہ :-

مدہوش! کلامِ تاجور سن — خاموش! کلامِ تاجور سن
شاعر کی طلاقتِ زباں دیکھ — ساحر کی فصاحتِ زباں دیکھ

آپ کو یہ معلوم کر کے افسوس ہوگا کہ اُردو کے اس قدر نامور شاعر کا مجموعۂ کلام اب تک نہیں چھپ سکا۔ یہ تاریخ ادب کا کتنا بڑا المیہ ہے۔

اے کاش! کہ اُن کا کوئی شاگرد اِس طرف بھی توجہ دے۔


ثنا پروڈکشنز کی ایک گھریلو ڈرامائی اور طلاطمی تصویر
گھر کا اُجالا
اُسکی
ساری کائنات
اُس کا گھر تھا۔
اُس کے گھر میں اُسکی
پیاری بیوی اور ایک
ننھا منا بچہ تھا ۔ ایک
ناگن نے شوہر کی محبت پر
ڈاکہ ڈالا اور بیوی سے شوہر کا
پیار چھن گیا۔ مُنا بھی باپ کی
شفقت سے محروم ہو گیا ۔ پھر ایک
وقت آیا جب بیٹے کی ممتا نے
باپ کو پکارا ۔ جب باپ کے پدری
جذبات بیدار ہوئے تو وُہ خونی اور مجرم بن گیا۔
۔ لیکن اس کی ممتا نہ مر سکی ۔ اُس نے
بیٹے اور بیوی کی خاطر ایک اور قربانی پیش کی اور
یہ قربانی اُسے زندۂ جاوید بنا گئی۔
پروڈکشنز کی یہ عظیم گھریلو تصویر بہت جلد نمائش کے لیے پیش کی جائے گی

Picture

LAHORE

Phone. 69226



… کے ہمراہ